تاریخ بلتستان

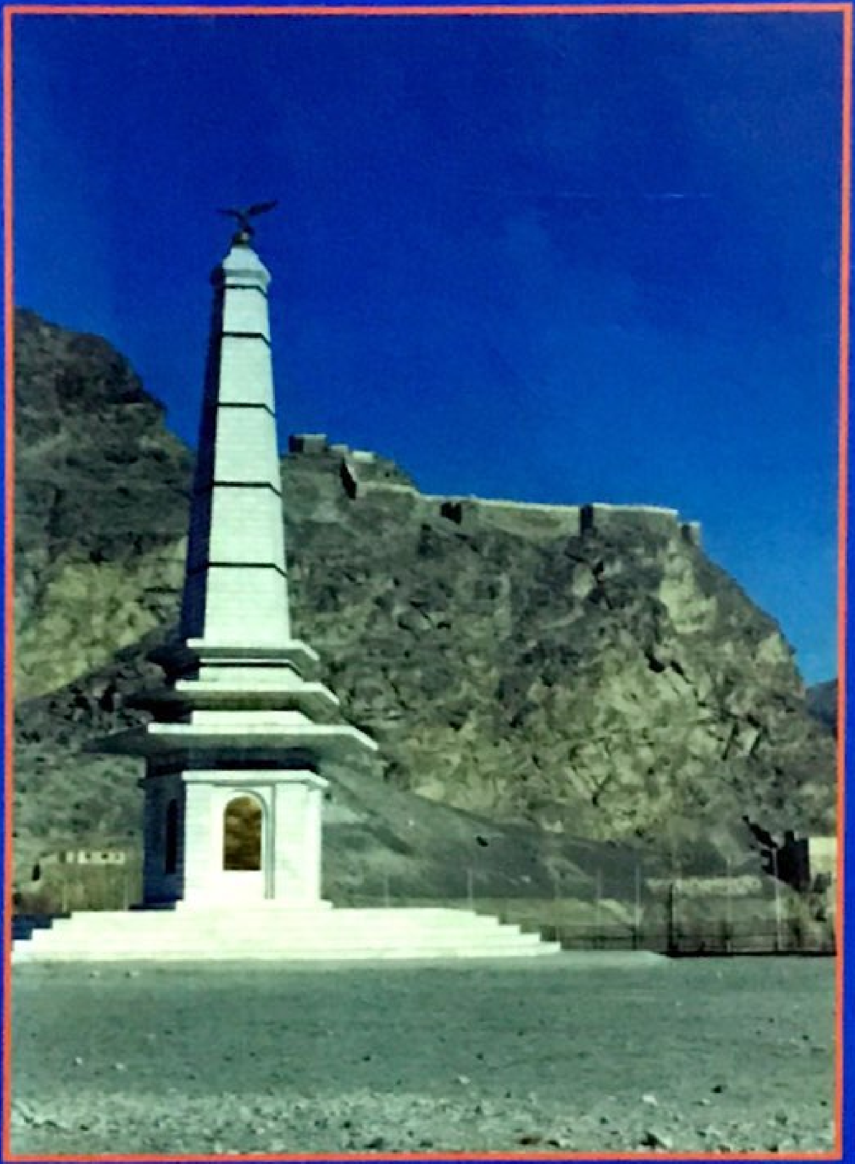

محمد یوسف حسین آبادی (پرائڈ آف پرفارمنس)
آنریری پروفیسر امریٹس یونیورسٹی آف بلتستان سکردو

تاریخ بلتستان

محمد یوسف حسین آبادی
(صدارتی اعزاز برائے حُسنِ کارکردگی)
آنریری پروفیسر امریٹس یونیورسٹی آف بلتستان سکردو

بلتستان بک ڈپو نیا بازار سکردو

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

نام کتاب : تاریخ بلتستان

پہلا ایڈیشن : فروری 2003ء

دوسرا ایڈیشن : دسمبر 2009ء

تیسرا ایڈیشن : جنوری 2019ء

ناشر : **بلتستان بکڈپو اینڈ پبلی کیشنز**، نیا بازار سکردو بلتستان۔

فون: 455522 - 455166 (05815)

قیمت: : 850.00 روپے

انتساب!

بھائی محمد رضا کے نام

صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان
ایچ ۸/۴، پطرس بخاری روڈ اسلام آباد
۲۱۔دسمبر ۲۰۰۲ء

فون دفتر: ۴۴۴۹۴۶۵
گھر: ۴۸۴۴۸۵۴
فیکس: ۴۴۴۶۸۸۳
ای میل: این ایل اے پاک
@اپالو۔نیٹ۔پی کے
پروفیسر فتح محمد ملک
۹۲۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

جناب محمد یوسف حسین آبادی شمالی پاکستان کے نامور ادیب، دانشور، محقق اور مترجم قرآن مجید ہیں۔آپ نے انتہائی خلوص و محبت کے ساتھ دینیات اور ادبیات کے شعبہ ہائے علم میں قابلِ رشک کارنامے سرانجام دیئے۔آپ نے قرآن پاک کا بلتی زبان میں پہلی بار ترجمہ شائع کر کے بلتستان کے عوام کو اپنی مادری زبان میں تفہیم القرآن کی نعمت غیر مترقبہ سے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔آپ نے بلتستان کی لسانی، ادبی اور تہذیبی زندگی کے حُسن و جمال سے دنیا کو روشناس کرانے کی خاطر متعدد تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھے جن سے بیرون ملک پاکستانی تہذیب وثقافت پر دادِ تحقیق دینے والے مستشرقین نے بھی بیش از بیش فیض حاصل کیا۔

پاکستان میں جناب محمد یوسف حسین آبادی کا سب سے بڑا کارنامہ بلتستان کی قدیم و جدید تاریخ پر یہ مبسوط، مستند اور فکر انگیز کتاب ہے۔ بلتستان کی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک زرین باب ہے۔بلتستان کو تحریک پاکستان میں یہ نمایاں امتیاز حاصل ہے کہ بلتستان کے عوام نے ڈوگرہ راج کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور سرفروشی کی زریں مثال قائم کرتے ہوئے خود کو ڈوگرہ

سامراج کے چُنگل سے آزاد کرایا اور پھر رضا کارانہ طور پہ پاکستان کو اپنا وطن قرار دیا۔ بلتستان میں تحریکِ پاکستان کے اس رُخ کو بھی جناب یوسف حسین آبادی نے اپنی اس کتاب میں حُسن و خوبی کے ساتھ نمایاں کیا۔ بلتستان کی تاریخ پر یہ یادگار تصنیف پاکستانیات کا ایک نیا خوبصورت اور قابلِ فخر باب ہے۔ میں اس قابلِ فخر تصنیف پر اُن کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

جناب محمد یوسف حسین آبادی کے ذہن اور ذوق سے پاکستان کی تہذیبی دنیا کی بہت سی بیش قیمت توقعات وابستہ ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ وہ ان توقعات پر پورا اتریں گے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

Phone: (0572) 2750
Fax (0572) 2593
Government of Pakistan
Deputy Chief Executive
Northern Areas, GILGIT.

Fida Mohammad Nashad

تقریظ

ممتاز تاریخ دان سابق مبصر/ممبر وفاقی مجلس شوریٰ مرحوم وزیر غلام مہدی ایم اے ایل ایل بی (علیگڑھ) کے یہ الفاظ ہیں جوانہوں نے 22 اگست 1983ء کو مصنف کی پہلی تصنیف 'بلتستان پر ایک نظر'' کی تقریظ میں لکھے تھے:

''......اس کتاب میں جتنا مواد جمع کیا گیا ہے اس سے مستقبل کا مورخ کما حقہ استفادہ کر سکتا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس کتاب کو رہبر بنائے بغیر کوئی شخص جنگ آزادی گلگت بلتستان پر قلم نہیں اٹھا سکتا......۔ فاضل مصنف جناب محمد یوسف نے اپنی اس تصنیف میں 1948ء کی جنگ آزادی کے علاوہ بلتستان کے جغرافیائی حالات، ڈوگرہ دور، بلتی زبان و رسم الخط، بلتی شاعری، بلتی شعراء، بلتی لوک گیت، موسیقی اور کہانیاں، آثار قدیمہ، رسم و رواج، صنعت و حرفت وغیرہ پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ گویا یہ کتاب بلتستان کا انسائیکلو پیڈیا ہے...... مجھے فاضل مصنف سے توقع ہے کہ ان کی دوسری تصنیف بلتستان کی مبسوط تاریخ ہو گی۔ میں جناب محمد یوسف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے وہ کام کیا ہے جو میں اپنی زبردست خواہش کے باوجود گذشتہ پچاس سال میں نہ کر سکا۔''

میں سلسلہ کلام کو یہیں سے آگے بڑھاتا ہوں۔ وزیر غلام مہدی مرحوم کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ مصنف کی پہلی تصنیف 1984ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد سے یہ کتاب بلتستان پر تحقیق کرنے والے ملکی و غیر ملکی محققین کے پیش نظر رہی ہے جس کے نہ صرف حوالے جا بجا ملتے

ہیں بلکہ ان کی رائج کردہ بعض اصطلاحات اور تراکیب بھی دیگر مصنفین کی کتابوں میں من وعن نظر آتی ہیں۔ یہ کتاب اس وقت ایک ریفرنس بک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ محمد یوسف حسین آبادی نے بلتستان پر باقاعدہ تحقیق وتالیف کی بنیاد رکھی جس کے بعد سے بلتستان پر کتابیں لکھنے کا خوش آئند سلسلہ شروع ہوا جو جاری رہے گا۔

محمد یوسف حسین آبادی نے جنگ آزادی بلتستان 1948ء کے واقعات کی تفصیل اس جنگ کے اعلیٰ کمانڈروں، مجاہدوں اور عینی شاہدوں سے انٹرویو کے ذریعے جمع کی۔ اس طرح ملت کی داستان کا یہ قیمتی باب انہوں نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ بلتی زبان کا قدیم رسم الخط صدیوں کے بعد پہلی بار دریافت کر کے منظر عام پر لانے کا سہرا بھی انہیں کے سر ہے۔ بلتی زبان کی تاریخ اور رسم الخط پر ''بلتی زبان'' کے عنوان سے ان کی تصنیف 1990ء میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے نہ صرف بلتی زبان کا قدیم رسم الخط دریافت کیا بلکہ سات نئے حروف کے اضافے کے ذریعے فارسی رسم الخط کو بلتی زبان کے تقاضوں کے موافق بھی بنا دیا۔ یہ رسم الخط چھ سو سالوں سے نامکمل صورت میں بلتی زبان کے لئے رائج چلا آ رہا تھا۔ قرآن مجید کا بلتی زبان میں ترجمہ کرنے کے مقدس مشن میں یوسف حسین آبادی نے کئی سال صرف کئے۔ یہ ترجمہ بالآخر 1995ء میں شائع ہوا۔ یہ بلاشک وشبہ ایک ایسا سعادت مندی کا کام ہے جو صرف نصیب والوں کے حصے میں آتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں:

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کسی بھی علاقے کی تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھانا آسان کام نہیں۔ خصوصاً بلتستان جیسے علاقے کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے تحقیق کرنا بلاشبہ غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ یہاں کی تاریخ سے متعلق تحریری مواد دستیاب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس علاقے کی کوئی مربوط اور جامع تاریخ موجود نہیں تھی۔ اس پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ یوسف حسین آبادی نے بلتستان کی جامع تاریخ مرتب کی ہے جس میں انہوں نے قدیم دور سے لے کر اب تک کی تاریخ جمع کی ہے۔

مصنف نے اس موضوع پر غیر جانبدارانہ اور عمیق تحقیق کر کے تاریخ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے۔
بلتستان کے ممتاز دانشور محمد اقبال (ریٹائرڈ ڈائریکٹر انفارمیشن آزاد کشمیر) مصنف کے بارے میں صحیح کہتے ہیں "اس بظاہر سادہ انسان میں عالمانہ گہرائی کے ساتھ مغربی محققین کا سا ذوق تحقیق ہے جو بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔"

جناب محمد یوسف حسین آبادی نے تاریخ بلتستان رقم کر کے نہ صرف ایک اہم قومی ضرورت کو پورا کر دیا ہے بلکہ تاریخ کے طلباء اور آئندہ کے مورخین و محققین کے لئے بھی تحقیق کی ایک بنیاد فراہم کر دی ہے۔ ان کا یہ کارنامہ لائق صد تحسین ہے ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

فدا محمد ناشاد

یکم دسمبر 2002ء

ریویو

آج جس کتاب پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں یہ ایک ایسے محقق و مورخ کی جنبش قلم کا نتیجہ ہے جو درحقیقت تعارف اور پذیرائی کے محتاج نہیں۔ پھر مجھ جیسے کم مایہ شخص کیلئے اس پر تبصرہ کرنا کارے دارد۔ تاہم تاریخ بلتستان کے خالق استاد محترم محمد یوسف حسین آبادی کی شخصیت بظاہر تو سیدھی سادی نظر آتی ہے لیکن جب ہم ان کی زندگی کے پیچ وخم میں جھانکنے لگیں تو ایک عجیب مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ حسین آبادی کا تعلق گاشوپا خاندان سے ہے اور یہ خاندان پُوریگ میں تقریباً 800ء سے 1834ء تک کم وبیش ایک ہزار برس برسراقتدار رہا ہے۔ اس خاندان کا تاریخی پس منظر ایک طویل داستان ہے۔ کالون رحیم خان کا تعلق اسی خاندان سے تھا جس کو وزیر زورآور سنگھ کے حملے کے دوران جنگ آزادی پُوریگ کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت بھی سرحد پار کرگل میں مقیم اس خاندان کے ایک فرد کاچو سکندر خان سکندؔر نے لداخ، پوریگ اور بلتستان کی قدیم تاریخ وتمدن پر کئی گراں بہا کتابیں لکھی ہیں جبکہ اسی خاندان کے دوسرے سپوت محمد یوسف حسین آبادی نے سرحد کے اِس طرف علم وادب کے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ ویسے تو یوسف حسین آبادی دینی تعلیم یافتہ ایک مولوی ہیں اور بقول خود ان کے نان پروفیشنل مولوی! لیکن ہماری روایت کے خلاف یہ روشن خیال مولوی کبھی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہو جاتے ہیں اور کبھی ماہر لسانیات بن کر زبان دانی کے سمندر میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ کبھی شاعری کے خارزار میں بھی آبلہ پا تھے۔ لیکن شاعری میں اب وہ تقیہ کرنے لگے ہیں اور اب تاریخ بلتستان کے نشیب وفراز میں ایک محقق بن کر تاریخ کی کایا پلٹتے نظر آرہے ہیں۔ محمد یوسف حسین آبادی ایک پُرعزم، فعال اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ جس کام کے پیچھے پڑتے ہیں اُسے منطقی انجام تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ کسی زمانے میں جب آپ نے پھولوں سے محبت کرنا شروع کی تو دیکھتے ہی دیکھتے اپنے باغ کو رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیا۔ ایک دفعہ بلتستان اور گلگت سے

متعلق کتابیں جمع کرنے کا عزم کیا تو انتہائی قلیل عرصے میں نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل ایک عظیم لائبریری قائم کرلی۔ جب آپ کو بلتستان میں تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کا احساس ہوا تو آپ نے سکردو میں نجی سطح پر سب سے پہلے جناح پبلک سکول جیسے معیاری ادارے کا قیام عمل میں لایا۔ بلتستان میں تصنیف و تالیف کے میدان میں تو آپ باوا آدم کہلاتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کی کتاب بلتستان پر ایک نظر 1984ء میں منظر عام پر آئی جو کسی مقامی مورخ کے قلم سے شائع ہونے والی تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع بلتستان کی جنگ آزادی ہے جبکہ اس کتاب میں یہاں کے جغرافیائی تعارف اور لوک ورثہ کو بھی زیب موضوع بنایا گیا ہے۔ صدیوں پہلے رائج اگیے رسم الخط کو دریافت کرنے اور پھر سے اسے بلتستان میں متعارف کرانے کا سہرا بھی حسین آبادی کے سر ہے۔ بلتستان کے اہل ذوق کو یہ رسم الخط سکھانے کے لئے آپ نے بلتی زبان کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی تحریر کیا۔ بعد میں جب آپ نے اس بات کا احساس کیا کہ یہ رسم الخط تقریباً چھ صدیوں سے متروک ہونے کے باعث اب یہاں قابل عمل نہیں ہے تو اُردو رسم الخط میں چند حروف کا اضافہ کر کے بلتی زبان کی صوتی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اب اسی رسم الخط میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام بلتی قاعدہ بھی شائع ہوا ہے۔ یوسف صاحب نے جب قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا تو میرے علم کے مطابق انہوں نے سب سے پہلے عربی مشکل الفاظ کی قرآنی لغت مرتب کی اور پھر ترجمے کا کام شروع کیا تھا۔ 1995ء میں قرآن مجید کا ترجمہ شائع کر کے نہ صرف تاریخ کے جریدۂ دوام پر اپنا نام ثبت کر دیا بلکہ نئی تہذیب کے سیلاب میں بہتی ہوئی بلتی زبان کو قرآن مجید کے حوالے کر کے اُسے بھی بقائے دوام سے نوازا۔ اب آپ نے تاریخ بلتستان کی مانگ میں زیر تبصرہ کتاب کا جھومر سجا کر بلتی قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر قاری کتاب کے تمام مندرجات سے اتفاق کرے کیونکہ تاریخ بذات خود تضادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر تاریخ کا ایک واقعہ کسی طبقے کے حق میں جاتا ہے تو وہی واقعہ دوسری طرف کسی طبقے کے خلاف بھی جا سکتا ہے۔ بہر حال 'تاریخ بلتستان' حسین آبادی کی سب سے اہم اور جامع تصنیف ہے جو ایک طرح سے بلتستان کی تاریخ و ثقافت کا

مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے۔ یہ کتاب بلتستان سے متعلق تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔اس میں دور راجگی کی جنگ وجدل کی داستانیں بھی ہیں اور بلتستان میں اشاعت اسلام کے قصے بھی۔ یہ کتاب جہاں علی شیر خان انچن کی فتح وکامرانی کی فخریہ تاریخ سے مزین ہے وہاں اس میں ڈوگرہ یلغار اور اپنوں کی سازش کے سربستہ رازوں کے انکشافات بھی ہیں۔اس کتاب میں جہاں مقپون راجاؤں کے ایران کے صفوی بادشاہوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کا ذکر ہے وہاں ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کے ساتھ ازدواجی رشتوں کے معاملات کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔اس کتاب میں مقپون،اماچہ اور ییگو حکمرانوں کی طرف سے خاقان چین اور وزیر یارقند کے دربار میں سفارتی اور تجارتی وفود بھیجے جانے کی کہانیاں بھی زیب قرطاس ہیں۔

یوسف حسین آبادی نے اس کتاب میں جہاں بلتستان کی پسماندگی کا نقشہ کھینچا ہے وہاں قیام پاکستان کے بعد ہونے والی ترقیات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ جہاں یہ کتاب جنگ آزادی کی محیر العقول داستانوں سے پر ہے وہاں اس علاقے کے لوگوں کی سیاسی وآئینی محرومیوں کا ذکر بھی برملا کیا گیا ہے۔حسین آبادی نے جہاں اس کتاب میں بلتستان کی قدیم تاریخ کے گمشدہ اوراق کو بازیاب کیا ہے وہاں انہوں نے ہماری جدید تاریخ کے نشیب وفراز پر بھی تبصرہ کیا ہے۔میری دانست کے مطابق اب تک کی تاریخ بلتستان وزیر زور آور سنگھ اور وزیر لکھپت کے کارناموں، ڈوگرہ سامراج کی ریشہ دوانیوں اور چند وطن فروش افراد کے ہاتھوں بلتستان کی شکست وریخت کے ذکر سے داغ دار تھی۔اب جناب یوسف حسین آبادی نے اپنی اس کتاب میں ان تمام پیشرو مورخین کی لغزشوں کا ازالہ کیا ہے۔انہوں نے مستند تاریخی ماخذ کی روشنی میں بہت سے تاریخی ابہام کو دور کیا ہے۔یوں ایک طرح سے سلطنت پولولو سے لیکر اب تک بلتستان کی کم وبیش سولہ سو سالہ تاریخ از سر نو مرتب ہوئی ہے اور اب تک چھپنے والی تاریخ کی تمام کتابوں پر یہ فائق ہے۔

جب مولوی حشمت اللہ خان تاریخ لکھ رہے تھے تو اُس کے پس منظر میں ڈوگرہ مہاراجاؤں کی خوشنودی کا عمل دخل تھا۔اسی طرح جب انگریز سیاح یہاں آکر سفرنامے لکھتے گئے تو یقیناً انہوں نے بھی تاج برطانیہ کے مفادات کا خیال رکھا ہوگا۔جیسا کہ مفتوحہ علاقوں کی تسخیر کے

دوران ڈوگرہ افواج اور اُن کے سرداروں کے ظالمانہ کردار اور مفتوحین کے ساتھ ان کے سلوک کے بارے میں کننگھم اور فرینکی جیسے یورپی مصنفین نے بھی عموماً خاموشی اختیار کی ہے۔ ممکن ہے اس کی سب سے بڑی وجہ سرکار جموں اور سرکار انگلشیہ کی باہمی دوستی آڑے آئی ہو جو خاص حالات میں قائم ہوئی تھی اور جس کی بقا سرکار انگلشیہ کے مفاد میں تھی۔ یوں بلتی یل کے ان غیور فرزندوں کی جرأت و بہادری کا صحیح نقشہ منظر عام پر نہ آسکا۔ اب حسین آبادی کے رشحات قلم نے بلتستان کی گمشدہ تاریخ کے اوراق کو منضبط کر کے تاریخی شخصیتوں کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''تاریخ بلتستان'' میں ان تمام شخصیات کا ذکر آیا ہے جن کا کسی نہ کسی طرح بلتستان کی تاریخ سے رشتہ جڑتا ہے۔ ان میں حکمران بھی ہیں سپاہی بھی، دینی مبلغین بھی ہیں شعراء بھی، سیاست دان بھی ہیں براڈ کاسٹرز اور بیوروکریٹ بھی۔ صرف ایک طبقہ شامل نہیں ہے۔ وہ ہے صاحب کتاب کا اپنا طبقہ یعنی یہاں کے ادب و ثقافت اور تاریخ و تہذیب پر لکھنے والے قلم کاروں کا طبقہ۔ یوسف حسین آبادی صاحب خود بہتر جانتے ہیں کہ انہوں نے اس طبقے کو کیوں فراموش کیا۔

جہاں تک تحقیقی مراحل کا تعلق ہے فاضل مصنف نے اپنی تحقیق میں پنڈت کلہن کی لکھی ہوئی قدیم تاریخ کشمیر یعنی راج ترنگنی سے لیکر سکندر بیگ منشی کی تاریخ عالم آرای عباسی تک، دوسری طرف فاہیان، ہیون سانگ اور برنیئر کے نایاب سفرناموں سے لیکر بلتستان چین تعلقات پر لوشوئی لن کے مقالے تک اُردو کے 74 اور انگریزی کے 50 مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور یہ مآخذ کتاب کی سند کے لئے ٹھوس ثبوت مہیا کرتے ہیں۔

تاریخ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ مستقبل کو سنوارنے کیلئے ماضی کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے درس ملتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ کسی قوم کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کی تاریخ کو محفوظ کیا جائے۔ کیونکہ وہی ماضی کا آئینہ دکھا کر مستقبل کے لئے مشعل راہ بنتی ہے۔

چنانچہ بلتستان کے قابل فخر دانشور محمد یوسف حسین آبادی نے اپنے توانا اور شستہ قلم

کے ذریعے آپ کو اب تک کی دستیاب اپنی تاریخ کا آئینہ دکھایا ہے۔ اب قوم کی نوجوان نسل کا فرض بنتا ہے کہ وہ غم جاناں اور غم روزگار کے دھندوں اور الیکٹرانک میڈیا کی رنگ رلیوں سے نظریں چرا کر کچھ وقت اپنے علاقے کی تحقیقی و تاریخی کتابوں کے مطالعے کے لئے بھی وقف کریں تا کہ تاریخ کے آئینے میں جھانک کر مستقبل کی راہیں متعین کر سکیں۔

محمد حسن حسرت

14 ستمبر 2003ء

پیش لفظ

1948ء کی جنگ آزادی بلتستان کی تاریخ راقم الحروف نے 1978ء تا1983ء کے دوران ان واقعات کے عینی شاہدوں اور شریک واقعہ افراد سے بالمشافہ انٹرویو کے ذریعے مرتب کر کے 1984ء میں 'بلتستان پر ایک نظر' کے نام سے منظر عام پر لایا تھا۔ اس کتاب میں بلتستان کے جغرافیائی تعارف اور ثقافتی ورثہ پر بھی دو ابواب شامل کئے گئے تھے۔ یوں بلتستان پر یہ پہلی کتاب تھی جس میں ایک دور کی تاریخ کے ساتھ اس علاقے اور اس کی ثقافت کا بھی مکمل تعارف موجود تھا۔ میں قوم کا شکر گزار ہوں کہ اس قلمی خدمت کی پوری قدردانی کی گئی۔

1984ء کے بعد کئی بلتی مصنفین نے بلتستان کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھ کر قابل قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن تاریخ پر ایک جامع کتاب کی کمی پھر بھی باقی رہی۔ 1988ء میں بنات گل آفریدی کی کتاب Baltistan in History شائع ہوئی اور اس کے ایک سال بعد 1989ء میں پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی کی کتاب ''History of Northern Areas of Pakistan'' منظر عام پر آئی جس میں شمالی علاقوں کی تاریخ کے ضمن میں بلتستان کی تاریخ بھی نہایت اختصار کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ بنات گل آفریدی نے بلتستان کی تاریخ پر اپنی طرف سے بھی کچھ تحقیق کی ہے تاہم بہت سی باتیں پھر بھی تشنۂ تحقیق رہ گئی ہیں۔ لیکن استاد محترم پروفیسر دانی سے ہمیں بجا طور پر گلہ ہے کہ انہوں نے بلتستان کی تاریخ پر اپنی شایان شان تحقیق نہیں کی۔

تاریخ کی اہمیت سے کس کو انکار ہے! تاریخ قوموں کے لئے سرمایہ افتخار بھی ہوتی ہے اور تازیانہ عبرت بھی۔ تاریخ ہی سے آیندہ نسلوں کو ان غلطیوں سے بچنے کا درس ملتا ہے جو اسلاف کی ذلت کا باعث بنیں اور ان اوصاف کو اپنانے کا شوق اجاگر ہوتا ہے جن کی بدولت انہیں عزت و شہرت حاصل ہوئی۔ اسی اہمیت کے حوالے سے بلتستان کی تاریخ پر ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی جس میں ماضی میں جہاں تک کھوج لگایا جا سکے وہاں سے جدید دور تک کی تاریخ موجود ہو۔ یہ

کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں قدیم تاریخ پر ایک باب سے تاریخ بلتستان کا آغاز کیا گیا ہے جس میں مختلف محققین کے تحقیقی کاموں کے علاوہ ان کے اصل مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ کی بنیاد الحاج مولوی حشمت اللہ خان کی تاریخ جموں ہے۔ تاریخ بلتستان کے حوالے سے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ الحاج مولوی حشمت اللہ خان کی تاریخ جموں نہ ہوتی تو آج ہمارے ہاتھ میں اس دور کی تاریخ کی اتنی تفصیل موجود نہ ہوتی۔ اس کے لئے ہم ان کے انتہائی احسان مند ہیں۔ تاہم یہ بھی واضح ہے کہ بہت سارے حوالے ان کی نظروں سے نہیں گزرے تھے جس کی وجہ سے اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تاریخ کے اس حصے پر دیگر دستیاب ذرائع کی روشنی میں دقیق نظروں سے تحقیق کی گئی ہے۔

جنگ آزادی بلتستان کی تاریخ، جغرافیائی تعارف اور لوک ورثہ کے بارے میں مواد میری پہلی تصنیف 'بلتستان پر ایک نظر' سے لیا گیا ہے۔ البتہ ان میں مزید مواد شامل کرنے کے علاوہ جغرافیائی تعارف اور لوک ورثہ کے ابواب میں تحقیقی کسر کو پورا کر کے مواد کو مستند بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ آزادی کے بعد کی تاریخ زیادہ تر ذاتی معلومات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ شائع شدہ اور غیر شائع شدہ تحریری ریکارڈز سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آخر میں 'بلتستان منزل بہ منزل' کے عنوان سے بعض امور کا صرف تاریخی پہلو کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح سے بلتستان کی تاریخ کو مکمل طور پر احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قارئین محترم! تاریخ بلتستان آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کی ہے۔ واقعات کو دیانتداری کے ساتھ پیش کرنے اور قلم کو ذاتی جذبات سے آزاد رکھنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی اور ادبی خوبیوں کی کمی اور دیگر کمزوریوں کا پورا اعتراف ہے۔ تاہم اس کتاب کے حسن و قبح پر نقد و جرح کا کام میں مستقبل کے مورخین پر چھوڑ دیتا ہوں۔

مجھے ان دوستوں، احباب اور ادب نوازوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی حوصلہ افزائیوں نے مجھے علمی تحقیق جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں فرداً فرداً ان سب کا

نام درج نہ کر سکا جس کے لئے میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ میں خصوصی طور پر نوجوان محقق، صحافی اور بلتستان بکڈ پو سکردو کے پروپرائٹر جناب محمد قاسم نسیم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا بندوبست کیا۔

سیٹلائٹ ٹاؤن سکردو

محمد یوسف حسین آبادی

10 دسمبر 2002ء

فہرست عنوانات

پہلا باب	27
جغرافیائی تعارف	27
وجہ تسمیہ	27
محل وقوع	28
حدود اربعہ	29
رقبہ	30
آبادی	30
وادیاں اور مواضعات	30
دریا	34
جھلیں	36
گرم چشمے	36
آب وہوا	37
زراعت	38
جنگلات	41
حیوانات	41
معدنیات	42
باشندے	43
مذہب	46

دوسرا باب	55
قدیم تاریخ	55
سلطنت پَولُولُو	55
تبتی دور	59
بلتستان اور بلور	65
طوائف الملوکی	70
تیسرا باب	73
بلتستان قرونِ وسطیٰ میں	73
سکردو	74
مقپون ابراہیم	74
ستک سنگے تا ساگوری تھم	76
کھوکھور سنگے تا بہرام چو	77
مقپون بوخا	78
شیر شاہ	83
علی خان	84
غازی میر	86
علی شیر خان انچن (اعظم)	87
احمد خان	101
عبدال خان	104
آدم خان	111
شاہ مراد	117
شیر شاہ ثانی	123
محمد رفیع خان	125

سلطان مراد	126
اعظم خان اماچا	127
محمد ظفر خان	129
علی شیر خان ثانی	132
احمد شاہ	134
کھرمنگ	145
انٹھوک خاندان	145
لداخی دور	146
سکردو کے ساتھ الحاق	146
شیر شاہ	147
عزیز خان و وسعادت خان	148
اعظم خان غازی	149
عبدالرحیم خان	150
علی شیر خان	150
شگر	151
قدیم حکمران خاندان	151
اماچا حکومت کا قیام	153
گوری تھم	154
گازری	155
عبداللہ خان	157
حیدر خان	157
مقپون عبدال خان	158
امام قلی خان	159

اعظم خان	160
علی خان	164
حسین خان	165
اعظم خان وقلی خان	165
حیدر خان	165
خپلو	166
ابتدائی آبادکار	166
یبگو حکومت کا قیام	167
مقیم خان	168
شاہ اعظم	169
سلیم الدے	169
یبگو ازرونا	170
یبگو بیکم	170
یبگو بہرام	170
یبگو سیکم	173
یبگو ابراہیم راجہ سالینگ	173
یبگو شیر غازی	174
یبگو رحیم خان	175
یبگو حاتم خان	176
یبگو دولت خان	177
یبگو محمد علی خان	178
یبگو یحییٰ خان	178
مہدی علی خان	179

مقپون احمد شاہ 179

چوتھا باب 181

سلطنت بلتستان کا خاتمہ 181

ڈوگروں کا عروج 181

بلتستان پر ڈوگروں کا قبضہ 183

ناکام جدوجہد آزادی 1842ء 193

ڈوگرہ حملہء بلتستان راجہ کھرمنگ کی زبانی 199

ڈوگرہ دور 209

پانچواں باب 217

جنگ آزادی 1948ء 217

بلتستان میں صورت حال 217

میجر محمد دین کی انقلابی مہم 219

گلگت کے حالات 221

آزادی گلگت 225

بونجی چھاؤنی پر قبضہ 229

آزادی روندو 231

آزاد فورس چھری میں 240

سکردو چھاؤنی کا پہلا محاصرہ 245

آزاد فورس کی پسپائی کے بعد 251

پرکشاق پر ڈوگرہ فوج کا خاتمہ 256

آزادی شگر 256

سکردو چھاؤنی کا دوسرا محاصرہ 258

تھورگو پڑی پر ایمبش (AMBUSH) 260

مہدی آباد میں لڑائی	263
پوریگ (کرگل) کی آزادی	266
کھرمنگ پر ایمبش	270
دراس کی فتح	271
زوجی لہ کی فتح	272
لیہ کی طرف پیش قدمی	273
نوبراہ میں پیشقدمی	274
سکردو چھاؤنی کی فتح	276
کمانڈروں کے تبادلے	286
محاذوں کا حال	287
پسپائی	289
جنگ بندی	294
پدم سے مجاہدین کی واپسی	295
چھٹا باب	301
آزادی کے بعد	301
ایف سی آر کا نفاذ	301
مسئلہ کشمیر کی لپیٹ میں	303
بیوروکریسی کا راج	305
احتجاج	307
ایڈوائزری کونسل کا قیام	311
بھٹو کے اصلاحاتی اقدامات	311
مارشل لا کا نفاذ	314

جمہوریت کی بحالی کے بعد	316
انتظامی وعدالتی اصلاحات 1994	322
غیر آئینی صوبہ گلگت بلتستان	329
گورنمنٹ آف جی بی آرڈر 2018	339
آئینی حقوق کا مسئلہ	342
سرحدوں کا حال	344
کرگل کا واقعہ	345
منقسم خاندانوں کی فریاد	346
ساتواں باب	347
ثقافتی ورثہ	347
بلتی زبان اور رسم الخط	347
بلتی شاعری	365
بلتی شعراء	367
بعض بلتی لوک گیتوں کے نام	370
بلتی موسیقی	372
لوک کہانیاں	374
بلتی رسومات اور معاشرہ	375
صنعت وحرفت وتجارت	384
آثار قدیمہ	386
آٹھواں باب	393
بلتستان منزل بہ منزل	393
تعلیم	393

صحت	397
ذرائع آمد ورفت	400
بلتی ریڈیو نشریات	402
ٹیلی ویژن سکردو میں	403
ٹیلیفون	403
بجلی اور انڈسٹری	404
اخبارات و جرائد	406
انتظامیہ کے سربراہان بلتستان	408
ممبران کونسل/ اسمبلی	411
گورنر گلگت بلتستان	417
صوبائی حکومت کے سربراہان	417
سپیکر کونسل/اسمبلی	417
چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل	418
بلدیہ کے سربراہان	419
ضمیمہ جات	421
حکمران خاندانوں کے نسب نامے	423
پدم کے مجاہدین	438
شہداء بلتستان	440
قدیم راستے	450
مآخذ	457
نقشہ بلتستان	464
تصاویر	465

......☆......

پہلا باب

جغرافیائی تعارف

وجہ تسمیہ

پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع جو علاقہ آج بلتستان کے نام سے مشہور ہے آٹھویں صدی عیسوی تک پولولو کے نام سے معروف تھا۔ تبت اور لداخ والے اس علاقے کو بلتی اور باشندوں کو بلتی پا کہتے ہیں۔ بلتی اس کا قدیم ترین نام ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں یونانی جغرافیہ دان بطلیموس نے BYLTAE کا ذکر کیا ہے جو محققین کے مطابق بالتی ہی کا تلفظ ہے۔ تبت والے بلتستان کو نانگ گونگ بھی کہتے ہیں۔ کشمیری لوگ اس علاقے کو لکھ بوٹن اور سوری بوٹن (ژیرہ بٹن) یعنی خوبانیوں والا تبت کہتے ہیں۔ بلتستان صدیوں تک پولولو سلطنت کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے گلگت کی طرف کے دردلوگ بلتستانیوں کو پلولو اور پلویو کہتے ہیں۔ بعد میں عربوں نے پولولو کو معرب کر کے بلور بنا دیا تو دردلوگوں نے اس علاقے کو پلور، بلورز، بلورنٹر کے نام دیئے۔ چونکہ بلتستان کے تقریباً اکانوے فیصد باشندے تبتی نژاد ہیں اس لئے یہ علاقہ کشمیر اور ہندوستان کی تواریخ میں تبت خورد، تبت کوچک اور تبت صغیر کے ناموں سے مذکور ہے۔ تبت کا لفظ بلتستان کی مقامی تحریروں میں بھی بیسویں صدی کے وسط تک استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن مقامی باشندے اپنے آپ کو بلتی اور علاقے کو بلتی یُول یعنی بلتیوں کا وطن کہتے آئے ہیں۔ بعد میں بلتی یول کا فارسی ترجمہ بلتستان استعمال ہونے لگا جو رفتہ رفتہ اس کا مستقل نام بن گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کا لفظ 1840ء کے بعد تحریروں میں آنے لگا ہے۔ لداخ والے سکردو کو سگر کھود (سمندر کی وادی) بھی کہتے ہیں۔

محل وقوع

بلتستان دو پہاڑی سلسلوں کوہ قراقرم اور کوہ ہمالیہ کے درمیان میں واقع ہے۔ قراقرم ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کالا پتھر۔ یہ سلسلہ پامیرناٹ کے قریب کوہ ہندوکش کے انتہائی شمالی کنارے سے شروع ہوتا ہے اور بلتستان کے شمال سے ہوتا ہوا300 میل مشرق میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ یہ کہیں پر 60 میل چوڑا ہے اور کہیں پر اس کی چوڑائی 30 میل ہے۔ دریائے گلگت کے منبع سے لے کر دریائے نوبراہ کے منبع تک کے حصے کو بلور تغ یا بلور رینج کہتے ہیں۔ جبکہ دریائے نوبرا کے منبع سے لے کر دریائے شیوک کے منبع تک کا حصہ خصوصی طور پر قراقرم کے نام سے معروف ہے۔ سلسلہ قراقرم میں تقریباً تین سو اونچی چوٹیاں ہیں جن میں سے 100 چوٹیاں بیس ہزار سے اٹھائیس ہزار فٹ کے درمیان بلند ہیں۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو بلتستان میں واقع ہے جو سکردو سے 125 میل زمینی! اور 65 میل ہوائی مسافت پر ہے۔ کے ٹو کا مقامی نام چھوغوری ہے۔ یہ بلتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں بڑا پہاڑ۔ پیمائش کے دوران اونچی چوٹیوں کو قراقرم نمبر 1 نمبر2 کی ترتیب سے نام دیا گیا تو اس ترتیب کے تحت مشہ بروم کو کے ون اور چھوغوری کو کے ٹو نام ملا۔ کے ٹو بلتستان اور سنکیانگ کی سرحد پر گاڈون آسٹن (GODWIN AUSTIN) گلیشئر کے اوپر واقع ہے۔ یہ چوٹی 8611 میٹر (28250 فٹ) بلند ہے جس کو پہلی بار 31 جولائی 1954ء کو اٹلی کے دو مہم جوؤں نے سر کیا تھا۔ اس کے بعد ہیڈن پیک 8068 میٹر، براڈ پیک 8051، گاشہ بروم 8035، کیانگ شیش 7852، ماشہ بروم 7821، بتورا 7785، تریور 7728، چھوغولنگمہ 7668، سکیانگ گانگ ری 7544، سیا گانگ ری 7422، بلتورو 7312، سکل بروم 7360، بیلتھہ بلق 7285، سوما گانگ ری 7286، مستغ ٹاور 7284، لاٹوق 7145، سپانگ ٹیک 7027 میٹر وغیرہ مشہور چوٹیاں ہیں۔

مستغ قراقرم کے سلسلے میں 40 بڑے گلیشیئر ہیں جن میں سے سب سے بڑا سیاچن ہے

جو46.6 میل لمبا اور 6166 میٹر اونچا ہے۔اس کے بعد بتو را34 میل لمبا اور بلتو رو 32.5 میل لمبا ہے۔ دوسرے بڑے گلیشئروں میں بیافو ، بلافوند، گونڈوغورو، گاڈون آسٹن ، چھوغو لونگمہ، چھوغولنگسہ، چھومیگ، گاشہ بروم، ماشہ بروم، سرپولاگو، براڈ پیک گلیشئر ،ہسپر ، بیار چیدی کا بیری، وین ، ویرخیراب ، بازِگل، خُوردوپن وغیرہ شامل ہیں۔قطبین کے بعد دنیا میں سب سے بڑے گلیشئر یہیں پائے جاتے ہیں۔

دوسرا سلسلہ کوہ ہمالیہ کا ہے جو دیامر میں دریائے سندھ سے شروع ہوتا اور بلتستان کے جنوب سے گزرتا ہوا مشرق میں تقریبا1500 میل دور برہم پتر آسام تک جاتا ہے۔ ہمالیہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں برف کا گھر۔اس کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ پاکستان میں ہے۔ 8126 میٹر (26660 فٹ) بلند مشہور چوٹی نانگا پربت اسی حصہ میں واقع ہے۔ دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ اسی سلسلہ کے نیپالی حصہ میں واقع ہے۔یہ چوٹی 8848 میٹر (29028 فٹ) بلند ہے۔ ہمالیہ کے سلسلے میں بھی متعدد بڑے گلیشئر اور بلند چوٹیاں ہیں۔

قدرتی گلیشئروں کے علاوہ بلتستان میں مصنوعی یعنی پالتو گلیشئروں کی بھی ایک تعداد موجود ہے جن سے آب پاشی کے لئے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

حدود اربعہ

بلتستان کی ریاست کے عروج کے دنوں (1588ء تا 1673ء) میں مشرق میں پورانگ اور مغرب میں چترال تک کے علاقے اس کی سرحدوں میں داخل تھے۔ اس وقت جنوب میں زوجی لہ اور شمال میں مستغ قراقرم اس کی سرحد تھے۔ بعد میں پوریگ، ہراموش اور استور کے علاوہ دیگر علاقے علیحدہ ہو گئے۔ مؤخر الذکر دونوں علاقوں کو بعد میں ریاست جموں وکشمیر کی ڈوگرہ حکومت نے انتظامی لحاظ سے وزارت (ضلع) گلگت میں شامل کر دیا۔تاریخ رشیدی میں مرزا حیدر گورگان نے تبت میں شامل علاقوں میں ایک علاقہ بالتی اور بالتی میں شامل علاقوں میں پوریگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ڈوگروں نے بھی پوریگ کو بلتستان کا حصہ سمجھا۔لیکن نومبر 1948ء میں

بھارتی حکومت نے اس پر بزور قبضہ کرلیا۔ چنانچہ موجودہ بلتستان کے مغرب میں ضلع گلگت اور ضلع دیامر کی وادیاں، مشرق میں بھارتی مقبوضہ اضلاع کرگل ولداخ، شمال میں چینی صوبہ سنکیانگ اور جنوب میں بھارتی مقبوضہ کشمیر واقع ہے۔

رقبہ

یکم جنوری 1949ء کی جنگ بندی لائن کے اندر بلتستان کا مجموعی رقبہ 26205 مربع کلو میٹر (10118 مربع میل) ہے جس میں سے تقریباً 388 مربع کلومیٹر (150 مربع میل) کا علاقہ 1971ء کی جنگ کے دوران بھارت کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔

آبادی

بلتستان کی آبادی 1951ء میں 1,25,162، 1961ء میں 1,31,952، 1972ء میں 1,67,665 اور 1981ء میں 2,23,296 نفوس پر مشتمل تھی۔ 1998ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق ضلع سکردو کی آبادی 2,19,209، ضلع گنگچھے کی 88,366 اور بلتستان کی مجموعی آبادی 3,07,575 نفوس پر مشتمل تھی۔ 2017 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کا سرکاری طور پر اعلان نہیں ہوا ہے تاہم غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ضلع سکردو کی آبادی 275000 نفوس، ضلع گنگچھے کی 125000، ضلع شگر کی 75000، ضلع کھرمنگ کی 65000 اور بلتستان کی مجموعی آبادی 540000 نفوس پر مشتمل ہے۔

وادیاں اور مواضعات

جغرافیائی اعتبار سے بلتستان میں سکردو، روندو، شگر، خپلو، کھرمنگ اور شنگھو شگر چھ وادیاں ہیں جو 229 مواضعات پر مشتمل ہیں۔

وادی سکردو موضع سرمیک سے شروع ہو کر چھری پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں 44 مواضعات

ہیں لیکن اولڈینگ اور سکمیدان (سیک کشمیری زبان میں ریت کو کہتے ہیں یہ نام کشمیری آبادکاروں کا دیا ہوا ہے) کے مواضعات کو ملا کر اب ایک میونسپلٹی تشکیل دی گئی ہے۔ مواضعات درج ذیل ہیں:

1. میونسپل ایریا 2. حسین آباد 3. گمبہ تھورگو 4. گونگمہ تھورگو
5. گموسطور 6. گول 7. سرمیک 8. ڈورو
9. شیلہ 10. غوڑو 11. نر 12. نربوچونگ
13. سرفہ رانگا 14. ننگ سوق 15. سدپارہ 16. نیورانگاہ
17. رگیایول 18. شگری خورد 19. کشمراہ 20. آستانہ
21. خلنگ رانگا 22. سندوس 23. کت پناہ 24. گمبہ سکردو
25. رانگا 26. حوطورانگا 27. شگری بالا 28. شگری کلان
29. تین جوس 30. تندل 31. حوطو 32. چونداہ
33. مرداچو 34. پونداس 35. کچورہ 36. شغرتھنگ
37. پڑنگ غلچو 38. بشو 39. سترانگ دوخمو 40. کواردو
41. قمراہ 42. بغاردو 43. چھری

روندو گربی داس سے شروع ہو کر شینگوس پر ختم ہو جاتا ہے۔ سکردو کی طرح روندو کی بھی پوری وادی قراقرم اور ہمالیہ کے درمیان میں واقع ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل 23 مواضعات ہیں:

1. تونگوس 2. باغیچہ 3. داسو 4. طورمیک
5. سکویو 6. میندی 7. ہرداس 8. ہینگو
9. کوشمل 10. نواشہر 11. شوت 12. ہرپوہ
13. بلامیک 14. تھورسے 15. تھوار 16. لشی تھنگ
17. تریکو 18. ستق 19. شینگوس 20. تلو
21. تلوبروق 22. گنجی 23. یولبو

شگر کی وادی برالدو اور باشہ کے نالوں کی ابتداء سے شروع ہو کر سرفہ رانگا کے قریب سکردو کی

سرحد پر ختم ہو جاتی ہے۔ پوری وادی قراقرم کے دامن میں واقع ہے۔اس میں 53 مواضعات ہیں:

1. کوتھنگ پائین 2. کوتھنگ بالا 3. مرہ پی 4. برقچھن
5. گیانپہ روپی 6. تونکھور کلان 7. تونکھور خورد 8. مرکونجہ
9. تھوگمو 10. مموچھنمو 11. ریسر 12. چھورکاہ
13. فرنگ بانگمہ 14. حشوپی 15. الچوڑی 16. سلدی
17. کشومل 18. یونو 19. منگو 20. پکورا
21. حوطو 22. سینو 23. کورفے 24. مون جینگ
25. تستے 26. اسکولی 27. سرنگو 28. تھونگول
29. چونگو 30. فولجو 31. گومرو 32. سیدر
33. بیانو 34. نید 35. داسو 36. تستون
37. ڈوگرو 38. بین 39. سیسکو 40. بیسل
41. ارندو 42. ڈوکو 43. سبڑی 44. تھورگو
45. ڈیمل 46. نیاسلو 47. ہمیسل 48. چھوترون
49. تسر 50. گلاب پور 51. وزیرپور 52. بوندو
53. نیالی

وادی خپلو چھوربٹ میں چھولونکھا کے نزدیک سے شروع ہو کر کریس کے قریب سکردو کی سرحد پر ختم ہو جاتی ہے۔ پوری وادی کوہ قراقرم کے دامن میں واقع ہے۔اس کے چار دیہات چھولونکھا، تورتوک، تھنگ اور ٹیقشی 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران بھارت کے قبضہ میں چلے گئے ہیں۔خپلو میں درج ذیل مواضعات ہیں:

1. مکھورکریس 2. توکھورکریس 3. گون 4. کورو
5. غواڑی 6. کونیس ہری کون 7. یوگو 8. کھرفق
9. براہ 10. بلغار 11. ڈغونی 12. تھلے

13. کھرکو 14. سوغہ 15. سیلنگ 16. نچلو پائین
17. نچلو بالا 18. غربوچونگ 19. یوچونگ 20. سرموں
21. لونکھہ 22. عبادان 23. غورسے 24. ڈاؤو
25. کوواس 26. حسن آباد 27. پیون 28. سکسہ
29. چھوارسیاری 30. فرانو 31. تھوگمس کلان 32. پرتوک
33. مرچھہ 34. پچولو 35. تھلس 36. مرضی گونڈ
37. کاندے 38. ہوشے 39. کھانے 40. بلے گونڈ
41. ہلدی 42. تھغس 43. تھولدی 44. سینوبروقکھور
45. پھڑوا 46. دوم سوم 47. لہ چھت 48. کرامانی
49. خورکون 50. تھلگ 51. مندک 52. تھلچو چھوغوگرونگ
53. سیت 54. چولی گونڈ 55. غاغولو 56. گونگمہ

کھرمنگ کی وادی ایک طرف گنگنی اور ہندورمو اور دوسری طرف مزبر اور دنسر سے شروع ہوکر کزبورتھنگ (مہدی آباد) کے قریب سکردو کی سرحد پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس وادی کے تین دیہات ہندورمو، کرکت اور مزبر 1971ء کی جنگ کے دوران بھارت کے قبضہ میں چلے گئے ہیں۔ اس وادی کا بالائی علاقہ ہمالیہ کے اندر واقع ہے۔ جبکہ پائینی علاقہ ہمالیہ اور قراقرم کے درمیان میں واقع ہے۔ اس میں 43 مواضعات ہیں:

1. داپا 2. کتی شو 3. چھٹ پا 4. طولتی بروق
5. کولطور 6. ڈوقبر 7. سرلینگ 8. مھدی آباد(پرکوتہ)
9. بیڈونگ 10. غاسینگ 11. پنداہ 12. منٹھوکھا
13. منٹھو 14. مادھوپور 15. سیندو 16. کمنگو
17. طولتی 18. کسورو 19. پاری 20. مایوردو
21. انگوت 22. غندوس 23. کھرمنگ 24. تھنگ

25. کندرک	26. باغیچہ	27. پلپلدو	28. غولیس
29. شری ٹینگ	30. تورغون	31. ترکتی	32. سنکرمو
33. حمزی گونڈ	34. مورول	35. چےچےتھنگ ڈپا	36. گنوخ
37. اولڈ ینگ	38. ہرغوسل	39. میموش	40. میموش تھنگ
41. بریسل	42. گنگنی	43. برولمو بلارگو	

شنگھو شگر کا علاقہ تین چھوٹی چھوٹی وادیوں شنگھو، شگر اور فلتوکس پر مشتمل ہے جو ہمالیہ کے اندر واقع ہے۔1948ء کے بعد سے یہ علاقہ گلتری کہلانے لگا ہے۔اس میں دس مواضعات ہیں:

1. فلتوکس	2. تھانوٹ	3. کوزر	4. بنیال
5. فرنساٹ	6. شہوارن	7. تھلی	8. گنیال ٹیال
9. کرابوش	10. گلتری		

دریا

بلتستان کلی طور پر پہاڑی علاقہ ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے گلیشئر اور برف پگھل کر سینکڑوں ندی نالے اور چند دریا نیچے کی طرف بہتے ہیں۔یہ سب دریائے سندھ کے معاون بنتے ہیں۔

اس علاقے میں سب سے بڑا دریا دریائے سندھ ہے جسے اس کے منبع تبت میں سنگے کھابب کہتے ہیں جس کے معنی ہیں شیر کے منہ سے نکلنے والا۔ بلتستان میں دریاے سندھ کا نام متعارف ہونے سے پہلے اسے دریاے اٹک کہتے تھے۔اسے سنسکرت میں سندھو، یونانی میں سنتھوس اور لاطینی میں سندوس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بحیرۂ عرب تک اس کی گزرگاہ کے مختلف علاقوں میں یہ دریا اباسین، نیلاب اور مہران کے ناموں سے معروف رہا ہے۔ سنگے کھابب کو مختصر کر کے سنگے چھو یعنی شیر دریا بھی کہتے ہیں۔یہ تبت میں کوہ کیلاس سے نکلتا ہے۔ اپنے منبع سے 390 میل چل کر یہ لداخ میں لیہ کے پاس سے گذرتا ہے۔نیمو کے مقام پر دریائے زانسکر اس میں شامل ہوتا ہے۔آگے چل کر واچرا کے پاس سے یہ بلتستان میں داخل ہوتا ہے اور

موروول گاؤں کے نزدیک شنگھو شگر، دراس، سورو اور واکھا کا متحدہ دریا دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ وہاں سے چل کر کریس کے مقام پر دریائے شیوک اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

دریائے شیوک درۂ قراقرم کے جنوب مشرق میں کوہ قراقرم سے نکلتا ہے۔ اپنے منبع سے 170 میل چل کر شیوک گاؤں پہنچتا ہے۔ ادھر سے مزید 80 میل چلنے کے بعد ہوندر کے مقام پر دریائے نوبراہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں سے کریس سنگم تک یہ دریا اور 150 میل کا سفر طے کرتا ہے۔ کریس تک اس کی کل لمبائی 400 میل ہے۔ کریس کے سنگم پر سابقہ زمانوں میں دریائے سندھ کو سوفو (نر دریا) اور دریائے شیوک کو سومو (مادہ دریا) کہتے تھے۔ دریائے شیوک کو دریائے خمدان بھی کہتے ہیں۔ کمدان یا خمدان درۂ قراقرم سے لیہ کی طرف تقریباً 45 میل کے فاصلے پر دریائے شیوک کے کنارے ایک پڑاؤ کا مقام ہے۔ اس جگہ ایک گلیشئر نے شیوک کی تنگ وادی کے آر پار بڑھ کر دریا کو ڈھانپا ہوا ہے۔ کبھی اس گلیشئر کا بہت بڑا ٹکڑا اپنے وزن کی وجہ سے ٹوٹ کر نیچے گرتا اور دریا کا راستہ روکتا ہے جس کے نتیجے میں کمدان یا خمدان کے نام سے یہاں کئی میل لمبی اور تقریباً آدھ میل چوڑی ایک عارضی جھیل وجود میں آتی ہے۔ پانی کا دباؤ بڑھنے کی وجہ سے برف کا یہ عارضی بند ٹوٹ جاتا ہے اور جھیل کا پانی سیلاب کی صورت میں بہ جاتا ہے۔ یہ عمل بار بار ہوتا رہتا تھا۔ اس لئے نہ صرف وادی شیوک میں بلکہ دریائے سندھ میں بھی ماضی میں عشروں کے بعد اور کبھی اس سے جلدی بہت ہی تباہ کن سیلاب آتا رہا ہے۔ 1929 اور 1932 میں تین سال کے وقفے کے ساتھ وادی شیوک میں دو بار تباہ کن سیلاب آیا جس کے بعد سیلاب کا یہ سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ خپلو میں یوچونگ کے نزدیک سلتورو، کوندوس اور ہوشے وادیوں کا متحدہ دریا دریائے شیوک میں گرتا ہے۔

دریائے سندھ میں سکردو شہر کے قریب دریائے شگر شامل ہو جاتا ہے۔ پھر روندو سے ہوتا ہوا ہراموش سے یہ گلگت میں داخل ہوتا ہے۔ کچھ آگے چل کر جنوب کو مڑ کر نانگا پربت کے قریب پہنچتا ہے۔ جہاں سے پھر مغرب کی طرف مڑ کر سازین گاؤں سے ہوتا ہوا گلگت بلتستان سے باہر نکل جاتا ہے۔ تربیلا ڈیم اسی دریا پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ دریا آخر کار 2880 کلومیٹر (1800 میل)

کا سفر طے کرنے کے بعد بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے۔

جھیلیں

یہاں چھوٹی بڑی جھیلیں بہت ہیں۔ یہ بھی قدرت کا عجوبہ ہے کہ ان میں سے اکثر پہاڑوں پر واقع ہیں۔ مشہور جھیلوں میں سد پارہ جھیل، کچورا جھیل اور کت پناہ جھیل سکردو میں، جیاربہ جھیل شگر میں اور گنگچھے سو بوکھر منگ میں واقع ہیں۔ دیوسائی میں چھوٹی جھیلوں کے علاوہ تین بڑی جھیلیں ہیں جن میں سب سے بڑی جھیل شیوسر ہے جو تقریباً پونے کلومیٹر لمبی اور اتنی ہی چوڑی ہے۔ سد پارہ جھیل سب سے بڑی ہے جو تقریباً ایک کلومیٹر لمبی اور 3/4 کلومیٹر چوڑی ہے۔ یہ سکردو شہر سے 6 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں بلندی پر واقع ہے۔ اس سے سکردو اور شگری خورد کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ اس جھیل کے بیچ میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں تک کشتی کے ذریعے رسائی ہوتی ہے۔ سائز میں سد پارہ کے بعد فوروق جھیل پھر جیاربہ جھیل اور کت پناہ جھیل بڑی ہیں۔ خوبصورتی میں کچورہ جھیل اپنی مثال آپ ہے جس کے کنارے شنگریلا ٹورسٹ ریزورٹ واقع ہے۔

گرم چشمے

ٹھنڈے چشموں کے علاوہ یہاں بہت سے گرم چشمے بھی نکلتے ہیں۔ وادی شگر میں چھوترون، بیسل، چونگو اور چھقپو کے نزدیک گرم چشمے موجود ہیں۔ بیسل چشمہ کا پانی بہت گرم ہے جس سے گندھک کی بو آتی ہے۔ چھوترون کے گرم چشمہ پر بلتستان بھر سے لوگ علاج کے لئے پہنچتے ہیں۔ چھوترون شگر کے پہاڑی سلسلہ کی دوسری جانب وادی روندو میں طورمیک نالہ، تریکو اور اسکولی کے درمیانی پڑاؤ، نالہ برومدو میں لب دریا اور شینگوس کے قریب دریا کے کنارے گرم چشمے نکلتے ہیں۔ دوسری طرف یولبو سے ایک کلومیٹر مغرب میں بھی ایک گرم چشمہ ہے۔ خپلو میں نالہ کوندوس میں چھوغو گرونگ اور خورکون میں دو گرم چشمے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے مقامات پر گرم چشمے موجود ہیں۔

آب وہوا

مجموعی طور پر بلتستان کی آب وہوا سرد خشک ہے۔ یہاں اپریل کی ابتداء سے جون کے تیسرے ہفتے تک بہار کا موسم شباب پر ہوتا ہے۔ پھر اگست کے آخر تک گرمیوں کا موسم اور ستمبر کے اوائل سے اکتوبر کے اختتام تک خزاں اور نومبر سے مارچ کے آخر تک جاڑوں کا موسم ہوتا ہے۔ بہار کے دوران زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 10 سے 20 ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ جبکہ گرمی کے دنوں میں عموماً زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 35 ڈگری سنٹی گریڈ سے نیچے ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھار غیر معمولی گرمی کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر شاذونادر 43 ڈگری سنٹی گریڈ تک بھی پارہ چڑھ جاتا ہے۔ خزاں کے آخری دنوں میں درجہ حرارت نقطہ انجماد تک اتر آتا ہے اور جاڑوں میں تو اوسطاً کم سے کم منفی 18 ڈگری سنٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ 4 ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان اور جنوری فروری کے انتہائی سردی کے دنوں میں سکردو شہر میں کم سے کم درجہ حرارت منفی 27 ڈگری سنٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ منفی 4 ڈگری سنٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے جبکہ اس سے بھی بلندی پر واقع علاقوں میں منفی 35 ڈگری سنٹی گریڈ تک درجہ حرارت گر جاتا ہے۔ بلتستان کی بستیاں سطح سمندر سے 1830 میٹر سے 3350 میٹر تک کی بلندیوں پر واقع ہیں۔ جاپان کے ہیروکی فیوجیتا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق سکردو شہر 2300 میٹر، خپلو گاؤں 2560 میٹر، شگر 2330 میٹر اور کھرمنگ 2540 میٹر سطح سمندر سے بلند ہیں۔ بہار کے موسم میں بارش شاذونادر ہوتی ہے اگرچہ اس دوران فصلوں کے لئے اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن گرمیوں کے آخری اور خزاں کے ابتدائی دنوں میں عموماً بارش زیادہ ہوتی ہے جس سے فصلوں اور میووں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ سال میں 0.0762 سے 0.1270 میٹر (3 سے 5 انچ) کے درمیان بارش ہوتی ہے۔ سرما کے دوران زیرین علاقوں میں 0.3048 سے 0.6096 میٹر (ایک سے دو فٹ) کے درمیان، وسطی بستیوں میں 0.6096 سے 0.9144 میٹر (دو سے تین فٹ) کے درمیان اور بالائی بستیوں

میں 0.9144 سے 2.1336 میٹر (تین سے سات فٹ) کے درمیان برف جمتی ہے۔ جبکہ سطح مرتفع دیوسائی اور پہاڑوں پر گزوں برف پڑتی ہے۔ اولے یہاں شاذ و نادر ہی پڑتے ہیں۔ بلتستان کے طول وعرض میں طوفانی آندھیاں بہت چلتی ہیں۔ سکردو اور اس کے نواحی علاقوں تھورگو سے حوطوتک میں سال کا بیشتر حصہ آندھیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ آندھیاں گرد و غبار کا طوفان ہوتی ہیں جو 30 سے 80 کلومیٹر (20 تا 50 میل) فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ ان آندھیوں کا سبب سطح مرتفع دیوسائی ہے جو 3657 سے 3962 میٹر کے درمیان بلند ہے۔ دن ڈھلنے کے بعد بستیوں میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے جبکہ دیوسائی میں گرا ہوا ہوتا ہے۔ تب وہاں کی ٹھنڈی ہوا شغر تھنگ ، برگے، سدپارہ اور حسین آباد کے نالوں سے وادی کی طرف چلنے لگتی ہے جو یہاں پہنچتے پہنچتے آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

زراعت

بلتستان ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر سے برف اور گلیشئر پگھل کر پانی ندیوں اور نالوں کی شکل میں نیچے کو بہتا ہے۔ بعض جگہوں پر جھیلوں کی شکل میں جمع رہتا ہے۔ جہاں سے زیر زمین راستوں سے رس کر پہاڑوں کے دامن اور نالوں کے دہانوں پر چشموں کی شکل میں ابلتا ہے۔ اس طرح جہاں کوئی چشمہ نکلتا ہو یا ندی بہتی ہو وہیں پر کوئی نہ کوئی بستی آباد ہے۔ ساری بستیاں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر واقع ہیں۔ یہاں کی وادیاں تنگ ہیں جن میں سے روندو اور کھرمنگ زیادہ تنگ ہیں۔ خپلو اور شگر کے پائینی علاقے نسبتاً وسیع ہیں۔ سکردو سب سے زیادہ کھلی وادی ہے جہاں تھورگو سے حوطوتک کا علاقہ آٹھ سے سولہ کلومیٹر تک چوڑا ہے۔ میدانی علاقے بہت کم ہیں۔ جو وادی جتنی تنگ ہو وہاں کے کھیت بھی اسی تناسب سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ زمین میں ریت زیادہ اور زرخیز مٹی کی مقدار بہت ہی کم ہے۔ اس میں نائٹروجن کی بھی شدید کمی ہے۔ اس لئے کھاد کے بغیر یہ کوئی فصل نہیں دیتی۔ کھاد کی تیاری کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہوا میں خشکی کی وجہ سے آبپاشی کے بغیر یہاں زراعت ممکن نہیں۔ دریا بستیوں کی سطح سے

سینکڑوں میٹر نیچے سے بہتے ہیں۔اس لئے آب پاشی کے کام نہیں آتے۔ پورے بلتستان میں موضع کواردو، غواڑی، کورو، گون اور میدان بہاء شگر کے کچھ حصے دریا سے سیراب ہوتے ہیں۔ بارانی زمین کا یہاں تصور تک نہیں۔ آب پاشی کا دارومدار چشموں، قدرتی اور مصنوعی گلیشئروں اور برفانی پانی پر ہے جس کی دستیابی تیز دھوپ پر موقوف ہوتی ہے۔لیکن مسلسل چلنے والی آندھیاں موسم کو عموماً خراب رکھتی ہیں۔ یہاں کی نہریں کھڑی چٹانوں اور دشوار ڈھلوانوں کو کاٹ چیر کر بنائی گئی ہیں۔ جہاں کہیں کھدائی یا دیوار بنانا ممکن نہ ہو وہاں لکڑی کے ناوے (چوبی پائپ) لگائے گئے ہیں جو چند سالوں بعد بدلے جاتے ہیں۔ نئے کھیت بنانا بڑا محنت طلب کام ہے۔نہروں کے ذریعے لائے ہوئے پانی کو تالابوں میں جمع کیا جاتا ہے اور بعد میں ضرورت کے مطابق وہاں سے کھیتوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ان دشواریوں کے سبب زرعی زمینوں کی شدید کمی ہے۔جتنی ہے وہ بڑھتی ہوئی آبادی میں تقسیم در تقسیم ہو کر ایک مسئلہ بن چکی ہے۔سابقہ زمانوں میں جبکہ سال بھر کے لئے غلہ گھرانے کو خود پیدا کرنا پڑتا تھا خریف کی فصل ضروری طور پر کاشت کی جاتی تھی۔اب چونکہ اجناس خوردنی حاصل کرنے کے اور بھی ذرائع فراہم ہو گئے ہیں اس لئے 1970ء کی دہائی کے دوسرے نصف سے خریف کی فصلیں کاشت کرنے میں لوگوں کی دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔سطح سمندر سے بلندی اور گلیشئر سے ڈھکے ہوئے اونچے پہاڑوں کی وجہ سے سرما کے دوران دھوپ کی سخت کمی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ آبادیاں سردی کے تین مہینے دھوپ سے محروم رہتی ہیں۔ کیونکہ اس دوران ترچھی دھوپ اور آبادی کے درمیان اونچے پہاڑ حائل رہتے ہیں جس سے زمین کی زرخیزی متأثر ہونے کے علاوہ اکثر کمزور پودے سوکھ جاتے ہیں۔ جون کے آخری ہفتے میں پہاڑوں پر چھوٹی چھوٹی وادیاں سرسبز ہو جاتی ہیں تو مویشیوں کو ادھر منتقل کیا جاتا ہے اور ستمبر کے چوتھے ہفتے میں واپس لایا جاتا ہے۔یوں کھاد کا خاصا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ بلتستان کا مجموعی مزروعہ رقبہ تقریباً بیس ہزار ہیکٹر ہے۔ یہ مزروعہ رقبہ مَل جینگ یعنی زرخیز، برسو یعنی اوسط درجے کی زرخیز، داس یعنی ریتلی و پتھریلی، ساگ زار یعنی سبزیوں کے لئے مخصوص رقبہ، باغ یعنی میوہ دار درختوں والا رقبہ، اول یعنی ٹوگ سُوگ نامی گھاس والا رقبہ اور بروق یعنی نالوں میں زیر کاشت رقبہ سات قسموں میں منقسم ہے۔

ربیع کی فصلوں میں گیہوں ، جو، مٹر، مسور اور باقلہ کاشت ہوتے ہیں اور خریف میں چینا (چے چے)، کنگنی (چھہ)، ترمبہ (برو) اور تمباکو کی فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ جون کا آخری اور جولائی کا پہلا ہفتہ خریف کی کاشت کا موسم ہوتا ہے۔ ٹھنڈے علاقوں اور خصوصاً نالوں میں شلغم خریف کی فصل کے طور پر بھی کاشت ہوتا ہے۔ نالہ جات کے علاوہ شلغم کی کاشت کا رواج وادی کھرمنگ میں عام ہے۔ خوراک کے لئے مکئی کی کاشت روندو میں رائج ہے جو دیگر علاقوں میں شاذ و نادر ہی چارہ کے طور پر کاشت کی جاتی ہے۔ سرسوں، چاوَل اور کپاس یہاں کاشت نہیں ہوتے گو کہ ان کو آزمایا گیا ہے۔ چاوَل کی کاشت تورانگا والوں نے ڈوگرہ ملازموں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے بند کر دی تھی۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر سے بلتستان میں تجارتی بنیادوں پر بڑے پیمانے پر آلو کی کاشت رائج ہوگئی جس نے یہاں کی معیشت میں تاریخی انقلاب برپا کیا ہے۔ اس نیک کام کا آغاز 1982 میں لاہور کے ڈاکٹر عبدالغفور بھٹی نامی ایک ماہر زراعت نے کیا تھا اس لئے عوام میں وہ بابائے آلو کے نام سے مشہور ہیں۔ واضح رہے کہ آلو بلتستان میں پہلی بار سکردو کے راجا احمد شاہ نے 1836 میں لدھیانہ سے بیج لا کر متعارف کرایا تھا۔

سبزیوں میں آلو، گوبھی، ٹماٹر، بینگن، مولی، مرچ، پالک، سلاد، گاجر، پیاز، بھنڈی، شلغم اور بعض دوسرے ساگ اگائے جاتے ہیں۔ وادی خپلو میں آلو کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ سکردو اور شگر کے علاقوں میں خاص طور پر اور بعض دوسرے مقامات پر بھی خربوز اور تربوز بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کھیرا کم و بیش سارے علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔

میووں میں یہاں سب سے پہلے مئی کے آخری ہفتہ میں توت پکتا ہے۔ پھر جون کے دوسرے ہفتے میں گیلاس پھر شوغون اور اس کے بعد جولائی کے دوسرے ہفتے میں آلو بخارا، آلوچہ اور خوبانی تیار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سیب، بادام، ناشپاتی، آڑو، اخروٹ، انگور اور زرشک بلتستان بھر میں پائے جاتے ہیں۔ انار وادی روندو میں عام طور پر اور دیگر علاقوں میں تھوڑا بہت پایا جاتا ہے۔ کچورہ، حشوپی اور پاری کے سیب اور کواردو سے روندو تک کے نچلے علاقوں کے انگور اور زرشک بہت عمدہ اور مشہور ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پھلوں کی سالانہ پیداوار کوئی پانچ لاکھ

من ہوتی ہے۔ بلتستان میں توت اور خوبانی کی بہتات ہے جن کے مفت کھانے پر کوئی بندش عائد نہیں۔شوغون، گیلاس اور آلو بخارا صرف محفوظ باغات میں پائے جاتے ہیں۔ باقی میوؤں کے درخت عام کھیتوں کے کناروں پر ہوتے ہیں۔ انجیر اور پستہ یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلتستان کی سبزیاں اور پھل لذت میں لاجواب ہیں۔

جنگلات

مون سون ہواؤں کے نہ ہونے کے باعث بلتستان میں قدرتی جنگلات کی کمی ہے۔ جو تھوڑے بہت ہیں وہ آبادیوں سے دور بلندیوں پر واقع ہیں۔ سکردو میں بشو اور کچورہ کے نالوں میں ،روندو میں لیفوڑو (نالہ ہرکویو)، ہینگو تھورسے، بلامیک، تلو، گنجی اور ستق کے نالوں میں اور کھرمنگ میں میموش اور ہرغوسل کے نالوں میں قدرتی جنگلات ہیں جن کا مجموعی رقبہ 2667 ہیکٹر ہے۔ میموش اور ہرغوسل کے جنگلوں میں چیڑ اور جونیپر کے درخت ہیں اور باقی جنگلوں میں ان کے علاوہ سلوفر اور بھوج پتر کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ سفیدہ، بید اور بیر کے درخت بلتستان میں بکثرت ہوتے ہیں۔ یہاں چنار، بید مشک اور بید مجنون کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ سفیدہ عام عمارتی لکڑی ہے۔ بلتستان کے مختلف مقامات پر جڑی بوٹیوں کے بیشمار اقسام بھی پائے جاتے ہیں۔

حیوانات

یہاں جنگلی حیوانات میں کیل، مارخور، شافو (اڑیال)، آہو، بھیڑیئے، چیتے، کالے ریچھ، بھورے ریچھ، چیتا بلی (قواہر)، سیاہ گوش (ای۔ای فر)، لومڑی، سگ آبی، جنگلی بلی، خرگوش اور مارمٹ (MARMOT) پائے جاتے ہیں۔ پالتو حیوانات میں سے گائے، بیل، زو، زومو، تول، تولمو، گر، گرمو، یاگ، یاگمو، گھوڑے، گدھے، بھیڑ، بکری، بطخ اور مرغیاں پائی جاتی ہیں۔ زو اور زومو یاگ اور گائے کے نسلی امتزاج کی پیداوار ہیں۔ زو سے زراعت کے علاوہ بار برداری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ پرندوں میں دیگر اقسام کے علاوہ چکور، رام چکور، مرغابی، کبوتر، فاختہ، بلبل

وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں کے دریاؤں اور نالوں کے پانی میں دیسی مچھلیاں کثرت سے موجود ہیں جو زیادہ تر چھوٹی جسامت کی ہوتی ہیں۔ بعض نالوں اور جھیلوں کے صاف پانی میں ٹراؤٹ مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

معدنیات

بلتستان میں معدنیات کی دریافت کے سلسلے میں اب تک حکومت کی طرف سے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تاہم اب تک دریافت شدہ معلومات کے مطابق یہاں معدنیات کے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ نالہ باشہ، نالہ برالدو، نالہ کتی شو، نالہ سلتورو، دریائے سندھ، دریائے شیوک اور دریائے شگر کے کناروں پر سونا پایا جاتا ہے۔ زہر مہرہ کی کانیں شگر کے نالہ اور چھوترون کے نالہ میں ہیں جس سے چائے دانی، گلاس، پیالہ، پھولدان وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں جو برآمد کئے جاتے رہے ہیں۔ زبرجد الچوری اور طورمیک میں پایا جاتا ہے۔ ایکویمرین، ٹوپاز، بلیک تورملین اور بیروج کی کانیں شنگوس، سبسر، تسر سے ارندو تک کے پہاڑوں اور الچوڑی سے اسکولی تک کے علاقوں میں موجود ہیں۔ بیروج ستق اور طورمیک میں بھی پایا جاتا ہے۔ باشہ میں تانبے کے ذخائر ہیں۔ داسونید میں زمرد کی کان ہے۔ فلورائٹ یونو، ڈوکو، نیاسلو، ستق اور شنگوس میں پایا جاتا ہے۔ یاقوت (تامڑا) داسونید، ڈوکو اور نیاسلو میں موجود ہے۔ بلور ہر سائز کا بلتستان کے تقریباً ہر نالہ کے اندرونی حصہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر برالدو، باشہ اور شغرتھنگ میں اعلیٰ قسم کا اور بکثرت ملتا ہے۔ سنگ مرمر کی کانیں شگر نالہ، تھوگمو، وزیر پور، گلاب پور، سلدی، چھوترون، تسر، ہمیسل، سیسکو، چونگو، بغاردو، تونگوس اور چھری کے درمیان، طورمیک، شنگوس، شغرتھنگ، باغیچہ کھرمنگ اور بہت سے دیگر مقامات پر موجود ہیں۔ گلاب پور اور چھوترون میں سنگ سیاہ بھی پایا جاتا ہے۔ نالہ نیاسلو، ہمیسل، طورمیک اور خپلو میں ابرک کی کانیں ہیں۔ سلاجیت بلتستان کے ہر علاقہ میں اور طوطیا چھور بٹ میں پایا جاتا ہے۔ موضع نید، نالہ چھوترون اور نالہ برالدو میں لوہے کی کانیں موجود ہیں۔ سیسے کی کانیں پھڑوا خپلو اور داسو شگر میں ہیں۔ سنگ یشب نالہ کتی شو،

نالہ ڈوڑو (رondo) اور موضع گمرو میں ملتا ہے۔ سرمہ کی کان ستق میں اور پھٹکری کی کانیں نالہ غواڑی، موضع کورو، نالہ چھورکاہ اور ہرکویو میں موجود ہیں۔ ایک قسم کا نرم سنگ خارا (کوڑو) چھور بٹ، برالدو، باشہ اور بشو میں پایا جاتا ہے جس سے کھانا پکانے کے برتن تراش کر تیار کئے جاتے ہیں۔ چونے کا پتھر تین جوس، سدپارہ، کواردو، غاسنگ اور دیگر بہت سے مقامات پر موجود ہے۔ گندھک ہر وادی میں اور پکھراج شنگوس نالہ اور داسوشگر میں میں پایا جاتا ہے۔ ظروف سازی کی مخصوص مٹی مہدی آباد اور بعض دیگر مقامات پر پائی جاتی ہے۔ ٹاک اور ایس پیسٹس شگر نالہ میں ملتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں مائننگ کی انڈسٹری نے رفتہ رفتہ ترقی کر لی ہے اور بلتستان کے سارے علاقوں میں قیمتی پتھروں کی کانیں دریافت کر لی گئی ہیں۔ اس انڈسٹری سے وابستہ حلقوں کا کہنا ہے کہ اس وقت تقریباً ساڑھے تین سو سے زیادہ قسموں کے قیمتی پتھر ان کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔

باشندے

بلتستان کے تقریباً اکانوے فیصد باشندے تبّتی نسل سے ہیں۔ محققین نے اس نسلی گروہ کو منگول کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کی اکثریت کی جسمانی خصوصیات تبت اور لداخ کی طرف کے ان کے نسلی بھائیوں سے قدرے مختلف ہیں جس کے بارے میں محقق ایف ڈریو کا خیال ہے کہ یہ فرق علاقائی آب وہوا اور مذہب کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ یہاں کے باشندوں کے بارے میں عمومی طور پر نظریہ یہ ہے کہ مغرب کی طرف سے درد قبائل اور مشرق کی جانب سے منگول خانہ بدوشوں نے یہاں آبادی کا آغاز کیا تھا۔ کرنل بڈلف کہتا ہے ”حقائق یوں نظر آتے ہیں کہ ماضی میں کسی وقت مشرق سے وادی سندھ میں تاتاری حملہ آور فتح کرتے ہوئے آئے اور پہلے سے یہاں موجود دردوں کو اپنے اندر ضم کرتے ہوئے بلا رکاوٹ روندو تک پہنچے۔ سکردو اور روندو دونوں علاقوں میں یہ روایات اب بھی موجود ہیں کہ یہاں کے قدیم باشندے درد تھے،،۔ ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ اس وقت ان علاقوں میں درد لوگ بہت کم تعداد میں آباد ہوں گے جو صدیوں تبّتی اکثریت کے بیچ میں رہ کر اپنا تشخص کھو چکے ہیں۔ اگر یہ لوگ کثیر تعداد میں آباد ہوتے تو ان علاقوں سے وہ یکسر غائب نہ تھے۔ کیونکہ ہیروڈوٹس نے درد لوگوں کو سارے ہندوستانیوں میں سب سے بڑھ کر جنگجو بتایا ہے۔ بڈلف کو شگر کی طرف کرغزی خون کی بھی علامات نظر آئی ہیں۔ ڈریو نے بلتیوں میں تو ارنی خدو خال بھی پایا ہے۔ فرینکی کی تحقیق کے مطابق یونانی مورخ ہیروڈوٹس (پانچویں صدی قبل مسیح) کے زمانے میں بلتستان اور لداخ کے علاقوں میں تبّتی نژاد لوگ رہتے تھے۔ اس وقت تبّتی خانہ بدوش گلگت کی سرحد تک کے علاقوں میں یاک کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔ کننگھم کی تحقیق بھی یہی ہے۔ بلتستان بھر کے پہاڑوں، دروں، ندی نالوں، چرا گاہوں، گلیشئر وں اور دیہاتوں وغیرہ کے ناموں سے بھی واضح ہوتا ہے کہ تبّتی لوگ یہاں ابتداء ہی سے اکثریت میں رہ رہے ہیں۔ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درد لوگوں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے بلتیوں میں آریائی خون کا امتزاج نمایاں ہے۔

تقریباً سات فیصد آبادی آریائی نسل کے چار درد قبائل شین، یشکن، کمین اور ڈوم کی ہے جن کو دیگر باشندے بلوقپہ یعنی بالائی علاقہ والے کہتے ہیں۔ یہ لوگ روندو، سکردو اور کھرمنگ کے نالوں اور شنگھو شگر اور فلتوکس کی تین وادیوں میں آباد ہیں۔ نالوں میں رہنے والوں کو سکردو کے حکمرانوں نے اپنے عروج کے دوران (1588ء تا 1673ء) گلگت کے علاقوں سے لا بسایا ہے۔ ان کی زبان شینا ہے جس میں بلتی الفاظ اور محاوروں کی کافی آمیزش ہو چکی ہے۔

بلتستان کی بلتی آبادی کے بیچ میں گنوخ نام کی ایک درد بستی آباد ہے۔ گنوخ کی زبان کو لوگ کیا تنگ سکت کہتے ہیں جو ہماری تحقیق کے مطابق شینا زبان کی ایک بہت ہی قدیم بولی ہے۔ لیکن موجودہ شینا بولنے والے لوگ یہ زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔ گنوخ کے باشندے مسلمان ہیں اور اپنی ماضی کی روایات بھلا چکے ہیں۔ لیکن اسی قبیلے کے کچھ لوگ گنوخ سے آگے لداخ کے اندر کئی بستیوں دا، ہنو، گرکون، درسیک، ہورداس، گرگردو، بٹالک، سلمو وغیرہ میں آباد ہیں۔ جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہے اور نہ بدھ مت بلکہ ابھی تک اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں۔ یہ لوگ ہر تیسرے

سال اور کبھی اس سے پہلے ''بونونا،، نام سے ایک تہوار مناتے ہیں۔اس میں گائے جانے والے گیتوں میں سے ایک میں درج ذیل آبادیوں کا ذکر ہے جن سے ہوتے ہوئے یہ لوگ اپنے موجودہ مقامات تک پہنچے تھے:

بروشال، گلگت، ساتھ سل (ساسی)، رونگ چور گیود (رونگ یول)، بشو، گسور (کچورہ)، گوارتو (کواردو)، کومر (قمراہ)، سکردو گود، شگر، کیریس، پگودا (پرکوتہ)، غاشینگ (غاسینگ)، منتھر وکھر (منٹھو کھہ)، گبس، گنوگس (گنوخ)، کیشور، ہنو........

یہ سارے نام معمولی فرق کے ساتھ اب بھی استعمال میں ہیں۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہاں کے ابتدائی باشندے نہیں بلکہ بعد کے زمانوں میں نامعلوم وجوہات کی بناء پر اپنے سابق وطن دردستان سے ان علاقوں میں آ بسے ہیں۔اس وقت بلتستان موجودہ صورت میں تبتی نژاد لوگوں سے آباد تھا۔

اشاعت اسلام کے بعد عرب نسل کے چند سید خاندانوں کے لوگ یہاں آ بسے جن میں موسوی، حسینی اور رضوی کثرت سے ہیں۔ان میں سے بعض ایران سے اور باقی کشمیر سے آئے ہیں۔بلتستان کے حکمرانوں نے مختلف ادوار میں کشمیر سے مختلف پیشوں سے منسلک کاریگروں کو یہاں لا بسایا تھا جن کی اولاد رانگا، مہدی آباد، سکمیدان وغیرہ میں کثیر تعداد میں آباد ہیں۔رانگا میں 1980 کی دہائی تک کشمیری زبان بولنے والے عمر رسیدہ لوگوں کی ایک تعداد موجود تھی لیکن اب وہاں صرف بلتی زبان بولی جاتی ہے۔

بلتستان کے شاہی خاندان مقپون، شگر کے راجہ خاندان اماچا اور خپلو کے حکمران خاندان یبگو کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ تینوں خاندان آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ لوگ تبتی نژاد نہیں ہیں۔یبگو کے بارے میں اندازہ ہے کہ تخارستان کے حکمران خاندان کی ایک شاخ ہے۔

مقپون خاندان کے حکمرانوں نے انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر بلتی معاشرے میں طبقاتی درجے متعین کئے تھے۔عوام میں سے وزارت یا مشاورت کے منصب کے لئے بارہ خاندانوں کو

اعلیٰ طبقہ کی حیثیت دی گئی تھی۔انہیں ''پاچونس،،یعنی بارہ خاندان اشراف کہتے ہیں۔ان کے نام یول سترونگ پا، ولی پا، افت پا، کناپا، بوڑوپا، گچاپا، زگانکپہ پا، ہورسوک پا، مراد پا، شاگر پا، شاتو سینگ پااور چہ کھٹ پا ہیں۔ان میں سے بھی بعض خاندان آریائی ہیں۔راجہ خاندان کے علاوہ باقی باشندے ربوترق چھوس (اعلیٰ)، شلی ترق چھوس (نیم اعلیٰ) فلانو پا (عوام الناس) اورمون (موسیقار) چارطبقوں میں منقسم تھے۔

بلتستان کے سات راجہ خاندانوں میں سے ہر خاندان کے دربار سے وابستہ موسیقاروں کے کچھ مخصوص گھرانے ہوتے تھے جونسل درنسل اسی پیشے سے منسلک رہتے تھے۔اس نسل کے لوگ بلتستان میں مختلف مقامات پرآباد ہیں۔ان موسیقار گھرانوں کومون کہتے ہیں ۔فرینکی سمیت محققین کا اتفاق ہے کہ مون آریائی نسلی گروہ کی ایک شاخ کا نام ہے۔اس گروہ کے لوگ تبت کے جنوب میں شمالی ہندوستان کے ہمالیائی جنگلات میں رہتے تھے جہاں سے یہ لوگ مختلف سمتوں میں پھیلتے رہے ہیں۔

مذہب

مقامی روایات کے مطابق بلتستان میں اسلام سے قبل بدھ مت اوراس سے پہلے بون چھوس رائج تھا۔تاہم اندازہ کیا جاتا ہے کہ بون چھوس سے پہلے یہاں زرتشتی مذہب رائج رہاہے۔محقق جان بڈلف کہتا ہے۔کہ اُوکسس وادی زرتشتی مذہب کا گہوارہ رہاہے۔جو بلتستان کے بالکل پڑوس میں واقع ہے۔وہاں سے ہندوکش کے پہاڑی سلسلے کوعبور کر کے ان علاقوں میں اس مذہب کا پہنچنا عین متوقع امر ہے۔قدیم آتش پرستوں کے بارے میں بڈلف نے رچرڈسن کے الفاظ نقل کیے ہیں:

> ''دسمبر میں لمبی ترین رات کوآگ کا بڑاتہوار تھا جسے وہ شب سادہ کہتے تھے۔عبادت خانوں میں چراغاں کرتے ،ساری سلطنت میں ہرجگہ آگ کے بڑے ڈھیر جلاتے جن کے گرد ساری رات لوگ گاتے ناچتے اورخوشی کے مزید

شغل بھی کرتے تھے۔،،

یہ تہوار بلتستان میں حالیہ زمانوں تک اسی رات کو جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا رہا ہے۔ جو یہاں مے پھنگ کے نام سے معروف ہے جس کے معنی ہیں آگ پھینکنے کا تہوار۔ بلتی بزرگ اس تہوار کی تشریح سے قاصر ہیں جو اس چیز کی غماز ہے کہ یہ تہوار اس علاقے میں بہت ہی قدیم زمانوں سے چلا آرہا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ زرتشتی مذہب کے آثار میں سے ہے۔

بون مت تبت کا قدیم مذہب تھا۔ اس کی بنیاد تبت کے موجودہ صوبہ ناری کے موضع سندہ دزونگ کے ایک شخص شینرب میبوچے (SHENRAB MIBOCHE) نے رکھی تھی۔ روایات کے مطابق سکیامنی کے نروان ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد شین نامی لڑکے کو تیرہ سال کی عمر میں کسی بھوت نے اغوا کیا۔ چھبیس سال کی عمر میں جب وہ واپس پہنچا تو وہ بڑی معجزانہ قوتوں کا مالک بن چکا تھا۔ وہ صحیح پیش گوئی کر سکتا تھا اور دم جھاڑ کے ذریعے آسیب اتار سکتا تھا۔ لوگوں نے اسے شین رب یعنی عظیم استاد کا نام دیا۔ اس نے لوگوں کو خداؤں کی پرستش کرنا، دعا کرنا، آسیب نکالنا اور بھوتوں کو قابو میں لانا سکھایا۔ چونکہ مظاہر قدرت کو سمجھنے سے لوگ قاصر تھے اس لئے انہیں الوہیت سے منسوب کیا اور نتیجۃً سورج چاند تاروں اور جانوروں تک کی پوجا شروع ہوئی۔ یہ چیزیں رفتہ رفتہ بون مت کی بنیاد بن گئیں۔ بون مت کے تحت کائنات تین دنیاؤں میں منقسم ہے۔ ہلہ یول (دیوتاؤں کی دنیا)، می یول (انسانوں کی دنیا) اور ہلو یول (بھوتوں بدروحوں کی دنیا)۔ بھوتوں سے بچنے کے لئے یہ لوگ چہرے پر سرخ رنگ کا نشان لگاتے اور پراسرار واقعات سے نبٹنے کے لئے ''بان،، (ORACLE) سے مشورہ کرتے اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ بون کی اس ابتدائی شکل کو دول بون کہتے ہیں۔ بعد میں ایک بون سکالر پنڈ تا شم تھب نون پو نے ان چھ فلسفیانہ نظریات کو متعارف کیا جنہوں نے مقامی بون مت کے ساتھ ضم ہو کر تبت کے بون مذہب کے مکمل عقائد تشکیل دیئے۔ اس کو کیار بون کہتے ہیں۔ بون سکالروں نے بدھ مت کی کتابوں کا بون مت کے اثاثہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ترجمہ کیا اور اصلاحات جاری رکھ کر بون مت

عقائد کو مالا مال کر دیا۔ اس کو گیور بون کہتے ہیں۔ تبت کے بادشاہ تری سونگ دے تسان نے بون مت کے پہلے مترجم سکالر گیالواچنگ چوب کو ترجمہ کرنے کی پاداش میں موت کی سزا دی۔ اس کے دور سے بون مت کے تین فرقے سفید بون، کالا بون اور لکیر دار بون ہو گئے۔ بلتستان کی مقامی روایات کے مطابق بدھ مت سے قبل یہاں بون مت رائج رہا ہے۔

کننگھم کے اندازے کے مطابق لداخ میں بدھ مت اشوک کے عہد میں کشمیر کی طرف سے پھیلا۔ بلتستان میں بھی بدھ مت اسی دوران پھیلا ہوگا۔ تاہم جدید تحقیق سے یہ بات واضح ہے کہ بلتستان میں بدھ مت تبت سے نہیں بلکہ کشمیر کی طرف سے پھیلا تھا۔ جبکہ تبت میں اس کے کئی صدی بعد بھی بون مت کا زور تھا۔ 727ء میں کوریا کا زائر ہوئی چاؤ (HUEI-CHAO) ہندوستان سے واپس وسطی ایشیاء پہنچا۔ اس نے لکھا ہے کہ بلتستان (پولولو) میں اس وقت بدھ مت کے عبادت خانے اور بھکشو موجود تھے اور لوگ بدھ مت عقائد کے پکے معتقد تھے۔ جبکہ مشرق میں تبت میں نہ کوئی بدھسٹ عبادت خانہ موجود تھا اور نہ بدھ مت کی تعلیمات سے کوئی شخص واقف تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ 721ء میں جب تبت نے بلتستان کو فتح کیا تو اس وقت فاتحوں نے یہاں کے مذہب کو نہیں چھیڑا تھا۔

بارھویں صدی میں بلتستان میں لاماازم پھل پھول رہا تھا۔ اے ایچ فرینکی لکھتا ہے:

> ''کہا جاتا ہے کہ سکر چونگ دوبینگ (غالباً سکردو) کی بدھ مت کی خانقاہ کی بنیاد رگیہ کے علاقے میں رکھی گئی تھی۔ رگیہ اس زمانے (804ء) میں لداخ کا صدر مقام تھا۔ بلتستان کا سب سے بڑا بدھ مت کا پیشوا سلیتے گرا کوم جس نے 1168ء میں سکردو اور شدکر (بشو وادی) کے نواح میں مشہور سکیور لونگ خانقاہ بنائی تھی، لامائی مذہب کا باقاعدہ رکن تھا،،

یہ رگیہ سکردو وادی کا موضع رگیایول ہو سکتا ہے جس کے بلتی زبان میں معنی ہیں مرکزی گاؤں۔ یہ مقام پرانے سکردو اور شگری کے نواح میں بھی واقع ہے اور اس گاؤں کے بالائی ٹیلے پر پرانی عمارات کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔

بدھ مت کے دور کی باقیات میں سے ایک سکردو شہر کے قریب منٹھل گاؤں میں واقع وہ چٹان ہے جس پر بدھ کی تصویریں اور عبارات کندہ ہیں۔ بدھ کی تصویروں پر مشتمل چار ضلعوں والے ایسے دائرے کو بدھسٹ لوگ مَنڈَ لہ کہتے ہیں جو اُن کے عقیدے کے مطابق کائنات کا علامتی نمونہ ہوتا ہے۔ اس کو غور وفکر کے عمل میں معاون کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ مَنڈَ لہ کے نام سے معروف تھی۔ کثرت استعمال سے یہ لفظ اب مَنٹَھل بن چکا ہے۔ کھلسے لداخ کے ایک سابق بدھسٹ ماہر کی دی ہوئی تشریح کے مطابق یہ کتبہ 1000ء سے پہلے کا ہے۔ یہ منڈلہ بدھسٹ عقیدے کے مطابق بدھ کے مختلف جنموں کی تصویروں پر مشتمل ہے۔ اس کے بیچ میں سکیا منی کی تصویر ہے جس کے ارد گرد گذشتہ کلپاؤں کے بدھوں کی تصویریں ہیں۔ اور کھڑی دونوں تصویریں مستقبل کے دو کلپاؤں کے بدھوں کی ہیں۔ سکیا منی کے بالکل اوپر والی تصویر گذشتہ آخری کلپہ کے بدھ کی ہے۔ یعنی سکیا منی سے پہلے والے بدھ کی۔ اس منڈلہ کے اوپر چٹان میں ایک طاقچہ بنا ہوا ہے جسے چٹان کے سامنے موجود ہال کی چھت کی بیم پھنسانے کے لئے بنایا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ چراغ دان ہے۔ تصویروں کے پہلو میں تبّتی یعنی قدیم بلتی رسم الخط میں عبارتیں بھی کندہ ہیں۔ اس چٹان کے پیچھے ایک چھورتن کا خاکہ بھی پتھر پر کندہ ہے۔ بدھ مت دور کے ایک چھورتن کی جگہ بھی 1982ء میں دریافت ہوئی ہے جو سکردو شہر کے مغرب میں ریڈیو پاکستان کے نزدیک ٹیلے پر واقع ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے آخری ربع کے دوران ایرانی مبلغین کے ذریعے بلتستان میں اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ عام طور پر یہاں اشاعت اسلام کو حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی سے منسوب کیا جاتا ہے جو اپنے سینکڑوں مریدوں، شاگردوں اور علماء کے ساتھ 83-1373ء کے دوران تین بار کشمیر تشریف لائے تھے۔ آپ کی تبلیغ سے رفتہ رفتہ لوگوں نے اسلام قبول کیا یہاں تک کہ آپ نے سب سے پہلے کھرڈونگ پر ایک مسجد تعمیر کرائی۔ پھر گمبہ سکردو میں جامع مسجد تعمیر کر کے نماز جمعہ و جماعت قائم کی۔ اس کے بعد حسین آباد (کھیچو نگ) میں اس کا اہتمام کیا گیا۔ سکردو سے آپ شگر چلے گئے اور وہاں برالدو تک اسلام پھیلایا۔ اس کے بعد خپلو میں چھوربٹ تک اسلام کی تبلیغ کی۔

بلتستان کے مشہور شاعر میر نجم الدین ثاقب (متوفی 1750ء) کی منظوم تاریخ کے مطابق حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی بلتستان میں پہلی بار سالنگ چپلو کے راجہ مقیم خان کے عہد میں 783ھ (1381ء) میں کشمیر کی طرف سے تشریف لائے۔ آپ نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی اور گاؤں گاؤں مسجد تعمیر کی۔ چپلو میں چھور بٹ تک اسلام پھیلایا۔ اس کے بعد یارقند کی طرف چلے گئے۔ 785ھ (1383ء) میں آپ شگر کے راجہ گوری تھم کے زمانے میں کاشغر کی طرف سے براستہ برالدو وارد شگر ہوئے اور ادھر اسلام پھیلایا۔ یہ بلتستان کی طرف آپ کا دوسرا سفر تھا۔ مقامی روایات کے مطابق شگر میں آپ نے پہلے مسجد امبوڑک پھر مسجد چھ برونجی تعمیر کرائی اور اسی دوران ذخیرۃ الملوک اور مودۃ القربیٰ تصنیف کیں۔

میر نجم الدین ثاقب کی روایت کے مطابق 850ھ (1446ء) میں امیر کبیر سید علی ہمدانی کے خواہرزادے اور شاگرد خاص حضرت سید محمد نور بخش بطوران کے خلیفہ کے بلتستان تشریف لائے۔ آپ اپنے زمانے کے نامور مفتی تھے۔ بلتستان میں اس وقت بھی ہزاروں لوگ آپ کی تقلید کرتے اور آپ کی کتاب فقہ احوط پر عمل پیرا ہیں۔ یہ مسلک فرقہ نوربخشیہ کے نام سے معروف ہے۔

ان کے بعد میر شمس الدین عراقی بت شکن 1499ء میں سکردو کے راجہ مقپون بوخا کے عہد میں کشمیر سے سکردو تشریف لائے اور پانچ سال تک یہاں اشاعت اسلام میں مصروف رہے۔ سارے بلتستان کا دورہ کیا اس کے بعد 1505ء میں کشمیر کے مدار المہام سید محمد بیہقی کے قتل ہو جانے پر آپ سرینگر واپس چلے گئے۔ قاضی نور اللہ شوستری (متوفی 1019ھ) اپنی تصنیف مجالس المؤمنین میں لکھتے ہیں: ''......تبت صغیر کے باشندے تب سے مسلمان چلے آرہے ہیں جب میر شمس الدین عراقی وہاں پہنچے تھے......''۔

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دو بھائی سید علی اور سید ناصر طوسی ترکستان سے موجودہ سلتورو گلیشئر کے راستے وارد بلتستان ہوئے۔ 1012ھ میں تھغس میں انہوں نے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی۔ اس کے بعد وہ شگر پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ سید ناصر داسونید کے پہاڑ پر غائب ہو گئے اور سید علی نے کواردو میں سکونت اختیار کی۔ مقامی روایات کے مطابق سید علی اور سید ناصر

کے دواور بھائی سید محموداور سید حیدر علی بھی ان کے ساتھ تھے۔سید علی کا مقبرہ کوار دو میں ہے جس پر سن وفات 1081ھ لکھا ہوا ہے اور سید محمود کا آستانہ کشو باغ سکردو میں ہے جس پر تاریخ وفات 1080ھ مرقوم ہے جس سے اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔سید حیدر علی کا مقبرہ قمراہ میں ہے۔ اس پر سن تعمیر یا تاریخ وفات موجود نہیں۔

1663ء میں اورنگ زیب عالمگیر کشمیر آیا۔سکردو سے تبت خورد کے فرمانروا شاہ مراد نے اس کے دربار میں حاضری دی۔ایک شام دربار کے سربرآوردہ منصب دار دانشمند خان نے شاہ مراد کو کھانے پر بلایا۔ادھر فرانس کے ڈاکٹر فرانکوئس برنیئر کو شاہ مراد نے بتایا:

> ''......تبت بزرگ (لداخ) میری ریاست کی حد شرقی ہے اور اس کا عرض قریب نوے یا ایک سو بیس میل کے ہے۔......وہاں (تبت خورد) کے باشندے پہلے غیر مسلم تھے لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت مسلمان ہو چکی ہے اور وہ خود (شاہ مراد) سمیت سب شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سارے ایران کا مذہب ہے۔''

ایرانی مبلغین و مشائخ کی براہ ترکستان یہاں آمد کا سلسلہ سترھویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہا جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ترکستان میں سیاسی شورشوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ بلتستان کے طول وعرض میں ان مشائخ کے مقبرے موجود ہیں۔اسی دوران کشمیر کی طرف سے علماء کی آمد شروع ہوگئی۔کشمیر سے دو بھائی میر عارف اور ابوسعید چھلو میں وارد ہوئے۔میر عارف نے تھغس میں اور ابوسعید نے کریس میں سکونت اختیار کی۔دونوں بھائیوں نے تھغس اور کریس میں جامع مسجد تعمیر کرائی۔میر عارف کی اکلوتی بیٹی شرف النساء کی ابوسعید کے بیٹے سید مختار کے ساتھ شادی ہوگئی۔اس طرح میر عارف کی وراثت بھی ابوسعید کی اولاد کے پاس آ گئی۔ابوسعید کے دو بیٹے سید مختار اور سید یحییٰ شگر چلے گئے۔پہلے شگر پھر موچھنمو میں قیام کیا۔بعد میں راجہ سے اختلاف کی بنا پر سید مختار کریس چلے گئے اور چھوربٹ تک بائیس خانقاہیں اور بے شمار مساجد تعمیر کروائیں۔سید یحییٰ نے شگر کے علاقے میں سات خانقاہیں اور چودہ مساجد تعمیر کروائیں۔

اس دوران بہت سے علماء ومشائخ ایران سے مقپون دربار میں بھی لائے جاتے رہے ہیں۔تاہم معلوم ہوتا ہے کہ 1880ء تک مقامی باشندوں میں کوئی مذہبی عالم پیدا نہیں ہوا تھا۔ روندو کے سید علی اکبر، سکردو کے شیخ جواد ناصر الاسلام، چھوترون کے آغا سید عباس اور کواردو کے شیخ غلام حسین اور شیخ عبد اللہ بلتستان کے پہلے مقامی علماء تھے جو ہم عصر تھے۔سید علی اکبر کی ایک تصنیف قاطع البرھان کے نام سے 1910ء میں شائع ہوئی تھی۔شیخ جواد کو ایران کے قاچار بادشاہ نے ناصر الاسلام کا خطاب دیا تھا۔ان کی دو کتابیں بدایۃ الصرف اور کفایۃ الصرف اب تک ایرانی اور پاکستانی امامیہ درسگاہوں میں شامل نصاب ہیں۔انہوں نے تقریباً 34-1930ء کے درمیان وفات پائی۔

چھوترون کے آغا سید عباس بڑے مقتدر عالم گزرے ہیں۔آپ دسمبر 1863ء میں موضع گول میں پیدا ہوئے تھے۔ بلتستان اور کشمیر میں ابتدائی تعلیم کے بعد 1889ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے عراق چلے گئے۔1898ء میں بلتستان واپسی پر پہلے شگر میں رہے پھر چھوترون میں مستقل سکونت اختیار کی۔1900ء کے لگ بھگ چھوترون میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ بلتستان کے علاوہ لداخ، پوریگ، استور، گلگت، ہنزہ اور نگر کے علاقوں میں تبلیغ دین میں زندگی گزاری۔ انہوں نے ڈوگرہ حکومت کے قانون وراثت میں ترمیم کروا کر لڑکیوں کو وراثت کا حقدار ٹھہرایا تھا۔سرکاری کاغذات کی تبدیلی وغیرہ کے سلسلے میں اٹھنے والے اخراجات انہوں نے اپنی جیب سے مہاراجہ کو ادا کر دیئے تھے۔انہوں نے لداخ اور پوریگ میں بہت سے بودھوں کو مسلمان بنایا۔ بلتستان کے بہت سے علاقوں کی آبادی کو انہوں نے زندہ مجتہد کی تقلید پر رجوع کرایا جو اشاعت اسلام سے تب تک نویں صدی ہجری کے نامور مفتی حضرت سید محمد نوربخش کی مقلد اور ان کی کتاب فقہ احوط پر عمل پیرا تھی۔ کہتے ہیں کہ اسماعیلیوں کی ایک تعداد کو بھی انہوں نے امامیہ اثنا عشریہ مسلک کا پیرو بنایا تھا۔واضح رہے کہ بلتستان میں زندہ مجتہد کی تقلید کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد پہلے سے موجود تھی۔آغا سید عباس نے 1346ھ (1928ء) میں وفات پائی۔ان کے بعد گنگوپی کے شیخ علی (متوفی 1956ء) بڑے عالم گزرے ہیں جن کے والد شیخ محمد رضا

(متوفی 1907ء) تہران سے سکردو میں آ بسے تھے۔ان علماء نے ایران اور نجف کی درسگاہوں سے سند فضیلت حاصل کی تھی۔1880ء کے بعد سے سفر ایران و عراق کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔

تقریباً 1874ء میں کھرمنگ کے راجہ نے ایک حنفی عالم المعروف ملا پشاوری کو اپنے محل میں معلم اور میر منشی بنا کر لایا۔کچھ عرصے کے بعد ملا پشاوری نے راجہ کھرمنگ کی ملازمت چھوڑ دی اور روزگار کی تلاش میں کھرمنگ سے کرگل اور وہاں سے براہ چھوربٹ لہ راجہ خپلو کے پاس چلے گئے۔خپلو محل میں ایک ہندو ملازم میر منشی کے طور پر پہلے سے کام کر رہا تھا۔چنانچہ کچھ عرصہ چھومک سکردو، کیریس، خپلو بالا اور غُورسے میں نجی طور پر تبلیغ و تدریس سے منسلک رہنے کے بعد بالآخر انہوں نے سکسہ چھوربٹ میں شادی کر کے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور معلم و مبلغ کی حیثیت سے باقی زندگی گزار دی۔خپلو بالا کے خلیل اور غواڑی کے عبدالرحیم اُن کے پہلے مرید تھے۔کہتے ہیں کہ بلتستان کے مشہور شاعر چھورکاہ کے عباس علی شاہ عباسؔ، ہلدی کے جوہر علی جوہر، تورتوک کے قربان علی اور ڈغونی کے سلطان علی ان کے شاگرد تھے۔قربان علی اور سلطان علی نے حنفی مسلک اختیار کیا لیکن بعد میں سلطان علی نے اہلحدیث دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی اور اسی مسلک سے منسلک ہوئے۔تاہم بعض کے نزدیک قربان علی کی تبدیلی مسلک متنازعہ ہے۔تقریباً 1900ء میں غواڑی میں اہل حدیث کا پہلا مدرسہ قائم ہوا۔مولوی محمد موسیٰ اس کے بانی تھے۔1913ء میں ڈپٹی کمشنر الحاج حشمت اللہ خان کے اہتمام سے کشوباغ سکردو میں اہل سنت کی پہلی جامع مسجد تعمیر ہوئی۔سکردو میں اہل حدیث کی پہلی الگ جامع مسجد اکتوبر 1982ء میں تعمیر ہوئی۔اس وقت بلتستان میں ایک اندازے کے مطابق گنگچھے کی آٹھ فیصد اور سکردو ضلع کی تین فیصد آبادی اہل سنت ہیں جن میں سے بعض حنفی اور باقی اہلحدیث ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی نصف کے دوران 1938 تک بلتستان میں یورپی عیسائی مبلغوں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ زوروں پر تھی جو 1894ء سے شروع ہوئی تھی۔لیکن اسے یہاں شرف قبولیت حاصل نہ ہوا۔ان مبلغوں نے بلتی زبان میں ایک کتابچہ بنام ''کھوملو کھسی لم،، (راہ نجات) لکھا تھا اور متی، یوحنا اور لوقا کی اناجیل اور اعمال کا بلتی میں ترجمہ کیا تھا۔2010ء میں

سکردو میں ایک سیکیورٹی ادارے میں مسیحی سینٹری ورکروں کی ایک تعداد کو کام پر رکھا گیا۔ ان کے لئے شہر میں مقپون پولوگراؤنڈ کے جنوب میں ایک چرچ تعمیر کیا گیا۔ یہ بلتستان میں تعمیر شدہ پہلا مسیحی عبادت خانہ ہے۔

1947ء کے دوران یوسف نامی ایک کشمیری سرکاری ملازم سرینگر سے سکردو ہسپتال میں تعینات ہوا جو بہائی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ انقلاب کے بعد اس نے سکردو میں سکونت اختیار کی۔ اس کی اولاد اب بھی اسی مذہب پر قائم ہے۔ بہائی مبلغین نے 1949ء میں بلتی زبان میں بہائی مذہب کی کتاب ''بہائی اُصول،، شائع کی تھی۔

1951-53ء کے دوران یوسف دیوانی اور نورالدین نام کے دو کشمیری تاجر گلگت سے سکردو میں آ بسے جن کا تعلق قادیانی مذہب سے تھا۔ ان کی تبلیغ کے نتیجے میں موضع دوم سوم چھلو کے غلام محمد نامی ایک شخص نے 1962ء میں یہ مذہب اختیار کیا۔

1960ء کے بعد ہنزہ اور یسین کی طرف سے بلتستان میں اسماعیلیوں کی نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1969ء میں سکردو میں اس فرقہ کا پہلا جماعت خانہ تعمیر ہوا۔

باقی آبادی بارہ اماموں کے معتقدین کی ہے جو شیعہ اور نوربخشیہ میں بٹی ہوئی ہے۔ نوربخشیہ نویں صدی ہجری کے نامور مفتی حضرت سید محمد نوربخشؒ کا پیرو اور ان کی کتاب فقہ احوط پر عمل پیرا ہے۔ سادگی پسندی اس کی خصوصیت ہے اسی لئے اس کے پیرو صوفی کہلاتے ہیں۔ سکردو میں ان کی الگ جامع مسجد 1950ء میں تعمیر ہوئی۔

اس تفصیل سے مراد یہ ہے کہ بلتستان کا معاشرہ اپنی روادارانہ روایات کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ دیگر مذاہب کے علاوہ یہاں اسلام کے ہر مکتب فکر کے پیروکار پائے جاتے ہیں جن کے درمیان مذہبی رواداری کے علاوہ آپس میں رشتہ داریاں بھی ہیں۔

......☆......

دوسرا باب

قدیم تاریخ

سلطنت پولولو

چینی زائرین کے سفرناموں اور دیگر چینی تحریروں سے بلتستان کی قدیم تاریخ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ان ذرائع کے مطابق پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں موجودہ بلتستان اوراس کے اردگرد کے علاقوں پر مشتمل ایک سلطنت موجود تھی۔اس کو پولولو (POLULO) کہتے تھے۔ یہ سلطنت کب سے قائم تھی اس کا علم دستیاب نہیں۔پولولو کی سرحدیں مغرب میں داریل کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔

فاہیان (FA-HSIEN) اس طرف سفر کرنے والا پہلا چینی زائر ہے جس کا سفرنامہ تحریری شکل میں اب تک موجود ہے۔403ء میں وہ داریل (تالی لو) پہنچا۔اس نے پولولو کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس جگہ (داریل) کے مشرق میں پہاڑ اور وادیاں عبور کر کے 500 لی کا فاصلہ طے کرنے پر آپ شمالی ہند کی سرحد پولولو میں پہنچتے ہیں،،

اس وقت پولولو ایک بڑا ملک تھا جس کا مرکز بلتستان میں تھا اسی لئے بلتی آج تک اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

فاہیان نے لکھا ہے کہ تالی لو اودھیانہ کا قدیم دارالحکومت تھا۔ بعد میں ہوان تسانگ نے بھی لکھا ہے کہ تالی لو اودھیانہ کا دارالحکومت تھا۔ کننگھم ،سر آرل سٹائن اور دیگر محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تالی لو داریل ہی ہے۔موجودہ گاؤں پوگوچ (POGUCH) میں سوفٹ اونچا بدھ کا مجسمہ تھا جس کی زیارت کے لئے ہزاروں کی تعداد میں زائرین صدیاں اس جگہ پر آتے رہے

ہیں۔اس جگہ بعد میں اسلامی عبادت خانہ تعمیر ہوا ہے۔ اودھیانہ سوات کا قدیم نام ہے۔

چینی حکمران خاندان وی (WEI) کا ایلچی سونگ یون (SUNG-YUN) 519ء میں گندھارا آیا۔اس نے لکھا ہے کہ اودھیانہ (سوات) اور پولولو کے درمیان دریا پر لوہے کی زنجیر سے بنا ہوا پل عبور کرنا پڑتا ہے۔دریا کی تہہ نظر نہیں آتی۔ہاتھ سے تھامنے کی کوئی چیز نہیں۔راستہ انتہائی دشوار ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی میں بھی پولولو سلطنت عروج پر تھی۔

اس کے بعد 626ء میں اگلا چینی زائر ہوان تسانگ (HSUAN-TSANG) ان علاقوں میں پہنچا۔اس نے بھی اپنے سفرنامے میں پولولو کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتا ہے:

''یہاں (داریل) سے مشرق کی سمت جائیں تو ترچھے پہاڑوں پر چڑھنے اور وادیاں عبور کرنے کے بعد ہم دریائے سندھ کے بہاؤ کے اوپر کی طرف جاتے ہیں۔اور پھر معلق پلوں اور لکڑی کی راہداریوں کی مدد سے گھاٹیوں اور ڈھلانوں میں 500 لی کا سفر کر کے پولولو کا ملک آتا ہے۔''

ھوان تسانگ نے پولولو ملک کے بارے میں لکھا ہے:

''پولولو ملک کا رقبہ 4000 لی ہے۔یہ عظیم برفیلے پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے۔یہ شرقاً غرباً لمبا ہے اور شمالاً جنوباً تنگ ہے۔یہ گندم، دالیں، سونا اور چاندی پیدا کرتا ہے۔سونے کی وسیع مقدار کی بدولت ملک میں بہت سا سونا موجود ہے۔موسم متواتر سرد رہتا ہے۔''

اس کے بعد چینی وقائع نامہ (CHINESE ANNALS) میں بڑے اور چھوٹے پولولو کی تفریق کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔محققین بڑے پولولو سے بلتستان اور چھوٹے پولولو سے ہنزہ، نگر اور گلگت کے علاقے مراد لیتے ہیں۔چین کے تانگ خاندان (618ء تا 907ء) کے دور کے تاریخی نقشے میں بلتستان کو بڑا پولولو اور گلگت اور یسین کے علاقوں کو چھوٹا پولولو دکھایا گیا ہے۔چینی سرکاری ریکارڈ کے مطابق 696ء میں بڑے پولولو کے حکمران کا ایلچی چین کے دربار میں پہنچا تھا۔717ء میں بڑے پولولو کے بادشاہ کو چین کے شہنشاہ کی طرف سے وانگ کا خطاب ملا۔خطاب دینے کی

دستاویز کا متن چینی زبان میں اب بھی موجود ہے۔ 719ء میں بڑے پولولو کی طرف سے دربار چین میں ایک اور سفارت پہنچی۔ 720ء میں بڑے پولولو کے نئے بادشاہ کو شہنشاہ چین کی طرف سے وانگ کا خطاب مل گیا۔ اس وقت دونوں پولولو چین کے ماتحت تھے۔ بلتستان کے تعلقات چینی دربار کے ساتھ 720ء کے فوراً بعد ختم ہو گئے کیونکہ اسی دوران اس علاقے پر تبت کا تسلط قائم ہو گیا۔

پتھروں پر کندہ ریکارڈ اور مسودات گلگت کی مدد سے محققین نے پولولو سلطنت کے کچھ حکمرانوں کے نام ترتیب دیئے ہیں۔ مسودات گلگت غالباً چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی کی بدھسٹ متن پر مشتمل دستاویز ہیں جو برچ کی چھال پر لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں تبّتی دور سے پہلے کی صدیوں کے واقعات درج ہیں۔ پروفیسر کارل ـ یتمار کہتے ہیں کہ چھٹی اور ساتویں صدی میں پولولو کے حکمرانوں کا دارالحکومت بڑے پولولو میں تھا۔ ان بادشاہوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ پرامیسوار اسری جیامنگالا وکرامادتیہ نندی (612ء)

۲۔ پٹولہ دیوا شاہ وجرادتیہ نندی

۳۔ مہاراجہ دھی راجہ پرامیسوارا پٹولہ شاہ سری آریہ نندی وکرامادتیہ نندی دیوا

۴۔ سری دیوا شاہ سریندراوکرامادتیہ نندا

۵۔ پٹولہ شاہ شہنشاہ سری نوا سریندرادتیہ نندی دیوا (653ء)

۶۔ نندی وکرامادتیہ نندی (696ء)

۷۔ موکینگ منگ (722ء)

پروفیسر ـ یتمار کا خیال ہے کہ کسی بڑے ایرانی حکمران خاندان کے شاہزادے کو اس سرحدی علاقے میں نگران مقرر کیا گیا ہوگا۔ جس کی اولاد صدیوں بعد بھی اس جگہ حکومت کر رہی ہوگی۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ ایرانی اثرات شمال میں پہنچے ہوئے تھے وہاں سے اس خاندان کے بانی نے یہاں آ کر اپنی حکومت قائم کی ہوگی۔

لیکن شہنشاہ اور شاہ کے دو الفاظ کے سوا باقی سارے نام اور القاب ہندوستانی ہیں۔ اس دور کی تاریخ کشمیر پر نظر کرنے سے ہمیں کشمیر کے کئی راجاؤں کے ایسے ہی نام ملتے ہیں۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے حکمران خاندان کا تعلق ایرانی نسل سے نہیں تھا۔ بلکہ چونکہ ایرانی تہذیب پولولو کی سرحد تک پہنچی تھی اس لئے شہنشاہ اور شاہ کے القاب استعمال ہوئے ہوں گے۔

پروفیسر فسمین (FUSSMAN) کو عالم پل کے قریب دریافت شدہ براہمی انسکرپشن (INSCRIPTION) میں پلولہ، پلالہ اور پلالو کے الفاظ چار جگہوں پر ملے ہیں۔ یہ انسکرپشن چوتھی یا پانچویں صدی کا ہے۔ ان الفاظ کو پروفیسر فسمین نے اسم علم تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ان کو کسی اور مفہوم پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کا تعلق پولولو سلطنت سے ہوسکتا ہے۔

پولولو سلطنت کے بادشاہوں کے مذکورہ ناموں میں پٹولہ کا لفظ بار بار آیا ہے جس سے یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ پولولو سلطنت میں پٹولہ شاہی حکومت قائم تھی۔ لیکن پروفیسر ہنوبر (HINUBER) نے ہودر (HODUR) کے ایک انسکرپشن میں اس لفظ کے ہجے کو پٹولہ کے بجائے پلولہ دریافت کیا ہے۔ اسی بناء پر پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے پولولو ملک کا نام اس کے حکمران خاندان کے نام پلولہ سے لیا گیا ہو۔ اگر ہم پروفیسر دانی کے مفروضے کو تسلیم کرلیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پولولو کے حکمرانوں کا تعلق اس نسل سے تھا جسے آج بلتی کہتے ہیں۔ کیونکہ سارے دردعلاقوں میں بلتی نسل کے لوگ خواہ وہ بلتستان میں ہوں یا کسی اور شہر میں یا کسی اور ملک میں، وہ جہاں کہیں بھی ہوں پولولو کے نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ جس شدت کی پابندی کے ساتھ یہ نام آج بھی بلتیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پولولو ملک کا تعلق بلتی نسل کے لوگوں سے ہی تھا اور یہ نام بھی بلتیوں ہی سے متعلق تھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قدیم زمانوں سے لے کر 737ء تک یہاں پولولو کی سلطنت قائم تھی جس کے بڑا پولولو اور چھوٹا پولولو دو حصے تھے۔ بلتستان بڑا پولولو کہلاتا تھا جبکہ ہنزہ، نگر، گلگت اور یسین کے علاقے چھوٹا پولولو کہلاتے تھے۔ پروفیسر یتمار کا خیال ہے کہ روندو اور ہراموش کی درمیانی گھاٹی سے مشرق کی طرف کا علاقہ بڑا پولولو اور ادھر سے مغرب کی طرف کا علاقہ چھوٹا پولولو تھا۔ بڑے پولولو کا دارالحکومت ان کے خیال میں موجودہ سکردو ہی تھا۔ بڈلف کا اندازہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے موجودہ رگیایول دارالحکومت ہو کیونکہ بلتی میں مرکزی گاؤں کو رگیایول کہتے ہیں۔

چھوٹے پولولو کے دارالحکومت کو چینیوں نے یہو (Yehto) لکھا ہے جس کے بارے میں پروفیسر یتمار کا اندازہ ہے کہ یسین میں یا اس سے بھی اوپر کہیں ہوگا۔ شندور درہ کے پار کا علاقہ کونر بھی پولولو میں شامل تھا کیونکہ شندور کا درہ کوئی رکاوٹ یا قدرتی سرحد نہیں ہوسکتا۔ تاہم پولولو کی انتہائی مشرقی اورانتہائی مغربی سرحدیں واضح نہیں ہیں۔

تبّتی دور

721ء تا 842ء

تبت کی مقامی روایات اور علاقے میں موجود آثار سے ماہرین کو معلوم ہوا ہے کہ تبت کی سطح مرتفع پر آج سے پانچ ہزار سال پہلے سے منگول نسل کے لوگ آباد چلے آرہے ہیں۔ 237 قبل مسیح میں یارلونگ کے مقام پر نیاتری تسان پو (NYATRI-TSANPO) کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہ شخص تبو (TUBO) خاندان کا جد امجد تھا۔ اس خاندان کا 33واں بادشاہ سونگ تسان گمپو (SONGTSAN GAMPO)(617-50ء) تیرہ سال کی عمر میں تحت نشین ہوا۔ اس نے 633ء میں لہاسہ کو دارالحکومت بنایا۔ ملک میں اندرونی طور پر امن وامان قائم کیا۔ فوج کی تنظیم نو عمل میں لایا۔ ملک کے لئے قوانین وضع کئے۔ معیشت کو درست کیا۔ زراعت کو ترقی دی۔ گلہ بانی کو فروغ دیا۔ مویشیوں کی افزائش کے لئے اقدامات کئے۔ اس کا ایک وزیر مسمی انو جس کا تعلق تھونمی قبیلے سے تھا تبو تاریخ کے سات داناؤں میں سے چوتھا تھا۔ 632ء میں بادشاہ نے اسے اپنے بیٹے سمیت شاگردوں کے ایک وفد کے ساتھ سنسکرت کے مطالعہ کے لئے ہندوستان بھیج دیا۔ انو تھونمی سامبھوتہ کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس نے تبّتی زبان کے لئے تیس حروف اور چار اعرابی علامات پر مشتمل ایک رسم الخط ایجاد کیا۔ اس کے بعد سے تبت کی تاریخ لکھی جانے لگی۔ اس وقت بون مت تبت کا مذہب تھا۔ بدھ مت اگرچہ پانچویں صدی میں تبت میں پہنچ چکا تھا لیکن اسے مقبولیت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ سونگ تسان گمپو نے بدھ مت کی اشاعت کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے بدھسٹ کتابوں کے تبّتی زبان میں ترجمے کروائے اور جگہ جگہ بدھسٹ عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ لیکن بون مت کے

ماننے والوں نے سخت مزاحمت جاری رکھی اور یہ کشمکش کئی صدیوں تک جاری رہی۔

تبت کے عروج کے ساتھ ہی اس کی توسیع کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ 35-634ء کے دوران سونگ تسان گمپو نے مغرب کی طرف پیشقدمی کر کے زانگ زونگ پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بلتستان ،لداخ اور وادی سندھ کے بالائی علاقے چین کے زیر تسلط تھے۔ 721ء میں تبت کے بادشاہ نے بڑے پولولو (بلتستان) کو فتح کیا۔ پولولو کا بادشاہ بھاگ کر چھوٹے پولولو میں منتقل ہو گیا۔ ایک سال بعد 722ء میں اس نے چھوٹے پولولو پر بڑے پیانے پر پہلا حملہ کیا۔ چھوٹے پولولو کے بادشاہ نے چین سے مدد مانگی۔ کہتے ہیں کہ اس خط کا متن چین کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ چین نے چار ہزار فوج بھیج دی اور تبت سے نومفتوحہ علاقے واپس لے لئے۔ اس کے بعد کئی سال تک تبت کو پھر حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اسی دوران کوریا کا زائر ہوئی چاؤ (HUEI-CHAO) 727ء میں ہندوستان سے وسطی ایشیا واپس پہنچا۔ اس نے لکھا ہے:

> ''کشمیر کے شمال مشرق میں پہاڑوں کے بیچ میں پندرہ روز کی مسافت پر بڑے پولولو، زانگ زونگ اور سوپوز کی ریاستیں واقع ہیں۔ یہ تینوں ریاستیں تبت کے زیر تسلط ہیں۔ ان کا لباس ، زبان اور رسم و رواج بالکل مختلف ہیں...... یہ ملک تنگ اور چھوٹا ہے اور پہاڑ اور وادیاں بہت ناہموار ہیں اور لوگ تین جیولز کے بدھسٹ عقیدے کا وفاداری کے ساتھ احترام کرتے ہیں۔ جہاں تک مشرق میں تبت کے علاقے کا تعلق ہے وہاں قطعاً کوئی بدھسٹ عبادت خانہ موجود نہیں۔ بدھ مت کی تعلیمات کو کوئی جانتا ہی نہیں۔ لیکن ان (مذکورہ) ریاستوں میں ہُو (HU) لوگوں کی آبادی ہے لہٰذا وہ لوگ بدھ مت کا عقیدہ رکھنے والے ہیں۔''

ہوئی چاؤ نے مزید لکھا ہے کہ کشمیر کے شمال مغرب میں پہاڑوں کی دوسری جانب سات روز کے فاصلے پر چھوٹا پولولو واقع ہے جو چین کے ماتحت ہے۔ اور یہ کہ پولولو کا بادشاہ بڑے پولولو

میں رہتا تھا۔تبت کے حملے کی وجہ سے بھاگ کر چھوٹے پولولو میں چلا گیا ہے۔جبکہ رؤساء اور عوام بڑے پولولو میں تبت کے زیرِ تسلط رہ گئے ہیں۔ ہُوآٹھویں صدی میں وسطی ایشیا کے ایرانی نسل کے لوگوں کو کہتے تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی ہُور کے لفظ کی ایک شکل ہے جو اب بھی بلتستان والے وسطی ایشیا کے ترک نسل کے لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

737ء میں تبت کے بادشاہ (KRI-LDE-GSUG-BRTSAN) کریلدے گسوگ تسان نے حملہ کر کے چھوٹے پولولو کو فتح کیا۔چین نے چھوٹے پولولو کی مدد کی لیکن اسے شکست ہوئی۔جن علاقوں کو چینی چھوٹا پولولو کہتے تھے تبتیوں نے اسے بروشال کے نام سے پکارنا شروع کیا جو ان علاقوں کا مقامی نام تھا۔تبتی ریکارڈ میں پولولو کا لفظ قطعاً استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ بڑے پولولو کو بلتی اور چھوٹے پولولو کو بروشال کے نام سے پکارا گیا ہے۔تبتی ریکارڈ میں سبروسال، بروسا، گروسا، بروزا، گروزا اور کروزا کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ سب بروشال کے تلفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ تبت نے دانستہ طور پر ان علاقوں کا نام بدل کر انہیں مقامی ناموں سے پکارنے کی پالیسی اپنائی تھی۔تاہم تبتیوں نے بلتی اور بروشال کے سابق حکمرانوں کو بحال رکھا۔

بروشال کا نام ان علاقوں کے لئے بلتستان میں اب تک استعمال ہوتا آیا ہے۔لیکن بلتستان میں یہ نام بروشسکی زبان بولنے والے علاقوں کے لئے مخصوص ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا تعلق بروشسکی زبان یا بروشسکی بولنے والوں یا بروشو نسل کے لوگوں سے ہے جو اپنے آپ کو بورش کہتے ہیں۔تبتی دور میں گلگت سمیت ہنزہ، نگر اور یسین سارے علاقوں کو یہ نام دیا گیا تھا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گلگت کے علاقوں میں اس وقت بورش لوگ اکثریت میں آباد ہوں گے۔کیونکہ محققین کے مطابق گلگت میں اکثر پہاڑوں، چراگاہوں وغیرہ کے نام ایسے ہیں جن کے شینا زبان میں کوئی مفہوم نہیں لیکن بروشسکی میں ان کے معنی ہیں۔شینا بولنے والے کچھ لوگ بھی یقیناً آباد تھے۔ بعد میں بڑے پیمانے پر شین قبائل ان علاقوں میں منتقل ہوئے تو پہلے سے یہاں آباد لوگ یشکن کہلائے جس کے بروشسکی زبان میں معنی ہیں ''مقامی باشندے''۔یشکن میں سارے بورش اور تھوڑے شینا بولنے والے لوگ شامل ہیں جو پہلے سے ان علاقوں کے

باشندے تھے۔ یاد رہے کہ شینوں کا اصلی وطن دارادائے بشمول وادی سندھ کشمیر اور افغانستان کے درمیان میں واقع تھا۔ راج ترنگنی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بڈلف کی تحقیق کے مطابق موجودہ ہزارہ شینوں کا آخری وطن تھا۔ بلتستان والے چلاس اور اس سے نیچے کے علاقوں کو داردو کہتے تھے۔

747ء میں چینی جرنیل کاؤ ہیان چی (KAO-HSIEN-CHIH) نے چھوٹے پولولو (بروشال) کو تبتیوں سے چھین لیا اور وہ راستہ کھلوایا جو وسطی ایشیا سے براہ وادی کشن گنگا کشمیر کو جاتا ہے۔ اس وقت کشمیر چین کا حلیف تھا۔ چھوٹے پولولو کو فتح کرنے کے بعد اس کے بادشاہ سوچے لی چے (SU-CHE-LI-TCHE) اور اس کی ملکہ کو گرفتار کر کے چین لے جایا گیا جو 748ء میں شہنشاہ چین کے دربار میں پہنچے۔ شہنشاہ نے اس کا قصور معاف کیا تو اُس نے چین میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت بڑے پولولو میں اسی خاندان کی ایک اور شاخ حکومت کر رہی تھی۔

چینی زوجی لہ کے راستے کشمیر تک کی شاہراہ کھلوانے کے لئے بے قرار تھے۔ اسی دوران 749ء میں تخارستان کے حاکم یبغو (YABGHO) نے چینی دربار کو تجویز پیش کی کہ بڑے پولولو کے راستے کو کھلوانے کے لئے ایک مہم بھیجی جائے۔ چین نے یہ تجویز قبول کی مگر اس پر عملدرآمد ہونے سے قبل 751ء میں چینیوں کو دریائے تلاس (TALAS) پر عربوں اور قرلوق کے ہاتھوں شکست ہوئی جس کے بعد رفتہ رفتہ وسطی ایشیا کے چینی مقبوضہ جات چین کے ہاتھ سے نکلنا شروع ہوئے۔ چین کی تاریخ میں ہے کہ 740ء کے بعد چین کی 22 مغربی ریاستیں تبت کے قبضے میں چلی گئیں۔

753ء میں چینی جرنیل کاؤہیان چی کے جانشین فینگ چانگ چینگ (FENG-CHANG-CHING) نے جو وسطی ایشیا میں چین کا گورنر تھا، بڑے پولولو کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی اور حملہ کر کے اس کے دارالحکومت ہوسالو (HO-SA-LAO) پر قبضہ کر لیا۔ بعض چینی سکالروں کے اندازے کے مطابق ہوسالو کھپلو یا خپلو کا چینی تلفظ ہے۔ یہاں سے ہمیں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ تخارستان کا یبغو خپلو میں گورنر مقرر رہا ہوگا۔ کننگھم کہتا ہے کہ خپلو کے راجہ خاندان کا بانی اور شگر کے راجہ خاندان کا بانی ہم عصر نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ ان دونوں خاندانوں کا عروج کسی مشترکہ سبب کے تحت ہوا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اماچا کا عروج بھی اسی

دوران ہوا ہو۔ یہاں سے چیلو کا پولولو کے دارالحکومت ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

تبتی ریکارڈ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس دوران کچھ عرصے کے لئے بالتی اور بروشال کے علاقے تبت کے تسلط سے نکل چکے تھے۔ چنانچہ تبت کے بادشاہ کھری سرونگ لدے تسان (KRI-SRONG-LDE-BRTSAN) نے اپنے دور حکومت (755ء تا 797ء) میں سبالتی (بالتی) اور سبروشال (بروشال) کو دوبارہ فتح کیا۔ بلکہ تبت کے بادشاہ کھری گسوگ لدے تسان (KRI-GSUG-LDE-BRTSAN) کو اپنے عہد حکومت (815ء تا 838ء) کے دوران ان علاقوں کو ایک بار اور فتح کرنا پڑا۔

چینی بھکشو نمائندہ ووکنگ (WU-KUNG) نے 64-759ء کے دوران گندھارا میں قیام کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ کشمیر سے ایک راستہ مشرق میں تبت کو جاتا ہے اور دوسرا شمال میں پولولو کو جاتا ہے۔ علماء کے خیال میں مشرقی راستہ وہی زوجی لہ والا ہے جبکہ شمال والا درہ برزل سے سکردو یا گلگت کی طرف کا راستہ ہے۔ ووکنگ کے بعد مغربی تبت کے علاقے چینی مشاہدے سے نکل گئے۔

737ء میں چھوٹے پولولو (بروشال) کی فتح کے ساتھ ہی تبت کی سرحدیں پامیر تک پہنچ گئیں۔ اسی دوران مغرب سے عربوں کی فتوحات تبت کی سرحدوں کو چھونے لگیں۔ عربوں نے پولولو کو معرب کر کے بلور کہنا شروع کیا۔

مامون رشید (33-813ء) نے 199ھ (14-813ء) میں کابل کو فتح کیا اور 200ھ میں کابل شاہ کے تخت کو مکہ بھیج دیا۔ تخت کے لوح پر مامون کے وزیر فضل ابن سھل کے بھائی حسن ابن سھل نے کچھ عبارتیں کندہ کرائی تھیں۔ اس عبارت کو مکہ کی تاریخ کے مؤلف محمد ابن عبداللہ الازرقی نے اپنی مشہور تالیف ''اخبار مکہ،، میں نقل کیا ہے جس کی تالیف 244ھ (858ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ ازرقی نے اس لوح کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تخت کے لوح سے یہ عبارتیں نقل کی تھیں۔ اس عبارت کے ایک حصے میں بلور کا ذکر ہے۔ تاریخ میں ہمیں بلور کا ذکر پہلی بار یہیں ملتا ہے:

'' و سیر الامام اکرمه الله الرایات الخضر علیٰ یدی ذی الریا ستین الیٰ القشمیر وفی ناحیة التبت۔ ماسیر ها فاظهره الله

سجانہ علیٰ بو خان و راور بلاد بلور صاحب جبل خاقان و جبل التبت و بعث بہ الیٰ العراق مع فرسان التبت......،،

ترجمہ:۔ امام، اللہ اسے عزت عطا کرے، نے سبز جھنڈوں کو ذو الریاستین (فضل ابن سھل) کے ہاتھوں کشمیر کی طرف اور تبت کے نواحی علاقوں کی طرف روانہ کر دیا۔ ابھی انہیں روانہ کیا ہی تھا کہ اللہ سجانہ نے اسے بوخان پر غالب کر دیا۔ اور بلاد بلور کے راور پر بھی غالب کر دیا جو کوہ خاقان اور کوہ تبت پر تسلط رکھتا تھا اور اسے تبت کے سواروں کے ساتھ عراق بھیج دیا گیا۔

اس عبارت میں بلور سے چھوٹا پولولو یعنی بروشال مراد ہے کیونکہ تبت کی عربوں سے جھڑپ مغربی سرحد پر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر یتمار کے مطابق چترال کی مقامی روایات سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ چھوٹے پولولو میں تبتیوں نے چترال کو بھی شامل کر لیا تھا۔ کرغز لوگ اسی لئے چترال کو بلور کہتے ہیں۔ اس وقت تک چھوٹے پولولو پر تبت کا قبضہ تھا۔

تبت اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکا تھا۔ مشرق میں کھم سے لیکر مغرب میں چترال تک تبت کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن بون مت کے پیروؤں اور بدھ مت کے حامیوں کے درمیان دو صدیوں سے کشمکش چلی آ رہی تھی جس نے اس سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ نویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں کھری تسوگ لدے تسان تبت کا بادشاہ بن گیا۔ وہ بدھ مت کا زبردست پیروکار تھا۔ اس نے بدھسٹ عبادت خانے بنائے اور بہت سے ہندوستانی اور تبتی سکالروں کو مذہبی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ اس بادشاہ کی سرپرستی میں بدھ مت خوب پھلا پھولا۔ بدھ مت سے اس کی شدت کی وابستگی کی وجہ سے 838ء میں وہ بدھ مت کے مخالفین کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کی موت پر اس کا بڑا بھائی لنگ درما (LANG DARMA) تخت پر بیٹھا جو اس سے پہلے راہب تھا۔ لنگ درما بدھ مت کا سخت مخالف تھا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں بدھ مت کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بدھ مت کے عبادت خانوں کو بند کر دیا اور انہیں مویشی خانوں میں تبدیل کیا۔ بدھ مورتوں کو دریا میں پھینکا۔ راہبوں کو شکار کرنے اور قصاب کا کام کرنے پر مجبور

کیا۔ بہت سے راہبوں کو قتل کر ڈالا اور باقیوں کو عام زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ اس کے ان اقدامات سے تنگ آ کر بالآخر لہالونگ پلدور (LHALUNG PALDOR) نامی بدھ مت کے ایک راہب نے نہایت ہوشیاری سے تیر مار کر 842ء میں لنگ درما کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل پر اس کے بیٹوں یُوم رتان اور اودسرونگ کے حامیوں میں تخت نشینی کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ ملک میں زبردست قحط بھی رونما ہوا۔ اس کے نتیجے میں تبت کی مرکزی حکومت کا خاتمہ ہوا اور سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران بلتستان اور بروشال بھی تبت سے علیحدہ ہوئے تھے۔ اس طرح تقریباً سوا سو سال بعد تبتی دور اختتام کو پہنچا۔ تبتی دور کے ان سوا سو سالوں میں مندرجہ ذیل بادشاہوں نے حکومت کی:

.1	کھریلدے تسوگ تسان	721ء	تا 755ء
.2	کھری سرونگ لدے تسان	755ء	تا 797ء
.3	کھری مونے تسان پو	797ء	تا 815ء
.4	کھریلدے سرونگ تسان		
.5	کھری تسوگ لدے تسان	815ء	تا 838ء
.6	لنگ درما	838ء	تا 842ء

یوم رتان　　اودسرونگ

بلتستان اور بلور

یہ حقیقت ہے کہ جو علاقے پولولو کے نام سے معروف تھے عربوں نے انہی علاقوں کے لئے پولولو کو معرب کر کے بلور کہنا شروع کیا تھا اور بعد میں دیگر مسلمان مورخین نے پولولو کی بجائے بلور ہی استعمال کیا۔ اگرچہ بلتستان کے باشندوں اور درد علاقوں میں رہنے والوں کے لئے یہ کوئی نیا نکتہ نہیں کہ پولولو بلتستان ہی ہے کیونکہ یہ نام اس وقت بھی گلگت کے علاقوں میں بلتیوں کی پہچان کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن چونکہ اس موضوع پر آج تک غیر مقامی سکالر ہی تحقیق کرتے رہے ہیں

جنہیں اس حقیقت کا علم نہیں تھا اس لئے عرصہ دراز تک ان کے لئے یہ معمہ بنا رہا کہ چینیوں اور عربوں کی تحریروں میں مذکور پولولو اور بلور کا علاقہ کونسا ہے۔ اسی دوران بعض محققین نے خیال کیا کہ بلور کوئی خاص علاقہ ہی نہیں بلکہ یہ فارسی زبان کے لفظ ''بالا،، کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں ''بلند جگہ،،۔ اس طرح 1847ء تک بلور تغ پہاڑوں کا بھی تعین نہیں ہو سکا تھا۔ الیگزینڈر کننگھم پہلا غیر مقامی محقق ہے جس نے دردلوگوں کو بلتیوں کے لئے پولولو کہتے ہوئے سنا اور اس کے ساتھ ہی یہ معمہ وہیں پر حل ہو گیا۔ چنانچہ کننگھم نہایت فخر کے ساتھ لکھتا ہے:

> ''میں خوش قسمت ہوں کہ کشمیر کے شمال میں واقع علاقوں کے تقابلی جغرافیہ میں ایک اہم اور دلچسپ نکتہ ڈھونڈ پایا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ بلور کا قدیم علاقہ موجودہ بالتی یا چھوٹا تبت ہی تھا۔ کافی عرصہ تک ہمارے نقشوں میں بولور پہاڑوں کا مقام غیر یقینی رہا۔ لیکن اب میں اس کا تعین کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ وہ دراصل مستغ نامی سلسلہ کوہ ہیں جو بالتی علاقہ کی شمالی حد متشکل کرتے ہیں۔ ہسورا، گلگت، چلاس، داریل، کوہلی، پالس اور دریائے سندھ کے کنارے پر واقع تمام شینا زبان بولنے والوں میں بالتی کو صرف پولولو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 640ء میں ھوان تسانگ نے بھی تصدیق کی کہ پولولو کی سلطنت میں بہت سا سونا پیدا ہوتا ہے۔ بالتی یا پولولو آج (1847ء) میں بھی سونے کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔،،

بلتستان کا بلور کے نام کے ساتھ فقط اتنا تعلق ہے کہ بلور پولولو کا معرب تلفظ ہے جو بنیادی طور پر بلتستان کا نام تھا۔ بلتی لوگ اپنے لئے ان دونوں ناموں میں سے کسی ایک کو بھی استعمال نہیں کرتے۔ یہ بلور کے تعارف کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ بعد کے زمانوں میں مسلمان مورخین کے سامنے جو مخصوص علاقہ بلور کے نام سے معروف ہوا اس میں بلتستان شامل نہیں بلکہ سابق چھوٹے پولولو (بروشال) میں شامل علاقوں کا نام بلور پڑ گیا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں نے کبھی بھی اپنے لئے یہ نام استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے اس سے حقیقی پولولو یعنی بلتستان مراد لیا۔ چنانچہ بڈلف لکھتا ہے:

''گلگت، ہنزہ، نگر اور مغرب کی طرف واقع ساری وادیوں میں ''سکردو''
کا نام تقریباً غیر معروف ہے۔ اس علاقے کو پلور یا بلورز یا بلور نٹر کہا جاتا ہے۔
سکردو کے باشندے اس نام کو یکسر نظرانداز کرتے ہیں۔''

حدود العالم جغرافیہ کے موضوع پر ایک رسالہ ہے جو 3-982ء میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں مصنف تبت کے علاقوں میں ایک بلوری تبت کے علاقے کا ذکر کرتا ہے:

''بلوری تبت بلور کی سرحد سے متصل واقع ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر
تجارت پیشہ ہیں۔ یہ لوگ خیموں میں اور نمدے کے چھپروں میں رہتے ہیں۔
اس کی لمبائی پندرہ روز کی اور چوڑائی پندرہ روز کی مسافت ہے۔''

محققین بلوری تبت سے سابق بڑا پولولو یعنی بلتستان مراد لیتے ہیں۔ تبتّی لوگ یاک کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔ حدود العالم کی تصنیف کے زمانے میں بلتستان سیاسی طور پر تبت کے تسلط سے آزاد تھا لیکن مشرق میں کھم سے لے کر مغرب میں بلتستان کی وادی روندو تک تقریباً بارہ سو میل لمبے علاقے میں تبتّی نژاد لوگ آباد ہیں جو ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ اس لئے بلتستان کو جغرافیائی لحاظ سے تبت کا علاقہ سمجھا گیا ہے۔ بلور اس سے علیحدہ ایک علاقہ تھا جس کی سرحدین بلتستان سے ملی ہوئی تھیں۔ چنانچہ بلور کے بارے میں حدود العالم کا مصنف لکھتا ہے:

''بلور ایک وسیع ملک ہے جس کا ایک بادشاہ ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خود
سورج کا بیٹا ہے۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے کہ بیٹے کو باپ سے پہلے نہیں اٹھنا
چاہیئے وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے بستر سے نہیں اٹھتا ہے۔ اسے بلورین
شاہ کہا جاتا ہے۔ اس ملک میں نمک نہیں ہے بلکہ کشمیر سے لایا جاتا ہے۔''

اس کے تقریباً نصف صدی بعد 1030ء میں البیرونی کشمیر پہنچا۔ اس نے بلور کے بارے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے:

''دریائے سندھ ترکوں کے علاقے میں انانگ کے پہاڑوں سے نکلتا

ہے جہاں آپ اس طریقے سے پہنچ سکتے ہیں۔ جس گھاٹی سے آپ کشمیر میں داخل ہوتے ہیں اسے چھوڑ کر اور سطح مرتفع میں داخل ہو کر، پھر آپ کو مزید دو دن چلنا پڑتا ہے۔ آپ کے بائیں طرف بلور اور شمیلان کے پہاڑ، ترک قبائل آتے ہیں جنہیں بھٹہ ورین (BHATTAVARYAN) کہتے ہیں۔ ان کے بادشاہ کا لقب بٹھہ شاہ ہے۔ ان کے قصبے گلگت، اسورا اور شلتاس ہیں اور ان کی زبان ترکی ہے۔ ان کے حملوں سے کشمیر کو اذیت پہنچتی رہتی ہے۔،،

شلتاس چلاس ہی کا تلفظ ہے۔ استور کو بلتستان والے اب بھی ہسورا (اسورا) کہتے ہیں۔ اس عبارت سے اتنا واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بلور گلگت استور اور چلاس کے علاقوں کو کہتے تھے۔ سر آرل سٹائن کہتا ہے کہ البیرونی نے بلور کے باشندوں کو غلطی سے ترک بتایا ہے۔ البیرونی کی ایک اور عبارت سے بلور کے بارے میں مزید معلومات ملتی ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس وقت کشمیر کے شمال میں بلتستان ترکوں کے زیر تسلط تھا:

،، کشمیر ایک سطح مرتفع پر واقع ہے جسے اردگرد سے ناقابل عبور پہاڑوں نے گھیرا ہوا ہے۔ اس ملک کے جنوب اور مشرق میں ہندوؤں کے علاقے ہیں۔ مغرب میں مختلف بادشاہوں کے علاقے ہیں۔ بلور شاہ کا علاقہ، شگنان شاہ کا علاقہ اور اس سے بھی دور بدخشان کی سرحد تک کے علاقے واخان شاہ کے ہیں۔ اس ملک کے شمال میں واقع علاقہ اور مغرب میں واقع علاقے کا ایک حصہ ختن کے ترکوں اور تبت کے قبضے میں ہیں۔،،

تیرھویں صدی عیسوی میں مارکو پولو نے بھی بلور کو پامیر کے پار واقع بتایا ہے جس کے باشندے پہاڑوں پر رہتے، بتوں کو پوجتے، شکار کرتے اور جانوروں کی کھالوں کا لباس پہنتے تھے۔ ظاہر ہے پامیر کے پار یسین، ہنزہ، نگر اور گلگت کے علاقے واقع ہیں۔ بڈلف کا اندازہ ہے کہ اس وقت سری کول بھی بلور میں شامل تھا۔

مرزا حیدر گورگان نے اپنی تاریخ رشیدی میں سلطان سعید خان شاہ یارقند کے حملوں

(1532ء) کے ضمن میں بلتستان اور بلور کے بارے میں واضح معلومات فراہم کردی ہیں۔ بلتستان کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ بالتی (بلتستان) تبت کا ایک علاقہ ہے جو پوریگ، چھلو، شگر اور سکردو پر مشتمل ہے۔ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ سلطان سعید خان بالتی (بلتستان) چلا گیا جو تبت اور بلور کے درمیان واقع ایک ملک ہے۔ بلور کے بارے میں مرزا حیدر لکھتا ہے:

''بلور ایک کافر ملک ہے اور اس کے باشندوں کی اکثریت پہاڑوں پر رہتی ہے۔ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی عقیدہ۔ نہ ان کے سامنے ایسی کوئی چیز ہے جس سے پرہیز کرنا ضروری ہو...... بلورستان کے مشرق میں کاشغر اور یارقند کے علاقے ہیں۔ شمال میں بدخشان واقع ہے۔ مغرب میں کابل اور لمغان ہیں اور جنوب میں کشمیر کے علاقے ہیں۔اس کے اردگرد چار ماہ کے سفر کی مسافت ہے۔سارا علاقہ پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں پر مشتمل ہے یہاں تک کہ یہ کہنے کی نوبت آتی ہے کہ سارے بلورستان میں ایک فرسخ ہموار زمین دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آبادی بے شمار ہے۔کسی بھی گاؤں کے تعلقات دوسرے گاؤں کے ساتھ پر امن نہیں بلکہ مسلسل دشمنی موجود ہے اور وقفے وقفے سے ان میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔،،

کرنل ڈیورینڈ نے لکھا ہے کہ سترھویں صدی کی ایک پشتو نظم میں بلورستان سوات کے شمال میں موجود پہاڑی ملک کو کہا گیا ہے۔

ان سارے حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلور میں گلگت، ہنزہ، نگر، یسین، چلاس اور استور کے علاقے شامل تھے۔اگر چہ دریائے گلگت کے منبع سے لے کر دریائے شیوک کے منبع تک کے شمال کے پہاڑی سلسلے کو کوہ بلور نام رکھتے وقت بلتستان کو پولولو کے حوالے سے بلور میں شامل سمجھا گیا اور یہ کہ حدودالعالم کے مصنف نے اسے بلوری تبت کا نام دیا تاہم بعد کے زمانوں میں جس علاقے کا خصوصی طور پر بلور نام پڑا بلتستان اس سے باہر تھا۔اس کی شناخت بالتی یا تبت خورد کی حیثیت سے تھی۔

طوائف الملوکی

تبت کے بادشاہ لنگ درما کے قتل کے ساتھ ہی دیگر تبتی مقبوضات کی طرح بلتستان بھی آزاد ہوگیا۔لیکن جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔کوئی مرکزی حکومت نہ رہی۔تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان نے بلتستان میں قبائلی وضع کی جن چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق اسی دور سے ہوسکتا ہے۔حشمت اللہ خان لکھتے ہیں:

''بلتستان میں آبادی کا آغاز وسط ایشیا کی ان اقوام نے کیا ہے جو گلگت کی طرف سے براہ وادی دریائے سندھ ملک اسکردو میں، یا براہ ہونزہ ونگر و پامیر گلگت اور کاشغر کی طرف سے ملک شغر و کھپلو میں، یا لداخ کی طرف سے ملک کھپلو میں وقتاً فوقتاً وارد ہوئیں......ابتدائی زمانہ آبادی کی تاریخ کا ٹھیک طور پر پتہ چلانا بہت مشکل ہے۔قومی گیتوں، قومی روایات اور آثار قدیمہ سے جہاں تک انکشاف ہوا ہے حسب ذیل ہے۔

''زمانہ سلف میں گلگت کی طرف سے حسب ذیل اشخاص مع اپنے ہمراہیوں کے وقتاً فوقتاً اس علاقہ میں وارد ہوئے اور انہوں نے آبادی شروع کی۔1. گیالوشالبو نے گیایول آباد کیا۔2. شکر گیالپو نے شکری کلاں، چونداہ، بیامانقپو آباد کئے۔3. کوروآسون چو نے کھر بو آباد کیا۔4. برق مایور چو نے برق نق میں آبادی کی بنیاد ڈالی۔5. لون چھے نے کچورہ کے نیچے وادی دریائے سندھ میں آبادی شروع کی۔

''ان کی معاشرت قبائلی وضع کی تھی۔جو حصہ جس نے آباد کیا اس کے اوپر اس کی حکومت قائم ہوگئی اور ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسل جاری رہی۔رفتہ رفتہ زمانہ کے اتار چڑھاؤ سے شکر گیالپو کے خاندان کا اقتدار لون چھے یعنی روندو

کے سوا دیگر تمام خاندانوں کے اوپر قائم ہو گیا اور اس نے ان سب سے خراج وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس خاندان کا صدر مقام شگری کلان اس خاندان کا باقاعدہ دارالحکومت بن گیا۔،،

فاضل مورخ کی باتوں سے اتفاق کرنا ہمارے لئے مشکل ہے کیونکہ اگر ابتدائی آبادکار گلگت سے آئے ہوتے تو یہ سارے نام شینا زبان کے ہوتے جبکہ گیایول، چونداہ، بیامانقپو، چو، کھربو، برق نق، گیالو، گیالپو، شکر، کوروآسوں چو، برق مایور اور لون چھے سب کے سب بلتی زبان کے الفاظ ہیں۔ اس لئے اس بات سے ہمیں اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ابتداء میں نہایت ہی قلیل تعداد میں درد اور بروشو نسل کے لوگ تبّتی خانہ بدوشوں کے دوش بدوش ان علاقوں میں موجود تھے۔ بعد میں تبّتی حملہ آور بھاری تعداد میں آ کر یہاں آباد ہوئے اور پہلے سے موجود آریائی نسل کی اقلیت کو اپنے اندر ضم کر لیا۔ تاہم ابتدائی آبادکاری اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے زمانوں کا تعین کرنا اس وقت ممکن نہیں۔

کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں وادی سکردو کے موضع کچورہ اور بغاردو کے درمیان سیلابی ملبے نے بند کی شکل اختیار کی اور دریائے سندھ کا پانی رک گیا۔ جس کی وجہ سے لداخ کی طرف کھلسے گاؤں تک اور اسی سطح پر شیوک، شگر اور پوریگ کی وادیوں میں بھی سکردو سمیت پانی بھر گیا اور ایک عظیم جھیل کی صورت اختیار کی۔ سکردو کے گھاٹ کی کشتی چونداہ گاؤں کے اوپر چڑھ گئی جہاں اسے ایک پتھر کے ساتھ باندھا جاتا تھا جو اب تک چینگ ردوا یعنی 'باندھنے کا پتھر، کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پتھر اس وقت بھی موجود ہے جس کے ایک پہلو میں رسی گزارنے کے لئے سوراخ بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی پتھر کی وجہ سے اس گاؤں کا نام چنگ روداپڑ گیا تھا جو کثرت استعمال سے چونداہ بن گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جھیل سے پانی خارج ہوا اور جب زمین خشک ہو گئی تو لوگوں نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ اتنی بڑی مقدار میں یہاں سے پانی خارج ہوا تو پنجاب اور سندھ میں دریائے سندھ کے آس پاس واقع بہت سی بستیاں نہ صرف زیر آب آ گئی ہوں گی بلکہ مٹی تلے دب گئی ہوں گی۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تباہی کا بھی اس سیلاب سے تعلق ہو سکتا ہے۔ فی الحال اس سیلاب کے زمانے کا تعین نہیں ہوا ہے۔

دسویں صدی عیسوی کے آغاز سے لے کر بارھویں صدی کے اواخر تک کی تین صدیوں کے دوران بلتستان کبھی آزاد، کبھی ترکستان کے ماتحت اور کبھی کشمیر کے زیر تسلط رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تبتی اقتدار کے خاتمے کے بعد ان علاقوں پر کشمیر کا تسلط قائم ہوگیا تھا۔ کشمیر کی تاریخ میں مذکور ہے کہ اس زمانے میں کاشغر کشمیر کا باجگذار تھا۔ کاشغر میں بغاوت کو فرد کرنے کے لئے کشمیر کی جو فوج جارہی تھی وہ قراقرم میں تباہ ہوگئی۔ اسی دور میں بلتستان کی حدود میں کوہ ٹونگ پر کشمیری فوج اور راجہ ختن کے لشکر کے درمیان جنگ کا بھی ذکر ملتا ہے۔

تاریخ کشمیر کے مطابق کشمیر کے راجہ جے سنگھ (تخت نشینی 1189 بکرمی) کے عہد میں پنڈت کلہن نے راج ترنگنی لکھی۔ اسی کے دور میں 525ھ میں چنگیز خان نے افغانستان کو فتح کرنے کے بعد کشمیر کی تسخیر کے لئے فوج بھیج دی۔ دریائے نیلاب کے کنارے جے سنگھ کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ آخر کار وزیر مل چندر ولد سوسرم چندر کی حکمت عملی اور تدبیر کے نتیجے میں راجہ کشمیر کے ساتھ مصالحت کر کے چنگیز خان کی فوج واپس چلی گئی اور یوں جے سنگھ کا تخت محفوظ رہا۔ اس خدمت کے عوض جے سنگھ نے تبت خورد (بلتستان) اور تبت بزرگ کے علاقے مل چندر کو جاگیر میں دیدیئے۔ مل چندر موضع گلنہ گیر میں قلعہ تعمیر کر کے ادھر سکونت پذیر ہوگیا۔ بعد میں راجہ پرمانو (تخت نشینی 1216 بکرمی) کے عہد میں اس کی کمزوری اور مل چندر کی موت کی وجہ سے بلتستان اور لداخ نے آزادی حاصل کی۔

راجہ سنگرام دیو (تخت نشینی 1297 بکرمی) کے دور حکومت میں اس کے بھائی اور مدارالمہام سورج دیو نے بغاوت کی۔ راجہ نے اسے حکومت سے فارغ کر دیا تو وہ جان کے خوف سے قلعہ گلنہ گیر میں بلاد چندر کے پاس پناہ گزین ہوگیا۔ سنگرام دیو نے لشکر کشی کی تو سورج دیو مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کر سکردو چلا آیا۔ سکردو کے حکمران ٹونگ نے سورج دیو کی مدد کے لئے بڑا لشکر جمع کیا۔ سنگرام دیو نے سکردو پر حملہ کر کے ٹونگ خاندان کا خاتمہ کیا اور سارے علاقے کو تباہ کر ڈالا۔

......☆......

تیسرا باب

بلتستان قرونِ وسطیٰ میں

بارھویں صدی کے اواخر میں مقامی طور پر سکردو میں شکر گیالپو کا خاندان، شگر میں اماچا، خپلو میں یبگو، روندو میں لونچھے، پوریگ میں گاشو اور کھرمنگ میں انٹھوک خاندان حکمرانی کر رہے تھے۔ اسی دوران سکردو میں مقپون خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔ مقپون خاندان کو رفتہ رفتہ عروج حاصل ہوا یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر تک مقپون کے زیر اقتدار سکردو، روندو، کھرمنگ، پوریگ، استور، شگر اور خپلو پر مشتمل تبت خورد کے نام سے بلتستان کی ایک متحدہ سلطنت قائم ہوگئی۔ اس کے بعد مقپون حکمرانوں نے ایک طرف لداخ اور دوسری طرف کافرستان چترال تک کے علاقوں کو اپنے زیرنگیں لایا۔ لیکن جب مقپون حکمرانوں کو زوال آیا تو اکثر مفتوحہ علاقے علیحدہ ہوگئے۔ تاہم روندو (بشمول ہراموش)، استور، کھرمنگ، شگر اور خپلو پر مشتمل بلتستان کی سلطنت انقلابات اور خانہ جنگیوں سے گزرنے کے باوجود ڈوگرہ دور کے آغاز تک قائم رہی جس پر سکردو کے مقپون خاندان کی بادشاہت قائم تھی۔ روندو اور استور 1840ء تک بدستور سکردو کے ساتھ ملحق رہے۔ اس لئے ان وادیوں کی الگ تاریخ موجود نہیں۔ کھرمنگ کچھ عرصے کے لئے لداخ کے قبضے میں چلا گیا۔ طولتی کھرمنگ کا اور کریس خپلو کا حصہ تھا۔ استور، روندو، کھرمنگ اور طولتی میں سکردو کے مقپون خاندان کی ذیلی شاخیں حکمران تھیں جن کی حیثیت گورنروں کی سی تھی۔ یہی حیثیت شگر کے اماچا اور خپلو اور کریس کے یبگو خاندانوں کی بھی تھی۔ لیکن جب بھی سکردو کی مقپون حکومت کمزور ہوئی شگر اور خپلو نے سرکشی اختیار کر لی اور پوریگ پر لداخ نے قبضہ کیا اور جونہی سکردو حکومت کو طاقت حاصل ہوئی اس نے شگر اور خپلو کو پھر سے مطیع کیا اور پوریگ کو لداخ سے چھین کر بلتستان میں شامل کر لیا۔ روندو، کھرمنگ اور استور کے علاقے سکردو

کے ساتھ ملحق رہے۔ ہراموش اوراستور ڈوگرہ دور میں انتظامی طور پر بلتستان سے علیحدہ کئے گئے۔ پوریگ پر1948ء میں بھارت نے قبضہ کرلیا۔

آیئے سکردو، کھرمنگ، شگراورخپلو کی تاریخ کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔

سکردو

مقپون ابراہیم

1190ء تا 1220ء

مقامی روایات کے مطابق سکندراعظم کی فوجوں کی واپسی کے وقت ایک سردار نے سکردو میں آکر سکونت اختیار کی اور کسی طرح سے ادھر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مقامی لوگوں میں وہ اپنی رنگت کی وجہ سے شکر گیالپو یعنی گورا بادشاہ مشہور ہوا جو رفتہ رفتہ اس کے خاندان کا مستقل نام بن گیا۔شکر گیالپو کے خاندان نے صدیوں تک اس علاقے پرامن وسکون کے ساتھ حکومت کی۔ بعد میں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وارث حکومت شکری نامی صرف ایک لڑکی رہ گئی۔اس زمانہ میں اس دربار میں ستانوٹوک ٹوک،ستانو نے شے،ستانو کنائی اورستانو بابور نامی چار آدمیوں کا رسوخ تھا۔ ان کے درمیان شکری کی شادی کے متعلق تنازعہ ہوا۔ ہرایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے خاندان میں شکری کی شادی کرے۔اس اثناء میں ابراہیم نامی ایک نوجوان کشمیر سے وارد سکردو ہوا۔اس کا زمانہ ازروئے حساب 1190ءتا1220ء کے قریب ہوتا ہے۔ یہ لڑکا قابل اور ہوشیار تھا۔ چندروز میں اس کی شہرت اس ملک میں پھیل گئی۔اب ان چاروں وزیروں نے مصالحت کی کہ شکری کے بیاہ کے متعلق آپس میں جھگڑنا بیکار ہے۔اس نووارد شخص کے ساتھ اس کی شادی کردی جائے۔ان حالات میں یہ مسافر برسراقتدار پہنچا اور مقپون یعنی سالار قوم کے لقب سے مشہور ہوا۔

لیکن سکردو کے آخری تاجدار راجہ احمد شاہ کی روایت کے مطابق شکری کی شادی کے سلسلے میں دربار کے بارہ وزیرآپس میں لڑرہے تھے۔اتنے میں ابراہیم نامی ایک نوجوان فقیر کے بھیس میں وارد شگری ہوا جس کے ایک ہاتھ میں سونے کا ایک عصا اوردوسرے ہاتھ میں سونے سے بھری

ہوئی ایک جھولی تھی۔ یہ نوجوان دن رات شگری میں بردوسنیاس نامی پتھر پر بیٹھا رہتا تھا اور نہایت ہی قلیل عرصے میں اس کی پارسائی کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ وزیروں نے آپس کے مشورے سے شگری کی شادی اس نوجوان سے کر دی۔ چونکہ مقپون خاندان کا جدامجد ابراہیم بردوسنیاس نامی اس پتھر سے سیدھا سکردو کے تخت پر جا پہنچا۔ غالباً اسی وجہ سے اس کے بعد یہ رسم قائم ہوگئی کہ مقپون خاندان میں ولیعہد جب شعور کی عمر کو پہنچتا تو اسی پتھر پر اس کی تاج پوشی کی جاتی۔ سب سے پہلے رگیالفو پھر شگری والے پھر سرداران ولیعہد کو سلام اور تحائف پیش کرتے، پھر پولو کھیلتے، اس کے بعد گھوڑوں پر سوار ہو کر تیر اور بندوق سے نشانہ بازی کرتے، پھر محفل موسیقی منعقد ہوتی اور آخر میں رگیالفو حرم میں جا کر خواتین سے مبارکباد وصول کرتا تھا۔ اس پتھر پر آخری بار راجہ احمد شاہ کے ولی عہد محمد علی خان کی تاج پوشی کی رسم 1836ء میں ادا ہوئی تھی۔

ابراہیم کے بارے میں روایت ہے کہ وہ مصر کا شہزادہ تھا اور براستہ ہندوستان یہاں پہنچا تھا۔ تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان نے مقپون خاندان کے شجرہ نسب کی مدد سے ابراہیم کے بلتستان میں ورود کا زمانہ 1190ء کے قریب معین کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 1171ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر میں فاطمیین کی خلافت کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ فاطمی خاندان کے لوگ ہر طرف بھاگ نکلے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شہزادہ جان کے خوف سے پناہ کے لئے ان پہاڑی علاقوں میں پہنچا ہو اور اپنا مذہب چھپا کر زندگی گزاری ہو۔ ابراہیم کا نام یا تو مسلمانوں کے ہاں ملتا ہے اور یا دوسرے اہل کتاب کے ہاں۔ یہ تو واضح ہے کہ اس زمانے میں مشرقی علاقوں میں یہودی اور عیسائی مذہب کا وجود ہی نہ تھا۔ ابراہیم مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔ اس وقت بلتستان میں بدھ مت کا دور دورہ تھا۔ اسے جان کا خوف لاحق ہوگا جس کی بناء پر اس نے اس غیر مسلم اور دشوار علاقے میں زندگی بسر کی۔ یہاں کی حکمران شہزادی کے لئے شوہر کے طور پر اس کے انتخاب سے بھی اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ کوئی متأثر کن شخصیت کا مالک شہزادہ ہی تھا۔ شگری سے شادی کی وجہ سے وہ مقپا یعنی داماد اور برائے آداب مقپون کہلانے لگا۔

ایک روایت کے مطابق ابراہیم کے ساتھ یعقوب نامی اس کا بھائی بھی تھا۔ ان دونوں

بھائیوں نے مصر سے آ کر کچھ عرصے کے لئے کشمیر میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن جلد ہی ایک بغاوت کے نتیجے میں اسے وہاں سے سکردو کی طرف بھاگنا پڑا۔ لیکن ایک اور روایت کے مطابق تبت سے آزادی ملنے کے بعد حصول اقتدار کی خاطر یہاں کے مقامی حکمرانوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے دوران کشمیر کے حکمرانوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دریائے سندھ کے بائیں جانب کے علاقوں پر اپنا تسلط جمالیا اور ابراہیم نامی ایک شخص کو سکردو میں ہرمق پون یعنی سالار لشکر مقرر کر دیا۔ ہرمق پون کا لفظ کثرت استعمال سے مقپون بن گیا۔ ابراہیم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے گھبرا کر کشمیر کی حکومت نے اسے معزول کر دیا۔ مگر مقامی لوگوں نے اس کی برطرفی کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اسی کو یہاں کا حکمران تسلیم کر لیا۔

ستک سنگے تا ساگوری تھم

1220ء تا 1400ء

ابراہیم کے بعد ستک سنگے (1220ء تا 1250ء)، زیک سنگے (1250ء تا 1280ء)، بروک سنگے (1280ء تا 1310ء)، سیک سنگے (1310ء تا 1340ء)، نم گوری تھم (1340ء تا 1370ء) اور ساگوری تھم (1370ء تا 1400ء) یکے بعد دیگرے سکردو میں حکمران رہے۔

سنگے بلتی زبان میں شیر کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ بلتیوں سمیت سارے تبتی زبان بولنے والوں کے درمیان قدیم زمانوں سے اب تک نام کا حصہ بن کر مستعمل رہا ہے۔ جان بڈلف نے بلتی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے مغالطہ ہو کر اس لفظ کو 'سنگ' سمجھا جو گلگت کی طرف شینوں کے ناموں کے ساتھ بطور لاحقہ آتا ہے۔

مقپون راجاؤں کے سلسلے میں تھم نام کے دو راجے بیچ میں گزرے ہیں۔ تھم شگر اور نگر کے راجاؤں کا لقب ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں راجے مقپون خاندان سے نہیں بلکہ شگر کے حکمران خاندان نے دو پشتوں تک سکردو پر حکومت کی ہے۔ نم گوری تھم میں 'نم' بمعنی آسمان اور ساگوری تھم میں 'سا' بمعنی زمین بلتی زبان کے الفاظ ہیں۔ سنم یا ختم بھی نم کے تلفظ کی رائج شکلیں

ہیں۔ پروفیسر احمد حسن دانی نے نم گوری تھم کو 'بھم گوری تھم، اور سا گوری تھم کو 'شاہ گوری تھم، بنا دیا ہے جو درست نہیں۔ معلوم نہیں اس بیجا توڑ مروڑ کے ذریعے پروفیسر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال نم گوری تھم کے دور تک کے واقعات مقامی طور پر کسی کو معلوم نہیں۔ اُس دور کی تاریخ کشمیر میں بلتستان کا ذکر ملتا ہے جو غالباً سا گوری تھم کے زمانے کے واقعات ہیں۔

773ھ (1372ء) میں کشمیر کے سلطان شہاب الدین نے بلتستان کے علاقے میں کاشغر کے بادشاہ کے ساتھ ایک بہت بڑی جنگ لڑنے کے بعد تبت اور سکردو کے ملک کو کاشغر کے قبضے سے چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ یہاں سے گلگت کی طرف چلا اور داردو کے ملک پر قبضہ کرلیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سا گوری تھم ہی کے دور میں خپلو اور شگر میں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے ہاتھوں اسلام پھیلا جو پہلی بار خپلو کے راجہ مقیم خان کے دور (1380ء تا 1420ء) میں 783ھ (1381ء) میں کشمیر سے بلتستان تشریف لائے۔ کشمیر میں آپ 781ھ میں پہنچے تھے۔ اس بار آپ کے ساتھ 700 سادات بھی تھے۔ یہ کشمیر کی طرف آپ کا دوسرا سفر تھا۔ بلتستان میں آپ دوسری بار شگر کے راجہ گوری تھم کے عہد میں 785ھ (1383ء) میں کاشغر کی طرف سے وارد شگر ہوئے۔ اگرچہ مقامی روایات میں ذکر ہے کہ سارے بلتستان میں آپ نے اسلام پھیلایا۔ لیکن بلتستان میں دستیاب تحریری تاریخی ذرائع میں آپ کے سکردو تشریف لانے کا ذکر نہیں ہے۔

کھوکھور سنگے تا بہرام چو

1400ء تا 1490ء

سا گوری تھم کے بعد کھوکھور سنگے (1400ء تا 1437ء)، غوطہ چو سنگے (1437ء تا 1464ء) اور بہرام چو (1464ء تا 1490ء) یکے بعد دیگرے سکردو میں شگری کے تخت پر حکمران رہے۔

تاریخ کشمیر سے پتہ چلتا ہے کہ اس دوران بلتستان پھر آزاد ہو چکا تھا۔ چنانچہ کشمیر کے سلطان سکندر (1394ء تا 1417ء) نے وزیر اعظم مادری کو بلتستان کو پھر زیر کرنے کے لئے بھیجا۔ وزیر نے سکردو پر لشکر کشی کی اور تمام ملک کو مسخر کرنے کے بعد اس نے خود سلطان سکندر کے خلاف

بغاوت کردی۔ سلطان نے وزیر کے خلاف لشکر بھیج دیا اور ایک شدید جنگ کے بعد وزیر کو مغلوب کر کے بلتستان پر پھر قبضہ کرلیا۔

سلطان علی شاہ (1417ء تا 1423ء) کے عہد میں والی کاشغر نے حملہ کر کے بلتستان اور لداخ پر قبضہ کرلیا۔ سلطان علی شاہ عدم استطاعت کے باعث خاموش رہا اور کوئی تدارک نہ کر سکا۔ بعد میں سلطان زین العابدین عرف بڈ شاہ (1423ء تا 1474ء) نے دروغ برگردن راوی ایک لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار ہمراہ لے کر بلتستان اور لداخ کے علاقوں کو کاشغر سے چھیننے کے لئے اس ملک پر چڑھائی کردی۔ والی کاشغر نے بھی ٹڈی دل فوج مقابلہ کے لئے بھیج دی۔ طرفین میں سخت مقابلہ ہوا۔ بالآخر کشمیر کی فوج غالب آئی اور کاشغری فوج کو شکست دے کر تبت کو چک اور تبت کلاں پر قبضہ کرلیا۔

تاریخ کشمیر میں بلتستان کے ان تذکروں سے یہاں ابھی تک موجود ترک کلچر کے اثرات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بلتی میں موجود ترکی زبان کے الفاظ انہی ادوار میں اس زبان میں داخل ہوئے ہوں گے۔ غوطہ چوسنگے کے زمانے میں ہمیں بہرام کا ترک نام ملتا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ اس کے دور میں یہاں ترکوں کا تسلط رہا ہے۔

حشمت اللہ خان کی تاریخ جموں کے مطابق بہرام کے دور میں روندو کے حکمران لون چھے اوت چو نے شگری کی ریاست پر حملہ کر کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ بہرام کے وزیر چندن گیری کی تدبیر سے اوت چو کو جنگی چال اور دھوکے سے سندوس کے مقام پر خندق میں گرا کر اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ اوت چو کے مارے جانے پر اس کا بھائی چڑا باقی ماندہ شکست خوردہ فوج کو لے کر بھاگ گیا۔ بہرام نے پیچھا کر کے بشوتک کے علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔

مقپون بوخا

1490ء تا 1515ء

بوخا کے بارے میں حشمت اللہ خان تاریخ جموں میں لکھتے ہیں:

''بہرام کا بیٹا بوخا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی شیر خوری کے زمانے میں سایہ پدری سر سے اٹھ گیا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر کھر بوکھر کے برق مایور خاندان کے راجہ نے شگری کی حکومت پر قبضہ کر لیا اور مقپون خاندان کے تمام آدمیوں کو قتل کر دیا۔ بوخا کو اس کے شیر پدر ملاتم زیر پا نے گونگا ظاہر کر کے اپنے گھر میں رکھا۔ راجہ نے بوخا کو قتل کرنا چاہا تو اس کے وزیر گچا نے راجہ کو اس ارادے سے باز رکھا کہ یہ گونگا لڑکا راجہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ گچا بہرام کا بھی وزیر رہا تھا۔ بوخا اٹھارہ سال تک اپنے شیر پدر کے گھر میں گونگا بن کر چرواہے کا کام کرتا رہا۔ ایک روز حسب معمول بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے اپنے باپ کے محل کے سامنے ایک بڑے پتھر پر سو رہا تھا۔ یہ پتھر بردوسنیاس کے نام سے معروف ہے۔ اسی اثناء میں اس کی رضاعی ماں اس کے لئے کھانا لے کر ادھر پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ بوخا پتھر پر سو رہا ہے اور ایک سانپ اس کے چوگردہ کنڈل مارے اپنے سر سے بوخا کے سر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ یہ غیر معمولی منظر دیکھ کر اس عورت نے شور مچایا تو بوخا جاگ پڑا اور وہ سانپ غائب ہو گیا۔ بوخا نے رضاعی ماں سے شکایت کی کہ میں ایک بہت اچھا خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک لشکر مجھے لباس فاخرہ پہنا کر لے گیا ہے اور تخت پر بٹھا رہا ہے۔ اس عورت نے یہ واقعہ اپنے شوہر کو سنایا۔ اس نے اس خواب کی تعبیر یہ کی کہ یہ لڑکا ضرور برسر حکومت پہنچے گا۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے ادھیڑ بن شروع کر دی۔ وزیر گچا کو اپنا طرفدار بنا لیا۔ اس کے ذریعے جملہ ہوا خواہان بہرام اس لڑکے کے حامی ہو گئے۔ آخر الامر برق مایور پا دونوں بھائیوں کو شکار کے بہانے سے بڑدولے جایا گیا اور ہانکہ کے لئے تمام رعایا کو جمع کیا گیا۔ قزلی یول میں پہنچ کر شکار اختتام کو پہنچا۔ وہاں ضیافت ہوئی۔ ناچ تماشا منعقد ہوا۔ وزیر گچا نے خود تلوار لے کر ناچنا شروع کیا اور اسی دوران اس نے تلوار سے برق مایور پا دونوں بھائیوں کا کام تمام کر دیا۔ سب نے بوخا کو حکمران تسلیم کر لیا اور شگری میں بردوسنیاس پتھر پر بٹھا کر اسے نذریں پیش کیں۔ بوخا اب تک گونگا بنا ہوا تھا۔ اس کے شیر پدر نے کہا بیٹا بات کرو اور بوخا بولنے لگا۔ اس سے اس کا لقب تم زیر پا یعنی بات کرنے والا ہو گیا۔ بوخا اپنے باپ کی وراثت کے ساتھ برق مایور پا کی حکومت پر بھی قابض ہو گیا۔ اس طرح سکردو کی چاروں ابتدائی خاندانوں کی حکومت شکر گیالپو کے خاندان میں

آ گئی۔ بوخا کو برق مقپون یعنی چٹان والا مقپون نام دیا گیا۔ اس کے بعد راجہ احمد شاہ تک یہ عمل رہا کہ رسم تاج پوشی اسی پتھر پر ادا کی جاتی تھی۔،،

اس قصے میں جزوی طور پر صداقت موجود ہے جس میں حسب دستور دیو مالائیت مل چکی ہے۔ 1904ء تک بلتستان میں یہ روایت موجود تھی کہ سکردو کا آخری بدھسٹ راجہ منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں قلعہ میں مارا گیا تھا۔ بہرام سکردو کا آخری بودھ راجہ ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ بہرام ترکستان کی طرف کے کسی حملے میں مارا گیا ہوگا۔ اس کے بیٹے کا نام بوخا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس سے بھی اس روایت کی کسی حد تک تائید ہوتی ہے۔ بہرام کا بشوتک کے علاقوں پر قبضہ تھا۔ اس لئے اس کے دارالحکومت کے پہلو میں کھر بوکھر کے برق مایور پا کی حکومت کا وجود کسی کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جو اس قصے میں شامل ہو گیا ہے۔ جہاں تک بوخا کی بردوسنیا س پر تاج پوشی کا تعلق ہے یہ دستور بقول راجہ احمد شاہ مقپون حکومت کے قیام کے ابتدائی زمانوں سے چلا آ رہا تھا۔ بوخا کی تاج پوشی بھی اس پتھر پر اسی دستور کی وجہ سے ہوئی تھی۔

شگری اب تک سکردو کا دارالحکومت تھا۔ بوخا نے موجودہ سکردو شہر کے پہلو میں موجود پہاڑی پر کھر پوچھے قلعہ تعمیر کر کے اپنا دارالحکومت اس جگہ منتقل کیا۔ کھر پوچھے کے معنی ہیں بڑا قلعہ۔ کثرت استعمال سے بعد میں یہ کھر پوچو ہو گیا۔ کھر پوچھے کا قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے وہ مشرق اور شمال کی طرف سے دریائے سندھ سے گھری ہوئی ہے اور مغرب اور جنوب کی طرف سے پہاڑی کی ہیئت عمودی صورت میں ہے جس کی وجہ سے یہ قلعہ سابقہ زمانوں میں ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ ’دو، بلتی زبان میں دو پہاڑوں کے درمیان کھلی جگہ کو کہتے ہیں۔ سکردو کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اغلب خیال یہ ہے کہ اسے ابتداء میں سکر یا سکار نامی شخص نے آباد کیا تھا۔ جس کے بارے میں اندازہ کیا جاتا ہے کہ شکر گیالپو کے خاندان کا جد امجد تھا۔ اسی وجہ تسمیہ کے ساتھ سکردو کے قریب کواردو، بغاردو اور کرال دو کے مواضعات بھی موجود ہیں جنہیں بالترتیب کوار، بغار، اور کرال نے آباد کیا تھا۔ اس ساخت کے نام بلتستان میں اور بھی کئی مقامات کے ہیں۔ اس لئے سکردو کے نام کے بارے میں دوسری توجیہات غیر ضروری تکلف کے سوا کچھ نہیں۔

بوخا کے دور میں سکردو میں میر شمس الدین عراقی کے ہاتھوں اسلام پھیلا۔ میر عراقی پہلی بار کشمیر میں 892ھ (1486ء) میں سلطان حسین مرزا والی خراسان کی جانب سے بطور سفیر آئے تھے۔ دوسری بار آپ سلطان محمد شاہ کے عہد میں سید محمد بیہقی کی وزارت (1499ء تا 1505ء) کے زمانے میں کشمیر میں پہنچے۔ اس دوران سید محمد بیہقی نے اپنے لئے میر عراقی کی بڑی بیٹی بی بی آغا کا رشتہ مانگا جسے انہوں نے نہ صرف قبول نہیں کیا بلکہ جلدی میں شیخ عبدالسلام رومی کے ساتھ بی بی آغا کا بیاہ بھی کر دیا۔ یہ فعل سید محمد بیہقی کے لئے بہت ناگوار گذرا اور اس نے آپ کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو آپ نے سکردو کا رخ کیا۔

میر شمس الدین عراقی کے بارے میں حشمت اللہ خان تاریخ جموں میں لکھتے ہیں:

''مقپون بوخا کے عہد کا یہ بھی اہم واقعہ ہے کہ میر شمس الدین عراقی خراسان سے ملک بدر کئے جانے پر بعہد محمد شاہ جس کا مدار المہام سید محمد بیہقی تھا۔ سنہ 901ھ میں وارد کشمیر ہوئے اور بابا علی نجار کی معاونت سے علانیہ مذہب امامیہ کی اشاعت کشمیر میں کرنے لگے۔ سید محمد مدار المہام کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے میر شمس الدین عراقی کو بجبر وتشدد کشمیر سے نکال کر اسکردو بھجوادیا۔

''اشاعت مذہب شیعہ: اسکردو میں پہنچ کر میر صاحب نے اپنے آپ کو سید محمد نور بخش کا خلیفہ ظاہر کر کے مذہب امامیہ کی اشاعت میں بڑی کوشش کی۔ اس وقت اسکردو میں مقپون بوخا، شغر میں گازری، کھپلو میں رائے بہرام اور پوریگ میں جیب چو حکمران تھے۔ چونکہ لوگ سید محمد نور بخش کے نام پر جان دیتے تھے۔ ہر ایک جگہ میر صاحب کی بڑی تعظیم وتکریم ہوئی اور اس حکمت عملی سے وہ اپنے مذہب کے پھیلانے میں بخوبی کامیاب ہوئے۔ پانچ چھ سال وہ اس ملک میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں سید محمد بیہقی کے کشمیر میں شہید ہونے کے بعد میر شمس الدین عراقی تقریباً 908ء میں واپس کشمیر چلے گئے۔''

میر شمس الدین عراقی کے خاص ساتھیوں میں سے ایک ملا خلیل اللہ تھا۔ اس کے خلف رشید

محمد علی کشمیری نے میر عراقی کی زندگی کے احوال وواقعات کو تحفۃ الاحباب کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا ہے۔میر عراقی کے سفر بلتستان کے بارے میں وہ رقمطراز ہے:

''جب آپ (میر شمس الدین عراقی) تبت (بلتستان) کے قریب پہنچے تو اسکردو کے راجے لوگوں کی بڑی جمعیت کو ساتھ لے کر آپ کے استقبال کے لئے آئے۔آپ کے سکردو پہنچنے کے وقت بوخا سکردو کا راجہ تھا۔اس وقت تبت کے علاقوں میں دین وملت کے کوئی آثار موجود نہ تھے اور احکام اسلام اور سیدؑالانام کی شریعت کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ان علاقوں میں سارے لوگ اور باشندے یا کافر تھے یا منافق اور بدکار تھے۔ان مقامات پر کسی کو بھی دین کا درد نہیں تھا۔ان علاقوں کے سارے قلعوں اور دوسرے مقامات پر بڑے بڑے بت خانے آباد تھے اور بتوں کو اپنا معبود بنا کر لوگ انہیں پوجتے تھے۔جب آپ کا قدم مبارک ان جگہوں پر پہنچا تو آپ کے آنے اور تشریف کی برکت سے اس سرزمین کے تمام راجے، سردار، ملوک، سلاطین اور باقی رعایا و کسان سب اسلام و ایمان سے مشرف ہوئے۔اور اس ملک کے چھوٹے بڑے سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر ایمان لا کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔اس ملک کے مرد عورت چھوٹے بڑے سب نے آپ کے سامنے کلمہ شہادت پڑھ کر کفار اور اشرار کی رسوم سے دوری اور لاتعلقی اختیار کی......''

تحفۃ الاحباب کے مطابق میر نے سارے اطراف میں صوفیوں اور درویشوں کو پھیلا دیا جنہوں نے سارے علاقے میں بتوں اور بت خانوں کو تباہ کر کے ان کی جگہ مسجدیں اور مساجد جامع بنائیں۔ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں اہل بیت اطہار اور آل حیدرؓ کرار کی محبت جاگزین ہوئی۔اس طرح بوخا اور اس کی رعایا نے اسلام قبول کیا۔کہتے ہیں کہ بوخا کا بیٹا شیر شاہ خصوصی طور پر میر عراقی کا مرید بن گیا تھا۔تحفۃ الاحباب سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان علاقوں میں ترک سکہ چلتا تھا۔اس وقت شگر میں گازری، کھپلو میں رائے بہرام اور پوریگ

میں حبیب چو حکمران تھے۔ ہر جگہ میر کی عزت وتکریم ہوئی۔ 1505ء (911ھ) میں سید محمد بیہقی کے مارے جانے کے بعد آپ واپس کشمیر چلے گئے جہاں 1526ء (932ھ) میں آپ نے وفات پائی اور زڑی بل میں دفن ہوئے۔

شیر شاہ

1515ءتا1540ء

بوخا کے بعد اس کا بیٹا شیر شاہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ میر شمس الدین عراقی کا مرید تھا۔ اس نے اپنے نئے مذہب کی اشاعت میں پوری کوشش کی۔

شیر شاہ کے دور میں 1532ء (939ھ) میں یارقند کے سلطان سعید خان نے بلتستان پر حملہ کیا۔ مرزا حیدر دوغلات تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے ''سلطان سعید خان شاہ یارقند نے ایک ہزار سپاہ لے کر 939ھ میں مریول (لداخ) سے بالتی (بلتستان) کا رخ کیا اور موسم سرما کے آغاز میں بالتی پہنچا۔ بہرام چو نے اطاعت قبول کی اور ملازمت میں حاضر ہوا۔ دیگر تمام چوپان بالتی نے تمرد اختیار کیا۔ بہرام چو کی راہبری سے قلعہ اشکار (شغر) جو کہ تمام بالتی کا دارالملک ہے اول حملہ میں فتح کیا۔ مرد مارے گئے۔ عورتیں اور اموال عساکر منصورہ کے حصہ میں آئے۔ اس کے علاوہ جہاں کوہستان تھا اسے فتح کیا۔ البتہ جو قلعے اور درے مستحکم تھے انہیں چھوڑ دیا اور اوائل بہار میں شاہ بالتی سے واپس لداخ روانہ ہوا۔،،

یہ بہرام چو خپلو کا رائے بہرام ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اپنے بھائی یبگو کور کور کے ساتھ مل کر خپلو پر حکومت کر رہا تھا۔ بہرام کی اس سے تقریباً 27 سال قبل میر شمس الدین عراقی سے بھی ملاقات رہی تھی۔ اس کی تائید خپلو کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق بہرام کے دور میں مسمی ہاشم ہو (یارقندی) نے کندوس کے راستے خپلو پر حملہ کیا اور تمام ملک خپلو کو تاخت وتاراج کیا اور اہل خپلو کو مع کور کور اور بہرام کے یارقند لے گئے۔ خپلو کی اس تباہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکردو کے راجہ نے تمام ملک خپلو پر قبضہ کر کے ادھر ایک بہت ہی ظالم اور جابر

شخص کو کھرپون مقرر کر دیا۔ اس کھرپون کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر کئی سال بعد خپلو کے لوگوں نے ملا حسن، بیکار ترو چے، خوشین البلدے اور لمکھن میک سنگے چار افراد کو یبگو کورکور اور بہرام کو تلاش کر کے واپس خپلو لانے کے لئے یارقند بھیج دیا۔

حشمت اللہ خان کا خیال ہے کہ یبگو بہرام کے دور میں یارقند کی طرف سے صرف سلطان سعید خان کا حملہ ہوا تھا جس کے دوران بہرام نے اطاعت قبول کی اور دوسرے قلعوں کی فتح میں اس کی رہبری کی۔ لہٰذا یارقندی فوج بہرام کو یقیناً گرفتار کر کے اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ بلکہ چونکہ بہرام کی رہبری کی وجہ سے سکردو اور شگر میں یارقندیوں نے تباہی مچائی تھی اس لئے یارقندیوں کی واپسی کے بعد راجہ سکردو نے حملہ کر کے خپلو پر قبضہ کر لیا تو کورکور اور بہرام بھاگ کر یارقند چلے گئے تھے۔ بہر حال ان چار افراد نے بہرام کو ڈھونڈ نکالا۔ اس وقت کورکور فوت ہو چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں ساتھ لے کر بہرام واپس آیا۔ سرموں پہنچا تو خپلو کے سارے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ دوسری صبح کو کچھ لوگوں نے کھرپون کو پولو کھیلنے کے بہانے قلعہ سے نکالا اور اسے پولو گراؤنڈ میں لے آئے تو بہرام نے ہنجوری کے راستے آ کر تھور سے کھر پر قبضہ کیا اور نقارہ بجا کر قلعے کی تسخیر کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران لوگوں نے سکردو کے کھرپون کو قتل کر دیا۔ یہ شیر شاہ کے دور کا واقعہ ہے۔

مرزا حیدر گورگان نے تاریخ رشیدی میں لکھا ہے کہ بالتی (بلتستان) تبت کا علاقہ ہے جو پوریگ، خپلو، شگر اور سکردو پر مشتمل ہے۔ اس نے رونداور کھرمنگ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روندو اور کھرمنگ پر سکردو کا اقتدار بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ کیونکہ انہیں سکردو کا حصہ سمجھ کر الگ ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن حشمت اللہ خان نے مقامی روایات کی روشنی میں خیال قائم کیا ہے کہ روندو اور کھرمنگ کے علاقوں پر بعد کے زمانوں میں سکردو کا اقتدار قائم ہوا تھا۔

علی خان

1540ء تا 1565ء

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا علی خان سکردو کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں چلاس اور

استور والوں کے حملوں کی وجہ سے شنگھو شگر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی جو مال لوٹ کر لے جاتے اور مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے اور غلامی میں رکھتے تھے۔ دراس میں بھی دونوں رانیوں کے آپس کے نفاق کی وجہ سے گڑبڑ پیدا ہوئی تھی۔ کناپا خاندان کی ایک شاخ گول میں جبکہ دوسری شنگھو شگر اور دراس میں آباد تھی۔ علی خان نے اس خاندان کے لوگوں کے ذریعے ان علاقوں میں شورش پھیلائی۔ بالآخر شنگھو شگر اور دراس کے لوگوں نے علی خان سے درخواست کی کہ استور اور چلاس والوں کی دستبرد سے بچانے کے لئے انہیں اپنی حفاظت میں لے لے۔ علی خان نے بخوشی ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے دراس اور شنگھو شگر کے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا اور کرابوش اور گلتری میں حفاظتی چوکیاں قائم کردیں۔ یہاں برج تعمیر کئے اور سپاہی تعینات کئے۔ دراس میں گوشن کے مقام پر ایک باقاعدہ قلعہ تعمیر کیا اور اس میں فوج تعینات کردی۔ اس تمام علاقہ کے لئے ایک کھرپون مقرر کیا۔ کناپا خاندان کو ان کی خدمات کے صلہ میں وزارت کا عہدہ بھی دیا اور اس نئی سرحد کی حفاظت کا انتظام بھی سونپا۔

علی خان کے عہد ہی کی بات ہے کہ مرزا حیدر دوغلات نے ہمایون بادشاہ کی اجازت سے کشمیر کو فتح کر کے نازک شاہ کے دور میں 947ھ (1540ء) میں کشمیر پر اپنی حکومت قائم کی۔ 1548ء میں مرزا حیدر نے بلتستان اور لداخ کو اپنے زیر تسلط لاکر بلتستان میں ملا قاسم کو اور لداخ میں ملا باقی کو حاکم مقرر کیا۔ اس وقت میر شمس الدین عراقی کا بیٹا دانیال سکردو میں مقیم تھا۔ مرزا حیدر نے اسے زبردستی سکردو سے لے جا کر ایک سال قید میں رکھا اور قاضی عبدالغفور اور قاضی ابراہیم کے فتویٰ پر 957ھ (1550ء) میں اسے قتل کردیا۔ اس کے بعد ہر طرف بغاوتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس کے دوران بلتستان والوں نے تبت خورد میں مرزا حیدر کے نمائندے ملا قاسم کو قتل کردیا۔ لیکن لداخ کا حاکم ملا باقی بھاگ کر مرزا حیدر کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ 958ھ (1551ء) میں مرزا حیدر خود بھی مارا گیا۔

تاریخ کشمیر کے مطابق غازی خان چک نے 962ھ (1554ء) میں لداخ اور گلگت کے ساتھ ایک بار پھر سکردو کو اپنے زیر اقتدار لایا جو مرزا حیدر کے قتل پر آزاد ہو چکا تھا۔

غازی میر

1565ءتا1588ء

حقیقت یہ ہے کہ غازی میر کے دور سے حکومت سکردو کے عروج کا آغاز ہوتا ہے جسے اس کے بیٹے علی شیر خان انچن اوراس کے پوتوں نے اوج کمال تک پہنچادیا۔

کہتے ہیں کہ غازی میر کے عہد میں روندو میں لون چھے خاندان کا آخری حکمران لاولد فوت ہوا۔ جب کوئی اصلی وارث نہ رہا تو غازی میر نے ادھر اپنا کھرپون بٹھا کر روندو کا مکمل طور پر سکردو کے ساتھ الحاق کرلیا۔ حالات وقرائن سے واضح ہے کہ روندو پر سکردو کا اقتدار اس واقعہ سے بہت پہلے سے قائم تھا۔

کرتخشہ (کھرمنگ)اور پرکوتہ کے علاقے پر اس وقت لداخ نے قبضہ کر رکھا تھا۔ تاریخ رشیدی کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1532ء کے لگ بھگ کھرمنگ سکردو کے قبضے میں تھا۔ ہوسکتا ہے اسی دوران میں اس پر لداخ نے پھر قبضہ کیا ہو۔ بہرحال غازی میر نے ان علاقوں کی تسخیر کے لئے ایک لشکر ترتیب دیا اور اپنے ولی عہد علی شیر خان، جو بعد میں انچن یعنی اعظم کے لقب سے مشہور ہوا، کی سرکردگی میں پرکوتہ کی طرف روانہ کردیا۔ پرکوتہ اور کرتخشہ کی لداخی فوج نے اپنی طاقت بھر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا مگر علی شیر خان کے سیلاب فنا کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ڈوگبر کے مقام پر لداخیوں کے مورچوں کے نشانات 1913ء تک موجود تھے۔ غرض لداخی شکست کھا کر فرار ہوگئے۔

پرکوتہ (مہدی آباد) میں اس وقت ایک بہت مضبوط قلعہ ہوتا تھا۔ اسے فتح کرنے کے بعد علی شیر خان نے کرتخشہ پر دھاوا بول دیا۔ لداخیوں نے پرکوتہ سے پسپائی کے بعد موضع غندوس کے قریب موجود دشوار گذار سنگلاخ پر مورچے قائم کئے اور علی شیر خان کا ایک بار پھر زوردار مقابلہ کیا مگر پھر شکست کھا کر بھاگ گئے اور علی شیر خان نے آگے بڑھ کر کرتخشہ پر قبضہ کرلیا۔

کرتخشہ سے علی شیر خان لداخیوں کا تعاقب کرتا ہوا گرکون تک گیا۔ کہتے ہیں کہ یہاں اسے چگتن کے فساد کا حال معلوم ہوا۔ اس بناء پر اس نے سوت پر حملہ کر دیا اور چھوسرانگ ملک اور آدم ملک کو مرزا سلطان کی قید سے رہائی دلا کر ان کی میراث چگتن اور پشکم پر قابض کر دیا۔ اس خدمت کے عوض علی شیر خان نے کھر بو پر قبضہ کر کے ادھر اپنا کھرپون مقرر کر دیا۔ یہ انتظامات مکمل کر کے واپس ہوا۔ کرتخشہ پہنچا تو یہاں کے سابق حکمران خاندان بروقپہ سنگے پا کے موجودہ وارث حیدر کو عامل کرتخشہ مقرر کر کے پرکوتہ چلا آیا۔ پرکوتہ میں بھی ملکی انتظام درست کیا اور وصولی مالیہ کا کام سابقہ حکومت کے معززین کے سپرد کر کے سکردو واپس چلا آیا۔ اس عظیم کامیابی پر بہت بڑا جشن منعقد کیا گیا اور خوشی منائی گئی۔

علی شیر خان انچن (اعظم)

1588ء تا 1625ء

تاریخ جموں کے مؤلف مولوی حشمت اللہ خان نے علی شیر خان انچن کا دور 1595ء تا 1633ء معین کیا ہے جبکہ علی شیر خان انچن کی عصری تحریری شہادتوں سے یہ ثابت ہے کہ وہ 1589ء سے پہلے تخت نشین ہوا تھا۔

ایک مقامی روایت کے مطابق علی شیر خان انچن کے بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور شگر کے راجہ نے اس کی پرورش اپنے ذمے لی تھی جو علی شیر خان کا ماموں تھا۔ علی شیر خان جب اٹھارہ برس کی عمر کا ہوا تو اس کے ماموں کی نیت بدل گئی اور اس نے بھانجے کو اپنے راستے سے ہٹا کر سکردو کے تخت پر مستقل طور پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ علی شیر خان نے اپنے ماموں کے عزائم کو بھانپ لیا اور وہ اپنے باپ کے وفادار بارہ افراد کے ساتھ بھاگ کر دہلی پہنچ گیا۔ اسی دوران لداخ کے راجہ نے پوریگ کے علاوہ سرمیک تک سکردو کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ علی شیر خان نے کسی طریقے سے مغل بادشاہ تک رسائی حاصل کر لی۔ مغل بادشاہ نے ایک فوج اس کی مدد کے لئے روانہ کر دی جس کے ذریعے راجہ شگر کو بھگا کر علی شیر خان نے سکردو کا تخت حاصل کر لیا۔ دہلی

میں قیام کے دوران علی شیر خان نے گل خاتون نامی ایک مغل شہزادی سے شادی کر لی تھی جسے اپنے ساتھ سکردو لے آیا۔ اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے بعد اس نے لداخ کے راجہ سے نہ صرف سکردو کے مفتوحہ علاقے واپس لئے بلکہ سارا لداخ فتح کر لیا۔ دوسری روایت کے مطابق علی شیر خان بھاگ کر دہلی نہیں بلکہ پوریگ کی طرف گیا اور کئی سالوں تک ادھر گمنام بیٹھا رہا۔ اسی دوران اس کے حامیوں نے سکردو میں حالات کو اس کے حق میں سازگار بنالیا۔ جب حالات سازگار ہوئے تو علی شیر خان سکردو چلا آیا اور شگر کے راجہ کے خلاف بغاوت کی قیادت کر کے اسے بھگا کر سکردو کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

پہلی روایت کی صداقت مشکوک ہے کیونکہ اس وقت کشمیر پر مغلوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور مغل فوج کے لئے بلتستان پہنچنے کے لئے براہ راست کوئی راستہ موجود نہ تھا۔ دوسری روایت سکردو کے راجہ محمد ظفر خان سے متعلق ہے علی شیر خان سے غلط منسوب ہو چکی ہے۔ علی شیر خان کے بارے میں اس طرح کی مقامی روایات بہت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علی شیر خان انچن کے دور سے مغل تاریخ میں بلتستان کا تذکرہ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ بلتستان کی تاریخ میں یہ واحد حکمران ہے جسے انچن یعنی اعظم کا لقب ملا اور اس کی شہرت ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہادری، فتوحات، ملکی انتظام اور تعمیر و ترقی غرض ہر زاویئے سے یہ سرزمین اس کا ثانی پیدا نہ کر سکی۔

1586ء (994ھ) میں مغل بادشاہ اکبر اعظم نے کشمیر کو فتح کیا۔ اس کے ساتھ ہی مغل سلطنت کی سرحدیں جنوب کی طرف سے بلتستان سے آملیں۔ 1589ء (998ھ) میں تخت ہندوستان کی طرف سے ایوب بیگ کو بطور سفیر علی شیر خان انچن کی طرف بھیجا گیا۔ یہ مغل دربار کی طرف سے بلتستان کی طرف پہلی سفارت تھی۔ اسی سفارت کے نتیجے میں علی شیر خان انچن کی بیٹی کا شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ساتھ رشتہ طے ہوا۔ اس رشتے کی خواہش کا اظہار علی شیر خان انچن اس سے پہلے کئی بار کر چکا تھا۔ چنانچہ 1000ھ (1591ء) میں مغل دربار کی طرف سے حاجی مرزا بیگ کابلی اور ملا طالب اصفہانی سفارت پر سکردو پہنچے اور شہزادی کو بمع تحفے تحائف ساتھ لے گئے

اور شہزادہ سلیم کے ساتھ اس کا بیاہ عمل میں آیا۔ دروغ برگردن بدایونی یہ شہزادہ سلیم کی آٹھویں بیوی تھی۔ یاد رہے کہ اس کے بیس سال بعد 1611ء میں جہانگیر کی نور جہاں (مہر النساء) سے شادی عمل میں آئی۔ علی شیر خان انچن کی ایک بیٹی کی شادی اس سے قبل 1589ء میں ایران کے میر عارف اردبیلی کے ساتھ ہو چکی تھی۔

مقامی طور پر بلتستان کی دو وادیوں شگر میں اماچا خاندان کی اور خپلو میں یبگو خاندان کی صدیوں سے حکومت چلی آ رہی تھی۔ ان کے بارے میں مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ سکردو میں جب بھی کوئی طاقتور حکمران گزرا یہ دونوں اس کے مطیع رہے اور جونہی سکردو کی حکومت کمزور ہوئی ان دونوں نے سرکشی اختیار کر لی۔ زیادہ تر یہ دونوں ریاستیں سکردو حکومت کے زیر اقتدار ہی رہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ علی شیر خان انچن کے دور کے ابتدائی زمانوں سے شگر اور خپلو کے راجے اس کے مطیع تھے۔ کننگھم لکھتا ہے:

''خپلو کے راجے کئی پشتوں سے بالتی کے حکمرانوں کے زیر تسلط رہ چکے ہیں لیکن غالب امکان یہ ہے کہ بالتی کے حکمران خاندان، جس کا مقپون یا سپہ سالار کا لقب یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ یہ کسی سردار لشکر کی اولاد ہے، کے عروج سے قبل صدیوں تک یہ ملک ان کے آبا و اجداد کے تصرف میں رہا ہے۔''

شگر کے بارے میں کننگھم رقمطراز ہے:

''شگر کا اپنا ایک راجہ ہے لیکن شگر کے راجے عام طور پر سکردو کے حکمرانوں کے محکوم رہے ہیں.....''

ادھر لداخ کے راجہ جمیا نگ نمگیل کو پرکوتہ اور کرتخشہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا دکھ تازہ تھا۔ چنانچہ اس نے بودھ کھربو پر حملہ کر کے ادھر متعین علی شیر خان انچن کے کھرپون اور سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ بودھ کھربو پر قبضہ کرنے کے بعد آگے بڑھ کر واکھا کو تسخیر کیا پھر ملبہ اور پھوکر کے راجاؤں کو قتل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرزا سلطان سوت پر حملے کے انتظامات میں مصروف ہوا۔

بودھ کھر بو پر متعین بلتی سپاہیوں کی تباہی کی خبر سکردو پہنچی تو علی شیر خان انچن نے شگر اور خپلو سمیت تمام بلتستان سے فوج جمع کی اور ایک لشکر جرار کے ساتھ لداخ پر حملہ کر دیا۔ لداخ کا راجہ جمیا نگ نمکیل اس وقت پوریگ میں سیرینگ ملک کی مدد میں مصروف تھا۔ لداخیوں نے جان توڑ کر بلتی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور علی شیر خان انچن فتح وظفر کا ڈنکہ بجاتا ہوا لداخ کے دارالحکومت میں داخل ہوا۔ دارالحکومت پر قبضہ کرنے کے بعد پوریگ میں جمیا نگ نمکیل کی طرف متوجہ ہوا۔ جمیا نگ نمکیل پوریگ کی مہم چھوڑ کر علی شیر خان انچن کے مقابلے کے لئے آیا لیکن شکست کھا کر قید ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تبت کی سرحد تک سارا لداخ علی شیر خان انچن کے زیر نگیں آ گیا اور عملاً لداخ کی مملکت ختم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ہر فاتح فوج کی طرح بلتی فوج نے بھی خوب لوٹ مار کی، عبادت خانوں کو جلا ڈالا، مورتیوں اور بتوں کو تباہ کر ڈالا، مذہبی اور تاریخی کتابوں کو جلا دیا اور بعض کو دریائے سندھ میں پھینک دیا۔ لداخیوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ لداخ کے ایک عبادت خانے میں گوتم بدھ کا ایک دانت محفوظ تھا۔ بلتی فوج نے اسے بھی اٹھا کر دریائے سندھ میں پھینک دیا۔

لداخ کی مقامی تاریخ لداقس رگیال رابس (کرانیکلز آف لداخ) میں علی شیر خان انچن کے حملہ لداخ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> ''جمیا نگ نمکیل نے......حکومت کی۔ اس راجہ کے دور میں پوریگ کے دو راجاؤں نے اتفاق نہیں کیا۔ راجہ لداخ ان میں سے ایک سیرینگ ملک کی مدد کے لئے آیا......ناگ گونگ (سکردو) کے راجہ علی میر کی فوج نے حملہ کیا۔ ان کا آمنا سامنا ہوا۔ علی میر جنگی چال کے طور پر کامیابی سے لڑائی ٹالتا رہا یہاں تک کہ تمام درے اور وادیاں برف پڑ کر بند ہو گئے۔ تب راجہ نے جس طرف بھی رخ کیا اسے ہر طرف سے شکست کا سامنا ہوا۔ بلتیوں نے سارے لداخ پر قبضہ کیا جنہوں نے تمام مذہبی کتابوں کو آگ لگا کر جلا ڈالا۔ بعض کو پانی میں پھینک دیا۔ سارے عبادت خانوں کو تباہ کر ڈالا جس کے بعد واپس اپنے ملک کو لوٹے......''

قاضی نوراللہ شوستری اکبر بادشاہ کے دور میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تھے۔ جہانگیر نے بھی کچھ عرصہ اسی عہدے پر انہیں بحال رکھا۔ بعد میں 1019ھ (1610ء) میں قتل کئے گئے۔ قاضی صاحب علی شیر خان انچن کے ہم عصر تھے۔ وہ اپنی تصنیف 'مجالس المؤمنین، میں لکھتے ہیں:

''تبت دو ملکوں کا نام ہے۔ ایک کو تبت کبیر کہتے ہیں۔ اس کے باشندے سب کے سب کافر ہیں۔ اور دوسرے کو تبت صغیر کہتے ہیں۔ 1000ھ میں میر علی رائے نے جو اس وقت بھی تبت کے حکمران ہیں، اللہ کی توفیق سے تبت کبیر کو تسخیر کر کے کفر کے سرداروں کو قتل کر دیا اور اس علاقے کے بت خانوں کو تباہ کر کے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا۔ تبت صغیر کے باشندے تب سے مسلمان چلے آرہے ہیں جب میر شمس الدین عراقی وہاں پہنچے تھے۔ اور حکمران، سپاہی اور رعایا سبھی سچے شیعہ امامیہ ہیں...... اور ہندوستان کے عظیم الشان بادشاہ کے پہلو میں واقع ہونے کے باوجود اپنے ہاں ایران کے صفوی موسوی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں......''

غرض علی شیر خان انچن نے 1000ھ میں لداخ کو فتح کیا۔ لداخ کے راجہ جمیا نگ نمگیل اور اس کے فوجیوں کو قید کر کے سکردو لایا۔ سالنگ کھرچلو کے راجہ یبگو شیر غازی کی کوششوں سے جمیا نگ نمگیل کی رہائی کی صورت نکل آئی۔ شیر غازی لداخ کے ساتھ اپنے رابطے کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ لداخ پر سالانہ باج وخراج کی ادائیگی کا عہد و پیمان ہوا۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے گونپہ لامہ یورو کا ایک لامہ مقرر ہوا۔ نالہ گراگر الداخ اور سکردو کے درمیان اندرونی سرحد مقرر ہوا۔ جمیا نگ نمگیل کی بیٹی کو علی شیر خان انچن نے اپنے عقد میں لایا۔ سکردو میں قیام کے دوران کھرچلو کے راجہ یبگو شیر غازی نے اپنی بیٹی ارگیال خاتون کی شادی جمیا نگ نمگیل کے ساتھ اس شرط پر کر دی کہ ارگیال خاتون کی اولاد وارث سلطنت ہوگی۔ اس انتظام کے بعد شیر غازی کی سفارش پر جمیا نگ نمگیل اور اس کی فوج کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ لامہ یورو کے ریکارڈ کے مطابق ڈوگرہ فتح لداخ تک لداخ کی طرف سے سکردو دربار کو سالانہ لوب چھت ادا ہوتا رہا۔

معلوم ہوتا ہے کہ لداخ کی فتح کے ساتھ ہی علی شیر خان انچن کے تعلقات مغل دربار کے ساتھ خراب ہو گئے تھے۔ مغل دربار کے مورخین شیخ ابوالفضل اور ملاّ عبدالقادر بدایونی دونوں کا بیان ہے کہ 1012ھ (1603ء) میں علی شیر خان انچن نے کشمیر کے سرحدی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ اس واقعہ کو ذکاء اللہ نے یوں بیان کیا ہے:

''جب تبت بزرگ پر علی رائے کو فتح ہوئی اور بہت دولت ہاتھ لگی تو اس کا دماغ آشفتہ ہوا اور 1012ھ میں اس نے حوالی کشمیر میں فساد مچایا۔ بادشاہ نے قلیج خان صوبہ دار لاہور کو حکم دیا کہ ایک جماعت شائستہ محمد قلی حاکم کشمیر کی کمک کے لئے بھیجے کہ اس پشہ بدمست کو کہ خودسری کے خمکدہ میں طن طن کر رہا ہے مسل ڈالے۔ قلیج خان نے تین ہزار سوار اور پانچ سو برق انداز بسرکردگی سیف اللہ خان محمد قلی کی یاوری کے لئے مقرر کئے۔ سیف اللہ خان اس کا بیٹا تھا۔ علی رائے بغیر لڑے بھاگ گیا۔ بادشاہی لشکر جہاں تک گھوڑے جا سکتے تھے جا کر الٹا واپس چلا آیا۔''

ذکاء اللہ نے حوالی کشمیر میں علی شیر خان انچن کے حملے کو لداخ کی فتح اور مال غنیمت کے ہاتھ لگنے سے مربوط کر دیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ کیونکہ لداخ 1000ھ میں فتح ہوا تھا اور کشمیر کے سرحدی علاقوں میں فساد کا واقعہ اس کے بارہ سال بعد 1012ھ کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی دوران کشمیر کے چک باغی حبیب چک اور احمد چک بمعہ اہل وعیال سکردو میں علی شیر خان انچن کی پناہ میں آئے تھے جو اس کے ہم مسلک تھے۔ اسی وجہ سے مغل دربار سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ کشمیر کے مغل صوبہ دار محمد قلی خان (1590ء تا 1601ء) نے فوج کشی کرنے کی کوشش کی لیکن علی شیر خان انچن نے اسے شکست دے کر بے بس کر دیا تو بادشاہ نے لاہور کے صوبہ دار کو اس کے پاس کمک بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ کمک پہنچنے کے باوجود مغل فوج بلتستان کی سرحد کے اندر دخل نہ ہو سکی حالانکہ سکردو تک گھوڑوں کے لئے راستہ ازمنہ قدیم سے موجود تھا۔

مغل بادشاہ اکبر اعظم کے دربار کے مورخ ابوالفضل نے بھی علی شیر خان انچن کے حملہ

لداخ کا ذکر کیا ہے جسے ذکاء اللہ نے بھی اپنی تاریخ ہندوستان میں نقل کیا ہے۔اس کے مطابق لداخ کے وزیر اور سپہ سالار راجورائے کے راجہ سے اختلافات تھے۔اس کی بدگوہری کی وجہ سے علی رائے نے لداخ کے راجہ کو پکڑ کر اس کے قلعہ پر چڑھ گیا اور بہت خزانہ جمع کیا۔ بہت سے مقامات پر قبضہ کیا۔ جب بادشاہ کے لشکر کا آوازہ سنا تو سابق حکمران خاندان کے ایک شخص کو یہاں حاکم مقرر کر کے خود چلا گیا۔

1006ھ (1597ء) میں شہنشاہ اکبر تیسری اور آخری بار کشمیر آیا۔ بادشاہ کا ارادہ تھا کہ تبت کی فتح کے لئے لشکر روانہ کرے لیکن ملک میں قحط سالی تھی اور چالیس روز کا آذوقہ بہم پہنچانا دشوار تھا۔اس لئے بادشاہ کا ارادہ ہوا کہ ایک سفارت بھیج کر اطاعت پر آمادہ کرے۔ چنانچہ امید علی ہولک، طالب اصفہانی اور محمد علی کشمیری کو خطاب، گھوڑے اور خلعت کے ساتھ علی شیر خان انچن کی طرف بھیجا۔انہیں یہ بھی حکم تھا کہ علی شیر خان انچن کو یہ پیش کرنے کے بعد اس ملک کے حالات، راہ وروش، جمعیت مردم، کیفیت خزانہ اور سامان سے واقفیت حاصل کریں۔

چنانچہ سکردو میں قیام کے دوران ملا طالب اصفہانی نے بلتستان پر ایک جامع مقالہ تیار کر کے مغل حکومت کو پیش کیا جس میں یہاں کے طور طریقے، رسم ورواج، مذہبی صورت حال، آبادی، اقتصادی حالت، سلطنت کی دولت اور فوجی طاقت کے بارے میں جائزہ اور یہاں کے دیگر عجائبات کے بارے میں تفصیل موجود تھی۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اسی سے مواد لیا تھا۔ یہ رسالہ اس وقت مفقود الخبر ہے۔ کہتے ہیں کہ حاجی مرزا بیگ کابلی نے بھی بلتستان کے بارے میں ایک ایسا ہی رسالہ لکھا تھا۔

شہنشاہ اکبر کی خواہش تھی کہ تبت خورد کو فتح کر کے علی شیر خان انچن کو مطیع کرے لیکن اس خواہش کی تکمیل سے پہلے وہ وفات پا گیا۔ یہ کشیدگی جہانگیر کے دور (27-1605ء) میں بھی جاری رہی۔ کشمیر کی تاریخ ''بہارستان شاہی،، کے مؤلف کا کہنا ہے کہ حاکم تبت علی شیر خان انچن نے جہانگیر کے عہد حکومت میں کشمیر کے باغیوں حسین چک، ظفر خان اور ان کے ساتھیوں کی مدد کے سلسلے میں پرگنہ لار میں مغل فوج پر حملہ کر دیا اور دو ماہ تک ان کے ساتھ برسر پیکار رہا۔اسی دوران

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ کشمیری باغی نہ صرف آپس میں شدید اختلافات کے شکار ہیں بلکہ غیر معمولی کاہلی کے عادی بھی ہیں اس نے اپنا ارادہ بدلا اور اپنی فوج کو ادھر سے نکال لایا۔

جہانگیر نے 1609ء تا 1612ء (21-1018ھ) کے دوران کشمیر کے صوبہ دار ہاشم خان ولد قاسم خان میر بحر کو تبت کی تسخیر پر مامور کیا۔ چنانچہ ہاشم خان نے سواروں اور پیادوں پر مشتمل ایک بڑا لشکر ترتیب دے کر بلتستان پر حملہ کر دیا۔ علی شیر خان انچن نے اسے بلتستان کی سرحد پر ہی روک دیا اور اپنے ملک کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہ دی۔ ہاشم خان نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے اور بڑی جدو جہد کی کہ بلتستان میں داخل ہو جائے۔ مگر شکست کھائی اور بہت جانی نقصان اٹھا کر واپس ہوا۔ 1615ء (1024ھ) میں جہانگیر نے احمد بیگ خان کابلی سے یہ عہد لے کر اسے کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا تھا کہ دو سال کے اندر ولایت تبت (بلتستان) اور کشتوار کو فتح کرے گا۔ تین سال گذر گئے مگر وہ تبت خورد کو فتح نہ کر سکا۔ چنانچہ اسے ہٹا کر 1618ء (1027ھ) میں دلاور خان کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔ دلاور خان نے خط تعہد لکھ دیا کہ وہ دو سال کے عرصے میں تبت خورد کو فتح کرے گا۔ لیکن وہ بھی یہ عہد پورا نہ کر سکا۔ لہذا اسے ہٹا کر جہانگیر نے 1620ء (1026ھ) میں ارادت خان کو صوبہ دار کشمیر کے عہدے پر مقرر کر دیا۔

علی شیر خان انچن کے دور کے بارے میں محمد قاسم فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مذہب میں یہاں اتنا غلو ہے کہ اگر کوئی بیگانہ وہاں شہر میں داخل ہو جائے تو اسے تب وہاں رہنے دیتے ہیں جب وہ آنحضرتؐ اور ان کی آل کے دشمنوں سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔

اسی اثناء میں گلگت، چلاس اور استور کے لوگوں نے روندو، شنگھو شگر اور دراس پر اپنے متواتر حملوں کی وجہ سے علی شیر خان انچن کو اشتعال دلایا اور وہ ان کی سرکوبی کے لئے اس طرف متوجہ ہو گیا۔ استور، چلاس اور گلگت کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد اس نے چترال پر دھاوا بول دیا۔ کہتے ہیں کہ علی شیر خان انچن نے روندو کے راستے گلگت پر حملہ کر دیا تھا۔ چونکہ روندو کا راستہ بہت دشوار تھا اس لئے فوج کے ایک دستے کو خصوصی طور پر راستے کی مرمت اور کھونٹیوں، رسیوں اور بلیوں کے ذریعے دشوار مقامات کو قابل گزر بنانے کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔ چترال کی فتح

کے ساتھ ہی علی شیر خان انچن کی سلطنت کی وسعت مغرب میں کافرستان تک پہنچ گئی۔ فتح کے نشان کے طور پر اس نے چترال میں ایک چنار کے درخت میں چکی کا پاٹ پرو دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت 1915ء تک موجود تھا اور وہ پاٹ اس درخت کی موٹائی کے اندر آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نیو (NEVE) نے فرینکی (FRANKE) کو بتایا کہ اسے چترال کے لوگوں نے چترال میں چنار کا ایک درخت دکھایا جسے وہاں کی مقامی روایت کے مطابق ایک بلتی بادشاہ نے نصب کیا تھا۔ روایت مشہور ہے کہ چترال تک کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد علی شیر خان انچن نے مفتوحہ علاقوں کے حکمرانوں کے لئے گلگت میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں مہمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے سکردو میں پکوا کر گرم گرم کھانا گلگت میں مہمانوں کو کھلایا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ چترال کی فتح کی یادگار کے طور پر چھوغو پریسول نامی ناچ کی دھن (ہرسیکار) تیار کی گئی تھی۔ مقپون شہزادوں کے ناچنے کے مواقع پر یہ دھن بجائی جاتی تھی۔ جن کے احترام میں بجانے والے کھڑے ہو کر بجاتے تھے۔ کھڑے ہو کر بجانے کی رسم آج بھی قائم ہے اگرچہ کوئی شہزادہ آج کل نہیں ناچتا۔

گلگت کے علاقوں میں ان جنگی مہموں کے دوران علی شیر خان انچن نے دریائے سندھ اور دریائے گلگت کے سنگم کے قریب دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ایک پولو گراؤنڈ تعمیر کی۔ یہ جگہ آج بھی مقپونی شغرن یعنی مقپون کی پولو گراؤنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ علی شیر خان انچن ان حملوں میں تین سال تک مصروف رہا۔ سارے علاقوں کی تسخیر کے بعد علاقہ ہراموش کو مستقل طور پر روندو میں شامل کر لیا۔ باقی سارے علاقوں میں مقامی راجاؤں کو مطیع بنا کر اس وقت کے دستور کے مطابق اپنی حکومتوں پر قائم رکھا اور سکردو واپس چلا آیا۔ واپسی کے وقت علی شیر خان انچن نے بروشال، گلگت، چلاس اور استور کے علاقوں سے اسیران جنگ کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لایا اور انہیں سکردو اور کھرمنگ کے نالہ جات میں مختلف مقامات پر آباد کیا۔

علی شیر خان انچن اب یہاں پر ایک مضبوط سلطنت قائم کر چکا تھا جس کی سرحدیں شمال میں مستغ قراقرم، جنوب میں درۂ زوجی لہ، مشرق میں پورانگ اور مغرب میں چترال تک پھیلی

ہوئی تھیں اور اس کی شہرت ہندوستان اور ایران کے ایوانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ تاریخ ایران میں اس بات کا نہایت فخر کے ساتھ ذکر ہے کہ ایران کے شاہ عباس صفوی کے دربار میں فرنگستان، روس، کاشغر، تبت (بلتستان) اور ہندوستان کے ایلچی آتے اور دوستی کا اظہار کرتے تھے۔

مقامی روایات کے مطابق علی شیر خان انچن نے گل خاتون نامی ایک مغل شہزادی سے شادی کی تھی۔ اس شہزادی کے ساتھ ہندوستان سے خدمتگاروں کا جو ٹولہ بھیجا گیا تھا اُس کا سردار ٹھاکر ولی ڈوگر راجپوت تھا جسے علی شیر خان انچن نے اپنے وزیروں میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا خاندان آج ''ولی پا،، کے نام سے مقپون بادشاہوں کے بارہ وزیر خاندانوں میں گنا جاتا ہے۔ سلطنت سے باہر سے آنے والے اور سلطنت کے اندر دیگر وادیوں سے آنے والے شاہی مہمانوں کی مہمانداری کی ڈیوٹی اسی ولی پا خاندان کے سپرد تھی۔ ماتحت راجاؤں کے ٹھہرنے کے لئے انچن نے غوتی بلچنگرا اور گنگوپی نہر کے درمیان میں کئی چھوٹے محلات تعمیر کئے تھے۔ وزیروں کی تعداد بھی انچن ہی نے بارہ معین کی تھی۔

انچن کی رانی گل خاتون نے اپنے شوہر کی جنگی مہموں کے دوران اس کی غیر حاضری میں کھرپوچھے قلعہ سے باہر اسی پہاڑی کے دامن میں ایک پانچ منزلہ خوبصورت محل تعمیر کیا جو اسی ملکہ کے نام پر میندوق کھر مشہور ہوگیا۔ گل خاتون کا ترجمہ بلتی زبان میں میندوق رگیالمو ہے۔ اس محل کے سامنے ملکہ نے ایک بہت بڑا اور خوبصورت باغ بنایا جس کا اس کی ہیئت کی مناسبت سے ہلال باغ نام رکھا گیا۔ کیونکہ یہ باغ کھرپوچھے قلعہ سے ہلال کی شکل کا نظر آتا تھا۔ میندوق کھر اور ہلال باغ اونچائی پر واقع تھے۔ اس لئے ان کے اندر پانی پہنچانے کے لئے گل خاتون نے ہرگیسہ نالہ سے ایک عالیشان نہر تعمیر کی۔ اس نہر کی تعمیر کا کام ہندوستان کے گنگو خاندان کے ایک انجینئر کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ اس لئے یہ نہر آج تک گنگوپی نہر کے نام سے مشہور ہے۔ میندوق کھر کے سامنے ہلال باغ میں ایک بڑے تالاب کے بیچ میں ایک خوبصورت بارہ دری تعمیر کی اس کے علاوہ فوارے نصب کئے گئے۔ بارہ دری کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ اسی دوران رانی گل خاتون نے کھرپوچھے قلعہ تک کا راستہ بھی تعمیر کیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ سارے تعمیراتی کام سترھویں صدی

کے پہلے عشرے کے دوران مکمل ہوئے ہیں۔علی شیر خان انچن جب جنگی مہمات سے فارغ ہو کر سکردو واپس پہنچا تو میندوق کھر، گنگوپی نہر اور ہلال باغ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن قلعہ تک کا راستہ دیکھ کر برہم ہوا۔ چنانچہ راجہ نے کہا کہ محل، نہر اور باغ بنا کر رانی انعام کی مستحق ہوئی ہے لیکن قلعہ تک کا راستہ بنا کر اس کے استحکام میں خلل ڈالا ہے جس کی وجہ سے ملکہ سزا کی بھی مستحق ہوئی ہے۔لہٰذا اسے انعام ملے گا اور نہ سزا۔

تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان نے ان تعمیراتی کاموں کو انچن کی لداخی رانی یعنی جمیا نگ نمگیل کی بیٹی سے منسوب کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ علی شیر خان انچن نے بہت جلد اسے طلاق دیدی تھی اور اسے واپس لداخ بھیج دیا تھا۔اس رانی نے اپنے اس المیے پر ایک مرثیہ پڑھا تھا جو بلتی لوک ادب میں ''ہلال باغ،، کے نام سے لوک گیت کی صورت میں موجود ہے۔اس گیت میں رانی دہائی دیتے ہوئے کہتی ہے کہ

''رانی کو جب سکردو لایا جا رہا تھا تو بڑی شان وشوکت اور اعزاز کے ساتھ لایا گیا تھا۔اس کے اعزاز میں سینکڑوں سوار اور پیادے ساتھ تھے اور بھاری مقدار میں جواہرات نچھاور کئے جا رہے تھے۔مگر اب جبکہ رانی کو واپس بھیجا جا رہا ہے تو اس کے ساتھ کوئی سوار ہے اور نہ کوئی پیادہ۔اس سلوک کے باوجود اے علی شیر خان انچن میں تجھ پر قربان ہو جاؤں۔تم اب بھی مجھے برق مقپون کے ہلال باغ میں ایک سرخ گلاب کی طرح خوبصورت اور ہلُو کے پھول کی طرح پیارے لگتے ہو۔،،

مزید برآں یہ کہ لداخ کی شہزادیوں میں محلات کی تعمیر اور باغات اور نہریں تعمیر کرنے کا رجحان موجود ہونے کی مثال اس سے قبل موجود نہیں۔خصوصاً ہندوستان سے انجینئر اور دیگر کاریگر لا کرا تنے اعلیٰ پیمانے پر تعمیرات کرانا لداخی شہزادی کی حیثیت اور اہلیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ دوسری طرف مغل خاندان کی خواتین میں گل خاتون نام کی خواتین نظر آتی ہیں۔

فتوحات سے فارغ ہونے کے بعد علی شیر خان انچن دفاع کو مستحکم بنانے کی طرف متوجہ

ہوا۔ کھر پوچھے قلعہ میں توسیع کی اور قلعہ کے بیچ میں ایک سات منزلہ محل تعمیر کیا۔ محل کے دالان میں پہاڑ کو کھود کر پانی ذخیرہ کرنے کے لئے ایک حوض بھی بنایا۔ محل کے ایک طرف خوراک کو ذخیرہ کرنے کے لئے پہاڑ کو کاٹ کر ایک خصوصی جگہ بنائی جہاں کئی سالوں کے لئے کافی اناج ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ سونے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے لئے پہاڑ کو کاٹ کر ایک الماری بنائی جس کا آہنی دروازہ بادشاہ کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ بارود خانہ اور اسلحہ خانہ الگ سے تعمیر کیا۔ محل کے پہلو میں ایک مسجد تھی اس کے پہلو میں ایک قید خانہ بھی تعمیر کیا۔ قلعہ کی جنوب مغربی ڈھلان میں ملازمین اور کارکنوں کے لئے کمرے تعمیر کئے۔ کھر پوچھے قلعہ تک کے راستے میں ایک بڑے دروازے کے علاوہ مختلف مقامات پر چوکیاں اور لکڑی کے منارے تعمیر کئے جہاں ہر وقت پہرہ دار متعین رہتے تھے۔ قلعہ سے کچھ اوپر پہاڑ کی ایک چوٹی پر اور قلعہ سے نیچے کی طرف بھی پہاڑی پر نگرانی کے لئے چوکیاں تعمیر کیں۔ ادھر بھی پہرہ دار متعین رہتے تھے۔ روحانی طور پر قلعے کی حفاظت کی خاطر تعویذ کے طور پر قلعہ سے چوٹی کی طرف کچھ اوپر ایک سید کی تدفین عمل میں لا کر اس کا مقبرہ بھی بنایا۔ قلعہ سے شمال کی طرف نیچے پانی کے چشمے تک کے راستے کو زیر زمین تعمیر کیا۔ بڑا گیٹ سنگے ستاغو یعنی شیر والا دروازہ کہلاتا تھا۔ یہ بارہ دری کے مشرق میں تھوڑا سا اوپر کی جانب واقع تھا۔ یہاں سے دونوں اطراف میں پہاڑ تک مضبوط دوہری دیواریں تعمیر کیں۔ کھر پوچھے پہاڑی کے شمال مغربی کنارے پر کچینہ کھر کے نام سے ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا جس کے ارد گرد مضبوط دیواریں اور کناروں پر چوکور مینارے تعمیر کئے۔ اگرچہ کھر پوچھے قلعہ کی تعمیر کا آغاز مقپون بوخا نے کیا تھا جس میں بعد کے راجاؤں نے اضافے کئے تھے لیکن علی شیر خان انچن نے اس میں اتنی کثرت سے تعمیرات کیں کہ کھر پوچھے کی تعمیر ہی اسی سے منسوب ہوگئی۔

سکردو کو مشرق اور شمال کی طرف سے دریائے سندھ نے اور باقی دو اطراف سے کوہ ہمالیہ نے گھیرا ہوا ہے۔ علی شیر خان انچن نے تھورگو سے لے کر بشوتک کے پہاڑی سلسلے میں دروں اور قابل گزر مقامات پر فصیل تعمیر کر کے دشمن کے حملے سے محفوظ کر دیا۔ فصیل میں مختلف اطراف میں چار مقامات پر تھورگو دروازہ، سدپار دروازہ، برگے دروازہ اور پشاوری دروازہ کے نام سے چار

دروازے نصب کر کے ادھر پہرے بٹھا دیئے۔ فصیل کے ٹکڑے اس وقت بھی مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ تھور گو دروازہ 1905ء تک موجود تھا۔ اس دروازے کے مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر حسین آباد (کھفچو نگ) گاؤں کے مشرقی کنارے پر ایک چوکی تعمیر کر کے ادھر پہرہ دار متعین کر دیا۔ اسی گاؤں کے جنوب میں پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک چھوٹا سا دیدبانی قلعہ کھر چونگ کے نام سے پہلے سے موجود تھا۔ علی شیر خان انچن نے سکردو کے اطراف میں تمام اہم مقامات پر برج اور چوکیاں قائم کر کے لائٹ سگنل کا ایک مربوط نظام قائم کیا۔ کسی بھی طرف سے دشمن کے حملے کی صورت میں متعلقہ برج پر آگ روشن کی جاتی۔ اسے دیکھتے ہی دوسری تمام چوکیوں پر آگ جلائی جاتی جس سے ایک طرف کھر پوچھے قلعہ میں اور دوسری طرف تمام لوگوں کو خطرے سے آگاہی ہو جاتی۔ قلعہ سے حریب بجا کر بھی لوگوں کو مطلوبہ پیغام دیا جاتا تھا۔ سکردو کے علاوہ اس نے اپنی سلطنت کے مجموعی دفاع کے استحکام کے پیش نظر تمام علاقوں میں قلعے تعمیر کیے۔ کرتخشہ میں جابجا قلعے تعمیر کیے۔ اسی وجہ سے اس وادی کا نام کھر منگ یعنی بہت قلعوں والا پڑ گیا۔ اس سے پہلے اسے کرتخشہ، کراتغ یا کتک چند کہتے تھے۔

سکردو میں بنجر زمینوں کی کمی نہ تھی لیکن آب پاشی کے لئے پانی کی کمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ علی شیر خان انچن نے نالہ سدپار پر واقع جھیل کے دہانے پر بند تعمیر کرنے کا اہتمام کیا تاکہ سردیوں کے دوران جھیل میں پانی ذخیرہ ہوتا رہے اور بہار کے زمانے میں برفانی پانی پہنچنے سے قبل پانی کی تنگی کے دوران اسے آب پاشی کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ چنانچہ مٹی، بجری وغیرہ کو یکجان کر کے بند تعمیر کیا گیا۔ پانی کو کنٹرول کرنے کے لئے بیچ میں اس نے پتھر کا ایک بہت مضبوط پشتہ تعمیر کرایا۔ کہتے ہیں کہ اس پشتے کی تعمیر میں انڈے کی زردی کو چونے کے ساتھ ملا کر گارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس پشتے میں اوپر نیچے دہانوں کے دو سلسلے بنائے گئے ہیں تاکہ پانی کو بقدر ضرورت چھوڑا جاسکے۔ ہر سطح پر چھ دہانے تھے اور ہر دہانہ پانچ فٹ لمبا اور دو فٹ نو انچ چوڑا تھا۔ دہانوں میں ہموار کٹی ہوئی دائرہ نما گہری جھریاں بنی ہوئی تھیں۔ اور ان دہانوں کے لئے اسی سائز کی پتھر کی انتہائی مہارت سے بنی ہوئی سلیں موجود تھیں جو دہانوں کی جھریوں میں ڈھکنے کی طرح

فٹ آتی تھیں۔ یہ بند چودہ فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ بعد میں 1761ء میں خانہ جنگی کے نتیجے میں یہ بند تباہ ہو گیا۔ پتھر کی سلیں 1904ء تک پشتے کے سامنے نیچے پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور دروازوں کی نچلی قطار کا آدھ حصہ بھی زمین میں دفن ہو چکا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سدپارہ کا بند ابتداء میں آخری بدھسٹ راجہ نے تعمیر کیا تھا اور اس بیراج کے پشتے پر بدھ کے چھوٹے چھوٹے مجسمے نصب تھے جنہیں بعد میں ڈوگرہ فوجی اٹھا کر لے گئے۔

ایک نہر ہرگیسہ نالہ سے حوطوتک تعمیر کی گئی تھی جس سے سارے علاقے کو سیراب کیا جاتا تھا۔ اس نہر میں کشتی کے ذریعے شاہی خاندان کی بیگمات اور شہزادیاں سیر کے لئے جایا کرتی تھیں۔ بلتستان میں 'بیامہ نقپو' کے نام سے ایک لوک گیت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی شیر خان انچن کے دور میں بیامہ نقپو نامی موجودہ ریگستان بھی آباد تھا۔ گیت کے تین مصرعوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

1۔ بیامہ نقپو کا ریگستان جب فیروزہ کی طرح سرسبز تھا اس وقت علی شیر خان نے لیہ اور پوریگ کے علاقے فتح کئے۔

2۔ جب بیامہ نقپو میں دستہ چھومیک کے چشمے ابل رہے تھے اس وقت علی شیر خان انچن نے چترال کو فتح کیا۔

3۔ جب مادر وطن سکردو دودھ کے حوض کی طرح تھا اس وقت علی شیر خان انچن نے سارے عالم کو تسخیر کر لیا۔

علی شیر خان انچن نے بہت سے باغات بھی لگوائے۔ کھرپوچھے قلعہ کے شمال کی طرف نانگمہ سر کے نام سے بہت بڑا باغ لگایا اور اس میں ایک محل تعمیر کیا۔ یہ باغ ننگ سوق تک پھیلا ہوا تھا۔ ننگ سوق کے مقام پر بھی دریا کے کنارے ایک عالی شان محل تعمیر کیا تھا۔ اس باغ میں آڑو، خوبانی اور دیگر اقسام کے میوہ دار درخت لگائے تھے۔ ننگ سوق کی طرف کے راستے کے دونوں اطراف میں درخت لگا کر اس کے حسن کو دوبالا کیا تھا۔ کھرپوچھے قلعہ کے جنوب مشرق میں ہلال باغ کے نیچے رگیہ سریعنی باغ کلان تعمیر کیا اور ہلال باغ کے مغرب میں گنگوپی نہر کے پار غورو سریعنی

پتھروں والا باغ تعمیر کیا جس میں ہر قسم کے میوہ دار درخت اور پھول لگائے گئے تھے۔اس کے علاوہ موجودہ کرفو پی ٹوق کے اطراف میں چہار باغ کے نام سے ایک نہایت ہی عالیشان باغ تعمیر کیا۔ان باغات میں جگہ جگہ حوض، آبشار اور فوارے لگے ہوئے تھے۔پانی کے لئے مٹی کے چار انچ موٹے پائپ اور سنگ خارا کے ٹی وغیرہ استعمال کئے گئے تھے۔پائپ کے ٹکڑے اور پتھر کے ٹی ان باغات میں اس وقت بھی کئی مقامات پر صحیح وسالم حالت میں موجود ہیں۔ہلال باغ میں سنگ مرمر کے فوارے کا ایک ٹکڑا 1847ء تک مقپون خاندان کے ماضی کی شان وعظمت کے دیگر آثار کے ساتھ موجود تھا جسے ڈاکٹر تھامسن (THOMSON) نے خود دیکھا تھا جس نے اس سال کی سردیاں یہاں گزاری تھیں۔لیکن 1904ء میں دوسری سیاح مس ڈنکن سکردو پہنچی تو یہ چیزیں غائب تھیں۔ہلال باغ سے متصل قلعہ کے دامن میں انچن نے ایک ابھرا ہوا چبوترہ بنا کر اس میں چنار کے درخت نصب کئے۔یہ جگہ شاہی قبرستان کے طور پر استعمال ہوئی۔پولو گراؤنڈ کے اوپر غوڑی ہلچنگرا کے نام سے ایک چبوترہ تعمیر کیا جس پر بیٹھ کر خواتین نیچے گراؤنڈ میں پولو اور دوسرے تماشا دیکھتی تھیں۔کہتے ہیں کہ انچن نے سنگ تراش اور کوزہ گری کے ماہرین کو لا کر ان صنعتوں کو ترقی دی تھی۔مہدی آباد (پرکوتہ) کوزہ گری اور مٹی کے پائپ بنانے کا مرکز تھا۔

کہتے ہیں کہ اس عظیم حکمران کے دور میں شاعری، فن تعمیر، آداب اور دیگر علوم وفنون کو بھی خوب فروغ ملا۔علی شیر خان انچن فتوحات، ملکی انتظام اور تعمیر وترقی کے لحاظ سے بلتستان کا سب سے بڑا اور صاحب اقتدار بادشاہ تھا جس پر نہ صرف خاندان سکردو بلکہ پورا شمالی خطہ واقعی طور پر فخر کر سکتا ہے اور انچن یعنی اعظم کا جو لقب اسے دیا گیا ہے وہ بلاشک وشبہ اس کا مستحق تھا۔

احمد خان

1625ء تا 1627ء

علی شیر خان انچن کی تاریخ وفات کے بارے میں حتمی معلومات دستیاب نہیں۔تاہم اس کے ایک ہم عصر جہانگیر کے درباری مورخ معتمد خان نے اپنی تصنیف اقبال نامہ جہانگیری میں

جہانگیر کی حکومت کے اٹھارہویں سال (1032ھ) کے دوران کے واقعات میں لکھا ہے۔ ''علی محمد پسر علی رائے حاکم تبت باپ کی رہبری سے دربار میں آ کر فیض یاب ہوا۔،، اس سے واضح ہوتا ہے کہ علی شیر خان انچن 1623ء (1032ھ) کے دوران بقید حیات تھا۔ اس سال جہانگیر تیسری مرتبہ کشمیر آیا تھا۔ علی شیر خان انچن نے اپنے بیٹے کو بطور ایلچی یا نائب بادشاہ کے پاس بھیجا تھا۔ دوسری طرف لداخ کی مقامی تاریخ لداقس رگیال راپس میں لداخ کے راجہ سنگے نمگیل کے دور میں یہ واقعہ مذکور ہے: ''اس کے بعد بلتی کے حکمران احمد خان نے جہانگیر شاہ کی امداد سے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ لداخ پر حملہ کیا۔ لیکن سنگے نمگیل نے اپنی فوجیں جمع کر کے ان کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کو شکست دی گئی اور کھربو پر بہت لوگ قتل ہو گئے....،، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے مرنے سے پہلے علی شیر خان انچن فوت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا بڑا بیٹا احمد خان سکردو کا راجہ بن گیا تھا۔ جہانگیر 1627ء (1036ھ) میں فوت ہوا تھا۔ اس طرح ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ علی شیر خان انچن کا 1625ء کے لگ بھگ انتقال ہو گیا تھا۔ کم از کم یہ بات یقینی ہے کہ اس کی موت 1624ء اور 1626 کے درمیان میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی قبر ڈوگرہ چھاؤنی کے شمال مغربی کونے کے شمال میں تقریباً پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ جس کے اوپر ایک مستطیل کمرہ بنا ہوا تھا جو 1913ء تک موجود تھا۔ بعد میں بوجوہ یہ کمرہ منہدم ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ معمہ بنا ہوا تھا کہ علی شیر خان انچن کہاں دفن ہے۔ دسمبر 2013ء میں اٹلی کے فلپو ڈی فلپی کی کتاب The Itatian Expedition 1913-14 راقم الحروف کے ہاتھ آئی جس میں انچن کے مقبرے کی تصویر اور تفصیل موجود ہے۔ انچن کے ساتھ اُس کے پانچ جانشین بھی اسی کمرے میں دفن ہیں۔

علی شیر خان انچن کے چار بیٹے تھے۔ احمد خان، عبدال خان، آدم خان اور علی محمد خان۔ بڑا بیٹا احمد خان ولی عہد تھا جو باپ کی وفات پر 1625ء کے قریب تخت نشین ہو گیا۔ احمد خان کے بعد عبدال خان اور اس سے چھوٹا آدم خان تھا۔ شاہ جہاں کے درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے اپنی تصنیف بادشاہ نامہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ عبدال خان عمر میں آدم خان سے بڑا تھا۔ ذکاء اللہ نے بھی اپنی تاریخ ہندوستان میں عبدال خان کو آدم خان کا بڑا بھائی بتایا ہے۔ علی

محمد خان بھی ان کا بھائی تھا جس کا معتمد خان نے ذکر کیا ہے۔لیکن اس کا نام حشمت اللہ خان کے دیئے ہوئے مقپون شجرہ نامے میں درج نہیں۔اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جوانی میں لاولد فوت ہوا تھا۔ اس کی تائیداس بات سے بھی ہوتی ہے کہ گلگت کے راجہ مرزا خان کی بیٹی جواہر خاتون جوانی میں بیوہ ہوکر سکردو میں کھر پوچھے میں رہ رہی تھی۔ بعد میں آدم خان کی اجازت سے اسے گلگت لے جا کرنگر کے شہزادہ فردوس خان کے ساتھ اس کا عقد ثانی کیا گیا جس سے حبیب خان پیدا ہوا۔ یہ علی محمد خان کی بیوہ تھی۔احمد خان کی رانی گلگت کے راجہ علی شیر خان کی بیٹی اور جواہر خاتون کی بھتیجی تھی جس نے ساری زندگی کھر پوچھے میں ہی بیوگی کی حالت میں گزاردی۔

تاریخ جموں میں حشمت اللہ خان نے آدم خان کو سب سے بڑا اور احمد خان کو سب سے چھوٹا بھائی بنادیا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔احمد خان بڑا بھائی تھا اور باپ کی وفات پر تخت نشین ہوا تھا۔ کننگھم اور فرینکی کی تحقیق ہے کہ علی شیر خان انچن نے لداخ کو فتح کیا اور اس کے بعد احمد خان اس کا جانشین ہوا۔ کننگھم رقمطراز ہے:

> ''علی شیر خان جو بوخا کے بعد چوتھی پشت میں آتا ہے، نے لداخ اور چیلو کو فتح کیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے احمد خان کو یہ علاقے وراثت میں ملے جو آخری عظیم مقپون حکمران تھا۔''

بڈلف بھی احمد خان کا بلتستان کے بادشاہ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ بلتستان کے آخری تاجدار راجہ احمد شاہ نے انگریز سیاح جی ٹی وین کو بتایا کہ علی شیر خان انچن کے بعد احمد خان راجہ بنا۔ اس کی وفات پر عبدال خان اور آدم خان تخت نشینی کے لئے لڑ پڑے۔جی ٹی وین لکھتا ہے:

> ''لیکن ان کی کہانی کی مستند ترین روایت جو احمد شاہ نے مجھے سنائی وہ علی شیر خان سے شروع ہو جاتی ہے جس نے سد پرندی سے پتھر کی وہ عظیم نہر تعمیر کی جس کے ذریعے کارآمد مٹی کی ایک مقدار کو جمع اور محفوظ کیا جاتا ہے جو بصورت دیگر پانی بہا کر لے جاتا۔اس نے پہاڑی پر قلعہ بھی تعمیر کیا اور قلعہ کے نزدیک نیچے ایک بلند چبوترہ تعمیر کیا جس میں چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں اور جس

میں بادشاہوں کی قبریں بھی ہیں۔ جب علی شیر خان اور اس کا جانشین بیٹا احمد خان فوت ہوئے تو اس کے دوسرے بیٹے عبدال اور آدم خان جھگڑ پڑے اور عبدال خان جس نے کچھ دروازے تعمیر کئے تھے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، نے اردگرد کے راجاؤں پر اتنا ظلم کیا کہ انہوں نے دہلی کے مغل شہنشاہ اورنگزیب سے مدد کی درخواست کی جس نے کشمیر سے فوج بھیج دی۔ اس پر عبدال نے اطاعت قبول کی اور تب دونوں بھائی اصالتاً مغل بادشاہ کے حضور گئے جس نے انہیں جانشینی کو تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ لیکن واپسی پر وہ کشمیر میں فوت ہو گئے۔،،

لیکن یہ نکتہ غور طلب ہے کہ احمد خان کے مرنے کے بعد اس کے بڑے بیٹے مراد خان کے ہوتے ہوئے عبدال خان اور آدم خان کو تخت کے لئے جھگڑنے کی نوبت کیسے آ گئی! مختلف ذرائع سے تاریخی مواد کو یکجا کرنے سے یہ معمہ حل ہو جاتا ہے۔ اصل واقعہ یوں نظر آتا ہے کہ احمد خان نے 1627ء کے لگ بھگ لداخ پر حملہ کیا۔ لیکن بودھ کھربو کے مقام پر اس کو شکست ہوگئی۔ اس کی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے آدمی لداخیوں کے ہاتھوں قید ہو گئے۔ قید ہونے والوں میں احمد خان کا بڑا بیٹا مراد خان بھی شامل تھا۔ احمد خان کا اپنا انجام کیا ہوا معلوم نہیں۔ تاہم اتنا تو یقینی ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ جب احمد خان اور اس کا ولیعہد یوں اچانک منظر سے غائب ہو گئے تو تخت نشینی کے لئے عبدال خان اور آدم خان آپس میں لڑ پڑے۔

عبدال خان

1627ء تا 1637ء

عبدال خان زور آور تھا اس نے سکردو کے تخت پر قبضہ کر لیا اور کہتے ہیں کہ آدم خان بھاگ کر دہلی چلا گیا۔ تخت نشینی کے تنازعے میں آدم خان کی حمایت کرنے کی پاداش میں اس نے شگر اور خپلو پر حملہ کر کے تباہی مچا دی۔ شگر کا حکمران محمد خان اسی دوران فوت ہو گیا۔ عبدال خان

نے اس کے بارہ میں سے گیارہ بیٹوں کو قتل کر دیا۔ مگر سب سے بڑا بیٹا حسن خان کسی طرح سے قتل سے بچ گیا اور بھاگ کر دہلی چلا گیا۔ چپلو کے شاہ بہرام چو کو قتل کر کے اس کی بہن کو کھر پوچھے میں ذلت آمیز طریقے سے زندہ رکھا۔ اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد اس نے لداخ پر حملہ کر کے قیدیوں کو چھڑا لایا۔ لداخ کے عبادت خانوں کو پھر غارت کیا اور بہت سے لوگوں کو تہہ تیغ کیا۔ اسی بناء پر اس نے غازی بت شکن کا لقب اختیار کیا۔ بعد کے زمانوں میں بھی سکردو کے جس کسی راجے کو لداخ کے غیر مسلم راجے پر فتح ملی اس نے فوراً غازی کا لقب اختیار کیا۔

عبدال خان سخت گیر تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بہت سے انسانوں کی جانیں لی تھیں۔ اس لئے بلتستان میں وہ اب تک ’ می زوس ، یعنی آدم خور کے نام سے مشہور ہے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ اس کا ایک چہیتا کتا مر گیا۔ اس کی موت پر ماتم کرنے کے لئے عبدال خان نے مقامی عورتوں کو بلا کر اس پر رونے کا حکم دیا۔ قہر حاکم کے سامنے انہیں اور کیا چارہ تھا۔ رونے لگیں۔ لیکن آنسو نہیں نکل رہے تھے جس پر ایک عورت نے رونے کی صورت بنا کر کہا ’’ تیری موت پر دل سے افسوس نہیں ہوا تو آنکھوں سے آنسو کیونکر ٹپک پڑیں گے اے عبدال خان کے کتے !،، یہ جملہ اس وقت بھی بلتیوں میں ضرب المثل کے طور پر رائج ہے۔

اسی دوران عبدال خان کی بیٹی شاہ خاتون کی شادی ہنزہ کے شہزادے عیاشو کے ساتھ ہو گئی۔ عبدال خان نے بلتی مستریوں، ترکھانوں اور ہنر مندوں کی ایک فوج بھیج دی جنہوں نے ہنزہ میں التت اور بلتت کے دو قلعے تعمیر کئے۔ کہتے ہیں کہ التت پہلے اور بلتت بعد میں بنایا گیا۔ اس شہزادی کے ساتھ بلتی خدمتگاروں کی جماعت ہنزہ میں آباد ہوئی۔ شاہ خاتون کا شیر پدر میور بھی ہنزہ میں آباد ہوا۔ عبدال خان نے شاہ خاتون کے ساتھ جہیز میں دیگر چیزوں کے علاوہ شہمار اور شیر مار نامی دو بندوقیں بھی دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ شہمار اب بھی میر ہنزہ کے اسلحہ خانہ میں موجود ہے۔ بعد میں ہنزہ کے حکمران کی درخواست پر بلتستان کے راجہ نے لوہار اور موسیقار بھی ہنزہ بھیج دیئے جو وہیں پر آباد ہو گئے۔ یاد رہے کہ ہنزہ کو بلتی میں ھ ھے یول بھی کہتے ہیں۔

عبدال خان نے دس سال سکردو پر بڑی مضبوطی سے حکومت کی۔ اس نے فصیل کو مزید

مضبوط بنایا اور دروازوں کی بھی تعمیر نو کی۔ اس نے علی شیر خان انچن کی قائم کردہ سلطنت کو اسی عظمت وقوت کے ساتھ قائم رکھا۔ کہتے ہیں کہ عبدال خان نے اپنے دس سالہ دور اقتدار میں بڑی سختی روا رکھی جس کی وجہ سے رعایا اس کے خلاف ہوگئی۔ آدم خان اور مراد خان دونوں بھی تخت کے دعویدار تھے۔ تخت کے دعویدار مقبوِن شہزادوں میں سے ایک نے خفیہ طریقے سے کشمیر کے مغل صوبیدار ظفر خان کو پیغام بھیجا کہ موقع مناسب آن پہنچا ہے سکردو پر حملہ کرے۔ ظفر خان نے شاہ جہاں کو اطلاع کردی تو بادشاہ نے فوراً حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس حملے کے اسباب کے بارے میں ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتا ہے:

''اس عہد کے مختصر الحاقات میں سے سب سے زیادہ دلیرانہ الحاق چھوٹے تبت کا تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں ہاشم خان نے اس ملک کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کو تباہ کن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہ جہاں نے اپنے دور میں اس کوشش کی تجدید کی۔ اس کو کچھ کامیابی ہوئی۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس دور کے مورخین حسب دستور بادشاہ کی اس لڑائی کا جواز پیش نہیں کرتے جو شمال کی غیر مہمان نواز پہاڑی علاقہ میں ہوئی۔ حقیقت یہ تھی کہ کوچک تبت میں بہت کم مایہ فخر سامان تھا۔ اس کی پیداوار میں بجز بعض کم حیثیت اون کے کچھ نہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حکمران ابدال نے کشمیر کے اصل حکمران چکوں کو پناہ دے کر مغلوں کو ناراض کر دیا تھا۔ یہ چک یہاں سے اکثر اوقات اپنے قدیمی ملک میں داخل ہو کر انتشار پیدا کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے حکمران ظفر خان نے ابدال کو مغل حکومت کی اطاعت اور بادشاہ کے نام پر خطبہ پڑھنے کے لئے 1634ء میں راضی کیا۔ لیکن چار سال کے اندر وہ اپنا وعدہ بھول گیا اور اس نے معاہدے رد کر دیئے۔ اس لئے 38-1637ء میں شاہ جہاں نے تبت کی تسخیر کی اور ظفر خان دو ہزار سوار اور دس ہزار پیدل لے کر چھوٹے تبت میں داخل ہوا.....''

کشمیر کے چک باغیوں کو سکردو میں سب سے پہلے علی شیر خان انچن نے پناہ دی تھی جس

کی وجہ سے مغل بادشاہ 1592ء سے تبت کو چک کے حکمرانوں سے ناراض چلے آرہے تھے اور کئی بار اس علاقے پر فوج کشی کر چکے تھے مگر ناکامی ہوئی تھی۔ لیکن اب یہاں کے حکمران خاندان کے اندر پھوٹ پڑ چکی تھی اس کے علاوہ رعایا بھی عبدال خان کے خلاف ہو چکی تھی۔ حکومت کے دعویدار ایک مقبوں شہزادے کی دعوت پر شاہ جہاں نے فوراً لشکر کشی کا حکم دیدیا۔ شاہ جہاں کے درباری مورخ ملا محمد صالح کمبوہ نے اپنی کتاب شاہ جہاں نامہ میں اور عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں تقریباً یکساں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ بعد میں ذکاء اللہ نے تاریخ ہندوستان میں اسی تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ کشمیر کی مکمل تاریخ کشمیر اور تاریخ حسن میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

ملا محمد صالح کمبوہ نے ان الفاظ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے:

''اس سال صوبیدار کشمیر ظفر خان ولد خواجہ ابوالحسن اس علاقے کی تسخیر پر متوجہ ہوا اور دو ہزار سوار جرار اور دس ہزار بہادر پیادے ہمرکاب لے کر تبت کی طرف بڑھا۔ کمراج (کرچہ، شکردار) کے راستے دشوار گزار گھاٹیاں طے کرتا ہوا صدپارہ کی پہاڑی پر پہنچا۔ یہاں پگڈنڈی اتنی باریک اور خطرناک تھی کہ پل صراط یاد آتا تھا۔ تبتیوں نے راستہ روکنا چاہا۔ لیکن تایید ایزدی معمولی سی جھڑپ کے بعد بھاگ نکلے اور تبت میں جا کر دم لیا۔ ظفر خان تعاقب کرتا ہوا بڑھا اور کشمیر سے روانگی کے ایک ماہ بعد دریائے سندھ کے ورے کنارے سرحدی پرگنہ گردو میں پہنچا۔ یہاں دوہرا قلعہ علی رائے نے پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا تھا۔ دریائے سندھ شمال کی طرف اس کے قدم چوم کر گزرتا ہے۔ ایک راستہ پہاڑ کی طرف سے آتا ہے عام راستہ جو دامن کوہ سے آتا ہے اتنا تنگ و تاریک ہے کہ چار آدمی اس کا ناکہ گھیر کر لشکروں کو روک سکتے ہیں۔ یہاں ابدال تبتی نے بالائی قلعہ گربوچہ میں پناہ لی تھی۔ دوسرا قلعہ گجناک اپنے معتمد سردار محمد مراد کے سپرد کر دیا تھا۔ اہل وعیال اور مال واسباب کو دریا پار کے قلعہ شکار میں محفوظ کر کے اپنے

خورد سال بیٹے اور علی کوکہ کو اس کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ محاصرہ سے انہیں فتح کرنا ممکن نہیں اور دو ماہ سے زیادہ وہاں ٹھہرنا محال ہے۔ رسد اور چارہ پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ حملہ آور کو یہاں پہنچتے پہنچتے دو ماہ لگ جاتے ہیں۔ آٹھ ماہ برف باری ہوتی رہتی ہے۔ باقی دو مہینوں میں محاصرہ سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔ واپسی پر راستے اس قدر مسدود ہوتے ہیں کہ گذرنا محال ہے۔ ظفر خان نے ان حالات کے پیش نظر مقامی لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کا فیصلہ کر کے ابدال کے بھائی آدم خان اور شاہی ملازمت کے تبّتی سپاہیوں کو اس غرض سے متعین کیا۔ جب یہ طریقہ کامیاب ہوتا نظر آیا تو اپنے وکیل میر فخر الدین تفرشی کو ایک شاہی منصب دار فرہاد بلوچ اور چار ہزار سوار و پیادے دے کر قلعہ شکار کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ میر تفرشی مقامی لوگوں کے مشورے سے نشیب کے رخ چل کر آدھی رات کے وقت چپ چاپ کشتیوں کے ذریعہ دریا عبور کر کے دریا کے کنارے متعین تبّتی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہوا اور انہیں قتل و پسپا کرنے کے بعد رات کے سناٹے میں قلعہ شکار کا محاصرہ کرلیا۔ ابدال کا پندرہ سالہ لیکن بہادر دلاور بیٹا مقابلہ کے لئے نکلا۔ عین پہاڑ پر ہنگامہ جنگ گرم ہوا۔ آخر کار تائید ایزدی غنیم بھاگ نکلا اور قلعہ میں جا کر دم لیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ کر دمدمے بنانے شروع کر دیئے۔ اسی اثنا میں علی کوکہ کے داماد اور اس کے کچھ عزیزوں نے جو افراتفری میں قلعہ میں داخل نہ ہوسکے تھے، میر فخر الدین سے امان طلب کر لی۔ اس پر علی کوکہ اور ابدال کے بیٹے میں بدگمانی پیدا ہوگئی اور ابدال کا یہ پندرہ سالہ بیٹا تین چھوٹے بھائیوں، والدہ اور رفیقوں کو قلعے میں چھوڑ کر سونا چاندی اور قیمتی چیزیں لے کر بطور احتیاط علی کوکہ کو ساتھ لئے کاشغری دروازہ سے نکل کر کاشغر کی طرف روانہ ہوگیا۔ قلعہ پر شاہی لشکر کا قبضہ ہوگیا۔ میر فخر الدین نے ابدال کے بیٹوں اور مستورات کو گرفتار کر کے لشکر کو اس

کے تعاقب میں بھیجا۔ وہ تو ہاتھ نہ آیا البتہ سونے چاندی کے کئی ڈھیر جو بدحواسی میں چھوڑ گیا تھا، فوج کے قبضے میں آئے۔ جنہیں فخر الدین نے خزانہ عامرہ کے لئے محفوظ کر لیا۔

قلعہ شکار کی فتح سے حوصلہ پا کر ظفر خان نے قلعہ گرپوچہ اور گجناک کی تسخیر کا فیصلہ کیا۔ اہل قلعہ کا غلہ کی قلت کے باعث برا حال تھا۔ ان تبتیوں نے جنہیں جوڑ توڑ سے اس نے ساتھ ملا لیا تھا، ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اہل قلعہ کو ابدال سے ایسا منحرف کیا کہ وہ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ دریں اثنا ظفر خان نے صلح کی گفت و شنید شروع کر کے ابدال کو لاپرواہ کر دیا۔ ادھر طے شدہ منصوبہ کے تحت 5 شہر یورم 25 اگست 1637ء بروز پنج شنبہ جب ظفر خان کا ایک رشتے دار محمد زمان اور آدم خان تبتی لشکر لے کر قلعہ گجناک کی طرف بڑھے تو انہیں دیکھتے ہی ابدال نے پھاٹک کی کنجیاں شاہی آدمیوں کے حوالے کر دیں۔ ابدال کو اب اپنا اور قلعہ گرپوچہ کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے شادمان ساکن پگلی کو بھیج کر امان طلب کی۔ جب مطمئن ہو گیا تو ظفر خان کی ملاقات کو آیا۔ اگلے روز ظفر خان اپنی تمام فوج اور ابدال کو ہمرکاب لئے قلعہ میں داخل ہوا اور قلعہ کی مضبوطی اور استحکام کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ اگر تایید ایزدی شامل حال نہ ہوتی تو تسخیر ممکن نہ تھی، عنایت ربانی کا شکر بجا لایا۔ خطبے میں خدا کی حمد، رسولؐ مقبول کی نعت اور آل اطہار اور اصحاب کبار کی منقبت کے بعد بادشاہ کا نام نامی پڑھا گیا۔

ظفر خان نے اپنی عرضداشت میں تمام احوال لکھ کر بارگاہ والا کو روانہ کر دیا۔ اسی اثنا میں فخر الدین بھی ابدال کے اہل و عیال اور دو لاکھ روپے کا سامان لئے حاضر ہوا۔ حسن اتفاق سے حبیب چک اور احمد چک بھی بمعہ اہل و عیال گرفتار ہو گئے۔ حبیب چک اکبر کے عہد میں بغاوت کر کے تبت جا نکلا تھا۔

برفباری کا آغاز ہونے پر ظفر خان تبت کا انتظام ابدال کے بھتیجے محمد مراد کے سپرد کر کے لاما، ابدال اور دوسرے مفسدوں کو ساتھ لے کر پرگنہ لار کے راستے کشمیر میں داخل ہوا۔ لیکن بادشاہ کو ظفر خان کا تبت کو میر مراد کی نگرانی میں دے کر جلد واپس آنا پسند نہ ہوا، اس لئے کوئی نمایاں عنایت کرنے کی بجائے خلعت و مرصع مجدھر کی عطا پر اکتفا کی اور ترقی دے کر منصب تین ہزاری ذات ڈھائی ہزار سوار کا مقرر کر دیا۔

تبت کے چاروں طرف فلک بوس پہاڑ کھڑے ہیں۔ ایک راستہ قرا تبت، کاشغر، بدخشاں اور نواحی پہاڑ ہمکال سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچتا ہے۔ کشمیر کی طرف سے دو راستے ہیں۔ ایک کمراج سے ہوکر، دوسرا لار کی طرف سے۔ پہلی راہ میں تین چار منزلوں کا پھیر تو ہے لیکن سردی، برف اور یخ کی زیادہ شدت نہیں، دشوار گزار ٹیلے اور ہولناک گھاٹیاں ایسی تنگ ہیں کہ دو سوار پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتے۔ بعض جگہ پیدل گزرنا بھی مشکل ہے۔ لار والا راستہ اگرچہ کسی قدر کم فاصلہ ہے۔ تاہم برف اور یخ سے اٹا رہتا ہے۔ آٹھ ماہ تک بارش کی جھڑی لگی رہتی ہے۔ برف باری اتنی شدید ہوتی ہے کہ ذرا سی دیر میں برف کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ بعض گھاٹیاں روز اول سے آج تک یخ پوش ہیں۔ بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ درمیان میں نصف کوس اونچا پہاڑ برف و باراں کا مرکز ہے، جس کے دامن سے بڑے بڑے دریا برف کی چادر کو سرکا کر نکلے ہیں۔ کشمیر سے تیس کوس کے فاصلے پر کوس بھر اونچا پہاڑ پڑتا ہے یہاں راستہ نہایت ڈھلوان اور تنگ ہے۔

تبت کا علاقہ، اکیس پرگنوں اور 37 پہاڑی قلعوں پر مشتمل ہے۔ گیہوں اور جو کی فصل برائے نام ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ سالانہ مالیہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک دریا سے گھٹیا سونے کے ریزے نکلتے ہیں جس کی قیمت سوا

روپے تولے ہوتی ہے اس کے ٹھیکے سے زمینداروں کو دو ہزار تولے کی یافت ہو جاتی ہے۔ میوؤں میں سرخ سیب، زرد آلو، انگور، آڑو، خربوزے نہایت میٹھے ہوتے ہیں اور سب ایک ہی موسم میں پک کر تیار ہوتے ہیں۔،،

یہ واقعہ شاجہاں کے دسویں سال جلوس 1047ھ (1637ء) کا ہے۔

عبدال خان اور اس کے اہل وعیال کو گرفتار کر کے ظفر خان اپنے ساتھ ہندوستان لے گیا۔ کہتے ہیں کہ دہلی سے اسے آزاد کر کے واپس بھیجا گیا۔ لیکن واپسی پر کشمیر میں فوت ہو گیا۔ لیکن حشمت اللہ خان کا کہنا ہے کہ عبدال خان شگر میں قید رہا اور وہیں فوت ہوا جہاں اس کی قبر موجود ہے۔ عبدالحمید لاہوری کے بیان میں مذکور ہے کہ عبدال خان کے پندرہ سالہ بیٹے کا نام دولت تھا اور یہ کہ ظفر خان کی فوج کے ساتھ عبدال خان کا بھانجا حسن بھی تھا جو اس کے ہاتھوں قتل سے بچ کر ہندوستان بھاگ گیا تھا۔

آدم خان

1637ء تا 1656ء

ظفر خان نے عبدال خان کی گرفتاری کے بعد سکردو کا تخت احمد خان کے بیٹے مراد خان کے حوالے کیا کیونکہ وہی حکومت کا حقیقی وارث تھا۔ لیکن شاہ جہاں کو اس کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ کیونکہ شاہ جہاں کو مراد خان کی وفاداری پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے علاوہ آدم خان بھی تخت کا دعویدار تھا۔ چنانچہ شاہ جہاں نے سکردو کی حکومت مراد خان سے واپس لے کر آدم خان کے سپرد کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آدم خان نے روندو اور ہراموش کا علاقہ مراد خان کو دیدیا جو علی شیر خان انچن اور احمد خان کے دور میں عبدال خان کی جاگیر تھا۔ چنانچہ مراد خان نے اپنے بھائیوں علی شاہ، شیر شاہ، شاہ سلطان اور امام قلی کے ساتھ روندو اور ہراموش پر قناعت کی۔

1639ء (1049ھ) میں آدم خان نے کشمیر کے مغل صوبیدار علی مردان خان کو لکھا کہ لداخ کے راجہ سنگے نمگیل نے بڑی فوج کے ساتھ پوریگ پر قبضہ کیا ہے جو تبت خورد کا حصہ ہے۔

علی مردان خان نے اپنے عزیز حسین بیگ کو ایک لشکر کے ساتھ لداخ روانہ کر دیا۔ اسی دوران آدم خان بھی بلتی فوج کے ساتھ کھر بو میں پہنچا۔ 25 اگست 1639ء (25 ربیع الثانی 1049ھ) کو کھر بو میں مقابلہ ہوا اور سنگے نمکیل کو شکست ہو گئی۔ اس نے درخواست کی کہ جان بخشی ہو جائے تو خراج ادا کیا کرے گا۔ اس کی درخواست منظور ہوئی۔ 20 ستمبر کو مغل فوج واپس کشمیر پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ذکر لداخ کی تاریخ میں یوں ہے:

''بلتی کے بادشاہ آدم خان نے شاہ جہاں کی فوج لا کر کھر بو میں بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ بہت سے ہور قتل ہو گئے.....''

یوں پوریگ پر دوبارہ سکردو کا قبضہ بحال ہو گیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1639ء تک آدم خان سکردو میں موجود تھا۔ اس کے بعد آدم خان نے سکردو کی حکومت اپنے نائب کے طور پر کھرمنگ کے بروقپہ سنگے پاحیدر کے بیٹے مرزا خان کے حوالے کر دی اور خود کشمیر میں سکونت پذیر ہوا۔

مرزا خان نے 1651ء تک آدم خان کے نائب کی حیثیت سے سکردو پر کامیاب حکومت کی۔ بالآخر آدم خان کے وزیر کے ساتھ اس کے اختلافات ہو گئے۔ اس نے وزیر کو قتل کر دیا اور آدم خان سے روگرداں ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ کشمیر کا راستہ بند کر دیا۔ کشمیر کے گورنر نے فوج بھیج دی۔ اسے بھی مرزا خان نے شکست دی۔

اسی دوران مراد خان اور شگر کے امام قلی خان کے درمیان لڑائی ہوئی اور مراد خان کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آ گیا۔ پہلے وہ روندو واپس ہوا۔ اس کے بعد دہلی پہنچ کر سکردو کی حکومت پر اپنے دعوے کی پھر تجدید کی۔ شاہ جہاں نے اپنے وزیر سعد اللہ کے ساتھ مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ آدم خان کی ایک بیٹی ناکتخدا موجود ہے۔ اس کے ساتھ اس نوجوان کا عقد کر دیا جائے۔ اس سے یہ دونوں ایک ہو جائیں گے۔ چنانچہ بادشاہ کے ایما سے یہ شادی ہو گئی۔ دونوں محبت سے رہنے لگے۔ اس کے بعد آدم خان نے مراد خان کو اپنا ولیعہد اور وارث قرار دیا۔

جب مرزا خان کی بغاوت کی خبر شاہ جہاں کو پہنچی تو اس نے مرزا خان کی سرکوبی کے لئے

لشکر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ واقعہ شاہ جہاں کے 25 ویں سال جلوس 1651ء مطابق 1061ھ کا ہے۔ذکاءاللہ اپنی تاریخ ہندوستان میں یہ واقعہ یوں بیان کرتا ہے:

''12 رجب کو آدم خان، غلام نبی اور اس کے بھتیجے محمد مراد کو اور نیز علیم بیگ اور نعیم بیگ پسران سلیم بیگ کاشغری کو جو آدم خان و غلام نبی کے ضامن تھے اور کشمیر میں تعینات تھے اور کشمیر کے زمینداروں کی ایک جماعت کو تبت اس غرض سے بھیجا کہ وہاں مرزا خان تبتّی کی تنبیہ کریں جس نے سرکشی کی ہے۔اور قلعہ اسکردو کو فتح کریں اور تبت جو ملازمان شاہی کے قبضہ سے نکل گیا ہے اس پر تصرف کریں۔ 27 شعبان کو آدم تبتّی کی عرضداشت سے معلوم ہوا کہ مرزا خان نے جب لشکر شاہی کے آنے کی خبر سنی تو وہ بھاگ گیا اور قلعہ سکردو اور ملک تبت بادشاہی آدمیوں کے تصرف میں آیا۔بادشاہ نے آدم خان اور اس کے بھائیوں کو یہ ولایت دیدی کہ وہاں وطن بنا کے رہیں۔،،

اس واقعہ کا ذکر شاہ جہاں کے دور کا مورخ ملا محمد صالح کمبوہ 25 ویں سال جلوس کے ضمن میں ان الفاظ میں کرتا ہے:

''15 اگست کو آدم تبتّی کی طرف سے مرزا کے فرار اور علاقہ تبت کے ملازمان شاہی کے تصرف میں آنے کی خبر پہنچی۔آپ نے آدم خان کو ہزاری ذات اور پان سو سوار کے منصب پر ترقی دے کر، وہ سرزمین کہ اس کی سالانہ جمع اسی لاکھ دام ہے جاگیر کے بطور اسے عطا فرمائی۔،،

ذکاءاللہ اور ملا محمد صالح کمبوہ کی ان دو عبارتوں سے ہمیں یہ نکتہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ آدم خان نے سکردو کے تخت و تاج کو چھوڑ کر کشمیر میں کیوں سکونت اختیار کی تھی۔حالانکہ اسی تخت و تاج کے لئے وہ بھائی سے جھگڑ پڑا تھا جس کے نتیجے میں تبت خورد پر مغلوں کی بالادستی قائم ہوئی تھی۔علی شیر خان انچن کے دور سے لے کر عبدال خان کے دور تک مغل بادشاہوں کی خواہش رہی تھی کہ تبت خورد کو فتح کریں۔مگر انہیں اس میں ناکامی ہوئی۔1637ء میں مقپون خاندان میں پھوٹ،

عبدال خان کی رعایا پر سختی اور مقامی لوگوں کی رہبری کی وجہ سے ظفر خان کو کھر پوچھے قلعہ کی فتح ممکن ہوگئی۔شاہ جہاں کو اب مقبوضہ شہزادوں پر اعتماد نہ رہا تھا اسی لئے مراد خان سے حکومت واپس لی اور آدم خان کو اس شرط پر دی کہ کسی اور کو نائب بنا کر خود کشمیر میں سکونت رکھے۔ادھر بھی اس کے اوپر ضامن اور نگران مقرر کر رکھے تھے۔مرزا خان کی بغاوت فرد ہونے پر آدم خان کو سکردو جاگیر میں ملا اور پہلی بار اجازت ملی کہ سکردو کو وطن بنا کر رہ سکتا ہے۔اندازہ ہوتا ہے کہ غلام نبی عبدال خان کا بیٹا تھا۔یہ بھی آدم خان کے ساتھ کسی کی ضمانت میں تھا۔کیونکہ آدم خان کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا۔احمد خان کے بیٹوں میں سے کسی کا نام غلام نبی نہیں۔عبدال خان کے تین چھوٹے بیٹوں کو گرفتار کر کے ہندوستان لے جایا گیا تھا۔غلام نبی انہی تینوں میں سے بڑے کا نام ہوسکتا ہے۔ ورنہ آدم خان کے ساتھ زیر نگرانی رکھے جانے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

سکردو سے مرزا خان کے فرار ہونے کے بعد آدم خان نے چند روز تک سکردو کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کی،جشن منایا۔بعدازاں یہ کہہ کر حکومت مراد خان کے سپرد کی کہ بیٹا میرے حکم سے باہر نہ ہونا۔میرے دوستوں کو رنج نہ دینا۔اور میرے باغ سے درخت نہ کاٹنا۔جب تک میں زندہ ہوں اپنا خیال نہ کرنا۔اس کے بعد لشکر کو لیکر آدم خان کشمیر کی طرف واپس چلا گیا اور شاہ جہاں کو فتح وظفر کے حالات بتا دیئے۔مرزا خان کو بھگانے میں شگر کے راجہ امام قلی نے نمایاں کردار ادا کیا تھا اس کے عوض اسے شہنشاہ ہند سے آدم خان نے منصب دلایا۔

مراد خان نے 1651ء سے پانچ سال تک آدم خان کے نائب کی حیثیت سے حکومت کی۔اس دوران اس نے آدم خان کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھا کہ اس کے حکم کے بغیر زبان نہیں ہلاتا تھا اور جب اس کا حکم صادر ہوتا تو اس کی تعمیل میں لحہ تاخیر نہیں کرتا تھا۔

ادھر مرزا خان سکردو سے اپنا مال و دولت لے کر شگر چلا گیا۔وہاں کچھ عرصہ مقیم رہ کر چلو چلا گیا۔ادھر کچھ عرصہ پناہ گزیں رہنے کے بعد اپنے وطن کرتخشہ (کھرمنگ) میں واپس آ کر حکومت کرنے لگا اور مراد خان کے خلاف سازش میں مصروف ہوا۔اس کے ہاتھوں اس سے پہلے بھی مراد خان نے تکلیف اٹھائی تھی۔مراد خان نے صورتحال سے آدم خان کو آگاہ کیا اور کرتخشہ پر

حملہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ شگر سے امام قلی خان کو تمموسہ میں بلا کر مشورہ کیا۔ اس کے بعد کرتخشہ پر حملہ کر دیا۔ پرکوتہ میں مرزا خان کے بیٹے علی خان نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قید ہو گیا۔ پرکوتہ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد طولتی کا قلعہ فتح کیا پھر کرتخشہ کے قلعے کا محاصرہ کیا جہاں مرزا خان قلعہ بند تھا۔ چار ماہ کے محاصرے کے بعد مرزا خان نے اپنا ایلچی بھیجا کہ اگر مراد خان یہ اقرار کرے کہ جس طرف میری مرضی ہو مجھے جانے کی اجازت ہوگی تو میں قلعہ سے اترتا ہوں۔ اس کی یہ پیشکش قبول کی گئی تو وہ پیشکش اور تحائف لے کر مراد خان اور امام قلی خان کے پاس آیا۔ عاجزی کی اور معافی مانگی۔ معافی ملنے پر وہ لداخ کی طرف روانہ ہو گیا اور کرتخشہ پر مراد خان کا قبضہ ہو گیا۔ مراد خان نے اپنے بھائی شیر خان کو کرتخشہ کا حاکم مقرر کیا اور سکردو واپس چلا آیا۔

سکردو کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر رحیم خان راجہ چلو نے گیالپو لداخ کے ساتھ سازش کر کے تھورسے کھر پر حملہ کر دیا تھا اور حسین خان کے بیٹوں بابر اور یعقوب کو مع ان کی والدہ حیا خاتون کے اسیر کر کے لداخ میں بمقام بودھ کھربو قید کر دیا تھا۔ اس خدمت کے عوض چھوربٹ کا علاقہ رحیم خان نے گیالپو لداخ کو دیا اور تھورسے کھر سمیت باقی علاقوں پر خود قابض ہوا۔ یہ حیا خاتون مراد خان کی ہمشیرہ اور بابر و یعقوب اس کے بھانجے تھے۔

لداخ کے راجہ نے اس کے علاوہ بودھ کھربو پر بھی قبضہ کیا تھا جو پوریگ کا علاقہ تھا۔ چنانچہ مراد خان نے گیالپو لداخ کو سزا دینے کے لئے لداخ پر حملہ کر دیا۔ امام قلی خان نے امیر خان کو شگر کی فوج کے ساتھ بھیج دیا۔ کھربو کے قلعہ کا محاصرہ کیا گیا۔ اس حملے کی خبر لداخ پہنچی تو مقابلہ کے لئے بہت بڑا لشکر بھیجا گیا۔ کھربو میں بڑا خونریز معرکہ جنگ برپا ہوا۔ لداخی فوج شکست کھا کر بھاگنے لگی۔ بلتی فوج نے اس کو گھیرے میں لے کر نو سو سپاہی گرفتار کئے۔ پچاس کے قریب بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ باقی تمام لشکر جنگ میں کام آیا۔ مراد خان کا قلعہ کھربو پر قبضہ ہو گیا۔ اس تباہی کی خبر لداخ میں پہنچی سارا علاقہ لرز اٹھا۔ لداخیوں نے اسیران جنگ کے بدلے مراد خان کی بہن اور دونوں بھانجوں کی رہائی کی پیشکش کی جسے مراد خان نے منظور کر لیا اور بابر اور یعقوب مع اپنی والدہ کے اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں ساتھ لے کر مراد خان سکردو واپس ہوا۔

اسی دوران مراد خان کو خبر پہنچی کہ علی خان قید سے فرار ہو کر چپلو کی طرف چلا گیا ہے۔ مرزا خان پہلے ہی لداخ سے آ کر چپلو میں رحیم خان کے پاس تھور سے کھر میں موجود تھا۔ مراد خان نے رحیم خان کو نافرمانی سے باز آنے کے لئے ایک خط لکھا تو اس نے جواب میں ایک دھمکی آمیز خط لکھا۔ چنانچہ امام قلی خان کو ساتھ لے کر مراد خان نے چپلو پر لشکر کشی کی اور تھور سے کھر کا محاصرہ کر لیا جس میں رحیم خان قلعہ بند تھا۔ تین ماہ کے محاصرے کے بعد جب خوراک کی تکلیف ہونے لگی تو رحیم خان نے عاجز آ کر ایلچی بھیجا کہ مجھے تکلیف نہ پہنچانے کا وعدہ کرو تو قلعہ تمہارے سپرد کر دوں گا۔ مراد خان نے وعدہ کیا کہ تمہاری شرط قبول ہے اگر اپنے وعدے سے پھر جاؤں تو مسلمان نہ ہوں گا۔ جب قلعہ فتح ہو گیا تو مراد خان نے اپنے وعدے کو توڑ کر رحیم خان کو قید کر دیا۔ اس نے مرزا خان کو آدم خان کے پاس روانہ کر دیا کہ وہ جو چاہے اس کے ساتھ کرے۔ آدم خان نے مرزا خان کو ہندوستان بھیج دیا کہ شاہ جہاں کے زندان میں رہے۔

رحیم خان کو شکست دے کر مراد خان نے بابر اور یعقوب کو تھور سے کھر کی حکومت پر بحال کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رحیم خان کی وفات کے بعد حاتم خان نے سرکشی کی جس کے نتیجے میں مراد خان نے چپلو پر حملہ کر کے کھر کوتک کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ حاتم خان نے شگر کے امام قلی خان کو درمیان میں ڈال کر مصالحت کرائی۔ مراد خان نے کونیس کو سالینگ حکومت سے نکال کر کریس کے ساتھ الحاق کر لیا۔ کریس اور سالینگ کے درمیان پھونگ نق پڑی کو سرحد قرار دیا۔

شاہ جہاں کے 30 ویں سال جلوس 1656ء (1066ھ) میں آدم خان کشمیر میں فوت ہو گیا۔ ملا محمد صالح کمبوہ شاہ جہاں نامہ میں لکھتا ہے:

> ”آدم خان تبتی ولد علی رائے تبتی کے کشمیر میں لاولد فوت ہو جانے پر اس کے بھتیجے محمد مراد کو تبت کا علاقہ جاگیر میں بخشا،،

چنانچہ کشمیر سے قاصد پہنچا اور آدم خان کی رحلت کی خبر دی۔ اس سے بڑا رنج والم پیدا ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد امام قلی خان سے مشورہ کر کے مراد خان نے سفر ہندوستان کا ارادہ کیا اور چند روز میں شاہ جہاں کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ دربار میں اس کی بڑی عزت ہوئی اور آدم خان کا

منصب اسے عطا کیا گیا۔ کشمیر میں اسے جاگیر بھی دی گئی۔ واپس ہو کر کشمیر پہنچا اور چند روز سیر کی غرض سے کشمیر میں ٹھہر گیا۔ پھر واپس سکردو کو روانہ ہوا۔

شاہ مراد

1656ء تا 1673ء

مراد خان کو سب سے پہلے 1637ء میں ظفر خان نے عبدال خان کو معزول کرنے کے بعد سکردو کے تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن شاہ جہاں نے اس سے سکردو کی حکومت واپس لے کر آدم خان کے حوالے کر دی تھی۔ 1651ء میں مرزا خان کو ہٹا کر آدم خان نے مراد خان کو اپنے نائب کے طور پر سکردو کی حکومت پر متمکن کر دیا۔ آدم خان کی زندگی میں وہ مراد خان کے نام سے کاروبار سلطنت چلاتا رہا اور 1656ء میں آدم خان کی وفات پر اس نے شاہ مراد کا لقب اختیار کیا۔

1658ء میں ہندوستان کے تخت پر اورنگ زیب کا قبضہ ہو گیا۔ 1663ء میں اس نے کشمیر کا سفر کیا۔ اس سفر میں فرانسیسی ڈاکٹر برنیئر (BERNIER) بھی اس کے ساتھ تھا۔ جس کی سرپرستی دربار کا ایک سربرآوردہ منصب دار دانشمند خان کر رہا تھا۔ اورنگ زیب کے اس سفر کے دوران سکردو سے شاہ مراد نے کشمیر میں اس کے دربار میں حاضری دی۔ ایک شام دانشمند خان نے شاہ مراد کو رات کے کھانے کی دعوت دی جہاں برنیئر کی شاہ مراد سے ملاقات ہوگئی۔ برنیئر نے اپنے سفرنامے میں اس ملاقات کا یوں ذکر کیا ہے:

> ''تبت خورد کے فرمانروا کے پیشکش لے کر کشمیر میں حاضر ہونے اور اس کی زبانی ملک تبت کے جو حالات معلوم ہوئے، ان کا ذکر
>
> تبت خورد جو کشمیر کی سرحد پر ہے اس کے فرمانروا خاندان کے لوگوں میں چند سال سے بڑے بڑے تنازعے ہو رہے تھے جن میں سے آخر کار ایک شخص نے جو حکومت و ریاست کا دعویٰ دار تھا پوشیدہ صوبہ دار کشمیر سے مدد کی درخواست کی اور شاہ جہاں کے حضور سے حکم ہو گیا کہ جو مدد درکار ہو، دی

جائے۔ چنانچہ صوبہ دار نے یورش کی اور بعض دعویدار تو قتل ہوئے اور بعض بھاگ گئے اور اس کو اس شرط کے ساتھ مسند پر بٹھا دیا گیا کہ سال بسال کسی قدر بلور، مشک اور شال بنانے کی اون بطور خراج دیا کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹے بادشاہ کو یہ چیزیں بطور پیشکش لے کر بذات خود اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونا پڑا۔ مگر ایسے ابتر حال نوکر چاکر کے ساتھ آیا ہے کہ میں تو کبھی اس کو عالی رتبہ شخص خیال نہیں کر چکا ہوتا۔ ہمارے نواب نے اس غرض سے اس کی دعوت کی کہ اس سے اس کے علاقہ کے کچھ حالات معلوم کر سکیں۔ چنانچہ اس نے ہم سے بیان کیا کہ تبت بزرگ میری ریاست کی حد شرقی ہے اور اس کا عرض قریب نوے یا ایک سو بیس میل کے ہے اور کہا کہ گو ہمارے ہاں بلور، مشک اور پشم، یہ اشیاء بہم پہنچتی ہیں، مگر میں چنداں متمول نہیں ہوں اور لوگوں کا یہ عام گمان کہ میرے قبضہ میں سونے کی کانیں ہیں، بالکل غلط ہے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ اس کے ملک کے بعض اضلاع میں عمدہ عمدہ میوے پیدا ہوتے ہیں خصوصاً خربوزہ جو کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر کثرت برف کے باعث جاڑا بڑی شدت سے پڑتا ہے اور وہاں کے باشندے پہلے غیر مسلم تھے۔ لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت مسلمان ہو چکی ہے اور وہ خود سمیت سب شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو سارے ایران کا مذہب ہے۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا کہ ''سترہ اٹھارہ برس گزرے کہ شاہ جہان نے بڑی تبت کو جس پر راجگان کشمیر کی اکثر تاخت رہتی تھی، تسخیر کرنے کا ارادہ کیا تھا اور سپاہ نے بعد سولہ دن کے ایک مشکل سفر کے جو کوہستان میں سے کرنا پڑا تھا ایک قلعہ کو محاصرہ کر کے لے بھی لیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں ایسی ہل چل ڈال دی تھی کہ بے شک تمام ملک مسخر ہو جاتا اگر سپاہ شاہی ایک مشہور اور تیز رو دریا سے، جو راستہ میں آتا ہے، اتر کر اسی وقت جرأت کر کے ریاست گاہ کو جا لیتی۔ مگر چونکہ موسم مخالف آن پہنچا تھا، صوبہ دار

کشمیر جو اس فوج کا حاکم تھا اس اندیشہ سے واپس آ گیا کہ کہیں برف نہ آن دبائے اور اس مفتوحہ قلعہ میں کسی قدر سپاہیوں کو اس لئے چھوڑ آیا کہ فصل بہار کے شروع میں پھر یورش کروں گا۔ مگر فوج متعینہ قلعہ نے عجیب حرکت کی کہ قلعہ کو یا تو دشمن کے خوف سے یا قلت رسد کی وجہ سے ناگہاں اور خلاف توقع خالی کر دیا۔ اور اس طرح سے بڑی تبت کا ملک جس کی تسخیر آیندہ فصل بہار پر ملتوی رکھی گئی تھی، محکوم ہونے سے بچ رہا۔،،

عالمگیر نامہ میں تصریح ہے کہ یہ شخص شاہ مراد تھا۔ شاہ مراد کی دی ہوئی تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ بلتستان پر شاہ جہاں کا حملہ ایک مقبوضہ ن شہزادے کی دعوت کے نتیجے میں ہوا تھا۔

شاہ مراد کی ایک بیٹی کی شادی حبیب خان راجہ گلگت کے ساتھ ہوگئی تھی ۔ کچھ سال امن و امان کے ساتھ گزر گئے ۔ پھر حبیب خان کے ایک بیٹے نے باپ کی نافرمانی کر کے ملک میں شورو فساد برپا کر دیا۔ اور یسین کے راجہ شاہ رئیس سے بھی مدد حاصل کی ۔ حبیب خان نے صورتحال سے مطلع کرنے کے لئے سکردو کی طرف قاصد روانہ کر دیا تو شاہ مراد نے باغیوں کی سرکوبی کے لئے امام قلی خان راجہ شگر کو ایک لشکر کے ساتھ گلگت کی طرف روانہ کر دیا۔ باغیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میدان کارزار خون سے لال ہو گیا۔ لیکن باغیوں کو شکست نہ ہوئی ۔ باغیوں نے قلعہ بند ہو کر چار ماہ تک لڑائی جاری رکھی ۔ آخر کار قلعہ میں خوراک کی تکلیف شروع ہوگئی تو حبیب خان کے باغی بیٹے نے امام قلی خان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر خطا معاف کر کے قسم کھائے کہ اسے نقصان نہیں پہنچایا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے گا۔ امام قلی خان نے شاہ مراد کو لکھا کہ دشمن قسم کے اوپر اطاعت قبول کرتا ہے جو کچھ حکم ہو اس سے مطلع کیا جائے ۔ شاہ مراد نے جواب دیا کہ قسم سے اس کو زیر کیا جائے مگر شرط یہ ہے کہ اسے سکردو میں شاہ مراد کے سامنے حاضر کیا جائے ۔ امام قلی خان نے ایسا ہی کیا۔ اسے قسم کے ذریعے اپنے ہاتھ میں لایا۔ اس فتح پر خوشی منائی گئی ۔ بعد میں شاہ مراد نے قسم کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس نوجوان کو قید کر دیا۔ امام قلی خان اس بات پر شاہ مراد سے سخت آزردہ ہو گیا۔

دو تین سال گلگت میں امن وامان قائم رہا۔ پھر شاہ مراد کو خبر ملی کہ اکی خان نے شاہ مراد کے داماد کو قتل کر دیا ہے اور تمام ملک میں فساد برپا ہوا ہے۔ شاہ مراد کو بڑی فکر ہوئی اور سرداروں سے مشورہ کرنے کے بعد گلگت پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ امام قلی خان شاہ مراد سے اس بات پر آزردہ تھا کہ قسم کا پاس رکھے بغیر اس نے حبیب خان راجہ گلگت کے باغی بیٹے کو قید کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے شاہ مراد کے پاس اپنا لشکر بھیج دیا لیکن خود نہیں آیا۔ شاہ مراد بذات خود لشکر لے کر گلگت کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاہ مراد کے آنے کی خبر سن کر اکی خان اپنے ملک سے باہر نکلا اور ایک غار میں بیٹھ کر راستہ روک دیا۔ ایک ماہ تک وہ اس غار میں آزاد رہا۔ آخر کار شاہ مراد کے آدمیوں نے اس غار کے منہ پر آگ جلائی اور نکاس روک کر دھویں اور حرارت کو اندر کی جانب کر دیا تو اکی خان باہر نکل آیا اسے پکڑ کر شاہ مراد کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس طرح گلگت کا فساد ایک بار پھر ختم ہو گیا۔ شاہ مراد نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو گلگت میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود سکردو واپس چلا آیا۔

اتنے میں گلگت سے پھر خبر آئی کہ بوتہ نے فساد برپا کر دیا ہے جبس خان اور ہرتم نے شاہ مراد کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اتحاد کر لیا ہے۔ شاہ مراد نے پھر گلگت جانے کا فیصلہ کیا۔ فوج تیار کی۔ امام قلی خان کو پیغام بھیجا تو اس نے امیر خان کو فوج دے کر شاہ مراد کے پاس بھیجا لیکن اس نے خود یہ کہہ کر آنے سے گریز کیا کہ اب مجھ میں کوہ قاف پر جانے کی طاقت باقی نہیں۔ علاوہ ازیں والی کاشغر کی بہن میرے ملک میں آئی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک لمبا قافلہ ہے اور جلد اپنے وطن کو واپس جانا چاہتی ہے۔ میرے نام شاہ کاشغر کا فرمان پہنچا ہے کہ ان اشخاص کو جلد روانہ کر دوں۔ چنانچہ شاہ مراد بذات خود لشکر کو ساتھ لے کر گلگت روانہ ہو گیا۔ جب شاہ مراد گلگت میں پہنچا تو اس کے خوف سے جبس خان اور بوتہ فرار ہو گئے۔ اس ملک کو بدخواہوں سے صاف کر کے چند روز میں وہ واپس سکردو پہنچ گیا۔ یہ واقعہ 1664ء تا 1667ء (78-1075ھ) کے دوران کا ہے جب کشمیر میں اورنگ زیب کی طرف سے نواب سیف خان صوبیدار مقرر تھا۔

گلگت سے واپسی پر شاہ مراد نے شگر کے راجہ امام قلی خان کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ تم

نے میرے حکم سے کیوں بے پروائی کی۔ تم جانتے ہو کہ چپلو و پوریگ میرے تابع فرمان ہیں اور گلگت وروندو خود میرا ملک ہے۔ شاہ و گدا سب میرے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ فوراً سکردو حاضر ہو جاؤ اور میری تعظیم سے سرفرازی حاصل کرو۔ امام قلی خان نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اس نے جواب دیا کہ تم کو اپنے سابقہ حالات کی یاد نہیں! لداخ کے قید خانے میں سڑ رہے تھے۔ میں نے تجھے آزاد کرالیا۔ چپلو اور پوریگ پر تم کو میری تلوار کی بدولت اقتدار حاصل ہوا ہے۔ اور روندو اور کرتخشہ بھی میرے زور بازو کے طفیل تمہارے قبضہ میں آئے ہیں۔ بروشال اور گلگت میں نے اپنی تلوار سے فتح کیا اور تم کو دیدیا ہے۔ اب جملہ اطراف تسخیر ہو چکے تو تمہیں میرے اوپر حملہ کرنے کا اچھا خیال آیا۔ میں شہنشاہ ہند کا خاص بندہ ہوں۔ تم کو میرے ملک پر کوئی قدرت حاصل نہیں۔

امام قلی خان سے جب ترکی بہ ترکی جواب ملا تو شاہ مراد نے کشمیر کے مغل صوبیدار سیف خان کے پاس اس کی شکایت کی کہ میں گلگت میں ایک بدخواہ کی تسخیر کے لئے گیا تھا۔ امام قلی خان نے نہ صرف ساتھ جانے سے انکار کیا بلکہ اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا رہا۔ جبکہ اس کے اجداد میرے باپ دادا کے تابعدار رہے ہیں۔ سیف خان نے امام قلی خان سے جواب طلبی کی تو اس نے جواب میں وہی باتیں دہرائیں جو شاہ مراد کو لکھی تھیں اور مزید کہا کہ شاہ مراد شہنشاہ ہند کی حمایت میں گلگت گیا تھا تو وہاں سے جو بے حساب زر و جواہر وصول کئے ہیں وہ شہنشاہ کے حضور میں پیش کیوں نہیں کیا۔ کام اس کی خودغرضی پر مبنی تھا۔ اب اسے شہنشاہ سے منسوب کرتا ہے۔ نواب حقیقت سے واقف ہوا۔ بالآخر اس کی مداخلت سے شاہ مراد اور امام قلی خان کے درمیان تصادم ٹل گیا۔ لیکن شاہ مراد کی وفات کے بعد سکردو اور شگر میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔

1665ء (1075ھ) میں اورنگ زیب کے حکم سے کشمیر کے صوبیدار سیف خان نے محمد شفیع کی سرکردگی میں لداخ کے راجہ دیلدن نمگیل کی طرف ایک مہم بھیجی۔ دیلدن نمگیل نے اطاعت قبول کی۔ پہلے جمعہ کو لوگوں کو جمع کر کے عالمگیر کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ خطیب کے سر پر سونا چاندی نچھاور کئے۔ خلعت فاخرہ دیا۔ ایک مسجد لیہ میں تعمیر کی جس کا نقشہ تحفے تحائف کے

ساتھ اورنگ زیب کے حضور بھیج دیا۔لداخ کی اس مہم میں شاہ مراد نہ صرف شامل تھا بلکہ اس حملے میں مرکزی کردار شاہ مراد کا تھا جس کی وجہ سے اسے خلعت عطا کیا گیا۔

محققین کی رائے ہے کہ لداخ کی فتح سکردو کے بادشاہ کی حکمت عملی اور فوجی شمولیت کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا۔

لداخی ذرائع سے کننگھم کو معلوم ہوا کہ دیلدن نمگیل کے دور میں بلتی کے بادشاہ مراد خان نے لداخ کو فتح کیا تھا۔ دراصل شاہ مراد نے مغل فوج کی مدد سے لداخ کو فتح کیا تھا۔ بلتی روایات کے مطابق شاہ مراد نے لداخ کو فتح کر کے ایک بار پھر لداخ سے لے کر چترال تک کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں لایا تھا۔ چترال میں قلعہ کے نزدیک شاہ مراد نے ایک پل تعمیر کرایا تھا۔ جو چو پل کے نام سے معروف تھا۔ بڈلف کہتا ہے کہ چترال پر سکردو کے مقپون راجاؤں کی حکومت تھی۔ بعد میں ایک مقپون حکمران کے دور میں قلماق (چینی) فوج نے بدخشاں کے ایک راجہ کے ساتھ اتحاد کر کے چترال کو مغلوب کر لیا۔ کننگھم نے بھی لکھا ہے کہ شاہ مراد نے گلگت، نگر ہنزہ اور چترال کو فتح کیا تھا۔

گلگت اور چترال کی مہموں میں شاہ مراد کے بھائیوں شیر شاہ اور علی شاہ نے نمایاں کارنامے انجام دیئے تھے۔ مقپون کے ان شہزادوں کے نام شینا لوک گیتوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ بڈلف کہتا ہے کہ سکردو کے مقپون حکمران احمد خان کے چار بیٹوں نے مغرب میں چترال تک کے علاقوں کو فتح کیا اور استور اور چلاس سے اسیران جنگ کو لا کر بلتستان کے مختلف مقامات پر بسایا۔ یہ چار بھائی شاہ مراد، علی شاہ، شیر شاہ اور شاہ سلطان تھے۔ شاہ مراد نے علی شاہ کو روندو کا، شیر شاہ کو کھرمنگ کا اور شاہ سلطان کو استور کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔ پانچواں بھائی امام قلی سکردو میں ہی مقیم رہا۔ بڈلف کی تحقیق کے مطابق ان بھائیوں کی ماں گلگت کی تراخانی شہزادی تھی۔

فتوحات سے فارغ ہونے پر شاہ مراد نے ملکی دفاع کے استحکام اور ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف توجہ دی۔ کھرپوچھے قلعہ کے شمال مغرب میں پہاڑی کی چوٹی پر ایک قلعہ نما دیدبانی چوکی تعمیر کر کے ادھر پہرہ دار مقرر کر دیئے۔ یہ عمارت ڈونکس کھر کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ شنگھو شگر اور دراس میں بھی قلعوں کو از سر نو تعمیر کیا۔ کشمیر سے مختلف پیشوں سے منسلک ماہرین کو لا کر سکمیدان

میں آباد کیا۔ ہنرمندوں کے ایک ایسے ہی ٹولے کو کشمیر سے لا کر موجودہ رانگا گاؤں میں بسایا۔ یہ کشمیری لوگ عرصہ دراز تک رانگا میں چاول بھی کاشت کرتے رہے۔ بعد میں ڈوگرہ سپاہیوں کی لوٹ مار کی وجہ سے چاول کی کاشت بند ہوگئی۔ شاہ مراد نے ہندوستان سے سنگ تراش بھی یہاں لا بسایا تھا۔

اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ مراد کا 1673ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ کیونکہ شاہ مراد کے فوت ہونے کے بعد 1673ء میں راجہ لداخ نے پوریگ پر اور چھلو کے راجہ حاتم خان نے 1674ء میں تھورسے کھر پر قبضہ کیا تھا۔

شیر شاہ ثانی

1673ء تا 1681ء

شاہ مراد نے مرتے وقت اپنے بھائی علی شاہ کو تاکید کی تھی کہ وہ اس کے بچوں کی سرپرستی کرے۔ لیکن اس نے بے وفائی کی اور شاہ مراد کے فوت ہونے کے فوراً بعد علی شاہ کے اشارے پر کھر منگ سے شیر شاہ تعزیت کے بہانے سکردو پہنچا اور بظاہر گریہ وزاری کے ذریعے رنج کا اظہار کیا۔ جب اس کی نیک دلی کی شہرت پھیلی اور ہر طرف سے تسلی ہوئی تو اس نے شاہ مراد کے بیٹے محمد رفیع خان کو جو اس کا اپنا داماد تھا قید کر دیا اور محمد بیگ وغیرہ شاہ مراد کے قریبی افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر سکردو کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شگر کے امام قلی خان کو مطیع کرنے کے لئے پوریگ، چھلو، کرتخشہ، روندو، بروشال اور گلگت سے دس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر جمع کر کے اس پر حملہ آور ہوا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر لداخ کے راجہ نیمہ نمگیل نے 1673ء میں پوریگ پر حملہ کر دیا۔

چھلو میں شاہ مراد نے تھورسے کھر کی حکومت پر اپنے بھانجے بابر کو متمکن کر دیا تھا۔ کچھ مدت حکومت کرنے کے بعد بابر لاولد فوت ہوا تو اس کا بھائی یعقوب جانشین ہوا تھا۔ شاہ مراد کی وفات کے بعد سکردو کی حکومت خانہ جنگیوں میں مصروف ہوئی تو سالنگ کھر کے راجہ حاتم خان نے

یہ تسلی کر کے کہ یعقوب کو سکردو سے امداد پہنچنے کا امکان نہیں ہے راجہ لداخ کی امداد سے تھور سے کھر پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب فریاد لے کر نواب کشمیر کے پاس روانہ ہوا لیکن راستے میں علیل ہو کر فوت ہوا اور یوں حاتم خان متحدہ چپلو کا حکمران ہو گیا۔

شیر شاہ اور شگر کے امام قلی خان کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ بلتی روایات کے مطابق شیر شاہ نے اسی دوران لداخ پر حملہ کر دیا اور لوٹ مار کرتا ہوا تنگ موگانگ تک جا پہنچا۔ وہاں سے غارت کرتا ہوا بزگو پہنچا۔ ادھر کے قلعہ کو بھی لوٹا پھر مال غنیمت کو گرکون میں ایک جگہ پر دفن کر کے سکردو واپس پہنچا۔ تاریخ میں اس بڑے پیمانے پر کئے گئے حملے کا کہیں ذکر نہیں۔ ویسے بھی لداخ اس وقت مغل شہنشاہ کا محکوم تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ لداخ سے پوریگ کے وہ علاقے واپس لئے ہوں جس پر 1673ء میں گیا لپو نے قبضہ کیا تھا۔ لیکن ہمارے خیال میں امر واقعہ یوں ہے کہ اسی دوران کوہستان کاشغر سے قلماق قوم لداخ پر حملہ آور ہوئی۔ اورنگ زیب نے کشمیر کے مغل گورنر ابراہیم خان کے بیٹے فدائی خان کی سرکردگی میں 1683ء (1094ھ) میں ایک لشکر لداخ کی طرف روانہ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فدائی خان کے پوریگ پہنچنے پر شیر شاہ بھی اس کے ساتھ لداخ کی مہم میں شامل ہو گیا تھا۔ حشمت اللہ خان نے غلطی سے اسے دیلدن نمگیل کے دور کا واقعہ قرار دیا ہے۔ دیلدن نمگیل کے دور کا واقعہ 1665 کا ہے جس میں شاہ مراد شریک تھا۔ دو ایک لڑائیوں کے بعد قلماق کے لوگ بھاگ گئے اور بے شمار مال غنیمت اور یرغمال مغل فوج کے ہاتھ آئے۔ کہتے ہیں کہ شیر شاہ کے ہاتھ جو مال غنیمت آیا اسے لشکریوں میں تقسیم سے بچانے کے لئے اس نے گرکون کے قریب ایک جگہ چھپا دیا اور جن لوگوں کو یہ مال چھپانے کے کام پر مامور کیا تھا انہیں دریا عبور کرتے وقت غرق کر دیا تاکہ یہ راز اسی تک محدود رہے۔ بعد میں اس نے یہ مال وہاں سے اٹھایا ہوگا۔ تاہم یہ جگہ مقپونی خسیر یعنی مقپون کا خزانہ، کے نام سے معروف ہے۔ یہ واقعات جب رونما ہوئے اس وقت شیر شاہ صرف کھرمنگ کا راجہ تھا۔ کیونکہ سکردو کا تخت 1681ء کے لگ بھگ شگر کے امام قلی خان اور اس کے اپنے بھائی امام قلی کی کوششوں سے اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

محمد رفیع خان

1681ء تا1712ء

شگر کے راجہ امام قلی خان اور شاہ مراد کے بھائی امام قلی کی کوششوں سے بالآخر 1681ء کے لگ بھگ محمد رفیع خان سکردو کے تخت پر متمکن ہو گیا اور شیر شاہ کو کھر منگ کی حکومت پر قناعت کرنا پڑی۔ محمد رفیع خان کے دور کی ایک تحریر دستیاب ہوئی ہے جس پر اس کی مہر بھی ثبت ہے اور سن تحریر 17 صفر 1093ھ درج ہے۔ یکم محرم 1093ھ کو 10 جنوری 1682ء کی تاریخ تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد رفیع خان 1682ء سے قبل سکردو کی حکومت پر قابض ہو چکا تھا۔ محمد رفیع خان کی حکومت سکردو تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ سارے ماتحت راجاؤں نے سرکشی اختیار کی۔ اس کے دور سے سکردو کی حکومت کے زوال کا زمانہ شروع ہو گیا۔

سکردو حکومت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چپلو کے راجہ حاتم خان نے لداخ کے گیالپو کی مدد سے ایک بھاری لشکر جمع کیا اور چپلو اور لداخ کی اس مشترکہ فوج کو لے کر سکردو پر حملہ کر دیا۔ محمد رفیع خان مقابلے کی تاب نہ لا کر کھرپوچھے میں قلعہ بند ہو گیا۔ حملہ آوروں نے قلعہ کا محاصرہ کیا اور ملک میں تاخت و تاراج کر دی اور سکردو کے ملحقہ دیہات کو تباہ کیا۔

تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان کا کہنا ہے کہ فتح کے نشان کے طور پر سکردو کا شیر دروازہ (سنگے ستاغو)، توتی امری مون چو، تھایول کی شغرن (پولو گراؤنڈ) کے خوبصورت پتھر اور کواردو کے عالی شان ستون اپنے ساتھ لے کر یہ لشکر واپس چلا گیا۔ سرداران لشکر بوتہ اور اچھکر کو اس کارنامے کے صلہ میں حاتم خان نے یہ انعام دیا کہ راجہ کے پاس آنے والے تحائف کا ساتواں حصہ دائمی طور پر ان کا حق ہوگا۔ یہ واقعہ لداخ کے راجہ نیمہ نمگیل کے دور کا ہے۔ لداخ کے سرکاری ریکارڈ کے تحت اس راجہ کے دور میں جون 1712ء کو ایک دستاویز جاری ہوئی جس کے تحت سکردو قلعہ کی فتح کے موقع پر کی گئی خدمات کے صلہ میں انعامات دیئے گئے تھے۔ اس دستاویز

سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد رفیع خان 1712ء تک زندہ تھا۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر شیر دروازہ اور دوسری چیزیں رفیع خان کے دور میں مال غنیمت میں خپلو پہنچی ہوتیں تو بعد میں جب 1819ء تا 1840ء کے دوران بیس سالوں تک خپلو پر سکردو کے راجہ احمد شاہ کا بلا واسطہ قبضہ قائم رہا تو اس دوران یہ چیزیں واپس سکردو پہنچ چکی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں 1840ء میں زور آور سنگھ کے ہاتھوں سقوط سکردو کے موقع پر لوٹ مار کے نتیجے میں خپلو پہنچی ہیں جس کا ذکر تاریخی گیت ''چوامیر حیدر،، میں بھی موجود ہے۔

اس زمانے میں طلاقیں زیادہ ہونے لگیں تو محمد رفیع خان نے اسے روکنے کے لئے خلع میں ایک تولو سونا مہر کے علاوہ مقرر کر دیا۔ اس وجہ سے خلع میں دیئے جانے والے مال کو سکردو میں آج بھی رفیع خانی تولو کہتے ہیں۔

سلطان مراد

1712ء تا 1722ء

محمد رفیع خان کے بعد اس کا بیٹا سلطان مراد اس کا جانشین ہوا۔ اس زمانے میں شگر میں امام قلی خان کا بیٹا اعظم خان حکمران تھا۔ اسی دوران لداخ کے راجہ نیمہ نمگیل کی پہلی بیوی ایک بچے کو جنم دے کر مر گئی تو اس نے خپلو کے حاتم خان کی پوتی اور دولت خان کی بھتیجی سے شادی کر لی جو بعد میں زیزی خاتون کے نام سے مشہور ہوئی۔ لداخی تاریخ میں مذکور ہے کہ گیالپو لداخ کے عقد میں لڑکی دینے کی وجہ سے بلتستان کے دوسرے راجے خپلو کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ جب 1716ء میں حاتم خان خپلو کے داماد نے بغاوت کی تو سکردو اور شگر کی فوج اس کی مدد کو پہنچی اور سالنگ کھر پر قبضہ کر لیا۔ راجہ حاتم خان نے لداخ سے مدد مانگی۔ لداخی فوج کو سرموں بروق میں رسنہ کے مقام پر شکست ہوگئی۔ آخر کار حملہ آور فوج پسپا ہوگئی۔ 2 اگست 1717ء کو جاری شدہ لداخ کی ایک سرکاری دستاویز کے تحت لداخ کے ایک سپاہی کو اس بات پر انعام دیا گیا تھا کہ سرموں میں رسنہ کے مقام پر لداخیوں کو شکست کے باوجود وہ شخص ڈٹ کر لڑتا رہا تھا۔ 1718ء میں جاری

شدہ ایک دستاویز میں 1715ء اور 1716ء میں بلتیوں کے خلاف مہم میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سکردو اور شگر کے تعلقات پھر خراب ہو گئے اور شگر کے راجہ کی طرف سے سکردو پر حملہ کا خطرہ ہوا تو لداخی تاریخ کے مطابق سکردو کے راجہ سلطان مراد نے شگر کے خلاف لداخ سے مدد مانگی۔ لداخ کے راجہ نے ایک فوج روانہ کر دی۔ ابھی یہ فوج ہنو پہنچی تھی کہ حملے کا خطرہ رفع ہو گیا۔ لیکن 1722ء میں سلطان مراد شگر کے راجہ اعظم خان کی سازش سے دریا میں غرق ہو گیا۔

انگریز سیاح جی ٹی وین نے لکھا ہے کہ سلطان مراد نے مشرق میں لداخ کو اور مغرب میں چترال تک کے علاقوں کو دوبارہ فتح کیا اور سارے علاقوں کو ایک بار پھر سکردو کے زیرِ نگیں لایا۔ وین نے شاہ مراد کی جگہ غلطی سے سلطان مراد کا نام لیا ہے۔ حقیقت میں شاہ مراد نے ان سارے علاقوں کو ایک بار پھر فتح کیا تھا۔

اعظم خان اماچا

1722ء تا 1727ء

محمد رفیع خان کے دور سے سکردو کے راجاؤں پر شگر کے حکمرانوں کا تسلط قائم تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مراد نے یہ جوا اتار پھینکنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے تاریخ لداخ کے مطابق 1719ء میں شگر کے راجہ اعظم خان کی طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ خطرہ لداخ کی مداخلت کی وجہ سے وقتی طور پر ٹل گیا۔ اعظم خان نے لشکر کشی میں لداخ کو حائل دیکھ کر حیلہ سے سلطان مراد کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ بظاہر تعلقات کو معمول پر لانے کے بعد سلطان مراد کو شگر آنے کی دعوت دی اور دریائے شگر کو عبور کرتے وقت سازش کے تحت سلطان مراد کو دریا میں غرق کر دیا۔ اس کے بعد اس نے سکردو کی حکومت پر قبضہ کر کے مونے پا علی کو سکردو میں کھرپون مقرر کر دیا۔

سلطان مراد کا بیٹا محمد ظفر خان اس وقت چھوٹی عمر کا تھا وہ پوریگ کی طرف فرار ہو گیا اور

پانچ سال وہاں پناہ گزین رہا۔اس دوران اعظم خان کا خیال اس کی طرف راجع نہیں ہوا۔اس اثناء میں اعظم خان کا بھائی علی خان اور غضواپا وزیر محمد جو یارقند کی سفارت پر گئے تھے براہ لداخ واپس آئے۔پوریگ میں انہیں ظفر خان مل گیا۔علی خان نے وزیر محمد کو سکردو میں محمد ظفر خان کے شیر پدر سوسوپا کے پاس بھیجا۔سوسوپا نے بے وفائی سے وزیر محمد کو گرفتار کر کے اعظم خان کے سامنے پیش کر دیا جس نے سکمیدان میں نشانہ تیر اندازی کر کے اسے ابدی نیند سلادی۔ظفر خان اور علی خان کو پوریگ سے گرفتار کر کے لایا۔ظفر خان کو شگر کے مون کھر میں قید کر دیا اور اپنے بھائی علی خان کو نگر کی طرف جلاوطن کر دیا۔واضح رہے کہ علی خان غضواپا وزیر خاندان کی رانی کے بطن سے تھا۔شگر میں غضواپا خاندان کا رسوخ بہت زیادہ تھا اس لئے سفارت کے بہانہ سے اعظم خان نے علی خان اور وزیر محمد کو یارقند کی طرف بھیجا تھا۔

اعظم خان کی رانی فخر النساء سلطان مراد کی بہن تھی۔وہ اپنے بھائی کے قتل اور اپنے آبائی خاندان کی تباہی کو دیکھ کر سخت برہم ہوئی۔لہذا موضع کواردو کا محلّہ برق نق اپنے حق مہر میں لے کر اس نے اعظم خان سے علیحدگی اختیار کی اور اس سے انتقام لینے کے منصوبوں میں مصروف ہوئی۔

سکردو پر قبضہ کرنے کے بعد اعظم خان کی گلگت سے لے کر پوریگ تک کے علاقوں پر حکومت قائم ہوگئی تھی۔لداخ کے تاریخی ذرائع کے مطابق چپلو کے راجہ حاتم خان کو اعظم خان کی طرف سے حملے کا خطرہ ہو گیا اور لداخ سے مدد کی درخواست کی۔لداخ سے براہ نوبراہ فوج روانہ ہوئی۔اعظم خان نے شگر، سکردو، روندو اور گلگت سے فوج جمع کی۔لیکن ان فوجوں کے پہنچنے سے پہلے اعظم خان کو شکست ہو چکی تھی۔اسی دوران فخر النساء نے مقتول وزیر محمد کے ماموں زاد بھائی ولی کے ذریعے شگر میں بغاوت کرادی۔جس میں اعظم خان قتل ہو گیا۔لداخی ریکارڈ کے مطابق لداخی فوج نے اعظم خان کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا اور محمد ظفر خان کو سکردو کا راجہ اور علی خان کو نگر سے لا کر شگر کا حکمران بنایا۔واپسی کے وقت لداخی فوج تب تک شگر میں موجود بدھ مت کی باقیات کو دیگر مال غنیمت کے ساتھ لداخ لے گئی۔

محمد ظفر خان

1727ء تا 1765ء

اعظم خان کے قتل کے بعد محمد ظفر خان سکردو میں تخت نشین ہو گیا۔ظفر خان کے بارے میں مقامی روایات یوں ہیں کہ جب وہ چھوٹا تھا تب لداخ کے کالون چھے نے سکردو کے تخت پر قبضہ کیا۔ظفر خان نے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور غازی کا لقب اختیار کیا۔ظفر خان کی مہر پر غازی لکھا ہوا تھا۔ظفر خان کے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد خپلو کے ساتھ فوجی تصادم کا آغاز ہوا۔ لداخ خپلو کا روایتی حلیف رہا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ انہی جنگوں کے دوران ظفر خان نے لداخی فوج کو فیصلہ کن شکست دے کر غازی کا لقب اختیار کیا تھا۔

لداخی تاریخی ریکارڈ کے مطابق 1733ء میں ظفر خان نے خپلو پر فوج کشی کی۔خپلو کے راجہ نے لداخی فوج کی مدد سے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔دوسرے سال سکردو کی فوج نے دوبارہ خپلو کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔دولت خان نے پھر لداخ سے مدد مانگی۔لداخی فوج نے سکردو کے حملہ آور لشکر کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

1738ء (1151ھ) میں محمد ظفر خان کی رانی میر خاتون نے کھر پوچھے قلعہ کے پہلو میں موجود مسجد کو ازسر نو تعمیر کرایا۔ظفر خان ہی کے دور میں 1750ء (1163ھ) میں بلتستان کے مشہور شاعر میر نجم الدین ثاقب کا انتقال ہو گیا۔میر صاحب بلتستان کے مشہور شاعر چھورکاہ شگر کے عباس علی شاہ عباسؔ کے جد امجد تھے۔میر کے بارے میں مشہور ہے کہ شغر نامہ انہی کی تصنیف ہے۔شغر نامہ شگر کے راجہ امام قلی خان کے دور کی منظوم تاریخ ہے جس سے اس دور کے بلتستان کے دیگر علاقوں کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔شغر نامہ کے علاوہ فصل الخطاب کے نام سے بھی ان کی ایک اور منظوم کتاب کی تصنیف 1736ء (1148ھ) سے قبل مکمل ہوئی تھی۔شگر کے سابق حکمران اماچا خاندان کی روایات کے مطابق شغر نامہ سید ابوالحسن تحسینؔ کی تصنیف ہے جسے امام قلی

خان کے پوتے حسین خان کی فرمائش پر تحسین نے منظوم کیا تھا اور اس کی تصنیف 1166ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان واقعات کو میر نجم الدین ثاقب نے نثر میں مرتب کیا تھا۔

1759ء میں محمد ظفر خان کی شگر کے راجہ حسین خان کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی۔ حسین خان کو کریس کے میر بیگ اور خپلو کے راجہ کی حمایت حاصل تھی۔ ظفر خان نے حسین خان کو قیدی بنایا۔ اس کے بعد کیریس پر حملہ کر کے قلعہ کو فتح کیا اور خپلو پر حملے کی تیاریاں کیں۔ خپلو کے راجہ محمد علی خان نے لداخ سے مدد کی درخواست کی۔ لداخ کی مداخلت سے حسین خان رہا ہو گیا اور کچھ عرصے کے لئے امن قائم ہو گیا۔

1759ء میں کاشغر اور یارقند کو فتح کر کے چین کی سرحدیں بلتستان اور لداخ سے آملیں۔ یارقند میں چین کا کمانڈر رہنے لگا۔ لداخ نے یارقند کے چینی گورنر کے پاس اپنا ایلچی بھیجا۔ لداخی ایلچی کے یارقند پہنچنے کے چار ماہ بعد 1760ء میں محمد ظفر خان کی طرف سے نورمات (نورمحمد) اور شگر کے راجہ حسین خان کی طرف سے اسی مات بطور ایلچی یارقند کے چینی گورنر (وزیر یارقند) کے پاس پہنچے۔ تین ماہ کے مسلسل سفر کے بعد یہ دونوں یارقند پہنچے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لداخ کے تاجروں کی زبانی ترکستان میں سیاسی تبدیلی کے بارے میں بلتستان کے راجاؤں کو معلومات ملی تھیں۔ ان دونوں کے ساتھ اٹھارہ تاجر بھی تھے۔ ایلچیوں نے گورنر کو ظفر خان اور حسین خان کے خطوط اور تحفے پیش کئے۔ تحفے میں ایک تھان اطلس اور ایک پیکٹ مصری شامل تھے۔ گورنر نے ایلچیوں کے سامان کا معاینہ کیا تو اس میں کوئی قیمتی چیز نہ پائی۔ سامان کی مقدار بھی زیادہ نہ تھی۔ اس وقت تجارتی سامان پر 1/30 کی شرح سے چین کی طرف سے ٹیکس عائد تھا لیکن وزیر یارقند نے انہیں یہ ٹیکس معاف کر دیا۔

ان دونوں ایلچیوں نے وزیر یارقند کو بتایا کہ پہلے حسین خان کا دادا زیادہ طاقتور تھا اور اس کے فیصلے چلتے تھے۔ حسین خان کی چھوٹی بہن ظفر خان کے عقد میں ہے۔ اب محمد ظفر خان زیادہ طاقتور ہے۔ پچھلے سال موسم خزاں میں حسین خان گرفتار ہو کر ظفر خان کے سامنے پہنچا۔ حسین خان بھاگ کر خپلو گیا۔ خپلو سے فوج لے کر آیا اور میدان جنگ میں خپلو کے لوگوں نے مصالحت کرائی

اور جنگ بند ہوگئی۔ بعد میں دریا پر برف جم گیا تو ظفر خان نے پھر حسین خان پر حملہ کیا لیکن باہمی مذاکرات سے جنگ بندی ہوگئی۔ اب فیصلے محمد ظفر خان کے چلتے ہیں۔ ہر دو علاقے کی آبادی آٹھ آٹھ ہزار ہے۔ لوگ کھیتی باڑی پر گزارہ کرتے ہیں۔ جانوروں میں صرف اونٹ نہیں ہے۔ 40روز بعد یہ دونوں ایلچی اپنے علاقوں کو واپس چلے آئے۔

دوسرے سال اور تیسرے سال 1761ء اور 1762ء میں صرف حسین خان کی طرف سے ایلچی وزیر یارقند کے پاس پہنچا۔ محمد ظفر خان کی طرف سے ایلچی نہیں پہنچا۔ اس دوران سکردو اور شگر کے راجاؤں کے درمیان پھر جنگ چھڑ چکی تھی۔ چنانچہ 1763ء میں حسین خان کا ایلچی احمد بچاس بلتی تاجروں کے ساتھ یارقند پہنچا اور وزیر یارقند کو حسین خان کا ایک خط پیش کیا۔ اس خط میں حسین خان نے لکھا تھا کہ میرے آباؤ اجداد پہلے سے یارقند کے ماتحت رہے ہیں۔ میں بھی یارقند کا فرمان بردار ہوں۔ جبکہ سکردو کے راجے کشمیر حکومت کے ماتحت تھے اور ان کے بل پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ اس وقت شگر کی سکردو کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے اگر آپ ہمارے اوپر احسان کر کے کچھ گھوڑے، بندوقیں اور تیر و کمان فراہم کریں تو ہم بہت شکر گزار ہوں گے۔ وزیر یارقند نے بہت اچھے الفاظ میں یہ چیزیں فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس خط کی زبان سے اس جنگ کی شدت کا اندازہ ہو جاتا ہے جو اس زمانے میں سکردو اور شگر کے درمیان جاری تھی۔ 1761ء (1175ھ) میں اسی جنگ کے دوران راجہ شگر حسین خان نے آدمی بھیج کر سدپارہ جھیل کا وہ عظیم بند توڑ دیا جو علی شیر خان انچن نے تعمیر کیا تھا۔ اس بند کے ٹوٹنے سے سکردو کا بہت بڑا علاقہ غرق ہو گیا اور ہر طرف کہرام مچ گیا۔ بند کے ٹوٹنے کا سن دیوان تحسین میں ''سدا سکردو شکست آب ہائے ہائے،، یعنی 1175ھ لکھا گیا ہے۔ جھیل کے قریب واقع گاؤں اسی سیلاب کی وجہ سے غرق ہو گیا۔

ظفر خان کے دور میں کھرپوچھے قلعہ کے اندر محل کی بالائی منزل میں آگ لگ گئی۔ دوسری قیمتی اشیاء اور نوادرات کے علاوہ سکردو کے حکمرانوں کی تاریخ کی تحریریں بھی جل کر خاکستر ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے سکردو کی تاریخ کی مستند دستاویزات ہمیشہ کے لئے تلف ہو گئیں۔

سکردو کے راجہ احمد شاہ کے کہنے کے مطابق ظفر خان نے تھور گو دروازہ کو از سرنو تعمیر کیا تھا۔ظفر خان کی تاریخ وفات کے بارے میں اندازہ ہے کہ 1765ء کے قریب اس کا انتقال ہوا تھا۔

علی شیر خان ثانی

1765ء تا 1800ء

محمد ظفر خان کے بعد اس کا بیٹا علی شیر خان ثانی اس کا جانشین ہوا۔ جو تحریر اس وقت بوقبوق نامہ کے نام سے مشہور ہے اس کے مطابق ظفر خان کا 67 سال کی عمر میں 8 صفر (18 حوت) 1193ھ (1779ء) کو انتقال ہوا تھا۔لیکن علی شیر خان ثانی کے عہد کی ایک تحریر دستیاب ہوئی ہے جس پر اس کی مہر ثبت ہے اور 1180ھ کی تاریخ درج ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی شیر خان ثانی 1765ء کے قریب تخت نشین ہوا تھا۔اس نے پرکوتہ کو کرتخشہ سے نکال کر سکردو کے ساتھ شامل کر لیا اور اپنے بیٹے غلام شاہ کو یہ علاقہ گزارہ میں دیدیا۔

مشہور شاعر سید ابوالحسن تحسین کا اسی راجہ کے عہد میں 1776ء (1190ھ) میں انتقال ہو گیا۔اس کا فارسی مجموعہ کلام (سفینۃ التحسین) دیوان تحسین کے نام سے مشہور ہے۔اس میں غزلوں کے علاوہ تاریخی قطعات اور تاریخی نظمیں بھی ہیں جن سے سکردو کی اس زمانے کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔دیوان تحسین سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ سکردو کے راجے اپنے دربار میں ایران سے اعلیٰ پایے کے مذہبی علماء اور مجتہدین لاتے رہے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ حسن اور مکمل تاریخ کشمیر دونوں میں تقریباً یکساں تفصیل کے ساتھ اس زمانے کا ایک واقعہ درج ہے:

> ''کچھ عرصہ بعد 1779ء میں حاجی کریم داد خان نے مرتضیٰ خان کو تسخیر اسکردو پر مامور کیا جس نے بڑی جد و جہد کے بعد مراد خان حاکم اسکردو کو مغلوب کر لیا اور باج وخراج اور یرغمال لے کر مظفر و منصور مراجعت پذیر ہوا۔ ناظم صوبہ نے فتح نامہ تیمور شاہ کی خدمت میں بھجوایا جس نے اس کے صلہ میں

اسے شجاع الملک کا خطاب عطا کیا۔،،

حشمت اللہ خان نے مراد خان کا نام دیکھ کر اپنی تاریخ جموں میں غلطی سے اس واقعہ کو سکردو کے راجہ سلطان مراد کے دور کا بنا دیا ہے جبکہ سلطان مراد اس سے 57 سال قبل 1722ء میں دریا میں غرق ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا ظفر خان بھی 1765ء کے قریب فوت ہو چکا تھا۔

حقیقت میں یہ علی شیر خان ثانی کے دور کا واقعہ ہے۔ 1779ء میں استور کا حاکم مراد خان تھا۔ مرتضیٰ خان نے اسی کو مغلوب کر لیا تھا اور لوٹ مار کر کے چلا گیا تھا۔ اس کی تائید ولیم مور کرافٹ کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو اس واقعہ کے چالیس سال بعد لداخ پہنچا تھا۔ غالباً اسی واقعہ کی وجہ سے تھا علی شیر خان ثانی نے گریز کی طرف کے سارے چھپر جو مویشیوں کے لئے بنے ہوئے تھے مسمار کر دیئے تھے تاکہ اس طرف سے آنے والے حملہ آوروں کو ستانے کے لئے بنے بنائے کمرے دستیاب نہ رہیں۔

بلتستان میں ایک لوک گیت 'بوٗنو مریم' کے نام سے موجود ہے۔ بوٗنو مریم ایک بلتی لڑکی کا نام ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے کسی دوسرے علاقہ کے راجہ نے سکردو کے راجہ کو شکست دے کر خراج میں اٹھایا تھا۔ اس لڑکی نے راستے میں ملنے والے بلتی مسافروں کے ساتھ اہل وطن کو غیرت آمیز طعنوں پر مشتمل پیغام بھیجا۔ یہ پیغام سن کر لوگ جذبات میں آ گئے اور پیچھے سے حملہ کر کے بوٗنو مریم کو دشمن سے چھین کر واپس لایا۔

بنات گل آفریدی نے اس قصے کو کشمیر کے افغان حکمرانوں کے دور کے ساتھ جوڑا ہے۔ تاریخ کشمیر میں اس طرف افغانوں کے صرف ایک ہی حملے کا ذکر ملتا ہے جو حاجی کریم داد خان صوبہ دار کشمیر کے دور میں 1779ء میں ہوا تھا۔ اس حملے میں مرتضیٰ خان نے مراد خان کو مغلوب کیا تھا۔ 1779ء میں سکردو میں مراد خان نہیں بلکہ علی شیر خان ثانی حاکم تھا اور مراد خان استور کا راجہ تھا۔ اس طرح یہ مفروضہ صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ افغانوں نے سکردو کو مغلوب کر لیا تھا۔ لہٰذا بوٗنو مریم کا قصہ اگر صحیح ہے تب بھی یہ کشمیر کے افغانوں کے دور کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔

اس زمانے میں شگر کے حکمران حسین خان کی وفات پر اس کے بیٹوں میں جانشینی کے

بارے میں تنازعہ پیدا ہو گیا۔ حسین خان کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا اعظم خان چپلو والی رانی کے بطن سے تھا۔ دوسرے دونوں بیٹے قلی خان اور دولت خان سکردو کے علی شیر خان ثانی کے بھانجے تھے۔ باپ کی وفات پر اعظم خان اس کا جانشین ہوا۔ علی شیر خان ثانی نے شگر پر حملہ کر کے قلعہ کو فتح کیا اور ادھر اپنے بھانجے قلی خان کو شگر کے تخت پر بٹھا دیا۔ چپلو کے حکمران محمد علی خان نے اعظم خان کی حمایت کی جس کی وجہ سے سکردو اور شگر کی فوجوں نے حملہ کر کے کریس اور کورو کے قلعوں پر قبضہ کیا اور آگے بڑھ کر بلغار میں ایک قلعہ تعمیر کر لیا۔ چپلو کے راجہ محمد علی خان اور اس کے بیٹے نے لداخ کے گیالپو سے مدد حاصل کی۔ لداخی ریکارڈ کے مطابق یہ 1785ء کا واقعہ ہے۔ جی ٹی وین کو سکردو کے راجہ احمد شاہ نے بتایا کہ علی شیر خان ثانی نے شگر کے قلعہ کو فتح کیا اور حملہ آور لداخی فوج کو قیدی بنا لیا تھا۔ اس مہم کی قیادت ولی عہد احمد شاہ کر رہا تھا۔ وین کو لداخ کے سکیور بوچن گاؤں میں لوگوں نے ایک درخت دکھایا جسے علی شیر خان ثانی نے ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد نصب کیا تھا۔ یہ پودا اب درخت بن چکا تھا۔

لداخ کے تاریخی ریکارڈ کے مطابق 1792ء میں شگر کے حکمران اعظم خان نے وزیر محمد سلطان کے خلاف لداخ سے امداد کی درخواست کی۔ لداخ کے گیالپو نے پوریگ اور لداخ سے ایک بڑی فوج ترتیب دی۔ لیکن سخت گرمی کی وجہ سے پیشقدمی ملتوی کی۔ اس دوران مذکرات کے ذریعے تنازعہ رفع ہو گیا۔ لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ علی شیر خان ثانی کا انتقال ہو گیا۔ علی شیر خان ثانی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے بہت سی نہریں تعمیر کیں اور بنجر زمینوں کو زیر کاشت لایا۔

احمد شاہ

1800ء تا 1840ء

علی شیر خان ثانی کے فوت ہونے پر اس کا بڑا بیٹا احمد شاہ 1800ء میں تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ کی مہر پر "علی شیر آں داور دادگر کز و یافت احمد بر اعداء ظفر" مرقوم تھا۔ احمد شاہ تخت نشینی کے وقت نوجوان تھا۔ اس کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ماتحت راجاؤں نے سرکشی

کرنا شروع کی اور اس کی حکومت کے بہت سے ابتدائی سال بغاوتوں کے فرد کرنے میں گزر گئے۔شگر کا قلعہ گیارہ سال اس کے اقتدار سے باہر رہا۔اس نے محاصرہ کیا اور آخر میں قلعہ کے اندر فاقوں کی نوبت آ گئی تو قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور شگر اس کے زیرنگیں آ گیا۔ حشمت اللہ نے تاریخ جموں میں لکھا ہے کہ شگر میں تخت نشینی کے جھگڑے میں خپلو کی فوج کی مدد سے اعظم خان تین بار شگر کی حکومت پر قابض ہوا اور سکردو کی مداخلت سے تین بار قلی خان شگر کے تخت پر بیٹھا۔ان لڑائیوں میں لداخ ہمیشہ حسب سابق خپلو کا طرف دار رہا۔لداخ کی تاریخ میں مذکور ہے کہ بلتیوں کے ساتھ ایک جنگ 1804ء میں ہوئی۔اس بار سکردو کی فوج کی قیادت وزیر محمد سلطان کر رہا تھا۔اس بار مذاکرات سے تنازعہ رفع ہوا۔1806ء میں پھر ایک جنگ ہوئی۔اس بار بھی مذاکرات سے مسئلہ حل ہوا۔1810ء میں احمد شاہ نے شگر قلعے کا محاصرہ کیا۔اسی محاصرے کے نتیجے میں شگر بالآخر فتح ہوا تھا۔شگر کی فتح کے بعد احمد شاہ نے 1811ء میں خپلو پر حملہ کر دیا۔لداخی فوج خپلو کی مدد کے لئے پہنچ گئی اور شدید لڑائیوں کے بعد عارضی طور پر امن قائم ہو گیا۔احمد شاہ نے وین کو بتایا کہ خپلو کی مہم کے دوران شگر نالے کے راستے فوج بھیجی تھی اور حملہ کامیاب رہا تھا۔ لداخی ریکارڈ کے مطابق بلتیوں کے خلاف ان جنگوں میں سے ایک کے دوران لداخی سوار دستہ تیر وکمان سے مسلح تھا لیکن پیدل فوج کے دس سپاہیوں کے بیچ میں ایک دیسی بندوق تھی۔بڈلف نے بھی لداخ کے ساتھ سکردو کی جنگوں کا ذکر کیا ہے۔

اس وقت خپلو میں محمد علی خان کا بیٹا یحییٰ خان حکمران تھا۔اسی دوران شگر کا اعظم خان فوت ہو گیا۔اعظم خان نے اپنی جلاوطنی کے دوران خپلو میں ایک فاچو کی بیٹی سے شادی کی تھی۔اس سے اس کے دو بیٹے حیدر خان وحاتم خان اور دو بیٹیاں دولت خاتون اور حلیمہ خاتون پیدا ہوئیں۔اعظم خان کی وفات پر حیدر خان اس کی جگہ حکمران ہو گیا۔قلی خان نے موقع پا کر تیسری بار شگر کی حکومت حاصل کی۔لیکن موت نے اسے فرصت نہ دی۔اسی دوران اعظم خان کی بیٹی دولت خاتون پر احمد شاہ کی نظر پڑ گئی جو حسن وجمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی اور اس سے شادی کر لی۔اب احمد شاہ نے اعظم خان کے بیٹے حیدر خان کو شگر کا برائے نام راجہ بنا کر حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔

1812ء میں خپلو کا راجہ یحییٰ خان فوت ہو گیا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ دولت علی خان، مہدی علی خان اور محمد شاہ۔ مہدی علی خان نے لداخ کے راجہ کی مدد سے حکومت پر قبضہ کیا اور اپنے دونوں بھائیوں کو قید کر کے لداخ بھیج دیا۔ راجہ لداخ نے انہیں نوبراہ میں نظر بند کر دیا۔ اس حمایت کے بدلے میں اس نے چھور بٹ کا علاقہ راجہ لداخ کو دیدیا۔ اسی دوران دولت علی خان کا بیٹا محمد علی خان گنگچھے کے راستے بھاگ کر کھرمنگ پہنچا اور وہاں سے احمد شاہ کے پاس فریاد لے کر حاضر ہوا۔ احمد شاہ خپلو کے ساتھ حالت جنگ میں تھا ہی۔ اسی اثناء میں اہل خپلو نے پرکوتہ پر بھی دست اندازی کی۔ چنانچہ احمد شاہ نے محمد علی خان کی حمایت کے بہانے اپنے بھتیجے عبدال کی سرکردگی میں خپلو پر لشکر کشی کی۔ عبدال نے کریس کو فتح کرنے کے بعد خپلو پر دھاوا بول دیا۔ مہدی علی خان کی مدد کے لئے لداخ سے بھی فوج پہنچ گئی۔ مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں سکردو کی فوج کو شکست ہوگئی اور عبدال سمیت تمام سرداران لشکر قید ہو گئے۔ لداخ کے ریکارڈ کے مطابق یہ 1815ء کا واقعہ ہے۔ عبدال کو نوبراہ میں موضع ڈگر کی آبادی ٹانیار کے محلہ یارمہان میں قید کر دیا۔ احمد شاہ کو اس شکست پر بڑا رنج ہوا اور سفارت کے ذریعے قیدیوں کو چھڑوانے کی کوشش میں لگ گیا۔ ملا جابر ساکن کریس کو اس کام پر مامور کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر سارے قیدی چھوڑ دیئے جائیں تو میں کبھی بھی پھونگ نق پڑی سے اوپر کی طرف دست اندازی نہ کروں گا۔ مگر مہدی نے قیدیوں کو چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ احمد شاہ نے اپنے قیدیوں کو رہائی دلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر مہدی اس پر راضی نہ ہوا۔ بالآخر احمد شاہ نے عبدال کی رہائی کے لئے ملا جابر کے ذریعے اس کے وزن کے برابر سونا دینے کی پیش کش کی۔ اسے بھی مہدی نے قبول نہ کیا۔ بلکہ اسی دوران اس نے عبدال کے دماغ میں بقولے دل میں میخ ٹھونک کر قید خانہ ہی میں اس کا کام تمام کر دیا اور وہیں اس کو دفن کر دیا۔

یہ حال جب احمد شاہ کو معلوم ہوا تو وہ بہت برہم ہوا۔ انتقام لینے کے لئے اس نے بڑے پیمانے پر تیاری کی اور ایک بہت بڑا لشکر جمع کر کے خود خپلو پر حملہ آور ہوا۔ اس دوران دولت علی خان اور محمد شاہ کے حامی خپلو کے لوگ بھی احمد شاہ سے آملے۔ کہتے ہیں کہ اس نے تھور سے کھر کا محاصرہ کیا اور قلعہ کی طرف پانی بند کر دیا۔ غرض اس نے مہدی کو شکست دے کر قید کر لیا اور خپلو کا

سکردو کے ساتھ الحاق کر کے وہاں یول ستر ونگ کریم کو حاکم چھلو اور اس کے بھائی رستم کو اس کا نائب مقرر کر دیا۔ مہدی اور دیگر چھلو اور لداخ کے قیدیوں کو ساتھ لے کر خود سکردو واپس ہوا۔ سکردو میں مہدی کو غوتی چنگرا کے تیرہ وتاریک کنویں میں قید کیا اور مساوی الوزن آٹے اور نمک کی روٹی اور ایک پیالہ پانی اس کی روزانہ خوارک مقرر کی۔ آخر کار مہدی سخت اذیتوں میں مبتلا رہ کر اسی زندان میں فوت ہو گیا۔ یہ واقعہ تقریباً 1819ء کا ہے۔

24 اکتوبر 1820ء کو ولیم مورکرافٹ لداخ پہنچا تو اس وقت چھلو پر احمد شاہ کی حکومت تھی۔ مورکرافٹ حیوانات کا ڈاکٹر تھا جس نے ڈاکٹری کا امتحان بھی پاس کیا ہوا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمہ افزائش حیوانات میں ملازم تھا جو 20 ستمبر 1822 تک لیہ میں مقیم رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ چھلو پہلے لداخ کا علاقہ تھا اب اس پر احمد شاہ کا قبضہ ہے۔ جان کی (JOHN KEAY) لکھتا ہے کہ احمد شاہ ایک مثالی حکمران کی حیثیت سے مشہور تھا۔ وہ اپنی رعایا میں بیحد مقبول تھا اور اس کے ہمسائے اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ لداخ بہت زیادہ خوفزدہ ہونے لگا تھا۔ چنانچہ 1822ء میں لداخ کے وزیر اعظم نے کشمیر کے سکھ گورنر کو اطلاع دی کہ لداخ پر سکردو کے حکمران احمد شاہ کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو کشمیر سے امداد کی درخواست کی جائے گی۔ مورکرافٹ کا بیان ہے کہ جب وہ لداخ پہنچا تو احمد شاہ کے جاسوس کارندے پوریگ میں لوگوں کو لداخ سے منحرف کرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت یہ افواہ زوروں پر تھی کہ پشکم اور سوت کے حکمرانوں نے لداخ کا جوا اتار پھینکنے اور احمد شاہ کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

احمد شاہ کی حکومت سکردو، کھرمنگ، شگر، چھلو، روندو، شنگھو شگر اور استور پر تھی۔ پہلے نگر بھی اس کا باج گزار تھا بعد میں اس کے تسلط سے آزاد ہو گیا تھا۔ روندو میں ہراموش بھی شامل تھا۔

شاہ سلطان مقپون احمد شاہ کی طرف سے استور کا حاکم تھا جو احمد شاہ کا بہنوئی تھا۔ اس کے گلگت کے راجہ کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ یہ بات احمد شاہ کو پسند نہ تھی۔ اس کی تنبیہ کی خاطر احمد شاہ نے اسے سکردو بلا بھیجا۔ شاہ سلطان نے بہانہ کر کے آنے سے گریز کیا تو احمد شاہ نے بذات خود حملہ کر کے اسے سکردو میں کواردو کے مقام پر قید کر دیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ استور

میں اپنے بیٹے محمد شاہ کو گورنر مقرر کر دیا۔ یہ 1823ء اور 1828ء کے دوران کا واقعہ ہے۔ اس دوران یسین کے راجہ سلیمان شاہ نے گلگت پر قبضہ کرنے کے بعد بونجی پر حملہ کر دیا جو استور کا علاقہ تھا۔ استور کے حاکم نے اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ لیکن دوسری بار اس نے پھر حملہ کیا اور کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد بونجی پر قابض ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ احمد شاہ اپنے بیٹے محمد شاہ کی حکمرانی کی صلاحیتوں سے مطمئن نہ تھا۔ بونجی کے اس واقعہ پر برہم ہو کر اس نے محمد شاہ کو گورنری سے ہٹا کر شاہ سلطان کے بیٹے جبار خان کو استور کا حاکم مقرر کیا جس نے بونجی کو دوبارہ اپنے قبضے میں لیا۔ جب جی ٹی وین 38-1837ء کے دوران بونجی پہنچا اس وقت یہ گاؤں احمد شاہ کے قبضے میں تھا۔

احمد شاہ کی نظروں کے سامنے 1799ء میں لاہور میں سکھ سلطنت کا ظہور ہوا۔ اور 1819ء میں رنجیت سنگھ نے افغانیوں کو شکست دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا جس کے ساتھ ہی پنجاب کی سکھ سلطنت کی سرحدیں بلتستان سے آملیں۔ اس وقت سے احمد شاہ سکھوں کی طرف سے حملے کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے اس نے انگریزوں سے رابطہ قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ 22-1820ء کے دوران ولیم مورکرافٹ لداخ میں تھا۔ احمد شاہ نے اس کے پاس خط کے ساتھ ایلچی بھیج کر اس سے رابطہ قائم کیا۔ رنجیت سنگھ کو اپنے مخبروں کے ذریعے اس رابطے کا علم ہو گیا۔ احمد شاہ سے رابطے کی وجہ سے وہ مورکرافٹ سے سخت ناراض تھا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کی شکایت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے مورکرافٹ کی سرزنش کی۔ اس کے بعد مئی 1831ء میں فرانسیسی علم نباتات کا ماہر جیکوئی مونٹ (JACQUEMONT) سری نگر پہنچا۔ احمد شاہ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوا تو ایک جوڑا بارہ سنگا تحفے کے ساتھ خط دے کر اس کے پاس اپنا ایلچی بھیج دیا۔ احمد شاہ نے غلطی سے اسے انگریز خیال کیا تھا۔ ایلچی نے واضح طور پر اسے بتایا کہ احمد شاہ انگریزوں کا طرف دار ہے اور سکھوں سے نفرت کرتا ہے اور انگریزوں سے ان کے خلاف مدد کی توقع رکھتا ہے۔ جیکوئی مونٹ فرانسیسی تھا۔ احمد شاہ کے انگریزوں کے حلیف ہونے کی خبر سن کر اسے کیا خوشی ہوئی تھی۔ رنجیت سنگھ کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ رنجیت سنگھ کے جاسوس اس کے ارد گرد موجود ہیں اور رنجیت سنگھ کو اس واقعہ کی خبر ملنا یقینی ہے۔ مورکرافٹ

کے واقعہ کا بھی اسے علم تھا۔ چنانچہ اس نے رنجیت سنگھ کو اس واقعہ کی رپورٹ کر دی۔ دو ماہ بعد احمد شاہ کی طرف سے پھر اس کے پاس ایلچی پہنچا۔ اس نے احمد شاہ کو سلام کے ساتھ پیغام بھیجا کہ اس کا کام صرف سائنسی تحقیق تک محدود ہے۔ اس بار اس نے رنجیت سنگھ کو ایک مفصل رپورٹ بھیج دی۔ اکتوبر 1832ء میں جوزف وولف (JOSEF WOLF) سری نگر پہنچا۔ وہ بلتستان آنا چاہتا تھا لیکن برف سے گھبرا کر واپس چلا گیا۔ احمد شاہ نے اس کے پاس بھی آدمی بھیجے تا کہ اسے سکردو لائیں۔ رنجیت سنگھ کو اس کی بھی اطلاع مل گئی۔ سکھوں کے خلاف احمد شاہ کی سرگرمیوں کی ان رپورٹوں کی وجہ سے 1833ء میں بلتستان پر سکھوں نے حملے کا آغاز کر دیا۔ اس وقت رنجیت سنگھ کا بیٹا شہزادہ شیر سنگھ کشمیر کا صوبیدار تھا۔ محمد دین فوق نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:

> ''ادھر ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی ادھر پنڈت گنیش راجہ سکردو سے جنگ وجدل میں مصروف تھا۔ آخر پنڈت کامیاب ہوا اور راجہ نے دربار خالصہ کا باجگذار ہونا قبول کیا۔ واپسی پر راستے میں کوہستان حصورہ میں بلور کی ایک کان ملی جہاں پہرے مقرر کر دیئے اور بہت سے ٹکڑے بلور کے شہزادہ کی خدمت میں پیش کئے۔ شیر سنگھ وسعت ملک اور دریافت کان سے بہت مسرور ہوا اور اسے صاحب کاری کا عہدہ عطا کیا،،

اس واقعہ کے صرف دو سال بعد انگریز سیاح جی ٹی وین اسی راستے سے سکردو آیا۔ وہ اس قصے کو یوں بیان کرتا ہے:

> ''جب پنجاب کا موجودہ مہاراجہ شیر سنگھ کشمیر کا گورنر تھا، اگست کے مہینے میں اپنی حملہ آور فوج لے کر وہ اس توقع کے ساتھ سکردو کی طرف بڑھا کہ وہ بغیر کسی بڑی مزاحمت کے سکردو پہنچ جائیں گے۔ مگر انہیں سامنے سے ایک تیز دریا کا اور دریا پار کی ہر چٹان کے پیچھے سے ایک بندوق کا سامنا ہوا۔ انہوں نے سفارت کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن احمد شاہ ان کے لئے بہت چالاک نکلا۔ احمد شاہ نے یہ جانتے ہوئے کہ اس طرح وقت گزرنے

کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں انہیں مصروف رکھا۔ پھر اچانک سرد موسم شروع ہوا۔ سردی کی شدت نے سکھوں کو گرفت میں لیا تو انتہائی عجلت میں انہوں نے پسپائی اختیار کی۔ لیکن ایک برفانی طوفان نے آگھیرا اور یوں بر زل کے اوپر ان کی سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔،،

یہ واقعہ استور میں گودائی کے مقام پر پیش آیا تھا اور سکھ فوج وہیں سے واپس چلی گئی تھی۔

اس زمانے میں علی شیر خان کھر منگ کا راجہ تھا جو احمد شاہ کا بھانجا اور داماد تھا۔ احمد شاہ کی بیٹی شاہ جہاں بیگم اس کے عقد میں تھی جس سے اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اسی دوران علی شیر خان نے سید حسین کھر منگ کی بیٹی فضہ بیگم سے بھی شادی کی۔ کہتے ہیں کہ علی شیر خان کے باغیانہ رویئے کی وجہ سے احمد شاہ پہلے ہی اس سے ناخوش تھا۔ شاہ جہاں بیگم کی موجودگی میں دوسری شادی کو احمد شاہ نے اپنی توہین سمجھا۔ چنانچہ اس کی تادیب کے لئے اپنے ولیعہد شاہ مراد کی سرکردگی میں کھر منگ پر فوج کشی کی۔ علی شیر خان اہل وعیال اور زر و مال سب کچھ چھوڑ کر فرار ہوا اور لداخ کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ اہل وعیال کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ شاہ مراد اپنی بہن کو بے عزت نہیں کرے گا۔ یہ 1835ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے۔

کھر منگ کی مہم سے واپسی پر ولیعہد شاہ مراد بخار میں مبتلا ہو کر اگست 1835ء میں فوت ہو گیا۔ وہ انتہائی لائق اور ذہین نوجوان تھا۔ اس کی موت پر ہر کسی کو افسوس ہوا۔ 7 ستمبر 1835ء کو انگریز سیاح جی ٹی وین سکردو پہنچا۔ وہ افسوس کرتا ہے کہ اگر میں ایک ماہ پہلے یہاں پہنچا ہوتا تو شاید ایک چھوٹی سی یورپی دوائی کے ذریعے شاہ مراد کی جان بچا سکتا۔ شاہ مراد کے بعد احمد شاہ کے باقی بیٹوں میں محمد شاہ سب سے بڑا تھا اور اصول جانشینی کے تحت اسے ولیعہد مقرر کیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن محمد شاہ اس سے قبل استور میں گورنر رہ چکا تھا اور احمد شاہ اس کی حکمرانی کی صلاحیتوں سے مطمئن نہ تھا۔ دوسری طرف سکردو کی محلاتی سازشوں میں احمد شاہ کی دوسری رانی دولت خاتون کا بڑا رسوخ تھا جو حیدر خان راجہ شگر کی ہمشیرہ تھی۔ دولت خاتون نے محمد شاہ کی بجائے اپنے بیٹے محمد علی خان کو ولیعہد مقرر کرنے کے لئے احمد شاہ پر دباؤ ڈالا۔ محمد شاہ کی ماں پہلے فوت ہو چکی تھی۔ چنانچہ

احمد شاہ نے محمد شاہ کو چھوڑ کر محمد علی خان کو ولیعہد مقرر کر دیا جو 1835ء میں بارہ سال کی عمر کا تھا۔ محمد علی خان چست، ذہین اور بہت ہی لائق لڑکا تھا۔ 1836ء میں تیرہ سال کی عمر میں مقپون دستور کے مطابق شگری کے بردوسنیا س پتھر پر اس کی تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔

ولیعہدی سے محرومی پر محمد شاہ 1836ء میں اپنے ہمدرد ڈغونی یا وزیر بونو کے ہمراہ اپنی رگیا سر کی رہائش گاہ سے فرار ہو گیا۔ اور دیوسائی کے راستے کشمیر جا پہنچا۔ کشمیر کے سکھ صوبیدار نے اسے رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیج دیا۔ رنجیت سنگھ چونکہ اپنے ماتحت راجہ گلاب سنگھ کو لداخ کو فتح کرنے کی اجازت دے چکا تھا اس لئے ان علاقوں میں مداخلت نامناسب خیال کر کے اس نے محمد شاہ کو گلاب سنگھ کے پاس جموں بھیج دیا۔ گلاب سنگھ نے اسے زورآور سنگھ کے پاس روانہ کر دیا جو لداخ میں بغاوت فرو کرنے کے لئے ستمبر 1837ء میں سورو پہنچ چکا تھا۔ محمد شاہ کے آنے پر زورآور سنگھ بہت خوش ہوا کیونکہ بلتستان میں مداخلت کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ اس نے وقتی طور پر محمد شاہ کو لداخ کے راجہ کے سپرد کیا تاکہ بعد میں مناسب موقع پر اس کی امداد کے بہانے بلتستان پر حملہ کر سکے۔ فی الحال لداخ کی طرف سے مکمل فراغت تک وہ احمد شاہ کے ساتھ الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

1836ء میں کھرمنگ کا راجہ علی شیر خان بھی لداخ میں پناہ لئے ہوئے تھا۔ اسی سال شاہ جہاں بیگم کی درخواست پر احمد شاہ نے علی شیر خان کو کھرمنگ واپس بلا لیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں احمد شاہ کے خلاف کینہ میں کوئی کمی نہ آئی اور در پردہ اس کی تباہی کے درپے رہا۔ 1837ء میں زورآور سنگھ کی آمد کی خبر سن کر اس نے اپنے دودھ بھائی وزیر غلام حسین نقتولو پا اور فضل علی دفتری کو خفیہ طور پر زورآور سنگھ کے پاس بھیجا اور اپنی مصیبت سے اسے آگاہ کر کے اس کا معتمد بن گیا۔ یہ واقعہ 18 رمضان المبارک 1253ھ (دسمبر 1837ء) کا ہے۔ بعد میں یکم ذی الحجہ 1253ھ بروز جمعرات (فروری 1838ء میں) علی شیر خان نے خود بھی زورآور سنگھ سے ملاقات کی اور اسے بلتستان پر حملے کی دعوت دے کر اپنی طرف سے ہر طرح کی امداد کا یقین دلایا۔

احمد شاہ سکھوں کی طرف سے حملے کے خطرے کو برابر محسوس کر رہا تھا۔ اسے ٹالنے کے لئے وہ پچھلے ڈیڑھ عشرے سے انگریزوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا لیکن

ابھی تک وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ لانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت لدھیانہ میں انگریزوں کی ایک پولیٹکل ایجنسی تھی جہاں کیپٹن ویڈ (WADE) نامی ایک انگریز پولیٹکل ایجنٹ تعینات تھا۔ احمد شاہ نے اسے خط لکھا کہ انگریز حکومت اپنا کوئی نمائندہ بلتستان بھیجے۔ کیپٹن ویڈ نے گاڈفرے تھومس وین (GODFREY THOMAS VIGNE) کو اس خط کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا اور فوراً وین نے سفر بلتستان کا ارادہ کیا۔ احمد شاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی نمایندے کو سکردو میں لاکر سکھوں پر یہ تأثر دینا چاہتا تھا کہ وہ انگریزوں کا حلیف یا باجگذار ہے تاکہ سکھ بلتستان پر حملے سے باز رہیں۔ لیکن انگریز رنجیت سنگھ کی سلطنت کو ہڑپ کرنے کے لئے اس کی موت کا انتظار کررہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ ان سارے علاقوں پر ان کا اقتدار قائم ہونے والا ہے۔ 1835ء میں لداخ پر ڈوگروں نے قبضہ کیا تو گیالپو لداخ کا بیٹا چھوغسفرول ماں سمیت بھاگ کر سپتی کے راستے شملہ گیا اور نواب گورنر جنرل بہادر سے اس نے شکایت کی کہ مہاراجہ جموں نے ہم سے ہمارا ملک چھین لیا ہے۔ ہماری مدد کیجئے۔ اسے انگریزوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ''لاہور کا بادشاہ انگریز سرکار کا دوست ہے اس کے خلاف امداد نہیں دی جاسکتی۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے کہ تمہارا ملک بھی ہمارے قبضے میں ہوگا۔ اس وقت ہم تمہارا ملک تمہیں واپس کر دیں گے۔ فی الحال ٹھہرو تمہیں رسد دی جائے گی۔،، لہٰذا بلتستان میں بے وقت مداخلت انگریزوں کے مفاد کے حوالے سے بے معنی سی بات تھی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ بلتستان نہ پہنچا بلکہ جی ٹی وین (1801-63ء) سیاحت کے شوق میں ستمبر 1835ء میں وارد سکردو ہوا۔ سکھوں کو یہ بھی گوارا نہ تھا اور کشمیر میں ان کے کارندوں نے اسے بلتستان آنے سے روکنے کے لئے ہر ممکن تدبیر پر عمل کیا۔ لیکن احمد شاہ کے آدمی سرینگر پہنچ چکے تھے۔ وہ اسے کھینچ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ کیونکہ کسی انگریز کی یہاں موجودگی سے سکھوں کے ان علاقوں کی تسخیر کے پروگرام میں تاخیر ہوسکتی تھی جس کا گلاب سنگھ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ اور رنجیت سنگھ اس کی اجازت بھی دے چکا تھا۔

جی ٹی وین ستمبر 1835ء میں بلتستان میں داخل ہوا تو اس وقت احمد شاہ دیوسائی میں ڈاکوؤں کے خلاف ایک مہم میں مصروف تھا جو شنگھو شگر کے علاقوں سے بھیڑ بکری اور دوسرے

مویشیوں کو لوٹ کر لے جانے اور انسانوں کو بھی پکڑ کر لے جانے آئے تھے۔اس زمانے میں ان ڈاکوؤں کی وارداتیں عام تھیں جو وادی سندھ میں کوہستان کے علاقوں سے آتے تھے۔ای ایف نائٹ کا کہنا ہے کہ یہ ڈاکو شیعوں کو پکڑ کر لے جاتے اور قتل کرتے تھے جبکہ سنیوں کو پکڑ کر لے جاتے اور تاحیات غلام بنا کر رکھتے تھے اور اگر کنجوتی (ہنزہ کے) ڈاکوؤں کے ہاتھ کوئی پھنستا تو وہ اسے وسطی ایشیا میں لے جا کر فروخت کرتے تھے۔احمد شاہ نے اس سلسلے کا قلع قمع کرنے کے لئے 1835ء میں خود ڈاکوؤں کے خلاف فوجی مہم کی قیادت کی۔یہ ڈاکو کوہلی پالس تک کے علاقوں سے آئے تھے۔جنگی مہموں میں عموماً مقپون فوج کا سردار راجہ کا بیٹا ہوتا تھا۔اس کے نیچے دو وزیر ہوتے اور ہر وزیر کے نیچے متعدد ترانگپے (نمبردار) اور ہر ترانگپہ کے نیچے ہر ایک سو یول (ایک یول = 24 کنال زیر کاشت زمین) کے لئے افسر ہوتا تھا۔

1835ء میں ایک روسی جاسوس ایرانی شیعہ کے بھیس میں شگر میں احمد شاہ کے دربار میں پہنچا۔روسی حکومت آرمینیائی مسلمانوں کو مشرقی علاقوں میں جاسوسی کے لئے استعمال کرتی تھی۔ اس سے پہلے 1814ء میں میکھتی رافے لوف نامی ایک روسی یہودی جاسوس آغا مہدی کے نام سے لداخ کے راجہ کے نام شہنشاہ روس کا خط لے کر لیہ پہنچا تھا۔اس زمانے میں شاہ چترال کا پوتا اپنے بیٹے کے ساتھ احمد شاہ کی پناہ میں آیا ہوا تھا اور شگر میں مقیم تھا۔یہ لوگ اپنی زبان میں بلتیوں کو بولون زیگ کہتے تھے۔اس کی زبانی جی ٹی وین کو معلوم ہوا کہ چترال قلعہ کے سامنے جو پل ہے اسے بلتستان کے ایک راجہ نے تعمیر کیا تھا۔اسی لئے اسے بَوپُل کہتے تھے۔

مئی 1835ء میں لداخ کو زورآور سنگھ نے فتح کرلیا۔لداخیوں کی مزاحمت جاری تھی۔ اسی دوران انگریز ڈاکٹر ہنڈرسن (HENDERSON) کمپنی کی اجازت کے بغیر لداخ پہنچا۔ لداخیوں نے اسے رحمت کا فرشتہ خیال کر کے زبردستی لیہ میں پکڑ رکھا اس امید پر کہ ایک انگریز نمایندے کی موجودگی میں ڈوگرے لداخ پر قبضہ نہ کرسکیں۔اس اثناء میں ہنڈرسن کسی طرح سے لیہ سے بھاگنے میں کامیاب ہوا اور گھوڑے، سامان اور نوکر چاکر سب کچھ چھوڑ کر بلتستان پہنچا۔ بلتیوں نے نومبر 1835ء میں ہمالیہ عبور کرنے میں اسے مدد دی۔یہ واقعہ جی ٹی وین کے سکردو سے

واپس جانے کے فوراً بعد پیش آیا۔

1835ء کے اواخر میں کئی سو ڈوگرہ فوجیوں نے لداخیوں کے ہمراہ درۂ ہنو سے آ کر اچانک چھوربٹ قلعہ پر حملہ کیا۔ احمد شاہ کے سپاہیوں نے اپنے مورچوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر اس فوج کو درہم برہم کر دیا جس سے ڈوگرہ فوج بھاگ گئی اور لداخیوں کو قید کر کے سکردو لایا گیا۔ بعد میں انہیں چھوڑ دیا گیا۔

1837ء میں وین دوسری مرتبہ بلتستان پہنچا۔ اس بار وہ سکردو سے لداخ بھی گیا۔ لیکن ادھر متعین گلاب سنگھ کے آدمیوں نے خوب بدسلوکی کر کے اسے وہاں سے بھگا دیا تاکہ اسے لداخ کے بارے میں کسی قسم کی بھی تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوں۔ گلاب سنگھ کو ڈر تھا کہ وین رنجیت سنگھ کو صحیح معلومات فراہم کرے گا جس کے نتیجے میں رنجیت سنگھ اس سے مال و زر کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ وین رنجیت سنگھ کا احترام کرتا تھا لیکن گلاب سنگھ سے سخت نفرت کرتا تھا۔ گلاب سنگھ سخت ظالم شخص تھا جو اپنے قیدیوں کی زندہ کھال اتروا تا تھا۔ تبت سے لاہور تک ساری رعایا اس سے نفرت کرتی تھی۔

وین بلتستان میں تیسری اور آخری بار 1838ء میں آیا اور اسی سال نومبر میں ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ احمد شاہ آخری دم تک اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا آدمی سمجھتا رہا۔ اس بار انگریز ڈاکٹر فالکونر (FALCONER) بھی بلتستان پہنچا۔ ان دونوں نے احمد شاہ کو اس بات پر منوانے کی کوشش کی کہ اسے خود یا اس کے بیٹوں کو یا رعایا کو چیچک کے خلاف ٹیکہ لگوائے لیکن اس نے نہ مانا۔ احمد شاہ کے بارے میں وین کہتا ہے کہ جب وہ 1835ء میں سکردو پہنچا اس وقت احمد شاہ کی عمر 65 اور 70 سال کے درمیان تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا اور وہ جسمانی طور پر بلتستان کے قد آور ترین لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ سے بندوق کی نالی توڑ سکتا تھا۔

لدھیانہ میں کیپٹن ویڈ احمد شاہ کا ہمدرد بیٹھا ہوا تھا۔ کمپنی کی طرف سے بلتستان میں کوئی نمائندہ بھیجنا اس کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے 1836ء میں سرویئر جنرل کو ایک دلچسپ خط لکھا کہ سروے کے لئے ان علاقوں میں آدمی رکھے۔ وین بھی احمد شاہ کو بہت چاہنے لگا تھا۔ ان دونوں کی کوشش تھی کہ بلتستان میں انگریزوں کے مفاد کا کوئی اہم پہلو دریافت کر لیں تاکہ

انگریزوں کی اس علاقے میں فوری مداخلت ناگزیر ہو جائے۔ 1835ء میں شگر میں روسی جاسوس کی موجودگی کی رپورٹ وائسرائے کو بھیج دی تھی۔ اسے بلتستان کی طرف روس کے توسیعی عزائم سے جوڑنے کے لئے وین نے بہت کوشش کی کہ خوقند کی طرف سے قراقرم کے پار بلتستان کی طرف راستے کا کھوج لگائے۔ لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود اس حوالے سے بلتستان کی اہمیت ثابت کرنے میں انہیں ناکامی کا سامنا ہوا۔ اسی اثناء میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل کو 1838ء میں افغانستان پر حملے میں رنجیت سنگھ کے تعاون کی ضرورت در پیش ہوئی۔ اس تعاون کی قیمت کے طور پر انگریزوں نے لداخ پر رنجیت سنگھ کے حق کو تسلیم کرنے کے علاوہ بلتستان سمیت اس طرف کے دوسرے پہاڑی علاقوں میں مداخلت کا اسے کلی اختیار دیدیا۔ وین کے خیال میں اس علاقے میں چند انگریزوں کی وقتاً فوقتاً آمدورفت کی وجہ سے ڈوگروں کے حملے میں اب تک تاخیر ہوئی تھی۔ اب کوئی رکاوٹ حائل نہ رہی تھی۔ چنانچہ 1840ء میں ڈوگروں نے بلتستان پر فیصلہ کن حملہ کردیا۔

کھرمنگ

انٹھوک خاندان

کھرمنگ کے ابتدائی آبادکاروں کے بارے میں مقامی روایات یوں ہیں کہ درد قبیلے سے تعلق رکھنے والے چوانٹھوک نامی شخص نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آکر نالہ کندرک کے کنارے کھرمنگ خاص کو آباد کیا۔ یول ستر ونگ نامی شخص نے چلاس سے آکر سرلینگ کو اور نن چھے، تاموا اور حلبی تین بھائیوں نے چپلو سے آکر پرکوتہ (مہدی آباد) کو آباد کیا۔ چپلو ہی سے آکر مایور نے کرابہ تھنگ کو اور چندن نے پاری کو آباد کیا۔ یوسف پا اور اوماچیک پا کے اسلاف چترال سے اور کنگاس پا کے بزرگ چپلو سے آکر غندوس میں آباد ہوگئے۔ روندو سے آکر چومرسک نے غویس کو اور اس کے نوکر پلپل نے پلپلد کو آباد کیا۔ بعد میں چوانٹھوک نے مایور کو کرابہ تھنگ سے

نکال دیا تو اس نے مایوردو کو آباد کیا۔ چومرسک کے بیٹے لوبزانگ کو بھگا کر چوانٹھوک نے غویس اور پلپلدو پر قبضہ کیا تو لوبزانگ بانیچہ میں آباد ہوگیا۔ چوانٹھوک نے اپنی رہائش کے لئے کھرمنگ کی پہاڑی پر ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا۔ کرابہ تھنگ، غویس اور پلپلدو کے بعد اس نے غندوس اور پاری پر بھی قبضہ کرلیا اور کرتخشہ کے نام سے ایک چھوٹی سی حکومت قائم کرلی جو غویس سے پاری تک کے علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں اس کی اولاد نے پرکوتہ پر بھی قبضہ کرلیا اور اسے کرتخشہ میں شامل کرلیا۔ طولتی وغیرہ دیہات انہوں نے خود آباد کئے۔

لداخی دور

کرتخشہ اور پرکوتہ کے علاقوں پر عرصہ دراز تک انٹھوک خاندان کی حکومت قائم رہی۔ بعد میں لداخ نے حملہ کر کے ان علاقوں پر قبضہ کرلیا اور کھرمنگ، پاری اور مہدی آباد میں لداخی کھرپون بٹھائے۔ کھرمنگ کی پہاڑی پر انٹھوک کھر کے پہلو میں ان لداخی قلعہ داروں نے ایک محل تعمیر کیا جو بوتی کھر کہلاتا تھا۔ موضع پاری میں قلعہ کے نشانات اب تک بوتی چو کے نام سے موجود ہیں جو غالباً انہی ادوار کی تعمیرات ہیں۔ چونکہ کھرمنگ اور پاری کے لداخی دور کے محلات بوتی کھر اور بوتی چو کے ناموں سے معروف ہیں اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لداخی حملہ بلتستان میں اشاعت اسلام کے بعد ہوا تھا۔

سکردو کے ساتھ الحاق

1000ھ کے لگ بھگ علی شیر خان انچن نے کھرمنگ کو لداخ سے چھین کر سکردو میں شامل کرلیا اور کھرمنگ کے سابق حکمران خاندان انٹھوک کے سرکردہ حیدر کو جو اس وقت بروقپہ سنگے پا کی قوم سے کہلاتا تھا کھرمنگ کا حاکم مقرر کیا۔ حیدر کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا مرزا خان عامل کرتخشہ مقرر ہوا۔ جب سکردو میں عبدال خان برسراقتدار آیا تو اس نے پرکوتہ کو بھی مرزا خان کے سپرد کردیا۔ بعد میں 1637ء میں عبدال خان کی گرفتاری کے بعد آدم خان نے مرزا خان کو اپنے

وکیل کی حیثیت سے سکردو کا حکمران بنادیا۔1651ء میں آدم خان اور شاہ مراد نے ہندوستان سے واپس آ کر سکردو پر قبضہ کر لیا تو مرزا خان سکردو سے بھاگ کر کرتخشہ گیا اور دو سال تک ادھر خود مختارانہ حکومت کرتا رہا۔1653ء میں شاہ مراد نے کھرمنگ پر حملہ کر دیا۔ مرزا خان نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن جب مقابلہ بے سود نظر آیا تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کندرک نالہ کے راستے سے بھاگ کر چھور بٹ قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔شاہ مراد نے کھرمنگ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے تعاقب میں چپلو کے راستے فوج بھیج دی اور ملازوم کشی پا ساکن کھرمنگ، برچھا ساکن یورنگوت اور نقتولو پا ساکن پاری تین اقوام کے تین اشخاص کو نالہ کندرک کے راستے خفیہ طور پر مرزا خان کو گرفتار کرنے کی غرض سے بھیجا۔مرزا خان کے ملازموں میں ملازوم کشی پا کا سالہ بلدورو پا ساکن مایوردو بھی شامل تھا۔اس کی سازش سے ان تینوں نے مرزا خان کو رات کے وقت خواب کی حالت میں پکڑ لیا اور گرفتار کر کے براہ نالہ کندرک شاہ مراد کے پاس لے آئے۔شاہ مراد نے اسے کشمیر میں آدم خان کے پاس بھیج دیا۔آدم خان نے دہلی میں شاہ جہاں کے حضور روانہ کر دیا۔

شیر شاہ

1653ء تا1685ء

مرزا خان کو بھگانے کے بعد شگر کے راجہ امام قلی خان کے مشورے سے شاہ مراد نے اپنے چھوٹے بھائی شیر شاہ کو کھرمنگ کا حاکم مقرر کر دیا۔اس طرح کھرمنگ پر سکردو حکومت کے زیر تسلط مقپون خاندان کرتخشہ کی حکومت قائم ہو گئی۔شیر شاہ نے بوتی کھر کے ساتھ کشمیری کاریگروں کے ذریعے ایک نیا محل تعمیر کیا جس کا سوما کھر نام پڑ گیا۔انٹوک کھر اور بوتی کھر پہلے سے موجود تھے۔ انٹوک کھر کو مرزا خان نے بہت ترقی دی تھی اس لئے اسے مرزائی کھر بھی کہتے تھے۔شیر شاہ نے سوما کھر میں ایک زیارت گاہ تعمیر کی تھی جس میں موئے مبارک کو ایک صندوق میں رکھا گیا تھا۔کہتے ہیں کہ یہ موئے مبارک کشمیر سے ایک فقیر اپنے ساتھ لایا تھا۔شیر شاہ نے ترکتی کے بالمقابل دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر ایک نیا گاؤں بسایا اور اپنے چھوٹے بیٹے حمزہ خان کو گزارہ میں دیدیا۔

اسی لئے اس کا حمزہ گونڈ نام رکھا گیا۔ شیر شاہ کی حکومت چرکتی پڑی سے ایک طرف کرکت اور دوسری طرف غوٹھا چھوتک تھی۔ شنگھو، شغر اور دراس براہ راست سکردو حکومت کے ماتحت تھے۔ شاہ مراد کی وفات کے بعد شیر شاہ نے سکردو کی حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد شگر کے ساتھ خانہ جنگی شروع ہوئی جو کئی سالوں تک جاری رہی۔ 1681ء کے لگ بھگ اسے سکردو کی حکومت سے دست بردار ہو کر کھرمنگ پر قناعت کرنی پڑی۔ اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

عزیز خان و سعادت خان

1685ء تا 1735ء

شیر شاہ کے بعد اس کا بیٹا عزیز خان کھرمنگ کی حکومت پر متمکن ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سعادت خان حکمران ہوا۔ سعادت خان کی حکومت کے آخری دنوں میں لداخ کی فوج نے لامہ چو پا کالون کی سرکردگی میں کھرمنگ پر حملہ کر دیا اور سعادت خان اور اس کے بیٹوں کو جو سوما کھر میں موجود تھے قتل کر ڈالا۔ اس طرح کھرمنگ پر لداخ کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت سعادت خان کے دو چھوٹے بیٹے بانچہ گاؤں میں ان کے شیر پدر علی داد چو کے گھر میں رہ رہے تھے۔ علی داد چو نے بڑے بیٹے اعظم خان کو گداگر کے بھیس میں پوریگ کی طرف بھگا دیا اور چھوٹے بیٹے شیر خوار شاہ نواز کو چھپا کر اپنے گھر میں رکھا۔ بعد میں جب لامہ چو کو شاہ نواز کے بارے میں علم ہوا تو اس نے علی داد چو کو شاہ نواز کو پیش کرنے کا حکم دے دیا۔ علی داد چو نے شاہ نواز کی جگہ اسی عمر کا اپنا بچہ لامہ چو کے پاس حاضر کر دیا جسے باپ کی نظروں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔

لداخ کے اس حملے کے وقت راجہ سکردو کو اپنے اندرونی جھگڑوں سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے کھرمنگ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر راجہ پشکم نے دراس کو گنڈیال چھوتک اور شنگھو شغر کا سارا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔

اعظم خان نے گداگری کی حالت میں جا کر ملبہ میں ٹشی نمگیل کے پاس سائیس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ اس دوران اس نے بودھی رسم الخط سیکھا۔ بودھی علوم کی تعلیم حاصل کی

اور خاص طور پر طب میں مہارت حاصل کرلی۔ اسی اثناء میں ٹشی نمگیل کو اعظم خان کی اصلیت کے بارے میں شک ہو گیا تو اعظم خان نے لرجے یعنی حکیم کے بھیس میں راہ فرار اختیار کرلی اور یور بلتنگ میں ایک شخص برگن پا کے گھر میں پہنچ کر اسے اصل صورتحال بتادی اور برگن پا نے اسے پناہ دی۔ اعظم خان کی تلاش میں ملبہ سے آئے ہوئے آدمیوں کو اس نے یقین دلا کر واپس کیا کہ اعظم خان اس طرف نہیں آیا ہے۔ اعظم خان اس کے بعد تورغون میں اپنے خاندان کے قدیمی ملازم املی کے گھر آیا اور بایچہ میں علی داد چو کو خبر بھیجی۔ علی داد چو اسے بایچہ لے آیا۔ علی داد چو نے ایک طرف غویس میں لداخی حکومت کے عامل حسن محمد بوتی پا کو اور دوسری طرف لامہ چو کے وزیر من چونگ بوٹو کو اعتماد میں لیا۔ یہ دونوں مقپون خاندان کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ اعظم خان کی مدد کے لئے تیار ہو گئے اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے۔

اتفاق سے اسی دوران لامہ چو اور اس کے دونوں بھائی جذام میں مبتلا ہو گئے۔ وزیر من چونگ بوٹو نے اعظم خان کو لامہ لرجے کے بھیس میں ان کے علاج کے بہانے قلعہ میں لایا۔ دوسری طرف بلتی عوام کو بھی کسی بہانے سے جمع کیا۔ لامہ نے تینوں بھائیوں کو علاج کے بہانے سے محل کی اوپر کی منزل میں تین الگ الگ کمروں میں بٹھادیا اور رات کو ایک ایک کر کے کھڑکی سے رگون لدانگ کی طرف نیچے گرا کر ختم کر ڈالا۔ اس کے بعد بلتی عوام نے کھرمنگ میں موجود لداخیوں کو چن چن کر قتل کر ڈالا۔ صبح کے وقت اعظم خان کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا اور یوں کرتخشہ اور پرکوتہ پر اعظم خان غازی کی حکومت قائم ہوگئی۔

اعظم خان غازی

1720ء تا 1750ء

اعظم خان نے اپنے بھائی شاہ نواز کو پرکوتہ کا حاکم مقرر کیا اور علی داد چو کو بایچہ کا گاؤں بطور عطیہ دے دیا۔ علی داد چو کو کرتخشہ کی فوج کا سردار بھی مقرر کر دیا۔ برگن پا کو بھی انعام سے نوازا۔ بعد میں غازی کے پوتے محمد علی خان نے جب میموش تھنگ گاؤں کو آباد کیا تو یہ نیا گاؤں برگن پا کی

اولادکوان کے بزرگوں کی خدمات کے صلے میں دیدیا۔

لامہ چو کے زمانے میں گنوخ کو گرکون میں شامل کیا گیا تھا۔ اعظم خان گنوخ کو واپس حاصل نہ کرسکا اور لداخ کی طرف مورول پر کھرمنگ کی سرحد مقرر ہوئی۔ اعظم خان کے چار بیٹے تھے۔ عبدالرحیم خان، علی شاہ، مختہ خان اور عباس بیگ۔ عبدالرحیم ولی عہد تھا۔ علی شاہ کو طولتی گذارہ میں دیدیا۔ مختہ خان کو مایوردو اور عباس بیگ کو ردوس کر دیدیا۔ ردوس کر بعد میں عباس بیگ اک شغرن کے نام سے مشہور ہوا۔

عبدالرحیم خان

غازی کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبدالرحیم خان کھرمنگ کا راجہ بن گیا۔ اس کا بھائی مختہ خان گرمیوں میں جب دریائے سندھ نا قابل گزر ہو جاتا تو کرکت تک لوٹ مار مچاتا تھا اور سردیوں میں کھرمنگ پر بھی چڑھائی کرتا تھا۔ عبدالرحیم خان نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔

عبدالرحیم خان کے تین بیٹے تھے۔ اشرف خان، محمد علی خان اور مشرف خان۔ اشرف خان نے ترک دنیا کر کے زاہدانہ زندگی اختیار کر لی۔ محمد علی خان ولی عہد مقرر ہوا اور عبدالرحیم خان کے بعد راجہ ہوا۔ اس نے اولڈینگ، مورول، شری ثنگ، ترکتی اور میموش تھنگ کے دیہات آباد کئے۔ محمد علی خان کی دو رانیاں تھیں۔ ایک علی شیر خان ثانی راجہ سکردو کی بیٹی تھی اور دوسری عزیز خان ساکن کھرمنگ کی بیٹی تھی۔ اصل رانی سے اس کے چار بیٹے علی شیر خان، عبدالرحیم خان، امیرالدین خان اور حسن خان تھے۔ علی شیر خان ولی عہد مقرر ہوا۔ حسن خان حج کو گیا اور وہیں لاولد فوت ہوا۔

علی شیر خان

محمد علی خان کے بعد علی شیر خان راجہ ہوا۔ اس کی پہلی بیوی شاہجہاں بیگم احمد شاہ راجہ سکردو کی بیٹی تھی۔ اس سے اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس وجہ سے اس نے شاہجہاں بیگم کے اوپر فضہ بیگم دختر سید حسین ساکن کھرمنگ سے شادی کر لی۔ راجہ احمد شاہ علی شیر خان کے باغیانہ رویئے کی وجہ سے اس

سے ناخوش تھا۔ کہتے ہیں کہ علی شیر خان کی دوسری شادی کے فعل کو اس نے اپنی توہین سمجھا۔ چنانچہ 1835ء میں اپنے ولی عہد شاہ مراد کی سرکردگی میں ایک فوج بھیج کر کھرمنگ پر حملہ کر دیا۔ علی شیر خان بھاگ کر لداخ میں پناہ گزین ہو گیا۔ بعد میں طولتی کے احمد خان کے ذریعے شاہجہان بیگم کی درخواست پر احمد شاہ نے علی شیر خان کو واپس بلا لیا۔ لیکن علی شیر خان اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے بیتاب رہا اور خفیہ طور پر اس نے ڈوگرہ فوج کے جرنیل زور آور سنگھ سے ملاقات کر کے اسے بلتستان پر حملے کی دعوت دے کر اپنی طرف سے تعاون کا یقین دلایا۔ بعد میں جنوری 1840ء میں زور آور سنگھ کے حملہ بلتستان کے وقت اور 1842ء میں وزیر لکھپت کی تحریک آزادی کو کچلنے کی مہم میں علی شیر خان نے ڈوگروں کی رہبری اور مدد کی جس کی تفصیل بعد میں بیان ہو گی۔

شگر

قدیم حکمران خاندان

شگر وادی کے ابتدائی آبادکاروں کے بارے میں حشمت اللہ خان لکھتے ہیں کہ وسط ایشیا کے لوگوں نے سلسلہ قراقرم کو عبور کر کے ایک طرف برالدو کے راستے اور دوسری طرف گلگت، ہنزہ اور نگر سے ہوتے ہوئے باشہ کے راستے آ کر شگر میں آبادکاری کا آغاز کیا تھا۔ ابتداء میں انہوں نے غوڑو چو کو آباد کیا اور ادھر گیا کھانگ کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد برالدو، باشہ اور پائینی شگر میں مختلف اطراف میں آبادی پھیلتی گئی۔ گیا کھانگ کے خاندان کے ایک راجہ تستے چو نے تھومل میں واقع گرم چشمہ کے نزدیک ایک عالیشان قلعہ تعمیر کر کے ادھر سکونت اختیار کی۔ یہ قلعہ لاچی کھر یعنی 'لاکھ سے بنا ہوا قلعہ' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قلعہ بعد میں اپی سو کے ساتھ ایک لڑائی کے دوران تباہ ہو گیا۔ تستے چو کے زمانے میں اپی سو نامی شخص نے سکردو کی طرف سے آ کر پائینی شگر میں پہلے لم سا کو آباد کیا۔ اس کے بعد اوپر کی جانب نالہ شگر کے بائیں کنارے تک کے علاقے کو آباد کیا۔ کہتے ہیں کہ اپی سو کو سکردو کے حکمران نے رگیایول سے نکال دیا تھا۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ غوڑو چو، برالدو، لاچی کھر، تستے چو، ارندو، چھوترون، لم ساوغیرہ خالص بلتی نام ہیں۔اس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ بلتستان کے دیگر علاقوں کی طرح شگر کے بھی ابتدائی آباد کار تبتی نسل کے لوگ تھے۔البتہ بیسل، ہمیسل، سلدی وغیرہ چند ناموں سے اشارہ ملتا ہے کہ بروشو نسل کے کچھ لوگ بھی ابتدائی آباد کاروں میں شامل تھے جو تبتی اکثریت میں ضم ہو کر اپنا تشخص کھو چکے ہیں۔شگر کے بعض علاقوں میں کرغز اور یارقندی خون کے آثار بھی ملتے ہیں۔ہوسکتا ہے ان کی بھی قلیل تعداد ابتدائی آباد کاری کے وقت موجود ہو۔لیکن زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ اس نسل کے لوگ بعد کے زمانوں میں مختلف ادوار میں یہاں آ بسے ہیں۔

غرض شگر وادی کے نچلے علاقوں پر اپی سو کی اولاد اور بالائی علاقوں پر گیا کھانگ کی اولاد حکمران رہی۔چاپا کھانگ نے ہمیسل میں ایک قلعہ تعمیر کیا جو شق کر کھر، کہلاتا تھا۔چاپا کھانگ کے دو بیٹے تھے۔شیر بٹن اور مشیڈ۔بڑا بیٹا شیر بٹن اپنے باپ کی جگہ حکمران ہوا اور مشیڈ کو گوماغنڈو (گلاب پور) گزارہ میں ملا۔اس نے وہاں پول پول کھر کے نام سے ایک محل تعمیر کر کے اس میں سکونت اختیار کی۔

غوڑو چو اس خاندان کا دارالحکومت تھا۔اس جگہ ہر سال ستروب لہ کے موقع پر ایک بڑا میلہ منعقد ہوا کرتا تھا جس میں سارے لوگ شریک ہوتے اور ناچ رنگ اور شراب و کباب کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ایک دفعہ اس میلہ کے موقع پر ایک فقیر پہنچا لیکن کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی اور وہ تین روز تک بھوکا پھرتا رہا۔آخر کار وہ ایک بوڑھی عورت کے گھر پہنچا تو اس نے اس کی مہمانی کی۔فقیر نے اس عورت کو اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر مشرق کی جانب پہاڑ پر بھاگنے کو کہا۔ان کے پیچھے فقیر خود بھی چلا آیا۔جب چشمہ پر پہنچے تو اس فقیر نے عورت سے کہا کہ پیچھے مڑ کر غوڑو چو کا نظارہ کرے۔وہ دیکھتی ہے کہ برالدو اور باشہ کے دریاؤں میں سیلاب آیا ہے اور غوڑو چو غرق ہو چکا ہے۔فقیر غائب ہو چکا تھا۔اس عورت نے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اس جگہ کو آباد کیا۔اس طرح سے منگو نامی گاؤں آباد ہو گیا۔

اماچا حکومت کا قیام

کہتے ہیں کہ اس سیلاب کی وجہ سے شیر بٹن کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا بھائی مشیڈ اس کا جانشین ہو گیا۔ لیکن ایک اور روایت کے مطابق مشیڈ نے سازش کے ذریعے شیر بٹن کو قتل کرا کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مشیڈ سخت ظالم اور جابر شخص تھا اس لئے رعایا اس سے سخت تنگ تھی۔ اسی دوران ہنزہ کے مغلوٹ راجہ نے نگر کے چاتھم پر حملہ کیا اور نگر پر قبضہ کر لیا۔ چاتھم نگر سے فرار ہو کر غنڈو میں مشیڈ کے پاس نوکر ہو گیا۔ چاتھم تھوڑے ہی دنوں میں مشیڈ کے مشیران خاص میں داخل ہو گیا اور دوسری طرف اس نے لوگوں کے درمیان رسوخ پیدا کر لیا۔ چونکہ لوگ مشیڈ کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے اس لئے انہوں نے چاتھم کو مشورہ دیا کہ اگر تم مشیڈ کو قتل کر دو تو ہم تم کو ملک کا حکمران تسلیم کر لیں گے۔ چاتھم نے ایک روز موقع پا کر مشیڈ کو قتل کر دیا اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے نام سے اس کا خاندان اماچا کے نام سے مشہور ہوا۔ چا اس کا نام تھا اور تھم بروشسکی زبان میں راجہ کو کہتے ہیں۔ اماچا خاندان کے بعض افراد کا کہنا ہے کہ ان کا خاندان اپنے اصلی وطن منگولیا سے آ کر پہلے ختن میں آباد ہوا پھر وہاں سے ہنزہ کے راستے آ کر شگر میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔

ایک اور روایت کے مطابق گلگت کی طرف سے ایک شاہین نے اپنے پنجوں میں ایک بچہ اٹھا کر لایا جو اس کے گھونسلے سے بعض چرواہوں کے ہاتھ لگ گیا۔ چرواہوں نے اس کی پرورش کی۔ بہت جلد وہ غیر معمولی حسن اور صلاحیتوں کا مالک نوجوان بن گیا۔ چنانچہ لوگوں نے اسے چاتھم کے نام سے راجہ بنا دیا۔ اس طرح سے اماچا خاندان کی حکومت قائم ہوگئی۔

اماچا خاندان کی حکومت شگر پر 1840ء میں ڈوگرہ قبضہ تک قائم رہی۔ لیکن مجموعی طور پر شگر کے راجے سکردو کے حکمرانوں کے زیر اقتدار رہے ہیں۔

کننگھم لکھتا ہے:

''شگر کا اپنا ایک راجہ ہے لیکن شگر کا راجہ عام طور پر سکردو کے حکمرانوں کا

محکوم رہا ہے۔ ذیل کا شجرہ نسب شگر کے موجودہ راجہ سلیمان خان سے حاصل ہوا ہے۔ یہ دو وجوہات کی بناء پر تعجب انگیز ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ تھم یعنی راجہ کا لقب شگر کے ابتدائی راجاؤں کے ناموں میں شامل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس خاندان کا تعلق یقیناً ہنزہ نگر کے دردراجاؤں سے ہے جو اب بھی یہی لقب رکھتے ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ تخمیناً ابتدائی راجہ کے برسرحکومت آنے کا زمانہ چپلو کے سلطان بیگو کے برسر اقتدار آنے کے زمانے سے بہت حد تک موافق نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ چپلو اور شگر کے خاندانوں کا عروج کسی مشترکہ سبب کے تحت ہوا ہو جو شاید اسلام کی اشاعت سے مربوط ہوسکتا ہے۔،،

بڈلف لکھتا ہے:

"شگر کے راجے اپنے خاندان کے بانی سے لے کر اب تک اپنے لئے اماچا کا لقب استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس کے بانی کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے والدین کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں۔ کیونکہ وہ ایک شاہین کے گھونسلے سے ملا تھا جس نے اسے کہیں سے اٹھالایا تھا...... شگر کے راجے اگرچہ مقپون حکمرانوں کے محکوم تھے تاہم وہ اتنے مضبوط ضرور تھے کہ سکردو کے قریب ہونے کے باوجود یہ خاندان بالکل معدوم ہونے سے بچارہا۔،،

الغرض چاتھم کی حکومت قائم ہونے کے بعد اس کے ہوا خواہ نگر سے آکر اس کے پاس جمع ہوئے جنہیں باشہ کے اندر کئی مقامات پر آباد کیا گیا۔ سلسلہ قراقرم کے گردونواح میں موجود کرغز خانہ بدوشوں کو چاتھم کے بیٹے یولگوتھم نے برالدو میں مختلف جگہوں پر بسایا۔

گوری تھم

1380ء تا 1430ء

چاتھم کے بعد شگر میں ہر طرف آبادی میں ترقی ہوتی گئی اور اماچا خاندان کے اقتدار کا

دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اپی سو کے مقبوضہ علاقے بھی اماچا کے زیر اقتدار آ گئے اور برالدو باشہ سمیت تمام وادی شگر پر اس خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔

گوری تھم کے عہد میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی 785ھ (1383ء) میں کاشغر کی طرف سے شگر میں وارد ہوئے اور تمام وادی شگر میں اسلام پھیلایا۔ مقامی روایات کے مطابق شگر میں آپ نے پہلے مسجد امبوڑک پھر مسجد چھہ برونجی تعمیر کرائی اور اسی دوران ذخیرۃ الملوک اور مودۃ القربیٰ تصنیف کیں۔

گازری

1490ء تا 1520ء

گوری تھم کے بعد غازی میر، اس کے بعد علی میر اور علی میر کے بعد اس کا بیٹا گازری راجہ ہوا۔ گازری نے شگر خاص میں بونگ ری نامی پہاڑی کے اوپر ایک قلعہ تعمیر کیا اور غنڈوکو ترک کر کے اس کو دارالحکومت بنایا۔ اس کے عہد میں میر شمس الدین عراقی وارد بلتستان ہوئے۔ اس وقت سکردو میں بوخا، چپلو میں رائے بہرام اور پوریگ میں حبیب چو حکمران تھے۔

تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان نے گازری کے زمانے کا ایک نہایت ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے گازری کی چالاکی، حسن تدبیر اور دلیری ثابت ہوتی ہے۔ واقعہ یوں ہے:

> ''گازری نے باتحاد حبیب چو راجہ سوت و راجہ اسکردو و راجہ کھپلو لداخ پر حملہ کیا۔ گیالپو نے اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنا مصلحت نہ سمجھا اور محصور ہو گیا۔ چونکہ اس کا قلعہ مستحکم تھا۔ محاصرین کی کچھ پیش نہ گئی اور محاصرہ نے طول کھینچا۔ اتحادی پریشان ہوئے۔ گازری نے کہا کہ میں اس شرط پر قلعہ زیر کئے دیتا ہوں کہ سب مال غنیمت مجھے دیا جائے۔ ماقبی تینوں اتحادیوں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔
>
> گازری نے رات کے وقت اپنے آدمی قلعہ سے ہٹا لئے اور صبح کے وقت

جتنے گھوڑے گدھے اور بیل اسے مل سکے سب کے اوپر مٹی لاد کر قلعہ کے سامنے لے گیا۔ محصورین نے خیال کیا کہ بے حد سامان خوراک محاصرہ کنندگان کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس سے ان کی ہمت پست ہوئی۔ بعد ازاں گازری نے بذریعہ اپنے آدمیوں کے زمین کا تردد شروع کر دیا۔ لداخیوں نے پوچھا کیا کرنے لگے ہو؟ گازری نے جواب دیا کہ محاصرہ طول کھینچ رہا ہے ہم لوگ خربوزہ کھانے کے عادی ہیں معلوم نہیں یہاں سے کب تک نجات ہو اس لئے خربوزہ کاشت کرنے لگے ہیں۔ یہ دیکھ کر لداخیوں نے ہمت ہار دی اور بہت سا مال وزر بطور تاوان دے کر نجات حاصل کی۔

اب یہ فوج واپس روانہ ہوئی۔ راستے میں گازری کے تینوں اتحادی راجگان کی نیت بد ہوگئی۔ گازری اسے تاڑ گیا۔ دم کھر کی منزل پر پہنچ کر اُس نے راجہ کھپلو کو یہ چکمہ دیا کہ میں اس قدر مال واسباب شغر لے جا کر کیا کروں گا میری ایک لڑکی ہے اس کا بیاہ تم اپنے بیٹے کے ساتھ کر لو اور یہ سب مال و اسباب درج فہرست کر کے بطور جہیز اپنے پاس رکھ لو۔ وہ جھانسے میں آ گیا اور اس انتظام پر راضی ہو گیا۔ جب یہ دونوں اس طرح مل گئے تو راجہ سکردو اور راجہ سوت کی کچھ پیش نہ گئی۔ جب فریقین نے شادی کی تیاری کر لی تو گازری نے راجہ کھپلو کو پیغام بھیجا کہ حسب رواج ملک اپنے معززین کو بھیج دو کہ دلہن کو رخصت کرا لے جائیں۔ بڑی دھوم دھام سے بارات روانہ ہوئی۔ شغر میں پہنچی تو گازری نے بڑی پر تکلف ضیافت انہیں دی اور اس کے بعد رات کے وقت سب کو قید کر دیا کہ جب تک ہمارا مال واسباب فہرست کے مطابق ہمارے پاس نہ پہنچے گا تمہاری رہائی ناممکن ہے۔ راجہ کھپلو کو پتہ چلا تو اُس نے اپنی غلطی پر بہت پیچ وتاب کھایا مگر مجبور تھا سب مال واسباب شغر کو پہنچا کر اپنے معززین کی رہائی کرائی اور تینوں اتحادی راجگان منہ دیکھتے رہ گئے۔،،

عبداللہ خان

1520ء تا1535ء

گازری کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ خان راجہ ہوا۔ مقامی روایات کے مطابق اسی راجہ کے عہد میں سلطان سعید خان شاہ یارقند نے بلتستان پر حملہ کیا تھا۔ مرزا حیدر گورگان اپنی تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے:

''سلطان سعید خان شاہ یارقند ایک ہزار سپاہ لے کر 939ہجری مطابق 1532ء میں مریول (لداخ) سے بالتی کی طرف متوجہ ہوا اور موسم سرما کے شروع میں بالتی پہنچا۔ بہرام چو نے اطاعت قبول کی اور ملازمت میں حاضر ہوا۔ دیگر تمام چوپان بالتی نے تمرد اختیار کیا۔ بہرام چو کی راہبری سے پہلے قلعہ اشگار کو جو کہ تمام بالتی کا دارالملک ہے۔ اول حملہ میں فتح کیا۔ مرد مارے گئے، عورتیں اور اموال عساکر منصورہ کے حصہ میں آئے۔ اس کے علاوہ جہاں کو ہستان تھا اسے فتح کیا۔ البتہ جو قلعے اور درے مستحکم تھے انہیں چھوڑ دیا اور اوائل بہار میں شاہ بالتی سے واپس روانہ لداخ ہوا۔،،

حیدر خان

1535ء تا1560ء

عبداللہ خان کے بعد اس کا بیٹا حیدر خان حکمران ہوا۔ اس نے برالدو کے اندر تستون اور اسکولی کو آباد کیا۔ اس نے یارقند کی سلطنت کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے۔ قراقرم کو شگر اور یارقند کے درمیان حد فاصل مقرر کیا۔ اس کے دور میں یارقند کا سفیر ایک سو سپاہیوں کے ساتھ شگر میں تعینات ہوا۔ اس کے بعد یارقندی سوداگروں کی آمد ورفت قائم ہوگئی۔ اسی راجہ کے عہد میں خوبانی، آڑو، انگور، سیب اور اخروٹ وغیرہ قسم قسم کے میوہ دار درخت یارقند اور نگر و ہنزہ سے لاکر شگر میں نصب کئے گئے۔ ان کا پیوند بھی ان ممالک سے لاکر شگر میں رائج کیا گیا۔ اس نے برالدو اور باشہ کی

آخری آبادیوں تستون اور ارندو سے متصل ایک ایک قلعہ تعمیر کیا اور ادھر سپاہی متعین کئے۔

حشمت اللہ خان کے مطابق یارقند کے ساتھ شگر کے سفارتی تعلقات اماچا خاندان کے 19 ویں حکمران محمد خان کے عہد تک قائم رہے۔ اسی زمانے میں دو بھائی شاہ ناصر طوسی اور سید علی طوسی تھلے کے راستے شگر میں پہنچے۔ انہوں نے احکام دین کی تبلیغ کی اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ مقامی روایات کے مطابق شاہ ناصر داسونید کے پہاڑ پر غائب ہو گئے جبکہ سید علی نے کواردو میں سکونت اختیار کی۔ انگریز سیاح جی ٹی وین شاہ ناصر کے بارے میں لکھتا ہے:

''برالدو وادی کے دہانے کے قریب دائیں طرف ایک عجیب ہیئت کی چٹان موجود ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر ایک مینار کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ہے۔ اس کو ایک فقیر کے نام سے شاہ ناصر خسرو کہتے ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ادھر رہتا تھا یا اس نے اس چٹان کے نیچے عبادت کی تھی اور بدخشان میں جیرم نامی مقام پر مدفون ہے۔''

مقپون عبدال خان

1627ء تا 1637ء

محمد خان اماچا کی وفات پر سکردو کے مقپون حکمران عبدال خان نے شگر میں اماچا حکومت کا خاتمہ کر کے سکردو کے ساتھ اس کا الحاق کر لیا۔ عبدال خان نے محمد خان کے بارہ بیٹوں کو بارہ مختلف دیہات میں قتل کئے جانے کی غرض سے بھیج دیا۔ گیارہ بیٹے تو قتل ہو گئے۔ سب سے بڑا حسن خان گوماغنڈو کے حصہ میں آیا تھا۔ غنڈو کے لوگوں نے اس پر رحم کیا اور اسے توشہ وغیرہ دے کر خفیہ طور پر ہندوستان کی طرف بھگا دیا۔ کہتے ہیں کہ حسن خان کو بچانے میں بوبل یا ابوملک نامی شخص کا مرکزی کردار تھا۔ حسن خان دہلی میں آدم خان سے ملا جو حسن خان کا ماموں تھا۔ اسی کے ذریعے شاہ جہان کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی۔ ایک دفعہ شیر کے شکار کی مہم میں بادشاہ کے ہمراہیوں میں حسن خان بھی شامل تھا۔ اسی اثناء میں بادشاہ کا شیر کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا اور شیر نے بادشاہ

پر حملہ کر دیا۔ حسن خان نے فوراً آ گے بڑھ کر تلوار سے ایک ہی وار میں شیر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کی وجہ سے بادشاہ حسن خان کی طرف متوجہ ہوا، اس کی فریادسنی اور کشمیر کے گورنر کو حکمنامہ بھیجا کہ حسن خان کی امداد کی جائے۔ باقی تفصیل سکردو کی تاریخ کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔

امر واقعہ یوں نظر آتا ہے کہ سکردو کے تخت کے لئے عبدال خان اور آدم خان کے درمیان کشمکش کے دوران شگر کے راجہ محمد خان اور اس کے بیٹوں نے آدم خان کا ساتھ دیا تھا۔ محمد خان عبدال خان اور آدم خان کا بہنوئی تھا۔ عبدال خان نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعدان سے انتقام لیا۔ اس وقت محمد خان کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی اولاد پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

عبدال خان کے خلاف مغل فوج کن حالات میں بھیجی گئی کس طرح سے عبدال خان کو زیر کر لیا گیا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ ان سارے نکات کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

حسن خان نے کشمیر سے ہر پیشے سے منسلک ہنر مند لا کر شگر میں بسائے اور صنعت و حرفت کو خوب ترقی دی۔ اس نے بونگ ری کھر جس کا دوسرا نام ڈونگ کھر ہے کے نیچے نالہ شگر کے داہنے کنارے پر ایک محل پھونگ کھر کے نام سے تعمیر کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

دربارِ اکبری میں حسن خان تبّتی اور فتح خان تبّتی کا ذکر ملتا ہے جو شہنشاہ اکبر کے عہد میں 971ھ کے قریب پٹھان لشکر کے ساتھ ہندوستان کی جنگوں میں شریک تھے۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ شگر کا یہی حسن خان ہے۔ ہمیں فی الحال اس گمان پر یقین کرنے لیے کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا۔ یہ حسن خان تبّتی اور فتح خان تبّتی کون تھے یہ نکتہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔

امام قلی خان

1638ء تا 1685ء

حسن خان کے بعد امام قلی خان شگر کا راجہ ہوا۔ شغر نامہ کے مطابق عبدال خان کے دور (37-1627ء) میں لداخ پر حملے اور سکردو کے قیدیوں کو چھڑانے کی مہم میں امام قلی خان بھی

شامل تھا۔ دوسری طرف حشمت اللہ خان کے دیئے ہوئے اماچا خاندان کے شجرہ نامے میں امام قلی خان کو حسام قلی خان کا بیٹا اور حسن خان کا پوتا دکھایا گیا ہے۔ حسن خان کے گیارہ بھائی عبدال خان کے ہاتھوں قتل ہوئے اور وہ خود بھاگ کر دہلی پہنچا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا پوتا امام قلی خان صحیح و سالم شگر میں موجود تھا۔ اس دور کی تاریخ سکردو کی طرح شگر کے حالات میں بھی ابہام موجود ہے۔ شگر کے راجہ سلیمان خان نے اماچا خاندان کا شجرہ نامہ کنگھم کو دیا تھا۔ اس میں امام قلی خان کو حسن خان کا جانشین دکھایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام قلی خان حسن خان کا بیٹا تھا اور ہو سکتا ہے یہ حسام قلی خان امام قلی خان کا بھائی ہو کیونکہ سلیمان خان کے مرتبہ شجرہ نامہ کے تحت قلی خان نے امام قلی خان کے بعد حکومت کی تھی۔ ممکن ہے یہ قلی خان وہی حسام قلی خان ہو۔

شگر کے حکمرانوں میں امام قلی خان سب سے زیادہ مقتدر حکمران گزرا ہے۔ مرزا خان کو سکردو سے بھگانے میں اس نے مرکزی کردار ادا کیا۔ شاہ مراد کی فوجی مہموں میں سردار لشکر کی حیثیت سے کارنامے انجام دیئے۔ لیکن شاہ مراد کے دور کے اواخر میں اس کے ساتھ اختلافات کا آغاز ہوا اور اس کی وفات کے بعد شیر شاہ کے دور میں سکردو کے ساتھ خانہ جنگی شروع ہوئی جو کئی سالوں تک جاری رہی۔ اس کی تفصیل سکردو کی تاریخ کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

اعظم خان

1685ء تا 1727ء

امام قلی خان کے بعد اس کا بڑا بیٹا اعظم خان شگر کا راجہ ہوا۔ اعظم خان کریس کے راجہ امیر خان کی ہمشیرہ کے بطن سے تھا اور سکردو کے راجہ محمد رفیع خان کی بیٹی فخر النساء اس کے عقد میں تھی۔ اس نے اپنے برادر نسبتی سکردو کے راجہ سلطان مراد کو دریا میں غرق کر کے سکردو پر بھی پانچ سال حکومت کی۔ جس کی تفصیل تاریخ سکردو کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔

بلتستان کے مشہور شاعر چھورکاہ کے بوا عباس نے اعظم خان کے دور کا ایک اہم واقعہ لکھ کر حشمت اللہ خان کو دیا تھا جنہوں نے اپنی تاریخ جموں میں اس کا ترجمہ شامل کیا ہے۔ جبکہ اصل تحریر

مفقود الخبر ہے۔ ہم اس کے ترجمے کو بشکریہ تاریخ جموں یہاں نقل کر رہے ہیں:

''راجہ اعظم خان کے عہد میں دو بھائی سید مختار اور سید یحیٰ وارد شغر ہوئے۔ راجہ نے ان کا احترام کیا اور ان کی منزل اور ضروریات کا انتظام کر دیا۔ دونوں بھائی یہاں ٹھہر گئے۔ راجہ ہر روز ان کی مجلس میں حاضر ہوا کرتا تھا اور شرعی مسائل کے متعلق ان سے باتیں کیا کرتا تھا۔ چونکہ سید مختار نہایت شیریں کلام اور عالم متبحر تھا۔ اس کی ذاتی کشش اور راجہ کی طبیعت سے تمام روسائے شغر اور انبوہ عوام ان دونوں سید بھائیوں کے پاس جمع ہوتے گئے۔ چند روز میں ان کی محفل کو اس حد تک فروغ ہوا کہ راجہ کا دربار سرد ہو گیا۔ راجہ کے دل میں اس سے حسد پیدا ہوا اور وہ ان کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ اپنے وزیروں کے ساتھ اس نے مشورہ کیا۔ ایک نے صلاح دی کہ پروردہ کو قتل کرنا مردانگی نہیں ہے۔ دوسرے نے کہا کہ تمام اہل شغر ان کے مرید ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ زندہ ہیں۔ ان کے اعتقاد سے وہ باہر نہیں ہو سکتے اور نہ کسی دوسرے اثر کو وہ قبول کر سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ایک بوڑھی عورت کے ذریعے حیلہ گری سے انہیں زہر دے کر ان کا کام تمام کر دیا جائے۔

شاہ کا دربان یہ باتیں سن رہا تھا۔ چونکہ وہ سید برادران کا معتقد تھا۔ راتوں رات سیدوں کے پاس پہنچا اور اس مشورہ سے انہیں آگاہ کیا۔ سیدوں نے یہ سن کر آدھی رات کو چھورکاہ کی طرف کوچ کر دیا اور محلّہ موژ ونمو میں اقامت اختیار کی اور اپنے مریدوں کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ چند روز میں چھورکاہ سے لے کر برالدو تک اور نیالی سے لے کر باشہ تک سب اہل ملک سیدوں کے مرید ہو گئے اور محلّہ موژ ونمو میں ان کے رہنے کے لئے ایک گڈھی تعمیر کر دی جو اس درجہ مستحکم تھی کہ اس کے اندر پرندہ کا گزر بھی محال تھا۔ اس طرح سے یہ دونوں سید بھائی راجہ کی زد سے نکل گئے اور راجہ کا اقتدار جاتا رہا۔ بعض مواضعات سے باج وخراج بھی بند ہو گیا۔ وزیروں نے نر کے آدمیوں سے کمک لے کر تین دفعہ بالائی علاقہ کے لوگوں پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ آخر کار اسی بوڑھی عورت کے ذریعے سید یحیٰ کو یہ خط بھیجا کہ اگر تم سید مختار کو ہمارے حوالے کر دو تو شغر خاص میں تمہارے لئے مکان سکونتی اور جامع مسجد ہم تعمیر کر دیں گے اور ہم ملک شغر کا مجتہد صرف تمہیں مقرر کر دیں گے ہم سب تمہارے پیرو ہو جائیں گے۔

سید یحییٰ کو یہ خط پہنچا تو اس نے دل میں سوچا کہ ایک روز بھائی کو بھائی سے جدا ہونا ہی ہے جب تک میں سید مختار کے ساتھ ہوں اُس کے چاکر اور غلام کی طرح ہوں۔ میرا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے میں راجہ کے حوالے کر دوں اور خود راجہ کی رضا جوئی میں رہوں کیونکہ شغر جیسی اور کوئی اچھی جگہ میری اور میری اولاد کی سکونت کے لئے نہیں مل سکتی۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے خط مرسولہ کی پشت پر یہ جواب لکھ کر واپس بھیج دیا کہ:

''سمعنا واطعنا کل رات شب جمعہ ہے جبکہ سید مختار اپنے مقصورہ یعنی عبادت خانے میں تمام رات عبادت و وظیفہ خوانی میں اس درجہ مصروف رہتا ہے کہ اسے اپنی جان کی بھی خبر نہیں رہتی۔ تم شب خون لاؤ اور قلعہ کے قریب تاک میں رہو۔ جس وقت سید مختار ذکر خفی میں سرگرم ہوگا میں دریچہ قلعہ سے آگ باہر پھینکوں گا اور قلعہ کا دروازہ کھول دوں گا۔ تم قلعہ میں داخل ہو جاؤ اور اس کو پکڑ لے جاؤ۔ دن کے وقت میں بھی راجہ کے سلام کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔''

راجہ کو اس جواب سے بڑی خوشی ہوئی اور سید کے قلعہ موسومہ بیرو گیالمو پر شب خون بھیج دیا۔ سید یحییٰ نے دریچہ سے آگ پھینکنے کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور خود لیٹ گیا۔ راجہ کے آدمی قلعہ کے اندر داخل ہوئے اور سید مختار کی بیوی بیرو گیالمو نے یہ شور سنا تو دوڑی ہوئی سید مختار کے مقصورہ میں پہنچی اور اس کو حال سنایا اور کہا کہ یہاں بیٹھے کیا کرتے ہو بھاگو۔ سید مختار چور دروازہ سے نکل کر بھاگا اور صبح ہونے تک کریس میں پہنچ گیا۔ راجہ کے آدمی تمام رات اسباب و جائداد قلعہ کی لوٹ مار میں مصروف رہے۔ پھر سید مختار کی بیوی اور اس کے دونوں لڑکوں کو قید کر کے باہر نکالا اور راجہ کو فتح کی خبر بھیجی۔ صبح کے وقت موضع تھونگمو دونگ کے ریگستان میں سید مختار کے دونوں لڑکوں کی مشکیں چوروں کی طرح باندھ دیں اور بطور نشانہ ہدف ریت میں کھڑا کر کے تیر باراں کر کے شہید کر دیا۔ ان کی قبور کا نشان آج تک اس جگہ موجود ہے اور اسی وجہ سے یہ موقع معصوموں کے آستانہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان میں سے ایک کا نام عبداللہ اور دوسرے کا نام سید باقر تھا۔

مال غنیمت اور بیر وگیالموکو راجہ کے پاس لے گئے۔اس نے مال غنیمت کو ان ظالموں کے درمیان تقسیم کر دیا۔سید یحییٰ بھی دن کے وقت ایک عالم زاہد اور عابد گوشہ نشین کے بھیس میں ہاتھ میں تسبیح لٹکائے ہوئے راجہ کے سلام کے لئے حاضر ہوئے۔راجہ نے ان کی خاطر تواضع کی اور ان سے کہا کہ تم نے اپنا وعدہ وفا کر دیا ہے۔اب ہماری نوبت ہے کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں۔جو موضع تمہیں پسند ہو وہ بتلاؤ کہ اس جگہ تمہارے لئے مکان سکونتی اور مسجد جامع تعمیر کرا دی جائے۔اس نے نالہ کے کنارے پر پل کے نزدیک ایک جگہ بتلائی۔کل باشندگان ملک شغر کو جمع کر کے اس کا انتظام کر دیا گیا اور قلعہ بیر وگیالمو کی لکڑی لا کر اس میں لگا دی گئی۔کہتے ہیں کہ ایک سال میں مسجد تعمیر ہو گئی۔بعد ازاں راجہ نے تمام علاقہ سے فی گھر نذرانہ سید یحییٰ کے لئے متعین کر دیا۔جو بندوبست کے زمانہ تک اس کی اولاد کو ملتا رہا۔بعد ازاں بند ہو گیا۔اب ان کی اولاد محلّہ بہ محلّہ گدائی کرتی پھرتی ہے۔

بیر وگیالمو جب راجہ کے قلعہ میں وارد ہوئی تو اپنے لڑکوں اور شوہر کی جدائی سے بہت بے قرار تھی۔شام ہوئی تو وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہوئی اور سجدہ میں جا کر جان دے دی اور مقبرہ راجگان میں مدفون ہوئی۔اب تک اس کی قبر کا نشان باقی ہے۔

سید مختار کریس میں پہنچے۔وہاں راجہ وزیر اور رعایا نے گرمجوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔اور کریس سے لے کر چھورہ بٹ تک کے لوگوں نے جمع ہو کر ان کے لئے مکان سکونتی اور مسجد جامع چند روز میں تیار کر دی اور برضا و رغبت ہر شخص نے آٹھ پیمانہ غلہ نسلاً بعد نسلٍ سید مختار کو میراث بہ میراث دینا قبول کیا اور ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوئے۔

راجہ کھپلو نے سید مختار کو لکھا اگر اجازت ہو شغر کے لوگوں سے انتقام لیا جائے اور آپ کے لئے کھپلو میں انتظام کیا جائے۔سید نے جواب دیا کہ جنگ اسلام میں قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا اور اس طرف کے لوگ میری حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔انہیں چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جانا مروت کے خلاف ہے۔البتہ اگر کوئی اور حادثہ پیش آیا تو اُس وقت تمہارے سوا اور کسی طرف بھاگنے کا راستہ نہیں ہے۔

الحاصل سید مذکور نے کریس سے چھور بٹ تک تمام دیہات میں مساجد جامع اور مساجد محلّہ جابجا تعمیر کرائیں اور تبلیغ و تعلیم کے لئے اپنے شاگردوں میں سے ملّا ان میں تعینات کئے۔ اب تک ان کا عزل و نصب ان کی اولاد کے ہاتھ میں ہے۔

بعد ازاں اہل شغر نے سید مختار کے پاس شکایت کی کہ ہم سید قطب الدین کے ساتھ کب تک گزارہ کریں۔ اپنی اولاد میں سے کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے ہمارے پاس تعینات کر دو۔ سید نے اپنے نواسوں میں سے سید نجم الدین کو اس خدمت کے لئے تجویز کیا۔ وہ شغر میں گیا اور موضع بیڑیپہ میں اس کے لئے مکان اور مسجد جامع تیار کر دی گئی اور یہاں اس کی مجلس خوب گرم ہوئی۔

پھر چھورکاہ کے لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ ہمارے پاس بھی ایک عالم تعینات کرو۔ انہوں نے سید ابوالحسن کو ان کے سپرد کیا۔ اس نے موضع خسمی کا میں سکونت اختیار کی۔ لوگوں نے اس جگہ اس کے لئے مکان اور مسجد جامع تیار کر دی اور اس نے یہاں اپنا کام جاری کر دیا۔ ابو الحسن جید عالم تھا۔ اس کی تصانیف اس وقت تک موجود ہیں۔،،

علی خان

1727ء تا 1755ء

اعظم خان کے قتل کے بعد اس کے سوتیلے بھائی علی خان کو نگر سے لا کر شگر کا راجہ بنایا گیا۔ علی خان نے مقتول غضوا یا وزیر محمد کے بیٹے حسین کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ حشمت اللہ خان نے لکھا ہے کہ اعظم خان کے قتل کے بعد اس کے بیٹے سلیمان خان کو جانشین بنایا گیا لیکن چونکہ اس کی کم عمری کے باعث وہ سکردو میں ماں کے ساتھ رہتا تھا اس لئے شگر میں اس کے شیر پدرولی کو وزیر مقرر کر کے شگر کی حکومت اسے سونپ دی گئی۔ بعد میں جب سلیمان خان بلوغت کو پہنچا تو ولی اسے سکردو سے لے آیا اور ستر انگ دوخمو کے مقام پر اسے ٹھکانے لگا کر لاش کو وہیں پر دفن کر دیا کیونکہ سلیمان خان کے عزائم کا راستے میں ولی کو علم ہوا کہ وہ باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا جبکہ اعظم خان کے قتل میں مرکزی کردار ولی ہی کا تھا۔

لیکن تاریخ لداخ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اعظم خان کے قتل کے فوراً بعد علی خان کو شگر کی حکومت مل گئی تھی۔

حسین خان

1755ء تا 1790ء

علی خان نے جلاوطنی کے دوران نگر میں شادی کر لی تھی اور اس سے ایک لڑکا حسین خان اسی جگہ پیدا ہوا تھا۔ علی خان کے بعد حسین خان اس کا جانشین ہوا۔ حسین خان سکردو کے راجہ ظفر خان کا ہم عصر تھا۔ اس کے زمانے کے واقعات تاریخ سکردو کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

اعظم خان و قلی خان

1790ء تا 1819ء

حسین خان کی وفات کے بعد چلو کی مدد سے اعظم خان تین بار شگر کا حکمران بنا اور سکردو کی حمایت سے قلی خان تین بار شگر کی حکومت پر قابض ہو گیا۔ اس دور کے واقعات تفصیل سے سکردو کی تاریخ میں بیان ہوئے ہیں۔

حیدر خان

1819ء تا 1842ء

اعظم خان کی وفات پر حیدر خان شگر کا راجہ بن گیا اور اسی کے زمانے میں 1840ء میں زور آور سنگھ نے بلتستان کو فتح کر لیا۔ 1842ء میں حیدر خان نے بغاوت کر کے بلتستان کو ڈوگرہ غلامی سے آزاد کرالیا۔ لیکن چند ماہ بعد اسی سال ڈوگرہ وزیر لکھپت نے جدوجہد آزادی کو کچل کر حیدر خان کو قید کر کے جموں پہنچا دیا۔ حیدر خان جموں میں بحالت اسیری فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مراد خان شگر واپس آیا اور اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔

خپلو

ابتدائی آبادکار

خپلو کے ابتدائی آبادکاروں کے بارے میں مقامی روایات کے حوالے سے حشمت اللہ خان لکھتے ہیں کہ وسط ایشیا کے لوگوں نے یارقند کی طرف سے سلتورو کے راستے یا گلگت کی طرف سے ہنزہ ورسکم کے راستے یا لہاسہ اور لداخ کے راستے خانہ بدوشوں کی صورت میں بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے آکر اس علاقے کو آباد کیا۔ کچھ لوگ کشمیر کی طرف سے آکر یہاں آباد ہو گئے۔ ہنزہ کی طرف سے آنے والے تھلے میں آباد ہوئے اور چیر خان نے محلّہ یارکھور کی مشرقی پہاڑی کے اوپر چنگ کھر، ماچیر خان نے محلّہ ٹھرونگوس کی شمالی پہاڑی کے اوپر چھوغو کھر اور شاہ سلطان نے مرچونگ لونگما کے جنوب مشرقی کنارے پر مرچونگ کھر تعمیر کیا۔ یارقند کی طرف سے آنے والے تھغس ، ہوشے اور سلتورو کے نالوں میں آباد ہوئے۔ انہوں نے ہلدی میں سترنپو کھر، سالینگ میں سالینگ کھر (مندوق کھر)، کھرکو میں کھرکو کھر اور بلغار میں سکم کھر چار قلعے تعمیر کئے۔ لداخ کی طرف سے آنے والوں نے موضع سیرمون میں تعمیر کیا۔

متذکرہ بالا قلعوں اور مقامات کے نام خالص بلتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خپلو کے ابتدائی آبادکاروں کی اکثریت تبّتی نسل کے لوگوں ہی کی تھی۔ ہنزہ اور یارقند کی طرف سے آئے ہوئے لوگ یا تو قلیل تعداد میں تھے یا یہ لوگ بعد کے زمانوں میں مختلف ادوار میں یہاں آباد ہوکر تبّتی اکثریت کے درمیان اپنا تشخص کھو بیٹھے ہیں۔

ابتدائی آبادکاروں میں سے ایک قبیلہ نے بالآخر اقتدار حاصل کیا۔ اس خاندان کے ایک راجہ موہوتنگ بشی شو کے بیٹے کے عہد حکومت میں طوفان عظیم آیا۔ یہ وہی طوفان تھا جو کچورہ کے مقام پر سیلابی ملبے نے دریائے سندھ کو روکنے کی وجہ سے آیا تھا۔ اس سیلاب کے وقت لوگ منتشر ہوگئے اور پانی کے خارج ہونے کے بعد دوبارہ آباد ہوگئے۔

اس دوران گوری تھم نامی ایک شخص نے اقتدار حاصل کیا اور نالہ فرؤا کے دہانہ کے متصل ایک چٹان کے اوپر اپنا محل تعمیر کیا اور حکومت کرنے لگا۔ یوں اس جگہ پر رلٹہ خومبو نامی گاؤں آباد ہو گیا جس کا بعد میں فرؤا نام پڑ گیا۔ خپلو وادی کے ایک حصے پر اسی دوران ہند ملک نامی ایک شخص نے اپنی حکومت قائم کر لی۔

یبگو حکومت کا قیام

اس کے بعد بیگ منتھل نامی ایک جنگجو آدمی کندوس نالہ کے راستے ہلدی گاؤں میں وارد ہوا اور ہلدی اور چے تھنگ پر متصرف ہو گیا۔ لوگوں نے اسے تند خو ہونے کی وجہ سے ثن پھوچھو کا لقب دیا۔ بیگ منتھل نے تھوڑے ہی عرصے میں گوری تھم اور ہند ملک کو بھی اپنا مطیع بنالیا۔

گوری تھم کے زمانے میں ڈورورندو سے گانے بجانے والی ایک ڈومنی اپنے بیٹے کے ساتھ رلٹہ خومبو پہنچی۔ اس کے حسن پر فریفتہ ہو کر گوری تھم نے اس سے شادی کر لی۔ اس سے اس کا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا البلدے نام رکھا گیا مگر وہ کم عمری میں ہی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس عورت سے گوری تھم کی اور کوئی اولاد نہیں ہوئی اس لئے اس نے اس ڈومنی کے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس کا یہ فعل بیگ منتھل کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے ہند ملک کے ساتھ مل کر حملہ کر کے گوری تھم کو بیدردی سے قتل کر دیا اور فرؤا کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسی اثناء میں پلدے نامی شخص نے چلاس سے آ کر بیگ منتھل کی اجازت سے مندک گاؤں میں محلّہ پلدے کو آباد کیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد تمام نالہ سلتورو میں پھیل گئی۔ گوری تھم کے قتل کے دو تین سال بعد ایک سیلاب کے نتیجے میں رلٹہ خومبو گاؤں غرق ہو گیا۔ اس جگہ بیگ منتھل نے ایک نیا گاؤں آباد کیا جس کا فرؤا نام پڑ گیا۔ کچھ مدت کے بعد ہند ملک لاولد فوت ہوا۔ بیگ منتھل نے اس کا علاقہ بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ یوں بیگ منتھل اس علاقے کا واحد راجہ ہو گیا۔ اس نے ہلدی کو سرمائی اور سالینگ کو گرمائی صدر مقام مقرر کیا۔ حشمت اللہ خان کے مطابق اس طرح سے خپلو میں یبگو خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔

لیکن جدید تحقیق کے مطابق یبغو یا یبگو تخارستان کے حکمرانوں کا لقب ہے۔749ء میں تخارستان کے یبغو حکمران نے چینی دربار کو تجویز پیش کی کہ ترکستان سے براہ زوجی لہ کشمیر کی طرف جانے والے راستے کو کھلوانے کے لئے ایک مہم بھیجی جائے۔تخارستان اس وقت چین کے زیر تسلط تھا۔753ء میں چین نے بڑے پولولو کے خلاف ایک مہم بھیج دی اور اس کے دارالحکومت ہوسالو پر قبضہ کرلیا۔بعض چینی سکالروں کا اندازہ ہے کہ ہوسالو کھپلو یا خپلو کا چینی تلفظ ہے۔تاریخ میں یبگو کے اس تذکرے سے ہمیں اشارہ ملتا ہے کہ چین نے خپلو کو فتح کرنے کے بعد یبگو خاندان کے کسی فرد کو خپلو میں گورنر مقرر کیا تھا جو بعد میں ان علاقوں پر چینی تسلط ختم ہونے کے باوجود اپنی لیاقت و اہلیت کی بناء پر تبت کے ماتحت اپنی حکمرانی قائم رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔

خپلو کے یبگو راجاؤں کے فراہم کردہ شجرۂ نسب کی صحت محققین کے سامنے مشکوک ہے۔ کننگھم لکھتا ہے:

> ''ذیل میں خپلو کے حکمرانوں کا شجرۂ نسب ہے۔اس کا آغاز سلطان سکندر یعنی سکندر اعظم سے ہوتا ہے جس کے جانشین ابراہیم اور اسحاق تھے۔شجرہ نسب کا یہ حصہ واضح طور پر افسانوی ہے.....''

حشمت اللہ خان نے بھی اس کو مسترد کر کے اپنی تحقیق سے ایک شجرہ نسب مرتب کیا ہے جس کے مطابق خپلو میں یبگو خاندان کے بانی کا زمانہ 850ء کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔اگر تخارستان کے یبگو کا واقعہ ان کی نظر سے گزرتا تو وہ بھی 753ء ہی پر اتفاق کرتے۔

مقیم خان

1380ءتا1420ء

بیگ منتھل کے بعد سے مقیم خان کے زمانے تک کے حالات کسی کو معلوم نہیں۔نجم الدین ثاقب کی منظوم تاریخ کے مطابق اس راجہ کے عہد میں 783ھ (1381ء) میں امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر سے خپلو تشریف لائے اور چھوربٹ تک سارے علاقے میں اسلام پھیلایا۔مقیم خان

خپلو کا پہلا مسلمان راجہ ہے۔

شاہ اعظم

1420ء تا1450ء

اس کے عہد حکومت میں چلاس کی طرف سے تین آدمی اپنے جانوروں کے ساتھ خپلو پہنچے اور راجہ نے بروقپہ کیر کوڈغونی سے نیچے کریس تک کا علاقہ چرائی اور آبادی کے لئے دیدیا۔ بروقپہ تھور کو ہنجوڑی اور بروقپہ چھوڑ کو پوئین سے اوپر نوبراہ تک کا علاقہ عطا کیا۔

کہتے ہیں کہ اس راجہ کے عہد میں سید محمد نور بخش بلتستان پہنچے اور خپلو میں تھوڑی مدت قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے چھچن مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد سلتورو نالہ کے راستے یارقند کو چلے گئے۔

شاہ اعظم کے بعد چار راجاؤں کے نام آتے ہیں جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ یہ نام فرضی ہیں۔

سلیم الدے

1450ء تا1470

سلیم الدے کے زمانے میں نالہ ہوشے اور دریائے شیوک میں زبردست سیلاب آیا جس کی وجہ سے چے تھنگ کی تقریباً کل آبادی غرق ہوگئی اور لوگ مختلف اطراف کو نکل بھاگے۔ کچھ لوگ چھوربٹ کی طرف بھاگے اور ڈاؤ کو آباد کیا۔ بعض لداخ جا کر چھچھوت میں آباد ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے ڈغونی اور پرکوتہ میں پناہ لی۔

سلیم الدے نے ایک طرف سیلاب زدہ رقبہ کو دوبارہ آباد کیا اور دوسری طرف موجودہ خپلو کو دریا کی طرف سے آباد کرنا شروع کیا جو پہلے جنگل تھا۔ راجہ کو اپنا صدر مقام بھی تبدیل کرنا پڑا۔ خپلو سے متصل اوپر کی جانب پہاڑی سلسلے کی چوٹی پر بروقپہ تھور کا مکان اسے پسند آیا۔ سلیم الدے

نے اسے اس سے حاصل کیا اور اس پر قلعہ تعمیر کر کے اسے اپنا بہاری صدر مقام بنا لیا۔ اس جگہ کا اس کے اصل بانی کے نام پر تھور سے کھر نام رکھا۔ اس کے بعد اس نے اوپر کی طرف چھور بٹ تک اور نیچے کی طرف کریس تک اپنی حکومت کو وسعت دی۔

یبگو ازرونا

1475ء تا 1485ء

سلیم الدے کے بعد دو راجے یکے بعد دیگرے حکمران رہے۔ اس کے بعد یبگو ازرونا راجہ ہوا۔ یہ بڑا بہادر راجہ تھا۔ اس نے اردگرد کے علاقوں کو مطیع کیا اور پوریگ پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت زانسکار کا راجہ بھی پوریگ پر حملہ آور ہوا تھا۔ ازرونا نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا اور اس کی رانی کو چیلو میں لے آیا۔ اس نے کھر کو قلعہ کو از سر نو تعمیر کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کی۔

یبگو بیکم

1485ء تا 1494ء

یبگو ازرونا کے بعد اس کا بیٹا یبگو بیکم راجہ ہوا اور بیکم کے بعد اس کا بیٹا یبگو کورکور حکمران بنا۔ حشمت اللہ خان کا خیال ہے کہ یبگو کورکور اور یبگو بہرام دونوں بھائیوں نے ایک ہی زمانے میں مل کر حکومت کی ہے۔ لیکن 1499ء تا 1505 کے دوران جب میر شمس الدین عراقی چیلو پہنچے تو اس وقت یبگو بہرام چیلو کا راجہ تھا۔ کورکور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یبگو کورکور کے بعد بہرام راجہ بنا تھا۔

یبگو بہرام

1494ء تا 1550ء

بہرام کے دور میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ 1499ء تا 1505ء کے دوران میر شمس

الدین عراقی کشمیر سے وارد بلتستان ہوئے۔ کہتے ہیں کہ سکردو میں انہوں نے اسلام پھیلایا۔ اس کے بعد شگر اور خپلو بھی گئے جہاں اسلام پہلے سے پہنچا ہوا تھا۔ 1505ء میں سید محمد بیہقی کے قتل ہو جانے کے بعد واپس کشمیر چلے گئے۔

بعد ازاں سلطان سعید خان شاہ یارقند نے ایک ہزار سپاہ کے ساتھ بلتستان پر حملہ کیا۔ مرزا حیدر دوغلات اپنی تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے:

''سلطان سعید خان شاہ یارقند ایک ہزار سپاہ لے کر 939ھ میں مریول (لداخ) سے بالتی (بلتستان) کی طرف متوجہ ہوا اور موسم سرما کے آغاز میں بالتی پہنچا۔ بہرام چو نے اطاعت قبول کی اور ملازمت میں حاضر ہوا۔ دیگر تمام چوپان بالتی نے تمرد اختیار کیا۔ بہرام چو کی راہبری سے قلعہ اشگار (شگر) کو جو کہ تمام بالتی کا دارالملک ہے اول حملہ میں فتح کیا۔ مرد مارے گئے، عورتیں اور اموال عساکر منصورہ کے حصہ میں آئے۔ اس کے علاوہ جہاں کوہستان تھا اسے فتح کیا۔ البتہ جو قلعے اور درے مستحکم تھے انہیں چھوڑ دیا اور اوائل بہار میں شاہ بالتی سے واپس روانہ لداخ ہوا۔''

خپلو کے یبگو حکمرانوں کے شجرۂ نسب میں ایک ہی بہرام نظر آتا ہے جو میر شمس الدین عراقی کے دورۂ بلتستان کے دوران (1499-1505ء) خپلو کا راجہ تھا۔ اس کے 27 سال بعد 1532ء میں یارقند کے بادشاہ سلطان سعید خان کے حملہ بلتستان کے وقت تک یہی بہرام چو زندہ تھا جس کا تاریخ رشیدی میں مرزا حیدر نے ذکر کیا ہے۔ لیکن شاہ بہرام چو کے نام سے بلتی ادب میں ایک لوک گیت مشہور ہے جس کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکردو کے راجہ عبدال خان کے عہد (1627ء تا 1637ء) میں بہرام چو خپلو کا راجہ تھا۔ 'شاہ بہرام چو' گیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''افسوس! میں نے اپنے بھائی شاہ بہرام چو کے عہد حکومت میں اپنے آبائی گنگچھے گلیشئر کا پانی جی بھر کر نہیں پیا۔ اب اس آدم خور عبدال خان کے دور

میں مجھے سکردو میں جو ہڑ اور دلدل کا پانی بھی نصیب نہیں اے میرے بھائی!
افسوس! میں اپنے بھائی شاہ بہرام چو کے عہد حکومت میں ہنجور کی سفید گندم کی
روٹی کھانے میں نخرے کیا کرتی تھی۔ اب اس آدم خور عبدال خان کے دور میں
مجھے سکردو میں کنگنی اور ترومبہ کی کاچی بھی نصیب نہیں اے میرے بھائی!
افسوس! میں نے اپنے بھائی شاہ بہرام چو کے عہد حکومت میں تھورسے کھر میں
ملکہ بننے کو بھی خاطر میں نہیں لایا۔ اب اس آدم خور عبدال خان کے دور میں اس
سکردو کے قلعہ میں معمولی نوکرانی کے برابر بھی میری حیثیت نہیں اے میرے
بھائی! میں تیری بڑی بہن تجھ پر قربان ہو جاؤں اے میرے نصیبوں والے بھائی
شاہ بہرام چو،،

علی شیر خان انچن کے جانشین احمد خان کی وفات کے بعد عبدال خان اور آدم خان سکردو کے تخت کے لئے جھگڑ پڑے۔ عبدال خان نے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد آدم خان سے ہمدردی رکھنے کی پاداش میں شگر میں تباہی مچانے کے بعد خپلو پر حملہ کر کے شاہ بہرام چو کو قتل کیا اور اس کی بہن کو سکردو لا کر ذلت آمیز طریقے سے زندہ رکھا جس کی دہائی مذکورہ گیت کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن یبگو راجاؤں کے نسب نامے میں عبدال خان کا ہم زمانہ دوسرا شاہ بہرام چو مذکور نہیں۔ اسی لئے بنات گل آفریدی نے اسی یبگو بہرام کو عبدال خان کا ہم عصر بنا دیا ہے۔ ان کے مفروضے سے اتفاق کرنا ہمارے لئے مشکل ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ یبگو بہرام کا پرپوتا شیر غازی علی شیر خان انچن کا ہم عصر تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس بہرام چو کا ذکر گیت میں موجود ہے وہ یہ یبگو بہرام نہیں جس کا ذکر تاریخ رشیدی میں ہے بلکہ عبدال خان کا ہم عصر دوسرا شاہ بہرام چو سالینگ کھر کے یبگو شیر غازی اور یبگو رحیم خان کے درمیانی عہد میں یا تھورسے کھر کے یبگو میر خان اور یبگو حسین خان کے درمیانی زمانے میں خپلو کا حاکم گذرا ہے جس کا نام نسب نامے میں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

حشمت اللہ خان کے مطابق سلطان سعید خان شاہ یارقند کے حملہ بلتستان کے بعد سکردو

کے راجہ شیر شاہ نے حملہ کر کے چھلو پر قبضہ کر لیا اور بہرام مع اپنے بھائی کے ترکستان کی طرف بھاگ نکلا اور بعد میں شیر شاہ کے مقرر کردہ ہر مقپون کے ظلم کی بناء پر لوگوں نے اسے ٹھکانے لگایا اور یار قند سے بہرام کو لاکر تخت پر بٹھا دیا۔ اس کی تفصیل سکردو کی تاریخ کے حصے میں بیان ہوئی ہے۔ بہرام نے لداخ کے راجہ کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اس رانی کے بطن سے یبگو سیکم پیدا ہوا جو بہرام کے بعد راجہ بنا۔

یبگو سیکم

1550ء تا1575ء

یبگو سیکم کے تین بیٹے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں ان تینوں کے درمیان اپنا ملک تقسیم کر دیا۔ یبگو امان عرف بیوان چوکوڈغونی سے کریس تک کا علاقہ، یبگو تراب کو چھلو اور چھور بٹ کا بالائی علاقہ اور یبگو پمبر یا ابراہیم کو دریائے شیوک کے دائیں کنارے پر واقع سالینگ اور ڈغونی تک واقع دیگر علاقے دیدیئے۔ یبگو سیکم کے فوت ہونے پر تینوں بیٹے اسی تقسیم کے مطابق حکومت کرنے لگے۔

تھور سے کھر پر یبگو تراب خان نے 1575ء تا1600ء حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یبگو میر خان 1600ء تا1615ء حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے یبگو حسین خان نے 1615ء تا1640ء حکومت کی۔ حسین خان کی شادی شاہ مراد کی بہن حیا خاتون کے ساتھ ہوئی تھی جس سے اس کے دو بیٹے بابر اور یعقوب پیدا ہوئے۔ حسین خان کی وفات پر بابر اور یعقوب نے یکے بعد دیگرے 1640ء تا1674ء حکومت کی۔ حسین خان کا ایک بھائی حمزہ خان تھا جو راجہ کریس کے ہاں بطور خانہ داماد چلا گیا۔

یبگو ابراہیم راجہ سالینگ

1575ء تا1590ء

حشمت اللہ خان نے یبگو ابراہیم کا دور 1590ء تا1605ء قرار دیا ہے جبکہ تاریخ سے

ثابت ہے کہ 1591ء میں علی شیر خان انچن کی فتح لداخ کے وقت یبگو شیر غازی سالینگ کھر کا راجہ تھا۔

یبگو شیر غازی

1590ء تا 1620ء

حشمت اللہ خان نے لکھا ہے کہ یبگو سیکم کے عہد میں دو بھائی سید ناصر شاہ طوسی اور سید علی طوسی سلتورو کے راستے یارقند سے چپلو پہنچے۔ انہوں نے تھغس میں قیام کیا اور ادھر تبلیغ دین میں مصروف رہے۔ تھغس میں ایک مسجد بھی تعمیر کی جس کا سن تکمیل 'غیب'، یعنی 1012ھ ہے۔ یار قندی قزاق بہار کے دنوں میں کندوس کے راستے آ کر چپلو میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ طوسی برادران کے چپلو میں قیام کے زمانے سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا جسے ان دونوں بھائیوں کے کرامات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ یبگو شیر غازی کے دور کا واقعہ ہے کیونکہ 1012ھ (1603ء) میں وہی سالینگ کھر کا راجہ تھا۔ یبگو ابراہیم کے بعد تقریباً 1590ء میں اس کا بیٹا شیر غازی سالینگ کھر کا راجہ ہوا تھا۔

علی شیر خان انچن کی فتح لداخ کی مہم میں یبگو شیر غازی بھی شریک تھا۔ اسی کی کوششوں سے لداخ کے راجہ جمیانگ نمگیل کو سکردو سے بسلامت رہائی نصیب ہوئی۔ یبگو شیر غازی نے اپنی بیٹی ارگیال خاتون کی شادی جمیانگ نمگیل کے ساتھ اس شرط پر کر دی کہ جمیانگ نمگیل کی ارگیال خاتون سے جو اولاد ہو وہی وارث حکومت ہو گی۔ اسی کے بطن سے سنگے نمگیل پیدا ہوا جو جمیانگ نمگیل کے بعد لداخ کا حکمران بنا۔

جمیانگ نمگیل کے فوت ہونے پر ارگیال خاتون نے بیوگی کا زمانہ نوبراہ میں ہوندر کے محل میں بسر کیا۔ اپنے شوہر کے ایصال ثواب کے لئے دو عالیشان سرائے تعمیر کرائیں۔ اپنے محل کے پہلو میں ایک مسجد تعمیر کی اور اسی کے قریب وہ دفن بھی ہوئی۔ اس گیالمو کو نوبراہ میں گزارہ کے طور پر کچھ رقبہ ملا ہوا تھا۔ اس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے لگان کا ایک حصہ بہت عرصہ تک راجہ چپلو

کوادا ہوتا رہا اور بندوبست کے وقت سے بند ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یبگو ابراہیم کے عہد کے اواخر میں یا یبگو شیر غازی کے عہد کے اوائل میں علی شیر خان انچن نے چپلو کو زیر نگین لایا تھا۔ کننگھم لکھتا ہے:

''علی شیر خان جو بوخا کے بعد چوتھی پشت میں آتا ہے نے لداخ اور چپلو کو فتح کیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے احمد خان کو یہ علاقے وراثت میں ملے جو عظیم مقپون حکمرانوں میں آخری تھا۔...''

کننگھم دوسری جگہ لکھتا ہے:

''چپلو کے راجے کئی پشتوں سے بالتی (سکردو) کے حکمرانوں کے زیر تسلط رہے ہیں۔ لیکن غالب امکان یہ ہے کہ بالتی کے حکمران خاندان جس کا مقپون یا سپہ سالار کا لقب اس کے کسی سردار لشکر کی اولاد ہونے کی غلط فہمی پیدا کرتا ہے، کے عروج سے قبل صدیوں تک یہ ملک ان کے آباواجداد کے تصرف میں رہا ہے۔''

یبگو رحیم خان

1620ء تا 1660ء

یبگو شیر غازی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رحیم خان اس کا جانشین ہوا۔ اس کی شادی راجہ لداخ کی بیٹی سے ہوئی جس سے حاتم خان اور اعظم خان پیدا ہوئے۔

تاریخ جموں کے مطابق یبگو رحیم خان راجہ سالینگ کھر اور یبگو حسین خان راجہ تھور سے کھر سکردو کے حاکم می زوس عبدال خان کے ہم عصر ہوتے ہیں۔ لیکن مشہور لوک گیت 'شاہ بہرام چو' کے مطابق عبدال خان کے عہد حکومت (37-1627ء) میں چپلو میں شاہ بہرام چو راجہ تھا۔ اس پر ہم نے اس سے قبل بات کی ہے۔ یہ نکتہ محققین کے لئے دعوت تحقیق دے رہا ہے۔

اس زمانے میں سکردو کے راجے اندورنی جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اس موقع سے

فائدہ اٹھا کر رحیم خان نے راجہ لداخ کی مدد سے تھور سے کھر پر حملہ کر دیا اور بابر و یعقوب کو ان کی والدہ سمیت اسیر کر کے لداخ میں بودھ کھر بو کے مقام پر قید کر دیا۔ اس مدد کے عوض راجہ لداخ نے پوئین سے اوپر چھوربٹ کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ تھور سے کھر اور باقی علاقوں پر رحیم خان نے قبضہ کر لیا۔

اسی دوران سکردو میں شاہ مراد کی حکومت کو استحکام نصیب ہوا۔ اس نے بابر و یعقوب کو لداخ کی قید سے چھڑا کر لایا اور رحیم خان کو شکست دے کر ان کی آبائی میراث پر دوبارہ قائم کر دیا۔

یبگو حاتم خان

1660ء تا 1727ء

یبگو رحیم خان کے بعد اس کا بیٹا حاتم خان اس کا جانشین ہوا۔ یہ بڑا زبردست اور مدبر راجہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے معرکے کرنے کے بعد اپنے حسن تدبیر سے آخر کار خپلو کی متحدہ حکومت قائم کی۔

شاہ مراد نے اپنے بھانجے بابر اور یعقوب کو لداخ کی قید سے چھڑا کر تھور سے کھر کی حکومت پر بحال کیا تھا۔ بابر کچھ عرصہ حکومت کرنے کے بعد لاولد فوت ہوا اور اس کا بھائی یعقوب اس کا جانشین ہوا۔ سکردو میں شاہ مراد کے فوت ہونے پر شیر شاہ نے سکردو کی حکومت پر قبضہ کر لیا جس کے بعد شگر کے ساتھ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ حاتم خان نے یہ تسلی کر کے کہ اس وقت سکردو سے یعقوب کو امداد پہنچنے کا امکان نہیں ہے اسے فریب دے کر 1674ء میں تھور سے کھر پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب اہل و عیال سمیت نواب کشمیر کے پاس فریاد کی غرض سے کرگل پہنچا اور اہل و عیال کو کرگل میں چھوڑ کر خود سری نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن سفر کے دوران سرسنگ گونڈ کے مقام پر بیمار ہو کر فوت ہوا۔ اس کی اولاد نے مجبوراً وہیں نجاری کا کام اختیار کیا۔ یعقوب کے ساتھیوں میں سے ایک نے دراس میں سکونت اختیار کی۔ اس کی اولاد کو چوہل کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ بعد

میں وزیر وزارت حشمت اللہ خان نے انہیں وہاں کا ذیل دار مقرر کیا تھا۔

تھور سے کھر پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی حاتم خان متحدہ خپلو کا حکمران ہو گیا۔ 1681ء کے لگ بھگ سکردو کے تخت پر محمد رفیع خان کو بٹھایا گیا تھا جو سکردو کے کمزور ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاتم خان نے ایک لشکر ترتیب دے کر اپنے بھائی اعظم خان کی سرکردگی میں سکردو پر حملہ کر دیا۔ گول پر قبضہ کرنے کے بعد یہ لشکر سکردو پہنچا تو محمد رفیع خان مقابلے کی تاب نہ لا کر کھر پوچھے میں قلعہ بند ہو چکا تھا۔ اعظم خان نے قلعہ کا محاصرہ کر کے ملک میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ سکردو کے ملحقہ دیہات کو تباہ کر دیا اور سنگے ستاغو، توتی امری مون چو، تھایور کی شغرن کے پتھر اور کواردو کے عالیشان ستون بطور یادگار فتح ساتھ لے کر واپس ہوا۔ یہ واقعہ 1712ء کا ہے۔ سرداران لشکر بوتہ واچھکر کو حاتم خان نے اس فتح کے انعام میں یہ دائمی عطیہ دیا کہ راجہ کے پاس آنے والے تحائف کا ساتواں حصہ ان کا حق ہو گا۔ چنانچہ ڈوگرہ دور تک یہ عطیہ بوتہ کی اولاد وصول کرتی رہی۔ حاتم خان نے کاندے، غورسے، ڈغونی اور براہ میں آب پاشی کے ذرائع کو بڑھا کر زراعت کو ترقی دی۔ اسی راجہ کے عہد میں دو بھائی میر عارف اور ابوسعید کشمیر کے راستے بلتستان میں پہنچے تھے جن کا قصہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

یبگو دولت خان

1727ء تا 1764ء

حاتم خان کے بعد اس کا بیٹا دولت خان عرف دبلہ خان خپلو کا حکمران بنا۔ اس کے عہد میں راجہ کریس ونر نے سرکشی کی۔ دبلہ خان نے ان دونوں کو زیر کر لیا۔ یبگو دولت خان کے عہد میں 1733ء میں سکردو کے راجہ ظفر خان نے خپلو پر فوج کشی کی۔ 1734ء میں دوسری بار پھر ظفر خان نے خپلو پر حملہ کر دیا۔ دونوں بار لداخی فوج کی مدد سے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا گیا۔ اس کا عہد حکومت سکردو کے ساتھ خانہ جنگیوں میں گزر گیا۔

یبگو محمد علی خان

1764ء تا 1795ء

دبلہ خان کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا محمد علی خان اس کا جانشین ہوا۔ یہ بڑا منتظم راجہ تھا۔ اس نے اپنے ملک کی معاشی ترقی میں ہر ممکن کوشش کی۔ 1765ء میں یبگو محمد علی خان نے وزیر یارقند کی وساطت سے شہنشاہ چین کو خط لکھا اور دوسرا خط یوسف وانگ کو لکھا کہ وہاں کے تاجر بلتستان کا راستہ اختیار کریں۔ ہم راستے کی تعمیر و مرمت کریں گے اور تاجروں کی خدمت بھی کریں گے۔ محمد علی خان نے یہ دونوں خطوط اپنے ایلچی حسن بیگ کے ساتھ یارقند بھیجا تھا۔ وزیر یارقند اور یوسف وانگ نے وہاں کے روایتی کیلنڈر کے ساتویں مہینے کے نویں روز شہنشاہ چین کو ان خطوط کے حوالے سے مفصل رپورٹ بھیج دی۔

محمد علی خان کے زمانے میں شگر میں اعظم خان اور قلی خان کے درمیان جانشینی کا تنازعہ برپا ہوا۔ سکردو کے علی شیر خان نے اعظم خان کو بھگا کر قلی خان کو شگر کی حکومت پر بیٹھا دیا۔ محمد علی خان نے لشکر بھیج کر اعظم خان کو شگر پر قابض کر دیا۔ محمد علی خان نے اسی دوران کھرمنگ پر بھی حملہ کر دیا لیکن مصالحت کر کے واپس چلا آیا۔

یبگو یحییٰ خان

1795ء تا 1812ء

محمد علی خان کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ خان اس کا جانشین ہو گیا۔ محمد علی خان کے زمانے سے شگر کی جانشینی کے سلسلے میں سکردو کے ساتھ مناقشہ چلا آ رہا تھا۔ یحییٰ خان کا دور بھی اسی کشمکش میں گزر گیا۔ اس زمانے میں احمد شاہ سکردو کا راجہ تھا۔ لداخ کے ریکارڈ کے مطابق 1812ء میں یحییٰ خان فوت ہوا۔

مہدی علی خان

1812ء تا1819ء

یحییٰ خان کے تین بیٹے تھے۔ دولت علی خان، مہدی علی خان (محمود شاہ) اور محمد شاہ۔ یحییٰ خان کے فوت ہونے پر جانشینی کے معاملے پر ان کے درمیان تنازعہ ہوا۔ منجھلا بھائی مہدی علی خان چالاک تھا۔ اس نے راجہ لداخ کی مدد سے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس مہم میں لداخی فوج کا سردار لونپو ہوندر تھا۔ اس مدد کے عوض چھور بٹ کا علاقہ راجہ لداخ کے حوالے کیا گیا۔ مہدی علی خان نے اپنے دونوں بھائیوں کو قید کر کے لداخ بھیج دیا جنہیں گیالپو لداخ نے نوبراہ میں نظر بند کر دیا۔

مقپون احمد شاہ

بذریعہ یول سترونگ کریم

1819ء تا1840ء

اسی دوران دولت علی خان کا بیٹا محمد علی خان بھاگ کر سکردو پہنچا۔ شگر میں اعظم خان اور قلی خان کے درمیان جانشینی کے تنازعے کے سلسلے میں خپلو اور سکردو میں لڑائیوں کا سلسلہ پہلے سے ہی جاری تھا۔ خپلو کے حکمران خاندان میں پھوٹ پڑنے پر احمد شاہ نے محمد علی خان کی حمایت کے بہانے سے اپنے بھتیجے عبدال خان کی سرکردگی میں فوج بھیج کر خپلو پر حملہ کر دیا۔ سکردو کی فوج کو شکست ہوگئی اور عبدال خان سمیت سرداران لشکر مہدی علی خان کے ہاتھوں قید ہو گئے۔ احمد شاہ نے عبدال خان کو چھڑانے کے لئے اس کے وزن کے برابر سونا دینے کی پیشکش کی لیکن مہدی نے عبدال خان کو نوبراہ میں جہاں وہ نظر بند تھا وہیں ابدی نیند سلادی۔

احمد شاہ نے انتقام لینے کے لئے خود خپلو پر حملہ کر دیا۔ مہدی علی خان کو شکست ہوگئی۔ اسے پکڑ کر سکردو لایا اور وہ یہیں احمد شاہ کی قید میں فوت ہو گیا۔ ادھر خپلو میں احمد شاہ نے یول ستروتگ کریم کو گورنر مقرر کر دیا۔ یول ستروتگ کریم 1840ء تک خپلو کا حکمران رہا اور اسی کے زمانے میں

وزیر زور آور سنگھ نے بلتستان پر حملہ کر دیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ مہدی علی خان کا نام بھی شاہ بہرام چو کے نام کی طرح خپلو کے یبگو راجاؤں کے اپنے مرتب کردہ شجرہ نامہ میں درج نہیں جبکہ تاریخ اور مقامی روایات دونوں سے ثابت ہے کہ مہدی علی خان 1812ء تا 1819ء خپلو کا حاکم رہا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ بہرام چو اور مہدی علی خان دونوں چونکہ یبگو خاندان کے لئے باعث عزت نہ تھے اس لئے بعد کے حکمرانوں نے ان دونوں کے ناموں کو دانستہ طور پر شجرہ نامے سے خارج کر دیا ہے۔ کم از کم مہدی علی خان کے بارے میں یہ اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ حشمت اللہ خان نے اپنے مرتب کردہ شجرہ نامہ میں مہدی علی خان کا نام درج کیا ہے۔

......☆......

چوتھا باب

سلطنت بلتستان کا خاتمہ

ڈوگروں کا عروج

برصغیر پاک و ہند میں مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ملک کے بعض حصوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے پردے میں اپنا اقتدار جمالیا۔ اسی طوائف الملوکی کے دوران پنجاب میں سکھوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ 1799ء میں ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور پنجاب میں سکھ سلطنت کی داغ بیل ڈالدی۔

رنجیت سنگھ صاحب عزم وفراست شخص تھا اس نے سکھوں کو ایک متحد قوم کی حیثیت دی اور تھوڑے ہی عرصے میں ملتان ہزارہ اور اٹک کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے بعد 1819ء میں کشمیر پر بھی قبضہ کرلیا۔ کشمیر کو مغل شہنشاہ اکبر نے 1586 میں مغل سلطنت میں شامل کیا تھا۔ 1752ء میں افغان بادشاہ احمد شاہ ابدالی نے مغلوں سے چھین کر وہاں درانی حکومت قائم کی تھی۔ پنجاب میں سکھ سلطنت کے ظہور کے بعد رنجیت سنگھ نے 1814ء میں کشمیر پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی۔ 1819ء میں دیوان ہری چند کے ذریعے اسے فتح کر کے سکھ سلطنت میں شامل کرلیا۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں جموں کے ڈوگرہ راجپوت خاندان کے دو بھائی گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ 1810ء میں مہاراجہ کے دربار میں قلیل تنخواہ پر حاضر باش ملازم ہو گئے۔ ان کی بے مثال خدمات کی وجہ سے مہاراجہ ان پر مہربان ہوگیا۔ 1819ء میں فتح کشمیر کی مہم میں گلاب سنگھ نے بڑی بہادری دکھائی۔ رنجیت سنگھ نے خوش ہو کر جنوری 1820 میں نگہداشت فوج کے اقرار پر ان کے باپ کشور سنگھ کو جموں کا راجہ بنادیا۔ اسی دوران کشتوار کے ایک باغی وزیر لکھپت رائے کی مدد سے گلاب سنگھ نے کشتوار کو فتح کرلیا۔ جون 1822ء میں گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنا دیا گیا۔

اس طرح پنجاب کی سکھ سلطنت کی سر پرستی میں جموں میں ڈوگرہ حکومت قائم ہوگئی۔

گلاب سنگھ پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ سکھ سلطنت زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ انگریز رنجیت سنگھ کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لئے گلاب سنگھ اپنے لئے ایک ڈوگرہ سلطنت قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ ساتھ ہی اسے تبت سے سونا چاندی سے مالا مال علاقے تھوک جالونگ، تھوک دارو کپہ اور نارس کورسوم چھیننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے نہایت ہی قلیل عرصے میں جموں کے ارد گرد کی ریاستوں کشتوار، ریاسی، راجوڑی اور چنانی کو فتح کیا اور زور آور سنگھ کو کشتوار کا گورنر بنایا۔ اس کے بعد کشتوار کے گورنر نے یہ بہانہ کر کے کہ لداخ پہلے کشتوار کا ماتحت تھا لداخ پر حملے کے لئے فوج لے کر روانہ ہوا۔ چنانچہ 16 اگست 1834 کو وزیر زور آور سنگھ براستہ بھوٹو کول سورو میں وارد ہوا اور حملہ کر کے سورو، کرگل، دراس اور زانسکر پر قبضہ کر لیا۔ سردیاں سورو میں گزاریں اور مئی 1835ء میں زور آور سنگھ نے لداخ کو فتح کیا۔ گیالپو لداخ پر پچاس ہزار روپے تاوان جنگ عائد کیا۔ 37 ہزار نقد وصول کئے اور باقی رقم دو قسطوں میں ادا کرنے کا عہد و پیمان ہوا۔ وزیر ابھی لداخ میں ہی تھا کشمیر کے سکھ گورنر میہان سنگھ نے اپنے آدمی بھیج کر پورگ کے علاقوں میں بغاوت کرادی۔ اس اطلاع کے ملنے پر زور آور سنگھ فوراً سوت اور سورو میں بغاوت فرو کرنے کے لئے چلا گیا۔ پورگ سے بغاوت فرو کر کے زانسکر پہنچا تو اسے لیہ سے گیالپو کے باغیانہ عزائم کی اطلاع مل گئی۔ جلدی سے لیہ پہنچا۔ گیالپو ٹنڈوف نمگیل کو معزول کر کے لیہ کے بالمقابل ستوک گاؤں میں اسے گزارہ کے لئے جاگیر دیدی۔ کالون موروپ ستزن کو حکومت سپرد کی۔ پچھلی بقایا رقم اور نیا تاوان جنگ اجناس کی شکل میں وصول کیا۔ اٹھارہ ہزار روپے سالانہ خراج مقرر کیا۔ لیہ کے باہر ایک قلعہ تعمیر کیا۔ دلیل سنگھ کو تھانہ دار مقرر کر کے 300 سپاہیوں کے ساتھ ادھر چھوڑا اور خود موروپ ستزن کے بیٹے اور دوسرے معززین کو ساتھ لے کر جموں واپس چلا گیا۔

1837ء میں لداخ اور پورگ سے پھر بغاوت کی خبریں آئیں تو ستمبر 1837ء میں وزیر زور آور سنگھ تین ہزار فوج لے کر پھر پورگ پہنچ گیا۔ وزیر کے آنے کی خبر سن کر موروپ ستزن ہندوستان کی طرف فرار ہو گیا لیکن ڈوگرہ فوجیوں نے سپتی سے اسے گرفتار کر کے لایا۔ وزیر نے

اسے معزول کر کے قید کر دیا۔ اور اس کی جائیداد ضبط کر لی۔ گیالپو ٹنڈ وف نمگیل کو لداخ کی حکومت پر بحال کیا۔ 23 ہزار روپے سالانہ خراج مقرر کیا اور چند ماہ بعد واپس جموں چلا گیا۔

بلتستان پر ڈوگروں کا قبضہ

زورآور سنگھ کی 1837ء کی مہم لداخ کے دوران سکردو کے راجہ احمد شاہ کا بیٹا محمد شاہ بھاگ کر اس کی پناہ میں پہنچا جسے اس نے گیالپو ٹنڈ وف نمگیل کے سپرد کیا۔ کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان نے بھی اسی دوران زورآور سنگھ سے ملاقات کر کے اسے بلتستان پر حملے کی دعوت دی اور اپنی طرف سے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

لداخ سے زورآور سنگھ کی واپسی کے بعد کشمیر میں سکھ حکومت کے صوبہ دار کرنیل میہان سنگھ نے پھر پوریگ اور لداخ میں اپنے آدمی بھیج کر انہیں ڈوگروں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ بغاوت کے اس عمل میں لہاسہ، کشمیر اور بلتستان سے امداد حاصل کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ بلتستان سے امداد حاصل کرنے کے لئے راجہ احمد شاہ کی حمایت حاصل کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا لداخ کے گیالپو نے احمد شاہ کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے آدمی بھیج کر محمد شاہ کو گرفتار کر کے لے جائے۔ چنانچہ احمد شاہ نے پچاس آدمی بھیج کر محمد شاہ کو لداخ سے پکڑ کر سکردو لایا جہاں اسے نظر بند کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ محمد شاہ کو لداخ سے سکردو تک ننگے پیر چلایا گیا جس کی وجہ سے سردی سے اس کے پاؤں جل گئے۔

احمد شاہ کا یہ فعل ڈوگرہ علاقے پر حملہ کے مترادف تھا اور ڈوگرہ حکومت کی پناہ سے محمد شاہ کو جبراً سکردو لانا ڈوگروں کو بلتستان پر حملے کی دعوت دینے کے برابر تھا۔ چنانچہ جب 1839ء کی گرمیوں میں زورآور سنگھ نے پوریگ اور لداخ میں تحریک آزادی کو کچلنے کا ارادہ کیا تو اس وقت لہاسہ، کشمیر اور بلتستان سے تحریک کے لیڈروں کو کوئی امداد نہ پہنچی اور اس نے بآسانی پوریگ اور لداخ کو پھر فتح کر لیا۔ تحریک آزادی کے سرکردہ رہنماؤں کو عبرتناک سزائیں دیں۔ دراس کا سکہ میرادھر کی تحریک کا رہنما تھا۔ وزیر نے اس کی زبان اور دایاں ہاتھ کاٹ کر کٹے ہوئے ہاتھ کو عبرت کے لئے کھلسے پل پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد زورآور سنگھ نے راجہ احمد شاہ کو مراسلہ بھیجا کہ تمہارا بیٹا محمد

شاہ جموں سرکار کی پناہ میں تھا تم نے اپنے آدمی بھیج کر لداخ پر حملہ کیا اور جبراً اسے واپس لے گیا۔ یہ تمہاری دست درازی ہے۔ اگر فوراً تم نے اسے ہمارے پاس واپس نہ پہنچایا تو ڈوگرہ فوج تمہارے دارالحکومت میں داخل ہو کر اسے چھڑا لے گی۔ احمد شاہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب بلتستان پر حملے کے لئے مناسب وقت آ چکا تھا۔ چنانچہ اپنے ساتھ موجود ڈوگرہ فوج کے علاوہ اس نے لداخ اور پوریگ کے علاقوں سے بھی ایک فوج تیار کی۔ پرانے لداخی سپہ سالار کالون پنکھاپا کو اس مقامی فوج کا سردار مقرر کیا۔ گیالپو تنڈوف نمگیل کو بھی اس کے ساتھ تعینات کیا۔ اس لشکر کو اپنی فوج کے ساتھ شامل کیا اور محمد شاہ کی رہائی کے بہانے سکردو کی طرف روانہ ہو گیا۔ کل پندرہ ہزار کی جمعیت زورآور سنگھ کے ساتھ تھی۔

راجہ احمد شاہ کو ڈوگروں کے حملے کی خبر ملی تو اس نے کھرمنگ اور خپلو میں ڈوگروں کا راستہ روکنے کا مکمل انتظام کیا۔ کریس اور خپلو سے ایک فوج تشکیل دے کر یول سترونگ کریم کی سرکردگی میں چھوربٹ خپلو میں پوئین کے مقام پر متعین کیا۔ بلتستان کے دیگر علاقوں کی افواج کو بوڑوپا خاندان کے دو بھائیوں وزیر غلام حسن اور وزیر غلام حسین کی سرکردگی میں کھرمنگ کی طرف سرحد پر زورآور سنگھ کے مقابلے کے لئے روانہ کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس فوج کی کل تعداد تین ہزار اور بقولے بیس ہزار تھی جس میں حمال بھی شامل تھے۔ اس فوج نے ڈوگروں کے پہنچنے سے پہلے چے چے تھنگ کے بالمقابل مورچے سنبھال لئے اور کمین گاہیں قائم کیں۔ فوج کا ایک دستہ ونکو میں دریائے سندھ کے کنارے متعین تھا جہاں پر سردار لشکر وزیر غلام حسن کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔ باقی فوج اوپر میدان میں کمین گاہوں میں تھی۔ یہ میدان ابھی تک تھموخانی تھنگ یعنی میدان جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس انتظام کے ساتھ ہی کھرمنگ کی طرف سے ڈوگرہ فوج کا راستہ مسدود ہو گیا۔

وزیر زورآور سنگھ لیہ سے روانہ ہو کر ہنو پہنچا۔ ادھر سے لداخی فوج کو مدین شاہ (محی الدین شاہ) کی سرکردگی میں اس نے ہنولہ کے راستے چھوربٹ خپلو کی طرف روانہ کر دیا۔ اور خود باقی فوج کو ساتھ لے کر گرکون سے ہوتا ہوا سوت پوریگ گیا اور وہاں کا لشکر بھی ساتھ لے کر پہاڑ عبور کر کے چے چے تھنگ پہنچ گیا۔ دریائے سندھ کو عبور کرنا تھا لیکن سامنے ونکو اور تھموخان میں بلتیوں

کے مورچے تھے جن کی گولیوں کے نیچے دریا عبور کرناممکن نہ تھااس لئے ڈوگرہ فوج پیش قدمی نہ کر سکی اور دو ہفتے تک ادھر پڑی رہی۔ پانچ ہزار نفری پر مشتمل فوج کے ایک حصے کو وزیر نے ندھان سنگھ کی سرکردگی میں دریائے دراس عبور کر کے اس طرف سے سکردو کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اس طرف راجہ احمد شاہ کی فوج تیار کھڑی تھی جس نے پندرہ میل تک اس فوج کو آگے بڑھنے دیا پھر مکمل نرغے میں لے کر اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ بلتیوں نے کرکت کے مقام پر ندھان سنگھ اور اس کی فوج کو کاٹ ڈالا۔ پانچ ہزار میں سے صرف چار سو نفر جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے جنہوں نے زور آور سنگھ کو چے چے تھنگ میں اس تباہی کی اطلاع دی۔

اس دوران برف باری ہوئی اور شدید سردی ہونے لگی۔ ادھر ایک ناقابل عبور دریا سامنے تھا اور ادھر شدت کی سردی کا بھی سامنا تھا۔ راتیں بڑے بڑے پتھروں کی پناہ میں بسر ہو رہی تھیں اور کوئی سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اس اثناء میں رسد کی بھی کمی ہوگئی۔ جس نے قحط کی سی صورت حال پیدا کر دی۔ ادھر سردی کی شدت سے 500 ڈوگرہ سپاہیوں کے ہاتھ پاؤں جل کر بیکار ہوگئے۔ ان حالات نے ڈوگرہ فوجیوں کے حوصلے پست کر دیئے اور فوج کا سارا نظم ونسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ سپاہیوں نے کمانڈروں کا حکم ماننا بھی چھوڑ دیا۔

جنوری 1840ء کا مہینہ تھا۔ دریا کی سطح پر مکمل طور پر ابھی تک یخ نہیں جمی تھی۔ دونوں کناروں سے یخ جمی تھی لیکن درمیان میں خالی تھا۔ اسی دوران کرگون کے دردلوگوں نے مشورہ دیا کہ دریا کے درمیانی حصے کو تدبیر سے یخ بستہ کر دینا ممکن ہے۔ ایک رات اندھیرے میں ڈوگرہ فوج کے ایک افسر مہتہ بستی رام نے اس تدبیر کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں دریا کے دونوں کناروں کی طرف سے یخ جمی ہوئی تھی اور بیچ میں صرف بیس فٹ کا فاصلہ باقی تھا۔ کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان کا وزیر زور آور سنگھ کے ساتھ خفیہ خط وکتابت کا سلسلہ قائم تھا۔ زور آور سنگھ نے اسے پیغام بھیجا کہ تمہاری مدد کے بھروسے پر ہم اس تنگ راستے میں آئے ہیں کچھ تدبیر کرلو۔ کہتے ہیں کہ علی شیر خان کا اس پل کی تیاری میں بڑا حصہ تھا۔ چنانچہ خط وکتابت کے ذریعے تعمیر پل کے موقع اور وقت کا فیصلہ کرلیا گیا اور وقت معینہ پر چے چے تھنگ کی طرف سے دردلوگوں نے اورونکو

کی طرف سے علی شیر خان کے آدمیوں نے دریا کی جمی ہوئی یخ کے کناروں کے ساتھ پانی کی سطح سے ملا کر لمبی بلیاں پھنسائیں۔ یخ کے ٹکڑے جو سردی کے زمانہ میں بہتے رہتے ہیں ان بلیوں کے ساتھ اٹکتے اور ایک دوسرے کے ساتھ چپکتے گئے۔ یہاں تک کہ دریا کے بیچ میں بیس فٹ کا فاصلہ جو یخ بندی سے کھلا ہوا تھا اس کے اوپر چند گھنٹوں میں یخ کی ایک مضبوط سطح تیار ہوگئی اور صبح پانچ بجے تک یخ کا پل قابل گزر ہوگیا۔ چنانچہ صبح کی روشنی ہونے سے پہلے مہتہ بستی رام نے ایک دستہ فوج اس پل کے ذریعے دریائے سندھ سے گزارا اور وزیر غلام حسن کے ساتھ ونکو میں متعین بلتی فوج پر حملہ کر دیا۔ پل کی تیاری اور دریا کے عبور کرنے کا کام اتنی ہوشیاری اور تیزی سے انجام دیا گیا کہ بلتی فوج کو تب اس کا علم ہوا جب ڈوگرہ فوج اس کے سر پر پہنچ گئی۔ کہتے ہیں کہ فوج کا سردار وزیر غلام حسن اس وقت وضو کی تیاری کے لئے طہارت میں مصروف تھا تاہم اس نے فوراً اپنی فوج کو تیار کر کے دست بدست لڑائی میں ڈوگرہ فوج کا سخت مقابلہ کیا اور تقریباً تمام حملہ آور سپاہیوں کو کاٹ ڈالا۔ زورآور سنگھ نے مزید کمک بھیجی۔ اس لڑائی میں وزیر غلام حسن مارا گیا۔ جس کے بعد ونکو پر متعین بلتی فوجی بھاگ کر تھموخان کی فوج کے ساتھ شامل ہوگئے اور یوں ڈوگروں کے لئے دریا عبور کرنے میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔

کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان نے اپنے وزیر ترانکپہ عبدالعلی کی سرکردگی میں کھرمنگ کی ایک ہزار فوج راجہ احمد شاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بلتی فوج کے ساتھ تھموخان کے میدان میں بھیج دی تھی۔ دوسری طرف وزیر زورآور سنگھ کو بھی مسلسل مدد فراہم کر رہا تھا تاکہ خواہ دونوں میں سے کسی فریق کی فتح ہو مگر اس کی اپنی فتح میں شک وشبہ نہ رہے۔ چنانچہ زورآور سنگھ کے مشورے سے کھرمنگ کے لوگوں کے لئے ایک خاص امتیازی نشان تجویز کیا گیا تھا اور معاہدہ یہ تھا کہ اس نشان والے اشخاص کو ڈوگرہ فوج کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ جب لڑائی شروع ہوگئی تو کھرمنگ کی فوج حسب سازش بلتی فوج سے الگ ہوگئی۔ نہ اس نے ڈوگروں پر حملہ کیا اور نہ ہی ڈوگروں نے اسے کوئی نقصان پہنچایا۔ بلتی فوج کا اس کی وجہ سے نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

زورآور سنگھ نے اب اپنی تمام فوج کے ساتھ تھموخان کی بلتی فوج پر حملہ کر دیا۔ چونکہ بلتی

فوج کے مورچے بلندی پر تھے انہوں نے ڈوگروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔اس دوران ایک دستہ ڈوگرہ فوج ایک پیچ دار راستے سے گھوم کر تھموخان کے اوپر پہاڑ پر چڑھ گئی اور نیچے بلتی مورچوں پر پیچھے کی جانب سے زبردست فائرنگ شروع کر دی۔اب بلتیوں کو اپنے مورچے چھوڑنے پڑے۔اتنے میں زورآورسنگھ کی فوج بھی سامنے پہنچ گئی۔دست بدست لڑائی میں بلتی فوج کا بہت جانی نقصان ہوا اور وہ پسپا ہوگئی۔تقریباً ایک ہزار لوگ جنگ میں کام آئے۔وزیر غلام حسن مارا گیا تھا۔وزیر غلام حسین اور سلطان بیگ وزیر روندو بھی مورول کے قریب مارے گئے۔وزیر غلام حسن کی قبر تھموخان میں اور اس کے بھائی وزیر غلام حسین کی قبر مورول میں اب تک موجود ہے۔تھموخان سے پسپا ہونے کے بعد بلتی فوج نے حمزی گونڈ کے قریب پھر مورچے سنبھال لئے۔اس جگہ پر راستہ پہاڑ کی کمر سے بلیوں کی مدد سے بنا ہوا تھا۔بلتیوں نے اس راستے کو ناقابل گزر بنا دیا۔عام حالات میں ڈوگرہ فوج کے لئے آگے بڑھنا مشکل تھا لیکن اب علی شیر خان کی کھرمنگ کی رعایا دل وجان سے وزیر زورآورسنگھ کی وفادار بن چکی تھی۔انہوں نے ڈوگرہ فوج کو اس جگہ پر پہاڑ کے اوپر سے گزار کر دوسری طرف اتار دیا۔اس لئے راجہ احمد شاہ کی فوج یہاں زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کرسکی اور ایک لڑائی کے بعد یہ لوگ وہاں سے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔اس کے بعد سکردو پہنچنے تک اس راستہ میں زورآورسنگھ کی مزاحمت نہیں ہوئی۔حمزی گونڈ میں زورآورسنگھ نے تین روز قیام کیا۔اس دوران اُس نے فوج کو از سر نو منظم کیا اور حوصلہ بڑھانے کے لئے بہت سے کمانڈروں اور سپاہیوں کو انعامات دیئے۔راجہ احمد شاہ کی فوج کھرمنگ سے فرار ہوگئی تو کھرمنگ کا راجہ علی شیر خان مقپون حمزی گونڈ میں وزیر زورآورسنگھ کے پاس اظہار عقیدت کے لئے بذات خود حاضر ہو گیا۔اسے اپنے ماموں اور سسر احمد شاہ سے شدت کی عداوت تھی۔اس کا انتقام لینے کے لئے اس نے خود اپنی آزادی کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا۔یہاں سے وہ ڈوگرہ فوج کی مکمل رہبری، امداد اور خدمت گزاری کے لئے کمربستہ ہوا۔ان خدمات کے صلہ میں وزیر نے یہ عہد کیا کہ اس کے مقبوضہ کھرمنگ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔اس عہد پر 1948ء تک عمل جاری رہا۔ڈوگرہ فوج کھرمنگ پہنچی تو علی شیر خان نے تین روز تک اس کی خوب مہمانداری کی۔علی

شیر خان کی سفارت کی بناء پر احمد خان راجہ طولتی اور وزیر پر کوتہ کھر منگ میں وزیر کی خدمت میں اظہار اطاعت کے لئے حاضر ہوئے۔ وزیر زور آور سنگھ کھر منگ سے روانہ ہو کر چوتھے روز گول پہنچا۔

ادھر مدین شاہ کی سرکردگی میں لداخی فوج ہنولہ کو عبور کر کے پوئین میں پہنچی اور ادھر قلعہ میں قیام کیا۔ پوئین اور کوستینگ کے درمیان میں پہاڑ پر یول سترونگ کریم کریس اور خپلو کی فوج کے ساتھ مورچہ زن تھا۔ اس کے ساتھ سکردو کے بھی کچھ لوگ تھے۔ اس دوران خپلو کی حکومت کے اصل دعویدار دولت علی خان نے نوبراہ سے آ کر ڈوگرہ اطاعت قبول کی۔ دولت علی خان نوبراہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسی دوران اس کے چچیرے بھائی حیدر خان نے یول سترونگ کریم کو دھوکہ دیا اور یہ کہہ کر کہ وہ دریا پار کر کے ڈوگرہ فوج پر پیچھے سے حملہ کرے گا۔ آدھی فوج کو لیکر سیدھا پوئین میں پہنچا اور ڈوگروں سے جا ملا۔ یول سترونگ کریم حیدر خان کی طرف سے ڈوگروں پر حملے کی اطلاع کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں حیدر خان کی طرف سے ایک ایلچی نے یول سترونگ کریم کو یہ پیغام پہنچایا کہ دولت علی خان سمیت ہم سب نے ڈوگروں کی اطاعت قبول کر لی ہے اور اب تمہارے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یول سترونگ کریم نے اس آدمی کو گولی مار کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا اور مجبوراً اپنے سکردو کے آدمیوں کو ساتھ لے کر خپلو واپس آیا اور بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر پیچھے ہٹ کر کریس میں مورچے سنبھال لئے۔ دولت علی خان نے چند روز خپلو میں ڈوگرہ فوج کی مہمانی کی۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر یہ فوج کریس پہنچی۔ ادھر یول سترونگ کریم نے راجہ احمد شاہ کے نمک کا حق ادا کیا اور لداخی ڈوگرہ فوج کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ لیکن اسی دوران جب اسے خبر ملی کہ زور آور سنگھ پر کوتہ (مہدی آباد) پہنچ گیا ہے تو پسپا ہو کر گول اور وہاں سے سکردو جا پہنچا۔ مدین شاہ کی فوج گول میں وزیر سے آ ملی۔ خورم خان راجہ کریس نے بھی لداخی فوج کے ساتھ گول پہنچ کر وزیر کی اطاعت و فرمان برداری کا اظہار کیا۔ وزیر کے ساتھ پوریگ، لداخ، خپلو، کھر منگ، طولتی اور کریس کے تمام راجے ہمرکاب تھے۔ ڈغونی پا وزیر بونو بھی وزیر کے ہمراہ تھا جو محمد شاہ کی گرفتاری کے وقت لداخ میں رہ گیا تھا۔

وزیر زور آور سنگھ سکردو پہنچا تو راجہ احمد شاہ کھرپوچھے میں قلعہ بند ہو چکا تھا۔قلعہ کا محاصرہ کرلیااور قلعہ تک آمدورفت کے راستے ہر طرف سے مسدود کردیئے۔

دریائے سندھ کے کنارے تین سوفٹ کی بلندی پر واقع کھرپوچھے قلعہ اپنے محل وقوع اور استحکام کی وجہ سے ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ احمد شاہ کے پاس تین سال تک کے مقابلے کے لئے کافی خوراک اور دیگر سامان قلعہ میں موجود تھا۔ کننگھم اور فرنیکی دونوں نے لکھا ہے کہ سکردو قلعہ کا محاصرہ بارہ روز تک جاری رہا پھر پانی نہ ملنے کی وجہ سے قلعہ والوں نے ہتھیار ڈالدیئے۔لیکن تاریخ جموں کے مؤلف حشمت اللہ خان کا کہنا ہے کہ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد بھی محصورین پر کچھ اثر ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو زورآور سنگھ کچھ مایوس سا ہوا۔اس کی مایوسی دیکھ کر علی شیر خان بھی پریشان ہوگیا۔ چنانچہ اس نے فریب کاری سے قلعہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنالیا۔اس نے احمد شاہ سے قسم کھا کر کہا ''وزیر زورآور سنگھ کا اس ملک پر قبضہ جمانے کا کوئی ارادہ نہیں وہ تو ولیعہدی کے بارے میں محمد شاہ کے ساتھ جو نانصافی ہوئی ہے اس سلسلہ میں اس کی درخواست پر اس کی مدد کو آیا ہے۔آپ قلعہ سے اتر کر اس جھگڑے کا تصفیہ کرلیں تو یہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔،،علی شیر خان کی قسم پر اعتبار کر کے احمد شاہ زورآور سنگھ کے پاس چلا آیا تو اسے گرفتار کر کے بیڑیاں پہنادی گئیں۔اس کے بعد ڈوگرہ فوج نے قلعہ کو لوٹ لیا۔ہزاروں بندوقیں، تلواریں، بارود کے ذخائر، بے شمار روپیہ اور مال واسباب جمع کیا گیا جن میں لاکھوں روپے مالیت کا سونا اور پارچہ جات بھی تھے۔ بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ بہتوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔

احمد شاہ کے ایک بیٹے کا نام امیر حیدر تھا۔امیر حیدر کی رضاعی ماں نے اس موقع پر ایک مرثیہ پڑھا تھا جو ''چوامیر حیدر،، کے نام سے لوک گیت کی صورت میں موجود ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

ہائے غم والم کا یہ کیسا زمانہ آن پہنچا ہے اے چو امیر حیدر
تیرے بُرگے نالے میں دشمن حملہ آور ہو رہے ہیں

تیرے غوتی چنگرا پر یبگو والے خوشی میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں

تیرے کھرپوچھے قلعہ کے دربار خانے میں کھرمنگ والے بیٹھے نظر آتے ہیں

تیری سبزہ زار پولو گراؤنڈ میں چپلو والے جمع نظر آتے ہیں

تیری آبری شہنائی لداخ کے محل میں پہنچ چکی ہے

تیری رونگ یُول مَو نامی بندوق لوٹ مار میں غائب ہو چکی ہے

تیرا کالے رنگ کا گھوڑا کھرمنگ والے لوٹ مار میں لے جا رہے ہیں

تیرا سنگے ستاغو نامی شاہی دروازہ دشمن لوٹ مار میں لے جا رہے ہیں

تیری پیاری شہزادیاں ننگے سر دشمنوں کے ہاتھوں اسیر ہو رہی ہیں

تیری پیاری شہزادیاں ننگے پیر دشمنوں کے ہاتھوں اسیر ہو رہی ہیں

اگر بلاؤں کا ٹلنا ممکن ہے تو میں بدنصیب ماں تجھ پر قربان ہو جاؤں

تو اکیلا میندوق کھر میں کس کی حفاظت کے لئے بیٹھا رہے گا

جس میں اب کوئی ذی روح موجود نہیں

کھرپوچھے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد زورآور سنگھ نے ایک ہزار ڈوگرہ فوج مرزا رسول بیگ اور محمد خان کی سرکردگی میں کچورہ کے راستے اور بلتی فوج کو کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان اور ڈوگرہ آفیسروں کے زیرنگرانی بغاردو کے راستے روندو کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ ڈوگرہ فوج میندی پہنچی تو راجہ علی خان قلعہ چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔ قلعہ پر بلا مزاحمت قبضہ ہو گیا۔ بعد میں تقریباً پندرہ ہزار روپے تاوان جنگ میں نقد اور اجناس کی صورت میں راجہ علی خان سے وصول کر کے اسے روندو کی حکومت پر بحال کیا گیا۔

پوریگ میں تحریک آزادی کا علمبردار وہاں کے حکمران گاشو خاندان کا رحیم خان تھا جو حسین خان سمیت بھاگ کر سکردو آیا تھا اور ڈوگرہ فوج کی سکردو کی طرف پیشقدمی کی خبر سن کر روندو چلا گیا تھا اور وہاں سے گلگت بھاگنے کی تیاری میں تھا۔ اسے پکڑ کر لایا گیا۔ زورآور سنگھ نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے سارے ڈوگرہ فوجی، لداخی، بلتی مرد عورت بچے بوڑھے سب کو سکردو میں

ایک جگہ جمع کیا۔اس کے بعد اسے تھوڑا سا افیون کھلایا۔ پھر ایک ایک کر کے اس کی زبان، ناک، کان اور ہاتھ کاٹ ڈالے اور زخموں پر کھولتا ہوا تیل ڈال کر یا تیل میں ڈبو کر خون کو بہنے سے روکا تا کہ اس کی موت جلدی واقع نہ ہو۔اس کے بعد حسین خان کو سامنے لایا اور اس کی زبان اور ہاتھ کاٹا۔ وہ زندہ رہا مگر کالون رحیم خان دو روز تک اسی جگہ تڑپتا رہا پھر مر گیا۔

اس کے بعد وزیر نے مدین شاہ کی سرکردگی میں پانچ سو ڈوگرہ فوجیوں کو کچھ بلتی فوج کے ساتھ استور کی تسخیر کے لئے روانہ کر دیا جس نے بیس روز کے محاصرے کے بعد قلعہ تک پانی بند کر کے جبار خان کو قید کر کے لایا۔ سکردو پر ڈوگرہ حملہ ہوتے ہی جبار خان نے کشمیر کے سکھ گورنر میہان سنگھ سے درخواست کی تھی کہ استور لاہور کی سکھ حکومت کا باجگذار ہے اس لئے ڈوگرہ فوج کو اس پر حملے سے باز رکھا جائے۔ میہان سنگھ نے لاہور سے اجازت لے کر دو کمپنیاں استور کی حفاظت کے لئے بھیج دیں۔لیکن اس کے پہنچنے سے قبل جبار خان زور آور کے پاس قید ہو چکا تھا۔اسی دوران لاہور حکومت کی سرزنش پر کہ استور سرکار خالصہ کا علاقہ ہے ڈوگرہ ان کی حدود میں مداخلت سے باز رہے، جبار خان کو رہا کر دیا گیا۔

وزیر زور آور سنگھ نے راجہ احمد شاہ کو معزول کیا اور سات ہزار روپے سالانہ خراج کی ادائیگی کی شرط پر محمد شاہ کو سکردو کا برائے نام راجہ بنایا۔اس کے ساتھ ہی بلتستان کی آزاد سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

جنوری 1840ء میں سکردو پر ڈوگروں کا قبضہ ہو گیا اور راجہ احمد شاہ گرفتار ہو گیا۔ زور آور سنگھ نے رپورٹ بھیج دی کہ راجہ احمد شاہ کے مظالم کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی تھی جس کی وجہ سے اس کے بیٹے محمد شاہ نے سکردو کی حکومت سنبھال لی ہے اور علاقے میں امن وامان قائم ہو گیا ہے۔

اگرچہ جموں کی ڈوگرہ ریاست لاہور کی ماتحت اور باجگذار تھی تاہم معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی سکھ سلطنت کے نچلی سطح کے کارندوں کے حلقے میں جموں ریاست کی توسیع پر زبردست بے چینی موجود تھی۔اس لئے کشمیر کا سکھ گورنر میہان سنگھ 1835ء سے لداخ اور پوریگ میں لوگوں کو

ڈوگروں کے خلاف بغاوت پر اکسا رہا تھا۔ اب سکردو پر ڈوگرہ قبضہ سے وہ مزید برہم ہوا اور اس نے کنور نونہال سنگھ کو رپورٹ بھیج دی کہ سردار گلاب سنگھ کا ایجنٹ زور آور سنگھ سکردو پر مکمل طور پر قبضہ کر رہا ہے اور استور قلعہ پر حملہ کر رہا ہے۔ شاید ان کے غم و غصے کو کم کرنے کی خاطر تھا کہ مئی 1840ء میں زور آور سنگھ کی طرف سے ایک خبر لاہور پہنچی کہ

''تبت خورد کے راجہ احمد شاہ سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ اب بھی لاہور دربار کی اطاعت قبول کر کے زور آور سنگھ کے ساتھ اپنے نمایندے تحائف سمیت دربار میں بھیجنے پر تیار ہے تو اس کی تمام پچھلی غلطیاں اور قصور معاف کر دیئے جائیں گے۔ جن میں دربار میں نذرانہ پیش نہ کرنا، مقابلے کے لئے فوج جمع کرنا، محمد شاہ کو سکھوں کے علاقے سے گرفتار کر کے لے جانا، ندھان سنگھ اور اس کی فوج کو قتل کرنا اور دوسرے راجاؤں کی طرح لاہور دربار میں نمایندے نہ بھیجنا شامل ہیں۔،،

احمد شاہ کی نگاہیں انگریزوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس طرف سے ابھی تک نا امید نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ 5 مئی 1840ء کو اس کے دو بیٹوں محمد علی خان اور احمد علی خان کی طرف سے ملنے والے دو خطوط لدھیانہ کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ لفٹننٹ جے ڈی کننگھم نے کمپنی کی حکومت کو بھیج دیئے جن میں یہ شکایت تھی کہ انہیں ڈوگروں نے گرفتار کیا ہے لہذا انگریزوں سے ان کے معاملے میں مداخلت کی درخواست کی گئی تھی۔ محمد علی خان اور احمد علی خان کشمیر میں پہنچے ہوئے تھے۔ 25 جون 1840ء کو لاہور دربار کے حکم پر لاہور بھیج دیئے گئے۔ غالبًا ادھر سے گلاب سنگھ کی قید میں پہنچے ہوں گے۔ یہ احمد شاہ کی طرف سے آزادی کے لئے سفارتی کوشش تھی۔

وزیر زور آور سنگھ نے ابتداء میں کھر گرونگ کے امام باڑے میں قیام کیا اور اس کی فوج اس کے ارد گرد خیموں میں رہتی تھی۔ اسی دوران اس نے موجودہ حمید گڑھ کے ٹیلے کے سلسلے میں ایک جگہ ایک عارضی چھاؤنی تعمیر کی اور فوج سمیت اس میں رہنے لگا۔ بالآخر آستانہ سید محمود کے شمال میں واقع ٹیلے پر ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ جون 1840ء میں لاہور میں یہ خبر پہنچی کہ سکردو اب زور آور سنگھ کے قبضے میں ہے، احمد شاہ گرفتار ہے اور زور آور سنگھ ایک قلعہ تعمیر

کرنے کی تیاری میں ہے۔ اس قلعے کے ایک حصہ کو زور آور سنگھ نے اپنے سامنے مکمل کرایا۔ بلتستان کے سارے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد اس کا نظم ونسق درست کیا۔ بھگوان سنگھ کشتواری کو یہاں کا تھانہ دار مقرر کر کے بھوپت اور مختار خان منشی سمیت اُسی سپاہیوں کے ساتھ سکردو قلعہ میں تعینات کیا۔ نو ماہ تک سکردو میں قیام کے بعد معزول راجہ احمد شاہ، اس کے وزیروں، امیروں اور شگر کے چند معززین کو بطور قیدی ساتھ لے کر سکردو سے لوٹے ہوئے مال سمیت خپلو کے راستے لداخ کو روانہ ہو گیا۔ حشمت اللہ خان کے مطابق زور آور سنگھ نے سکردو میں سات ماہ قیام کیا۔ لیکن کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ زور آور نو ماہ بعد سکردو سے لداخ کو روانہ ہوا۔

ناکام جدوجہد آزادی 1842ء

مسلسل فتوحات سے زور آور سنگھ کا حوصلہ بہت بڑھ چکا تھا اور اب وہ یارقند پر حملے تک کی بات کرنے لگا تھا۔ لیکن فی الحال اس نے مغربی تبت کے روڈوق اور ناری پر لداخ کے پرانے دعوے کو تازہ کر دیا جو کسی زمانے میں لداخ میں شامل تھے۔ وہاں کے بدھسٹ عبادت خانوں میں سونے کی مورتیاں اور اوزار بہت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ شال کی عمدہ اون ان ہی علاقوں میں پیدا ہوتی تھی۔ اس کی یہ ہوس زر طلبی اسے موت کی طرف کھینچ کر لے جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ پانچ ہزار ڈوگرہ فوج تھی۔ تقریباً پانچ ہزار کی ایک اور فوج بلتستان اور لداخ سے تیار کی۔ بلتستان کی فوج کے ساتھ تمام راجاؤں کی طرف سے ان کا قائم مقام ان کی فوج کے اہتمام کے لئے ساتھ لیا۔ دولت علی خان راجہ خپلو بذات خود وزیر کے ساتھ ہولیا۔ اس اثناء میں خپلو میں چیچک کی بیماری پھیلی۔ اس سے اس فوج کا بڑا نقصان ہوا۔ لداخ کا گیالپو ٹنڈوف نمگیل بھی اس بیماری سے فوت ہو گیا۔ زور آور سنگھ اس تمام فوج کو ساتھ لے کر خپلو، چھوربٹ اور نوبراہ کے راستے لداخ پہنچا۔ لداخ پہنچنے پر راجہ علی شیر خان بھی کھرمنگ اور طولتی کی فوج لے کر حاضر ہو گیا اور اپنے بھائی حیدر علی خان اور غلام علی کو خدمت کے لئے وزیر کے ساتھ تعینات کیا۔ ساری تیاریاں مکمل کرنے

کے بعد وزیر مئی 1841ء میں وادی سندھ کے راستے تبت پر حملہ آور ہوا۔ یکے بعد دیگرے سارے علاقوں کو فتح کرتا ہوا دریائے گھاگرا کے کنارے تغلا کھر پر بھی قبضہ کرلیا جو نیپال کی سرحد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ تغلا کھر میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور مہتہ بستی رام کو ادھر فوج کے ساتھ متعین کیا۔ مزید حملے سرما کے بعد تک کے لئے ملتوی کر دیئے۔ اب سارے نارس کورسوم جس میں رودوق، کوگے اور پورانگ شامل ہیں اور علاقہ سپتی پر زورآ ورسنگھ کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ جموں اور تبت کے درمیان مریوم لہ سرحد بن چکی تھی۔ دوسری طرف نیپال سے جموں کی سرحد مل چکی تھی اور جھیل مانسرور اور کیلاس پربت کے مقدس مقامات جموں کی حکومت کے قبضہ میں تھے۔ اتنے میں 7 نومبر کو دس ہزار تبّتی فوج پہنچ گئی جس نے ڈوگرہ فوج کو کاٹنا شروع کیا۔ کئی ڈوگرہ فوجی دستوں کی تباہی کے بعد زورآ ورسنگھ خود تبّتی افواج کے مقابلے کے لئے آگے بڑھا۔ 10 دسمبر 1841ء کو تغلا کھر اور کرتو نگ کے درمیان میں طویو کے مقام پر مقابلہ شروع ہوا۔ تین روز تک لڑائی جاری رہی۔ 12 دسمبر 1841ء کو لڑائی کے دوران زورآ ورسنگھ کے کندھے پر اور بقول اس کی داہنی ران پر گولی لگی اور گھوڑے سے گر گیا۔ تبتیوں نے اسے گھیرا اور پیچھے کی جانب سے دونگ (دوسروں والا نیزہ) گھما کر چلایا جو اس کی پشت پر لگا اور سینہ کی طرف نکل آیا۔ یوں زورآ ورسنگھ کا کام تمام ہو گیا۔ میدان جنگ پندرہ ہزار فٹ سطح سمندر سے بلندی پر تھا۔ شدت کی سردی تھی۔ لکڑی نایاب تھی، سامان رسد کی کمی کا سامنا تھا۔ زورآ ورسنگھ کی موت نے ڈوگرہ فوج کی کمر توڑ دی۔ جسے جس طرف راستہ ملا بھاگ نکلا۔ لیکن تبتیوں نے پیچھا کر کے سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ چھ ہزار میں سے صرف ایک ہزار زندہ بچے۔ ان میں سے بھی 700 قید ہوئے۔ صرف 300 بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بھی ہاتھ پاؤں سردی کی وجہ سے جل کر بیکار ہو گئے۔

ڈوگروں کی اس تباہی سے لداخیوں اور بلتیوں کو آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ زورآ ورسنگھ کی قید ختم ہونے پر ڈوگرہ آفیسروں کے ساتھ راجہ احمد شاہ بھی تبّتی فوج کے پاس اسیر ہو گیا۔ ڈوگرہ دشمنی دونوں کے درمیان قدر مشترک تھی اس لئے اسیری دوستی میں بدل گئی اور ان کے ساتھ مل کر ڈوگروں کی تباہی کی تدبیروں میں مصروف ہو گیا۔ راجہ احمد شاہ نے اپنے

معتمد خاص یول سٹرونگ کریم کو خصوصی پروگرام کے ساتھ بلتستان روانہ کر دیا۔ یول سٹرونگ کریم نے راجہ حیدر خان شگر اور کاظم بیگ رئیس سکردو کے ساتھ مل کر پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی اور انقلاب برپا کر دیا۔ علی خان راجہ روندو، دولت علی خان راجہ خپلو اور خورم خان راجہ کریس اور بلتستان کے دیگر رؤساء اس مہم میں شریک ہوگئے۔ چنانچہ راجہ حیدر خان نے اپنے حریف سلیمان خان کو شگر میں اور راجہ احمد شاہ کے بڑے بیٹے محمد شاہ کو کواردو کی خانقاہ میں قید کر دیا۔ بھگوان سنگھ اور اس کی فوج کو شگر میں نیالی کے مقام پر قید کر دیا۔ قلعہ اور توشہ خانہ کو اپنے تصرف میں لایا اور 1842ء کے اوائل میں راجہ احمد شاہ کی وکالت پر کھرپوچھے پر متصرف ہو کر ڈوگرہ غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ نگر سے وزیر شجاع 140 آدمیوں کے ساتھ سکردو پہنچ کر حیدر خان کی مہم میں شریک ہو گیا۔ بلتستان ڈوگرہ غلامی سے آزاد ہو چکا تھا لیکن راجہ احمد شاہ ابھی تک واپس نہیں پہنچا تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن وجوہات کی بنا پر وہ تبتیوں کے ساتھ ابھی تک ٹھہرنے پر مجبور تھا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ اگر راجہ احمد شاہ جلدی سے سکردو واپس آجاتا تو ڈوگروں کے لئے دوبارہ بلتستان کو فتح کرنا یقیناً آسان نہ ہوتا۔

گلاب سنگھ کو زورآور سنگھ اور اس کی فوج کی تباہی اور بلتستان اور لداخ میں بغاوت کی خبر ملی تو اس نے دیوان ہری چند کو ایک بڑی فوج کے ساتھ لداخ کی طرف اور اپنے معتمد خاص وزیر لکھپت کو بلتستان کی طرف بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ وزیر لکھپت تقریباً تین ہزار ڈوگرہ فوجی اپنے ساتھ لے کر نالہ چیلونگ کے راستے سورو میں وارد ہوا اور تحریک آزادی کو کچلتا ہوا کرگل پہنچ گیا۔ بلتستان کی بدلی ہوئی صورتحال سے کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ وزیر لکھپت کی آمد کی خبر سن کر اس کی جان میں جان آئی اور فوراً کرگل پہنچ کر پھر ڈوگروں کی رہبری شروع کر دی۔ راجہ حیدر خان ڈوگروں سے مقابلے کے سارے انتظامات درست کر چکا تھا اور عام راستوں سے کرگل سے سکردو کی طرف بڑھنا ڈوگرہ فوج کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر علی شیر خان نے ڈوگرہ فوج کو براستہ دیوسائی چور دروازے سے سکردو پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ڈوگرہ فوج دریائے دراس کو عبور کر کے کرکت کے راستے شنگھو

شگر پہنچی۔ ادھر سکردو کے حکمرانوں نے ایک برج تعمیر کر رکھا تھا اور کچھ فوج ادھر متعین تھی۔ اس نے ڈوگروں کو روکنے کی سخت کوشش کی لیکن اس کی مزاحمت تعداد کے کم ہونے کی وجہ سے کام نہ آئی اور کچھ مارے گئے اور باقی وزیر لکھپت کے ہاتھوں قید ہو گئے۔ اس کے بعد تیزی سے دیوسائی کے راستے ڈوگرہ فوج نالہ حسین آباد (کھفچو نگ) سے اتر کر سکردو میں داخل ہو گئی۔ چونکہ یہ عام آمد رفت کا راستہ نہ تھا اس لئے حسین آباد پہنچنے تک کسی کو بھی ڈوگرہ فوج کی آمد کے بارے میں علم نہ ہو سکا۔ ڈوگرہ فوج کی اس اچانک اور غیر متوقع آمد پر راجہ حیدر خان کھر پوچھے میں قلعہ بند ہو گیا کیونکہ اب مقابلے کی تیاری کے لئے وقت باقی نہیں رہا تھا۔ ڈوگروں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

کھر پوچھے قلعہ اپنی جائے وقوع ناقابل دسترس ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر مستحکم تھا اس لئے ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ کئی روز کے محاصرے کے باوجود قلعہ کو زیر کرنے کی کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو علی شیر خان اور محمد شاہ نے قلعہ کے محافظ دستے کے آفیسر وزیر محمد علی ہلچہ خٹ پا کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ وزیر محمد علی نے رات کے وقت قلعہ کے پھاٹک کو کھلا چھوڑ دیا اور نیورانگاہ کی طرف کی پہاڑی پر واقع برج پر متعین پہرہ دار دستے کو بھی ڈوگرہ فوج کی مزاحمت سے باز رکھا جو قلعہ کے بالائی راستہ کی حفاظت پر مامور تھا۔ چنانچہ رات کے وقت فوج کے ایک دستے کو وزیر لکھپت نے نیورانگاہ کی طرف سے پہاڑی کے اوپر روانہ کیا اور باقی فوج کے ساتھ اس نے خود قلعہ کے دروازہ سے حملہ کر دیا۔ چونکہ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ ڈوگرہ فوج آسانی کے ساتھ قلعہ کے اندر داخل ہوئی۔ محصورین پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کا قتل عام ہوا۔ بعض خشکی کے راستے اور کچھ لوگ دریائے سندھ کو تیر کر بھاگ نکلے۔ بہت سے دریا میں غرق ہو گئے۔ ایک بڑھیا نے بارود خانے کو آگ لگا دی تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ آئے۔ راجہ حیدر خان قلعہ کے شمالی دروازہ سے نکل کر اپنے ہمراہیوں سمیت راتوں رات شگر جا پہنچا اور وہاں سے انتظام کر کے نالہ تھلے اور سلتورو کے راستے یارقند کی طرف فرار ہو گیا۔ خپلو کے راجہ دولت علی خان کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے اپنے آدمی بھیج کر حیدر خان کو اس کے اسی ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے خپلو لایا اور وہاں سے انہیں اپنے ساتھ لے کر سکردو میں وزیر لکھپت کے سامنے پیش ہوا۔ وزیر نے دولت علی خان کی اس خدمت

کی قدر کی۔ حیدر خان کو ساتھیوں سمیت قید کرلیا اور بعد میں اسے اپنے ساتھ جموں لے گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔

وزیر لکھپت نے تحریک آزادی کے علمبرداروں اور کارکنوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔ بہتوں کو تہہ تیغ کیا اور بعض کے سروں کو عبرت کے لئے نمایاں مقامات پر لٹکا دیا۔ چونکہ قلعہ کھرپوچھے دوسری بار دھوکے سے فتح ہوا تھا اور آئندہ کسی بھی وقت یہ نا قابل تسخیر قلعہ ڈوگروں کے خلاف پھر باغیوں کے لئے مرکز بن سکتا تھا اس لئے ادھر موجود چھوٹی سی مسجد کے سوا سارے قلعہ کو آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ قلعہ کے بیچ میں موجود مقپون خاندان کا سات منزلہ تاریخی محل بھی جل کر خاکستر ہو گیا۔ جس کے ساتھ ہی ایک عہد کا نشان ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ ڈوگرہ فوج نے میندوق کھر کو بھی تباہ کر ڈالا۔

زور آور سنگھ نے نالہ ست پر کے داہنے کنارے کی طرف آستانہ سید محمود کے شمال میں موجود ٹیلے پر ایک مستحکم قلعے کی تعمیر شروع کی تھی۔ وزیر لکھپت نے سکردو میں اپنے قیام کے دوران اس کی تعمیر مکمل کی۔ بھگوان سنگھ کو تین سو سپاہیوں کے ساتھ اس قلعہ میں تعینات کیا۔ اس فوج کے خرچ و خوراک کے لئے سکردو کے سارے علاقے میں فی بُول (24 کنال زیر کاشت زمین) مختلف پیمانوں کے حساب سے غلہ گندم و گرم، مکھن، نمک، گھاس اور لکڑی سالانہ مقرر کی۔ راجگی کی رسوم اپنی جگہ اس کے علاوہ بحال تھیں۔ عوام سے اس رسد کی وصولی راجہ کے ذمہ تھی۔ جو رعایا سے وصول کر کے قلعہ دار کے حوالے کر دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ٹیکس عائد نہ تھا۔

وزیر لکھپت نے سکردو میں محمد شاہ کو بدستور راجہ مقرر رکھا۔ خپلو میں دولت علی خان کو اور کریس میں خرم خان کو راجہ تسلیم کیا اور ان کی جاگیریں حسب دستور بحال رکھیں۔ طولتی میں احمد خان کو بدستور راجہ قائم رکھا۔ کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان نے دوسری بار ڈوگروں کی مثالی خدمت کر کے بلتستان پر ڈوگرہ تسلط قائم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس کی ان خدمات کے صلے میں وہ اس علاقے میں گلاب سنگھ کا معتمد خاص بن چکا تھا۔ لہذا اس کے علاقہ جاگیر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی گئی۔ یہ انتظام ڈوگرہ دور کے اختتام تک قائم رہا۔

سکردو کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد وزیر لکھپت شگر گیا۔ یہاں سلیمان خان فوت ہو چکا تھا لہذا اس کے بیٹے امام قلی خان کو راجہ مقرر کیا اور اس کی جاگیر اور اختیارات کو بحال رکھا۔ راجہ حیدر خان کے حامیوں کے خوف سے ادھر تھوڑی سی فوج متعین رکھی۔ شگر کا انتظام درست کر کے وزیر روندو کو روانہ ہوا اور بشو جنگل کے راستے سے گزر کر روندو پر حملہ کر دیا۔ روندو والوں نے کچھ دیر تک مقابلہ کیا لیکن جلد مغلوب ہو گئے۔ اس مقابلے میں سکردو کے راجہ محمد شاہ کا معتمد خاص اور وفادار ملازم ڈغونی پا وزیر بُونُو مارا گیا جو وزیر لکھپت کا بھی خصوصی رہبر تھا۔ روندو میں اس وقت علی خان راجہ تھا۔ وزیر لکھپت نے اسے اپنی جاگیر پر قائم رکھا مگر اس کے بیٹے حسین خان کو بطور یرغمال اپنے ساتھ لے گیا۔ وزیر نے کچھ فوج سرحد کی حفاظت کے لئے ستق کے قلعے میں تعینات کی اور ہر پولہ کے راستے استور پر حملہ آور ہوا۔ استور کا راجہ جبار خان قلعہ بند ہو گیا۔ وزیر لکھپت نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ چار ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ کے اندر خوراک کی کمی محسوس ہونے لگی تو جبار خان نے ہتھیار ڈال دیئے اور اطاعت کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں کہ اس بار بھی کشمیر کے سکھ گورنر کی مداخلت سے جبار خان ڈوگرہ تسلط سے آزاد ہو گیا۔ استور سے وزیر لکھپت سکردو واپس پہنچا۔ اس وقت تک قلعہ کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا تھا اور ادھر متعینہ فوج اس کے اندر اطمینان کے ساتھ سکونت پذیر تھی۔ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ لہذا راجہ حیدر خان اور بلتستان کے دیگر قیدیوں کو ساتھ لے کر وزیر لکھپت کشتوار کے راستے جموں کو واپس روانہ ہوا۔

ادھر راجہ احمد شاہ تبتی افواج کے ساتھ حملہ لداخ میں شریک تھا۔ ٹانچی کے علاقے میں لونگ یوغما کی چھاؤنی میں تبتی فوج کے ساتھ محصور ہو گیا۔ ڈوگرہ فوج نے نالہ کے پانی کا رخ چھاؤنی کی طرف کر دیا تو تین روز کے اندر محصورین کا سامان اور اسباب حرب پانی میں غرق ہو گیا اور مجبوراً انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح موروپ ستزن اور لہاسی آفیسروں کے ساتھ راجہ احمد شاہ پھر ڈوگروں کے ہاتھوں میں قید ہو گیا۔ راجہ احمد شاہ کو بحالت قید گلاب سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ عرصہ اسے جموں میں گومٹ کے مقام پر نظر بند رکھا گیا۔ گومٹ جیل سے اس کا ولی عہد محمد علی خان ہندوستان کی طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا اور بھاگ کر لدھیانہ جا پہنچا۔

لدھیانہ میں انگریزوں کی ایک ایجنسی تھی۔ محمد علی خان کو یہ امید تھی کہ انگریزوں کی مداخلت سے انہیں ان کا ملک واپس مل جائے گا۔ گلاب سنگھ بڑا شاطر آدمی تھا اسے معلوم تھا کہ لدھیانہ کے انگریز پولیٹکل ایجنٹ کے ساتھ راجہ احمد شاہ کے مراسم تھے۔ چنانچہ محمد علی خان کے پیچھے اس نے اپنے آدمی بھیج دیئے۔ گلاب سنگھ کے گماشتے اس کے تعاقب میں لدھیانہ پہنچے جہاں دھوکے سے اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ کو مع اہل وعیال کشتوار منتقل کیا گیا جہاں وہ تاحیات نظر بند رہا۔ ایک روایت کے مطابق احمد شاہ کے کل گیارہ بیٹے محمد شاہ، محمد علی خان، احمد علی خان، امیر حیدر، لطف علی خان، ملک حیدر، حسین علی خان، سلطان خان، علی نظر، محمد خان اور مراد خان تھے۔ ان کے علاوہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ محمد شاہ اور اس کی بہن کے علاوہ باقی ساری اولاد اور دو بیویاں احمد شاہ کے ساتھ نظر بند تھیں۔ احمد شاہ کا بھائی غلام شاہ اس کی بیوی اور تین بیٹے علی خان، شاہ رخ اور مرزا حمید الدین بھی کشتوار میں احمد شاہ کے ساتھ قید تھے۔

ڈوگرہ حملہء بلتستان راجہ کھرمنگ کی زبانی

1840ء میں ڈوگروں کے ہاتھوں سقوط بلتستان اور 1842ء میں بلتستان کی جدوجہد آزادی کو کچلنے میں مرکزی کردار مقپون خاندان ہی کے علی شیر خان راجہ کھرمنگ کا تھا۔ اس نے اپنی ان سیہ کاریوں کو ایک فارسی تحریر کی شکل میں لکھ کر محفوظ کر دیا تھا۔ یہ تحریر امان علی شاہ راجہ کھرمنگ سے مولوی حشمت اللہ خان کے ہاتھ آئی جنہوں نے تاریخ جموں میں اس تحریر کا خلاصہ بیان کیا ہے لیکن اصل تحریر غائب ہو چکی ہے۔ ہم اس خلاصے کو بشکریہ تاریخ جموں یہاں پیش کرتے ہیں:

''راجہ احمد شاہ اسکردو کے ساتھ میرے دو رشتے ہیں۔ یعنی میں اس کا بھانجا بھی ہوں اور داماد بھی ہوں۔ مگر راجہ نے اس تعلق کو بالائے طاق رکھ کر تمام تبت خورد کو یعنی اسکردو، روندو، شغر، کریس، استور، کھپلو و پرکوتہ کے لوگوں کو میرے خلاف کر دیا اور اس نے علی خان روندو، حیدر خان شغر، غلام شاہ پرکوتہ، خورم خان کریس۔ دولت علی خان کھپلو اور احمد خان طولتی والا کو اپنے ساتھ

یکدل و یک زبان کر کے بے حساب لشکر لے کر کرتخشہ پر حملہ کر دیا۔ اب میرے لئے بجز راہ فرار اختیار کرنے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔۔ چنانچہ میں اپنے اہل وعیال اور زر و مال کو دشمن کے پنجہ میں چھوڑ کر تبت کلاں یعنی لداخ میں پناہ گزین ہو گیا۔ اس اثناء میں وزیر زور آور سنگھ کلھوریہ افواج ڈوگرہ لے کر از راہ واروان سورو کرتسے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اس خبر کے معلوم ہونے سے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے اپنے شیر برادر وزیر غلام حسین نقتلو پا اور فضل علی دفتری کو خفیہ وزیر صاحب موصوف کی خدمت میں روانہ کیا۔ انہوں نے اس ملک کے سب نشیب وفراز وزیر کو سمجھائے اور میری مصیبت کا حال بھی سنایا اور جو پیغام میں نے دیا تھا وہ بھی پہنچایا۔ چنانچہ انعام واکرام سے سرفراز ہو کر وہ اس پیغام کے ساتھ واپس پہنچے کہ تم آج سے سرکار والا کے معتمد تصور کئے جاؤ گے۔ تم کو چاہیئے کہ جس طرح ممکن ہو راجہ لداخ کو سلام کے لئے ہمارے پاس حاضر کرو۔ اس سے تمہاری سرخروئی مقصود ہوگی۔ یہ واقعہ 18 رمضان 1253ھ (مطابق 1837ء) کا ہے۔ بعدازاں اسی سال یکم ذی الحجہ کو بروز پنج شنبہ میں وزیر زور آور سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے وزیر صاحب سے وعدہ کیا تھا اور عہد و پیمان ہو گئے تھے کہ بموقع حملہ بلتستان میں افواج ڈوگرہ کو اپنے ملک سے راستہ دے دوں گا اور ہر طرح سے امداد کروں گا۔ چنانچہ میرے اپنے قلعہ میں واپس پہنچنے کے چار سال بعد وزیر موصوف مع گیارہ ہزار فوج جنگی اور دس ہزار ملکیاں لداخ و پوریگ کے اور اس ملک کے راجگان کے ساتھ بعزم تسخیر بلتستان موضع چے چے تھنگ میں وارد ہوا۔ صرف دریائے اٹک درمیان میں رہا۔ دونوں لشکروں کے درمیان جنگ وقتال کی گرما گرمی شروع ہوئی۔

اس اثنا میں وزیر صاحب کا حکم میرے نام صادر ہوا کہ ہم اس تنگ راستہ میں افواج سرکار کو لے کر محض تمہارے وعدے پر آئے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم راستہ دے دو گے اور ہر طرح سے امداد کرو گے۔ اب اس بارے میں جو چارہ کار ہو وہ بتلاؤ کہ موجب تمہاری سرخروئی اور خیر خواہی سرکار کا ہو۔ اس پر میں نے اپنے سرکردگان کو حکم دیا۔ کہ میدان جنگ سے فرار ہو کر واپس چلے آؤ کہ لشکر سرکار کے لئے راستہ کھل جائے۔ میرے ملک کا ایک لشکر ایک ہزار کے قریب تھا وہ واپس آ گیا۔ اب لشکر سرکار نے حملہ کیا۔ لشکر راجہ احمد شاہ کے سرکردگان جیسے کہ وزیر سلطان اور وزیر پرکوتہ

جان محمد وغیرہ اور چند نفر اور لوگ مارے گئے اور لشکر اسکردو منہزم ہو کر منتشر ہو گیا اور وزیر صاحب مع افواج سرکار دریا عبور کر کے میرے ملک میں داخل ہو کر حمزہ گنڈ میں وارد ہوئے۔ میں نے فضل علی اور غلام حسین عدولپہ اور ترنگفا عبدالعلی کو وزیر کی خدمت میں بغرض حصول شرف ملازمت روانہ کیا اور دوسرے دن لشکر اسکردو کی واپسی کے بعد نذرانہ اور پیش کش لے کر حمزہ گنڈ میں، میں خود بھی حاضر خدمت ہو گیا۔ وزیر نے میری بڑی عزت افزائی کی۔ خلعت وانعام واکرام عطا کیا اور سرکار عالی میں خیر خواہی کی عرض داشت گذارش کی۔

وزیر صاحب کو میں اپنے ساتھ لے کر اپنے قلعہ میں پہنچا اور تین دن تک تمام لشکر کی مہمان داری کی اور احمد خان راجہ طولتی اور غلام شاہ راجہ پرکوتہ کو وزیر کے سلام کے لئے حاضر کیا۔ تین روز کے بعد وزیر کے ساتھ بمع افواج سرکاری کے روانہ اسکردو ہوا۔ راجہ غلام شاہ پرکوتہ کے اہل وعیال بھاگ کر راجہ احمد شاہ کی پناہ میں چلے گئے۔ پانچ روز کے بعد وزیر مع فوج ظفر موج قلعہ اسکردو کے دروازے پر پہنچ گیا اور قلعہ کے بیرونی پھاٹک پر خود میں نے مورچہ بندی اور محاصرہ کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے کھپلو، چھوربٹ، کرس وشغر کے لوگوں نے اتفاق کر کے اطاعت قبول کی اور سلام کے لئے حاضر ہوئے اور قلعہ کے محاصرہ میں شامل ہو گئے۔

سات روز کے بعد راجہ احمد شاہ نے پیغام بھیجا کہ میں بھی سلام کے واسطے حاضر ہوتا ہوں۔ وزیر صاحب نے قبول نہ کیا اور جواب دیا کہ تمہارا سلام قبول نہیں ہو سکتا۔ تم راجہ محمد شاہ کو قلعہ لداخ سے دامن مناہ سرکار توڑ کر چوری سے لے آئے ہو۔ پہلے اس کو ہمارے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ راجہ احمد شاہ نے اپنے بیٹے محمد شاہ کو میری ذمہ داری پر وزیر کے سلام کے لئے روانہ کیا اور دوسرے دن وہ خود بغرض سلام وزیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسکردو کی تمام وکمال دولت، خزانہ اور اسباب قلعہ میں جمع کر دیا جو سب افواج سرکار کے قبضہ میں آیا۔ تین ہزار بندوقیں، دو ہزار تلواریں اور روپیہ اور بے شمار اسباب سب جمع ہو گیا اور قلعہ فتح ہو گیا۔ احمد شاہ کے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈال کر قید کر دیا اور بغاردو سے جو سکردو کی سرحد تھی اس جگہ تک سرکار کا قبضہ ہو گیا۔

روندو اور استور کے لوگ بموجب گلگت کی پشتی بانی اور کمک کے سرکار کے سلام کے لئے

حاضر نہیں ہوئے۔ وزیر نے مجھے لشکر کے ساتھ بغاردو میں بھیجا۔ بغاردو سے میں فوج لے کر براہ چیری روانہ ہوا اور دو نفر آفیسران سرکار مرزا رسول بیگ و محمد خان مع ایک ہزار فوج کے کچورہ کی راہ سے روانہ ہوئے۔ میں اور آفیسران مذکورہ ایک ساتھ قلعہ روندو پر وارد ہوئے۔ راجہ روندو علی خان اپنے قلعہ اور ملک کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ مال واسباب جو کچھ قلعہ میں تھا سرکار کے ہاتھ آیا۔ ہم سب سرخروئی کے ساتھ وزیر کی خدمت میں واپس پہنچے۔ وزیر نے پانچ سو سپاہی استور کی طرف بھیجے اور قلعہ استور کو بھی فتح کیا۔ وزیر نے مع افواج سرکار کے پورے سات ماہ تک اسکردو میں توقف کیا۔ اس اثناء میں میں اپنے آدمیوں کے ساتھ مسلسل حاضر خدمت رہا اور ہر طرح سے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس سلسلہ میں پانچ ہزار کے قریب روپیہ اپنی گرہ سے بھی مجھے خرچ کرنا پڑا۔

نو ماہ بعد وزیر نے بھگوان سنگھ کشتواری کی مع جمعدار بھوپت اور مختار خاں منشی کے اور 80 نفر سپاہیاں کے قلعہ سکردو میں تعینات کر دیا اور خود راجہ احمد شاہ و کلانان و وزیران سکردو و شغر کو اپنے ساتھ لے کر کھپلو کے راستہ سے واپس روانہ لداخ ہوا اور میں مع اپنے ملک کے بزرگان و کلانان و معتبران کے علاقہ پرکوتہ و طولتی کا مالیہ وصول کر کے اپنا لشکر لے کر اپنے ملک کے راستہ سے روانہ ہو کر لداخ میں وزیر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

لداخ پہنچ کر وزیر نے جنگ پورانگ کے ارادے سے چان تھان کی طرف حملہ کرنے کا بندوبست کیا۔ چنانچہ افواج سرکاری و آدمان جنگی لداخ، پوریگ و لشکر تبت خورد و کلاں تمام و کمال روانہ ہو گئے۔ میں خود بھی وزیر کے ہمرکاب کوتل چان تھان تک گیا۔ وہاں سے وزیر نے مجھے بغرض نگہبانی تبت خورد و انتظام روانگی سامان حرب و رسد وغیرہ کے واپس کر دیا۔ اپنے حقیقی بھائی راجہ حیدر علی اور شیر برادر غلام علی کو اپنے لشکر کے ساتھ میں نے وزیر کے ہمرکاب کر دیا اور خود بغرض انجام دہی خدمات مفوضہ واپس چلا آیا۔ پورانگ کی سامان رسانی و رسد رسانی میں مجھے تین ہزار روپیہ کے قریب اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔

وزیر نے پورانگ پہنچ کر قلعہ پورانگ کو فتح کر لیا۔ مہتہ بستی رام کو وہاں کا تھانہ دار مقرر کیا

اور خود چان تھان میں آ گیا۔ اس اثناء میں لہاسہ کی طرف سے لشکر بھوٹیہ بے حساب اور بے شمار پہنچ گیا اور قلعہ پورانگ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ خبر معلوم کر کے وزیر چان تھان سے پورانگ واپس ہوا اور لشکر بھوٹیہ کے ساتھ بہت جدال وقتال کیا۔ آخر الامر بتقدیر الٰہی وزیر جان نثار ہوا۔ میرا بھائی حیدر علی خان اور راجہ احمد شاہ و محمد علی خان کھپلو احمد خان طولتی واچو گونبو معتبر لداخ وغیرہ خواہ بلتی یا سپاہی سب افواج بھوٹیہ کے پاس اسیر ہو گئے اور ماتبقی قتل ہو گئے۔

بعد ازاں افواج بھوٹیہ نے بمشورہ راجہ احمد شاہ و محمد علی خان کھپلو وغیرہ لداخ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ لداخ میں پہلوان سنگھ کمیدان مع تھوڑی فوج کے تعینات تھا۔ اس کا نہایت سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا۔ قلعہ سے باہر کسی کے نکلنے کا امکان نہ تھا۔

اس موقع پر راجہ احمد شاہ نے اپنے وزیر معتمد خاص یول ستر ونگ کریم کو سکردو میں بھیجا۔ علی خان روندو، حیدر خان شغر، دولت علی خان کھپلو و کاظم بیگ سکردو والا و لطف علی خان و خورم خان سبھوں نے اتفاق کر کے بھگوان سنگھ تھانہ دار سکردو کو پکڑ لیا اور قلعہ سرکار پر قابض ہو گئے۔ سرکاری توشہ خانہ کو لوٹ لیا اور بھگوان سنگھ کو اور جمعدار کو اور سپاہیوں کو منتشر طور پر جا بجا یعنی گلاب پور، وزیر پور وغیرہ میں قید کر دیا۔ تمام ملک کو روگردان کر دیا۔ مال سرکار کو غارت کیا اور عین نمک حرامی کی۔ راجہ حیدر خان نگر سے وزیر ہولو کے لڑکے وزیر شجاع کو ایک سو چالیس نفر آدمان نگر والا کے ساتھ کمک کے لئے لایا۔ توشہ خانہ سرکار میں جو کچھ اسباب و مال و منال تھا اسے راجگان و نگر والوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ قلعہ کرگل کو بھی نہیں چھوڑا اور تھانہ دار کرتسے و سورو اور تھانہ دار زانسکار قدم بجا نہیں رکھ سکے۔ صرف قلعہ لداخ بچا رہا۔ مگر اس کی حالت بھی معرض نظر میں آ گئی تھی۔

جب یہ حالات لداخ و بلتستان میں گذر رہے تھے تو دیوان ہری چند و وزیر رتنو دراس میں افواج سرکار لے کر وارد ہوئے۔ چونکہ تمام ملک کی روگردانی کا حال دیکھ کر میں اپنے دل میں بہت تنگ تھا فوج سرکار کے وارد دراس ہونے کی خبر سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے فوراً اپنے وزیر غلام حسین عدولپہ کو دیوان ہری چند اور وزیر رتنو کے پاس روانہ کیا۔ اس نے دیوان اور وزیر کے پاس پہنچ کر انہیں حالات مقامی سے آگاہ کیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر قلعہ کرگل کو فتح کرا دیا اور

دیوان نے تمام ملک پوریگ کو زیر کر کے بدستور سابق تھانیدار کے سپرد کر دیا۔ پھر وہاں سے دیوان ووزیر مع افواج کے روانہ لداخ ہو گئے۔لداخ پہنچ کر چھب جوت کوانہوں نے منہزم کیا اور سب کو تہ و بالا کر دیا۔قلعہ لداخ کا محاصرہ اٹھ گیا اور ملک لداخ دوبارہ سرکار کے قبضہ میں آیا۔ رات کے وقت راجہ احمد شاہ ومحمد علی خان کھپلو، واچو گونبو چھب جوت کے ساتھ بھاگ کر نکل گئے۔ دیوان ووزیر نے قلعہ میں داخل ہو کر گمنا تھانہ دار، پہلوان سنگھ کمیدان اور سپاہیان سرکار سے ملاقات کی اور فتح کی خوشی منائی۔

بزمانہ محاصرہ قلعہ لداخ راجہ محمد علی کھپلو اپنا لشکر اور ایک ہزار لشکر بھوٹیہ ساتھ لے کر گمنا تھانہ دار اور قلعہ لداخ کے اوپر جنگ وقتال کے لئے آیا تھا۔ یہاں سے واپس ہو کر قلعہ چمرے میں داخل ہو گیا۔اس نے دیوان ہری چند اور سپاہ سرکار کے ساتھ بہت جدال وقتال کیا اور بہت سپاہی مارے گئے۔

آخر الامر دیوان کو فتح ہوئی، دشمن کی طرف سے کچھ مارے گئے کچھ اسیر ہوئے۔خود راجہ محمد علی خان مع تین سو لشکر بھوٹیہ اور ایک سو چالیس نفر لشکر کھپلو والا دیوان کے پاس اسیر ہوئے۔محمد علی خان کو بوجہ اس کے فعل قبیح کے پابزنجیر کر کے قید خانہ میں رکھا۔غرض کہ جب تمام ملک لداخ دیوان ہری چند ووزیر رتنو کے ہاتھ میں آ گیا تو وزیر غلام حسین عدولپہ فتح و فیروزی کے ساتھ واپس ہوا اور میرے پاس پہنچا۔

اس کے پہنچنے پر میں خود بجا آوری خدمات کی غرض سے روانہ ہوا اور کرپوکھر واقع کرتسے میں پہنچ کر وزیر لکھپت کی خدمت میں حاضر ہوا۔وزیر کو اپنے ساتھ لایا اور شنگھو وشغر کے راستہ سے مع ایک ہزار سپاہ سرکار کے زادراہ خرچ کا انتظام کر کے کوتل کچھون سے گذر کر داخل سکردو ہو گیا۔ قلعہ پر پہنچے تو جنگ وقتال شروع ہو گیا۔ کیونکہ قلعہ میں بارہ ہزار فوج تھی یعنی ایک ہزار فوج سرکار اور ایک ہزار میرے اپنے آدمی دو ہزار فوج نے بارہ ہزار کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ بہت آدمیوں کو مارا کچھ بھاگ گئے کچھ دریا میں غرق ہوئے اور ماقبی قید ہوئے اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔اسکردو والوں کی لوٹ مار کی وجہ سے قلعہ میں ایک مٹھی آٹا موجود نہ تھا۔ میں نے تین ہزار من آرد گندم بہم پہنچایا۔

راجہ احمد شاہ وراجہ غلام شاہ کے اہل وعیال وزیران وکلانان و بزرگان سکردو کے ساتھ فرار ہو کر روندو میں راجہ علی خان کے پاس چلے گئے۔ راجہ حیدر خان شغر مع جملہ کلانان و اکابران و ترنگفاہائے شغر سے بھاگ گیا۔ راجہ دولت علی خان کھپلو بعزم لہاسہ براہ چھور بٹ فرار ہوا۔ ماقی قید ہوئے۔ میں نے دولت علی خان و حیدر علی خان کے تعاقب میں آدمی روانہ کئے اور دم دلاسادے کر دونوں کو واپس منگوایا۔ وزیر شجاع مع اپنے آدمیوں کے راتوں رات نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بھگوان سنگھ اور جمعدار بھوپت کو گلاب پور و وزیر پور سے واپس لا کر قلعہ سکردو میں پہنچایا اور وزیر لکھپت سے ان کی ملاقات کرائی وزیر لکھپت کے شنگھو شغر میں وارد ہونے سے لے کر خاتمہ جنگ اسکردو تک میں خدمت میں حاضر رہا اور غلہ وگندم، بھیڑ و بکری، ٹٹو واسپ وغیرہ وگولی بارود کی بہم رسانی میں میرا پانچ ہزار روپیہ خرچ ہوا۔

اس عرصہ میں حضور انور میں فتح نامہ کے پہنچنے پر سرکار والا کا پروانہ خاص میرے نام صادر ہوا جس میں حکم تھا کہ میں تمام راجگان و وزیران وکلانان و اکابران کو لے کر حضور میں حاضر ہو جاؤں۔ اس سے مجھے دوست و دشمن کے درمیان سرفرازی حاصل ہوئی۔ پس میں نے بموجب حکم تمام راجگان وکلانان کو روانگی کے واسطے تیار کیا۔ نیز حکم تھا کہ اپنے خاص آدمیوں میں سے جن کی نمک حلالی پر مجھے پورا اعتماد ہے یعنی اپنے وزیروں میں سے یا اپنے بھائیوں میں سے جسے میں اس خدمت کے لائق خیال کروں۔ سکردو میں بطور اپنے وکیل کے تعینات کر دوں کہ خدمت سرکار میں حاضر رہے اور وزیر کو صلاح و مشورہ سے مدد دیتا رہے۔ لہذا میں نے بمشورہ وزیر غلام حسین کو اس خدمت پر اس کے ساتھ سکردو میں تعینات کر دیا اور خود تمام راجگان وکلانتران کو ساتھ لے کر حضور میں مشرف ہونے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ میں گاندربل میں پہنچا تو ہاتھی مع ہودہ زرنگار میری سواری کے لئے موجود تھا۔ اس عزت و احترام کے ساتھ میں حضور انور میں پہنچا۔ پابوسی سے مشرف ہوا۔ اپنے ہم جنسوں میں سرفرازی اور سربلندی حاصل ہوئی اور کشمیر کے جملہ آفیسروں سے میری ملاقات کرائی گئی۔

دیوان ہری چند نے اقبال سرکار چان تھان میں فوج بھوٹیہ کو شکست فاش دی تمام لشکر کو

تباہ کیا۔ اور بہت آدمیوں کو قید کیا۔ بعد میں دیوان نے تمام لشکر کو قید سے چھوڑ دیا۔ صرف تین نفر کالون لہاسہ اور چھب جوت اور اچو گونبو کو ساتھ لے کر اور راجہ احمد شاہ اور راجہ محمد علی خان کو پابزنجیر کر کے حضور میں حاضر کیا۔ میں نے بوجہ رشتہ داری حضور میں سفارش کر کے محمد علی خان کو قید سے خلاصی دلائی۔ جس پر اسے میرے حوالہ کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں حاکم کشمیر شیخ غلام محی الدین تھا۔ وہ خیر خواہ سرکار تھا۔ جب دیوان ہری چندو وزیر رتنو روانگی چان تھان کے واسطے تیار ہوئے تو اس موقع پر اس نے بہت کمک دی تھی اور شالی و گولی بارود بہت بہم پہنچائی تھی۔ اور نیز بوقت جنگ سکردو کچھ سپاہی مع ایک ضرب توپ و ایک ضرب عومبارہ و بقدر ضرورت خرچ سپاہان و گولی بارود ارسال کئے تھے۔ اس وقت راجہ گلگت کریم خان و وزیر کسیر وغیرہ کلانان گلگت گوہر امان کے ظلم سے بھاگ کر شیخ غلام محی الدین کے پاس بطلب امداد کمک پہنچے تھے۔ شیخ نے نتھے شاہ کو کمک لے جانے کا حکم دیا اور حضور انور سے درخواست کی کہ ملک تبت سے کسی خیر خواہ کو تعینات کیا جائے تا کہ نتھے شاہ کی یاری و رہنمائی کرتا رہے۔ سرکار والا نے مجھے اور وزیر لکھپت کو ارشاد فرمایا کہ نتھے شاہ کی امداد کے لئے اپنے خیر خواہوں میں سے یا اپنے بھائیوں اور وزیروں میں سے جس کسی کو کہ ہم دونوں لائق خدمت سرکار خیال کرتے ہیں منتخب کر کے اپنا لشکر دے کر نتھے شاہ کے ساتھ روانہ کریں اور اس بارہ میں جو کچھ خرچ اور زحمت اٹھانی پڑے اس سے دریغ نہ کریں۔ میں نے اپنے وزیر غلام حسین اور فضل علی دفتری کو اسکردو میں خدمات سرکاری کے لئے گوساؤں تھانہ دار کے پاس اپنے وکیل کے طور پر تعینات کیا تھا اس کو حکم بھیجا اور وزیر لکھپت نے بھی تھانہ دار کے نام حکم لکھا کہ وزیر غلام حسین بتعمیل حکم سرکار والا خدمت کے لئے تیار ہو جائے اور تمام سامان جنگ اور غلہ گندم و دانہ و بز و گوسفند وغیرہ لے کر لشکر کے ساتھ فوراً روانہ ہو جائے۔ جو کچھ خرچ ہو اس میں دریغ نہ کرے۔ روندو کو فتح کر کے گلگت میں نتھے شاہ کے ساتھ خدمت بجالائے۔

چنانچہ وزیر غلام حسین دو ہزار لشکر لے کر سکردو سے روانہ ہوا اور راتوں رات روندو پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جنگ پر نوبت نہیں پہنچی۔ صلح کے ساتھ قلعہ زیر ہو گیا۔ احمد شاہ و غلام شاہ و

وزیران وکلانان سکردو وشغر کے اہل وعیال روندو سے قلعہ استق میں بھاگ کر چلے گئے تھے۔ وزیر غلام حسین روندو سے روانہ ہو کر استق میں پہنچا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اسے فتح کر کے ان سب کو سکردو میں تھانہ دار گوساؤں کے پاس روانہ کر دیا اور سرحد استق تک حکومت سرکار قائم کر دی۔

اس کے بعد وزیر غلام حسین لشکر تبت و روندو والا کو اور راجہ علی خان کو لے کر روانہ گلگت ہوا۔ راہ میں قلعہ سفید یعنی کرپوکھر جنگ وقتال سے فتح کر کے ہاتھ میں لایا اور پھر یہاں کا لشکر بھی اپنے ساتھ لے کر بقدر تین ہزار سپاہ کے ساتھ بغرض دفع گوہرامان گلگت میں نتھے شاہ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گوہرامان اس وقت تمام ملک گلگت کا مالک تھا۔ جنگ وقتال بہت ہوا اور طرفین سے بے شمار نقصان ہوا۔ لیکن گلگت فتح ہو گیا اور گوہرامان منہزم ہو کر غداروں کی طرف فرار ہو گیا۔ گلگت پر سرکار کا قبضہ ہو گیا۔

یہ وقت زمستان کا تھا قلعہ میں ایک چھٹانک آٹا موجود نہ تھا کیونکہ تین ماہ محاصرہ جاری رہا تھا اور نتھے شاہ کے ساتھ تین ہزار سپاہ تھی اور تبت کا لشکر بھی تین ہزار تھا اور گوہرامان کی فوج سات ہزار کے قریب تھی۔ راہ کشمیر بند تھی اتنے آدمیوں کے لئے خوراک کا بہم پہنچانا گلگت جیسے تنگ ملک میں دشوار تھا۔ نتھے شاہ نے میرے وزیر سے کہا کہ قحط سے سپاہی بہت تنگ ہیں۔ اس کا علاج کرنا چاہیئے۔ وزیر مذکور اس فتح کی خبر لے کر مظفر و منصور اپنے لشکر کے ساتھ اسکردو کو واپس روانہ ہوا۔ اس چھ مہینے کی مدت میں میرے وزیر نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ یعنی غرّہ ماہ سرطان میں قلعہ لداخ ابتداءً فتح کیا۔ غرہ میزان میں قلعہ ہائے سکردو وشغرو کھپلو فتح کئے اور غرہ جدی میں قلعہ گلگت فتح کیا۔ نمک حرامان سرکار اور روگردانی کرنے والون کا نام ونشان باقی نہیں رکھا۔ وزیر سکردو میں پہنچا تو بصلاح گوساؤں تھانہ دار غلہ گندم، پٹو، بزوگوسفند، گولی بارود، نمک و تمبا کو بقدر کفایت سپاہان افواج متعینہ گلگت پورے چھ ہزار من ارسال کئے۔ جب یہ فتح نامہ حضور انور میں پہنچا تو سرکار نے میری بڑی عزت افزائی کی۔ جس سے مجھے تمام راجگان بلتستان کے درمیان امتیاز حاصل ہوا۔

سرکار والا نے مجھے سربلندی سے سرفراز وممتاز کر کے مرخص کیا اور تمام راجگان کو جو میرے

ساتھ کشمیر گئے تھے میرے سپرد کیا۔ میں ان سب کو لے کر واپس اپنے ملک میں پہنچا اور جملہ ہمراہیوں کو ان کے اہل وعیال کے پاس ان کے گھروں میں بخیریت پہنچا دیا۔

بعد میں جب مہاراجہ دلیپ سنگھ کے زمانہ میں قبضہ کشمیر کے متعلق شیخ امام الدین صوبہ کشمیر اور سرکار والا کے درمیان مناقشہ ہوا تو سرکار والا نے پروانہ خاص میرے نام صادر فرمایا کہ تبت کا لشکر لے کر مع سامان جنگ جلد حاضر سری نگر ہو جاؤں۔ میں نے اس کا انتظام کیا۔ چونکہ دیگر راجگان کا لشکر پہنچنے کے لئے بہت انتظار کرنا پڑا۔ میں نے اپنے وزیر غلام حسین عدولپہ اور فضل علی کو گولی بارود وغیرہ ضروریات حرب دے کر اپنے کرتخشہ سے بیس نفر بندوقچی ساتھ کر کے پہلے روانہ کیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد راجگان اپنی اپنی فوج کے ساتھ پہنچے لیکن راجہ دولت علی خان قلعہ کھرکو سے اپنے گھر کو واپس چلا گیا۔ میں راجگان کو مع ان کی فوج کے ساتھ لے کر اور اپنی فوج لے کر روانہ سری نگر ہوا۔ روانگی سے پندرہ روز بعد سری نگر میں مع راجگان وفوج کے وزیر لکھپت کی خدمت میں حاضر ہوا اور محلّہ شیخ باغ میں مقیم ہوا۔ میرے پہنچنے کے بیس روز بعد وزیر رتنو دس ہزار سپاہ لے کر اسی محلّہ میں پہنچا اور جنگ کی تیاری ہوئی۔ تجویز یہ قرار پائی کہ میں مع دیگر راجگان تبت کے کوہ ماراں کی طرف سے حملہ کروں۔ سخت خونریزی ہوئی رات کو دشمن نے شب خون مارا۔ آدھی رات سے لے کر صبح صادق تک توپ چلتی رہی اور جنگ جاری رہی۔ صبح ہونے کے ساتھ ہی دست بدست لڑائی تلوار سے شروع ہوگئی۔ وزیر لکھپت جان نثار ہوا۔ امام الدین کا لشکر بہت زیادہ تھا۔ کوہ ماراں و شیخ باغ کے راستے سے اس نے محاصرہ کر لیا تھا۔ قلعہ کا راستہ بند کر دیا تھا۔ وزیر رتنو ایک ہزار پانچ سو جنگی فوج لے کر نکلا اور کوہ ماراں کے راستہ میں سکھوں کی فوج سے مقابل ہوا اور ان کی قطار توڑ کر راستہ نکالا اور میرے پاس قلعہ میں پہنچ گیا۔ میں نے خدا پر توکل کر کے قلعہ کے دروازہ کو بند کر لیا اور قلعہ کے اندر بیٹھ گیا۔ شیخ امام الدین کے پاس ہر روز کمک پہنچتی رہتی تھی۔ شیر احمد اور راجگان بمبہ و کھکھہ کے ساتھ سات ہزار جوان جنگی پہنچ گئے۔ اس طرح سے شیخ امام الدین کے پاس تیس ہزار سپاہ جنگی جمع ہوگئی۔ انہوں نے اس سختی کے ساتھ ہمارا محاصرہ کیا کہ پرندہ کا گذر بھی مشکل ہو گیا۔ مخدوم و حسن آباد پہنچنے کے لئے بوتو کدل کا راستہ مسدود ہو گیا۔ توپ و تفنگ کا

گولہ موسم بہار کی بارش کی طرح برستا تھا۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو دشمن نے زمین کے اندر سے سرنگ ہماری طرف تیار کرنا شروع کی یہ حال دیکھ کر وزیر رتنو نے مجھ سے صلاح کی اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں نے رائے دی کہ قلعہ کے اندر سے بھی سرنگ شروع کر دی جائے۔ اس پر اتفاق ہوا میں نے وزیر غلام حسین کو مع اپنے آدمیوں کے برج کے تہ خانہ میں لے جا کر سرنگ شروع کھودنے کے کام پر لگا دیا۔ بیس بیس آدمی شب و روز کام کرتے تھے۔ تین تین روپیہ دن کے لئے اور تین تین روپیہ فی کس رات کے لئے مزدوری دی جاتی تھی۔ الغرض چودہ روز کی محنت کے بعد برج سے تیس گز باہر ہماری سرنگ پہنچ گئی اور شیخ امام الدین کے سرنگ کھودنے والوں کے ساتھ ہماری مڈھ بھیڑ ہو گئی اور ہم نے انہیں مار کر بھگا دیا۔ تین ماہ تک ہم محصور رہے لوگ پریشان ہو گئے۔ لیکن میں نے دلاسا دے کر انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ اس کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ کا وکیل پہنچا اور اس کے حکم سے محاصرہ ختم ہوا۔ سرکار کو فتح ہوئی۔ مجھے سات ہزار روپیہ اپنے پاس سے اس مناقشہ میں خرچ کرنا پڑا۔

جب فیصلہ ہو گیا تو ہم سب بمقام شیر گڈھی سرکار والا کے حضور میں مشرف ہوئے۔ وزیر رتنو نے میری خدمات بالتفصیل بیان کیں۔ سرکار والا نے خلعت بے بہا عطا فرمایا یعنی شقہ کمخواب اعلیٰ طلائی کڑوں کی جوڑی، کنٹھا طلائی، جوڑہ شال پشمینہ رنگین، ولونگی زری وغیرہ اور کشمیر میں پانچ سو روپیہ کی جاگیر عطا فرمائی۔ بعد ازاں ہم سب اپنے وطن میں واپس پہنچے۔،،

ڈوگرہ دور

1840ء تا 1948ء

ڈوگرہ تسلط کے ان ایک سو آٹھ سالوں میں چار مہاراجاؤں گلاب سنگھ (57-1840ء)، اس کے بیٹے رنبیر سنگھ (85-1857ء)، رنبیر سنگھ کے بیٹے پرتاب سنگھ (1885ء تا 1925ء) اور پرتاب سنگھ کے بھتیجے ہری سنگھ (48-1925ء) نے یکے بعد دیگرے جموں و کشمیر کی ریاست پر حکومت کی۔ ہری سنگھ ریاست کا آخری ڈوگرہ حکمران تھا۔

1840ء میں ڈوگرہ قبضہ کے بعد بلتستان کوایک کارداری (سب ڈویژن) بنا کر سکردو میں ایک کاردار یعنی ایڈمنسٹریٹر متعین کیا گیا۔ پوریگ کو بھی انتظامی لحاظ سے بلتستان کے ساتھ شامل کر کے سکردو کے کاردار کے ماتحت کرگل میں ایک تھانہ دار مقرر کیا گیا۔ زورآور سنگھ کے سکردو میں نو ماہ قیام کے بعد بھگوان سنگھ یہاں پہلا ڈوگرہ حاکم مقرر ہوا۔ اس کے بعد گوساؤں، کرم سنگھ، جواہر سنگھ وغیرہ متعدد حاکم رہے۔ اس کے بعد 64-1852ء کے دوران کیدارو سکردو میں تعینات ہوا۔ اس نے ازسرنو تشخیص کر کے مالیہ عائد کیا اور مالیہ کی وصولی کا کام راجاؤں سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لیا۔ مقامی راجاؤں کے رسوخ کو کم کر کے سرکاری حکومت قائم کی اور ڈوگرہ سرکار کی آمدنی میں اضافہ کیا۔ راجاؤں نے اس کے خلاف شکایت کی جو صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ کیدارو کے بعد کشتوار کا وزیر لعبہ جو 76-1864ء کے دوران بلتستان کا کاردار رہا۔ اس نے سکردو کے درمیان سے بہنے والی نالہ سدپار کی ایک شاخ کے بائیں کنارے پر اپنے رہنے کے لئے ایک شاندار محل تعمیر کیا۔ انہی تعمیرات کے ٹکڑے کر کے بعد میں شفا خانہ، ڈاک خانہ اور تار خانہ اس میں قائم رہے۔ عرصہ دراز تک سکردو کے تحصیلداروں کی رہائش بھی اسی کے ایک حصے میں رہی۔ اس کے بعد 86-1876ء کے دوران دس سال تک مہتہ منگل حاکم سکردو رہا۔ اس کا تعلق بھی کشتوار سے تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک نیک اور لائق انسان تھا اور رعایا کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی مشفقانہ تھا۔ اس کے ساتھ وہ اچھا منتظم بھی تھا۔ اس نے بلتستان اور پوریگ کے علاقوں میں ایک سو سے زائد باغات لگائے۔ تقریباً پانچ لاکھ غیر پھلدار اور پچاس ہزار پھلدار پودے لگائے۔ سرکاری ملازمین کے لئے جلانے کی لکڑی اور مویشیوں کے لئے گھاس کے لئے سکردو میں بیس مقامات پر وسیع رقبہ جات مختص کئے تا کہ اہل ملک پر ان چیزوں کے مہیا کرنے کا بوجھ ہلکا ہو۔ دوسری جگہوں پر بھی جہاں سرکاری ملازم تعینات تھے یا انہیں ڈیوٹی کے سلسلے میں ٹھہرنا پڑتا تھا اس نے یہ انتظام کر دیا۔ اپنے رہنے اور کچہری کے لئے ایک عالی شان عمارت رنبیر گڑھ کے نام سے سکردو میں تعمیر کی۔ اس کے اندر سکردو میں متعین سارے سرکاری ملازمین کے لئے رہائش کا بھی انتظام کر دیا۔ اس کے ساتھ اس نے ایک بڑا باغ لگایا جس میں قسم قسم کے میوہ دار درخت کشمیر سے لا کر نصب

کیئے اور پھولوں سے اسے گلزار بنا دیا۔ عمارت کوتوالی بھی تعمیر کی اور زیر تفتیش وزیر تجویز ملزموں کے لئے حوالاتیں بھی بنائیں۔ عملہ کوتوالی کی رہائش کے لئے بھی مکانات تعمیر کیئے۔ عیالدار سرکاری ملازمین کے لئے سکونتی مکانات تعمیر کیئے۔ سرکاری باغات کے اندر تفریح کے لئے بارہ دریاں تعمیر کیں۔ رنبیر گڑھ کی یہ جگہ اب حمید گڑھ کہلاتی ہے۔ سکردو سے ایک طرف سوروتک، دوسری طرف خپلو تک اور تیسری طرف ستق روندوتک ہر ایک پڑاؤ پر عام مسافروں کے لئے مسافر خانے اور معززین کے لئے آرام گاہیں تعمیر کیں۔ سکردو، شگر، ستق سمیت بہت سے ضروری مقامات پر غلہ کے لئے کوٹھیاں تعمیر کیں۔ شگر اور ستق میں چھاؤنیاں تعمیر کیں اور دیگر ملازمین کے لئے رہائشی مکانات بھی تعمیر کیئے۔ سکردو بازار میں دکانیں تعمیر کیں۔ روندو میں تانبہ کی کان دریافت ہوئی۔ اس سے تانبہ نکالنے کے لئے میندی میں ایک کارخانہ قائم کیا۔ اس نے سرمہ گوگرو اور ابرق کی کانیں بھی دریافت کیں۔ چونکہ بلتستان میں شہتوت کے درخت کثرت سے موجود ہیں اس لئے اس نے ریشم کے کیڑے پالنے کے کئی جگہوں پر مراکز تعمیر کیئے۔ اس صنعت کوفروغ دینے کی اس نے بہت جدوجہد کی۔ زمینیں نوتوڑ کروا کر اس نے آبادی میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کی۔

سکردو میں ڈوگروں کا فوجی قلعہ سید محمود کے آستانے کے شمال میں موجود اونچے ٹیلے پر واقع تھا جہاں پر جنگی ملازمین تنگ رہتے تھے۔ مہتہ منگل نے مقپون پولوگراؤنڈ کے قریب نالہ کے بائیں کنارے پر ایک قلعہ نما وسیع چھاونی تعمیر کی اور فوج کو ادھر منتقل کر دیا۔ یہ جگہ اب بھی چھاؤنی کے طور پر مستعمل ہے۔ اسی چھاؤنی کے اندر اس نے قید خانہ بنایا جو آزادی کے بعد بھی عرصہ تک اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ جس جگہ پر ڈوگروں کا پرانا قلعہ تھا سکردو شہر میں وہ جگہ اب برباد قلعہ کے نام سے معروف ہے۔ لیکن تعمیرات کا نام ونشان موجود نہیں۔ کھرپوچھے قلعہ کو 1842ء میں وزیر لکھپت نے نذر آتش کر ڈالا تھا اور قلعہ کا چبوترہ اور ایک نیم خستہ مسجد کے سوا ادھر اور کچھ باقی نہ تھا۔ مہتہ منگل نے نئے نقشے کے تحت از سرنو بنیاد سے تعمیر کر کے اردگرد کوٹھریاں تعمیر کیں جنہیں جنگی سامان کے سٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ آزادی کے بعد بھی 1990ء کی دہائی تک یہ اسی مقصد کے لئے مستعمل رہا۔ تعمیر نو کی تاریخ قلعہ کے اندر دیوار میں موجود ایک کالے پتھر پر فارسی

اشعار کی صورت میں کندہ کی ہوئی ہے۔ سکردو شہر کے اندر سڑک کے کناروں پر مہتہ منگل کے نصب کردہ سفیدے کے بوڑھے درخت 1970ء کی دہائی تک موجود تھے۔ سرمیک گاؤں کے کنارے پر مہتہ منگل کا لگایا ہوا ایک باغ اب بھی اسی کے نام پر منگل باغ کے نام سے آباد ہے۔

مہتہ منگل کے بعد ٹھاکر گنگا سنگھ، رائے بہادر پنڈت رادھا کشن کول، لالہ دھنپت رائے اور سید غلام جیلانی شاہ یکے بعد دیگرے کاردار بلتستان رہے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں ہندوستان کی انگریز سرکار نے روس کے ساتھ ساز باز کے الزام میں اس کو حکومت سے بیدخل کر کے ریاست میں ایک سٹیٹ کونسل قائم کی۔ اسی دوران 1899ء میں بلتستان، لداخ اور گلگت کے علاقوں کو ملا کر ایک وزارت (ضلع) وزارت سرحدی کے نام سے تشکیل دی گئی۔ خان بہادر سردار محمد اکبر خان اس ضلع کا وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) تھا۔ مگر دو ہی سال بعد سکردو، کرگل اور لیہ تحصیلوں پر مشتمل ضلع لداخ کا قیام عمل میں آیا۔ گلتری سمیت پاری سے کھرول تک کے سکردو کے علاقہ کو تحصیل کرگل میں شامل کر دیا گیا۔ اسوقت سے سکردو قصبہ ضلع لداخ کا سرمائی صدر مقام بن گیا اس کے بعد چوہدری خوشی محمد ناظر وزیر وزارت متعین ہوا۔ اسی کے دور میں بلتستان کا پہلا قانونی بندوبست مکمل ہوا تھا۔ اس کے بعد پنڈت لچھمن داس اور اس کے بعد الحاج مولوی حشمت اللہ خان ضلع لداخ کا وزیر وزارت تعینات ہوا جو 1914ء تک اس عہدے پر متمکن رہا۔ اس نے تاریخ جموں کے ضمن میں بلتستان کی تاریخ لکھ کر اس علاقے کے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے ممنون کر دیا ہے۔ اس کے بعد لالہ بنسی لال، وزیر فیروز چند، لالہ سری رام، پنڈت نرنجل لال، کوتوال تیجرام، راؤ رتن سنگھ، چودھری فیض اللہ خان، ٹھاکر دھروپ سنگھ، لالہ رومیش چندر اور پنڈت بشمبر ناتھ جوتشی 1947ء تک یکے بعد دیگرے بلتستان کے وزیر وزارت گزرے ہیں۔ بلتستان میں آخری ڈوگرہ وزیر وزارت لالہ امرناتھ ستمبر 1947ء میں سکردو پہنچا تھا۔ 11 فروری 1948ء کو سپاہی سرفراز خان کے ہاتھوں یہیں قتل ہو گیا۔

ریاست جموں و کشمیر کے چار حصے تھے۔ صوبہ جموں، صوبہ کشمیر، ضلع گلگت اور ضلع لداخ۔ ضلع لداخ، لیہ، کرگل اور سکردو کی تین تحصیلوں پر مشتمل تھا۔ ضلع کا حاکم وزیر وزارت کہلاتا تھا جو

ریونیو کمشنر اور ریونیو منسٹر کے ماتحت ہوتا تھا۔ اسے گورنر کے اختیارات کے علاوہ کلکٹر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ڈسٹرکٹ جج، سیشن جج اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ اس کو اس سرحدی علاقے میں مہاراجہ کے نمایندے کی حیثیت سے سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ وزارت براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھی۔ وزیر کے فیصلوں کے خلاف ریاست کی اعلیٰ عدالتوں میں اپیلوں کا دروازہ کھلا تھا۔ وزیر ستمبر تا مارچ چھ ماہ سکردو میں اس کے بعد تین ماہ کرگل میں اور گرمی کے تین ماہ لیہ میں گزارتا تھا۔

کارداری کے خاتمہ پر تحصلیں وجود میں آئیں جس کے بعد سے ایک تحصیلدار مستقل طور پر سکردو میں رہنے لگا جو نائب وزیر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اول گریڈ کے اسسٹنٹ کلکٹر، فرسٹ کلاس مجسٹریٹ، سول جج اور انسپکٹر پولیس کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ وہی آفیسر خزانہ بھی ہوتا تھا۔ سکردو میں ایک سب ٹریژری تھی جس میں یہاں کی نقد آمدن جمع رہتی تھی۔ وزارت لداخ کی تحصیلوں میں سکردو تحصیل سب سے بڑی تھی۔ اس میں چالیس پٹوار حلقے تھے جبکہ کرگل میں بشمول (کھرمنگ) سترہ اور لیہ میں اٹھارہ حلقے تھے۔ سکردو کی سالانہ مجموعی آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے تھی۔ تحصیل کی انتظامیہ میں باقی عملہ کے علاوہ چار گرداور اور چالیس پٹواری تھے۔ تحصیلدار اجلاس عام میں انتقالات تصدیق کرتا تھا۔ زمین کے نوتوڑ کئے جانے سے پہلے اجازت لینا ضروری نہ تھا بلکہ اس کے آباد ہونے کے بعد پٹواری کو رپورٹ کی جاتی جو انتقال درج کر لیتا تھا۔ تحصیلدار کے ماتحت سکردو میں ایک نائب تحصیلدار بھی ہوتا تھا جسے مروجہ اختیارات کے علاوہ مجسٹریٹ درجہ سوم اور سب انسپکٹر پولیس کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ تحصیل کی پولیس براہ راست نائب تحصیلدار کے ماتحت تھی۔ سکردو میں ایک کوتوال، ایک نائب کوتوال اور چھ کنسٹیبل ہوتے تھے جو لیویز کہلاتے تھے۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں پہلے سرینگر سے بونجی پھر بونجی سے سکردو تک ٹیلیفون لائن بچھائی گئی تھی۔ بعد میں وزارت لداخ کے قیام پر براستہ کرگل لائن بچھائی گئی۔ سکردو میں ایک تار گھر تھا جہاں سے لیہ، سرینگر وغیرہ تار بھیجے جاتے۔ وہی پی سی او کا بھی کام کرتا تھا۔ اسی دوران

میں سکردو میں ایک موسمیاتی رصدگاہ (اوبزرویٹری) قائم کردی گئی۔ اس کے لئے کوئی الگ عملہ نہ تھا بلکہ تارگھر کے دو کلرکوں میں سے ایک کو اس اضافی ڈیوٹی کی انجام دہی کے لئے الاؤنس ملتا تھا۔ سکردو میں ایک سب پوسٹ آفس اور شگر، خپلو، گول اور کھرمنگ میں برانچ پوسٹ آفس قائم کئے گئے۔ سکردو سے کرگل تک کے راستے کو خچروں کے گزرنے کے قابل بنا دیا گیا۔ سارے ضلع میں تعمیراتی کاموں کا انچارج ایک اسسٹنٹ انجینئر ہوتا تھا۔ ابتداء میں دیوان خاندان کا ایک شخص سکردو میں اسسٹنٹ انجینئر مقرر رہا تھا اس لیے بعد کے تمام اسسٹنٹ انجینئروں کو بھی مقامی لوگ دیوان ہی کہا کرتے تھے۔ محکمہ تعمیرات کے سکردو میں متعین عملہ کا سربراہ ایک سب اورسیر ہوا کرتا تھا۔ پڑاؤ پر مسافر خانوں کی تعمیر و مرمت بھی اسی محکمہ کے ذمے تھی۔ اس کا دفتر کشوباغ میں تھا۔

پرتاب سنگھ کے برسراقتدار آتے ہی ہندوستان کی انگریز سرکار نے روس کے ساتھ ساز باز کے الزام میں 1885ء میں اس کو حکومت سے بے دخل کیا اور ریاستی اُمور کو چلانے کے لئے ایک انگریز ریزیڈنٹ کی سربراہی میں ایک سٹیٹ کونسل قائم کی۔ اسی سٹیٹ کونسل کے عہد حکومت میں 1892ء میں سکردو میں پہلا پرائمری سکول قائم ہوا۔ اس کے بعد بلتستان میں مدارس کے قیام کا سلسلہ جاری رہا اور اُن کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ ڈوگرہ دور کے آخر میں سکردو میں ایک لوئر ہائی سکول، خپلو میں ایک لوئر مڈل سکول، دیگر مواضعات میں 32 پرائمری سکول اور 10 مکتب کام کررہے تھے۔ مدارس کے انتظام کے لئے ضلع لداخ میں ایک اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکول متعین ہوتا تھا۔ دینیات کا مضمون نصاب میں شامل تھا۔ 1901ء میں ریاست کی سٹیٹ کونسل حکومت نے سکردو میں ایک ڈسپنسری قائم کی۔ 1925ء میں اُسے دس بستروں کا ہسپتال بنایا گیا جس میں ایک چھوٹی سی لیبارٹری بھی تھی۔ ایکسرے اور بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ عملہ کا سربراہ ایک میڈیکل آفیسر ہوتا تھا جو اسسٹنٹ سرجن کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت دیگر عملہ کے علاوہ تین سب اسسٹنٹ سرجن بھی متعین تھے جو لائسنسڈ میڈیکل پریکٹشنر کہلاتے تھے۔ بعد میں شگر اور خپلو میں بھی ڈسپنسریاں قائم کی گئیں جن میں سب اسسٹنٹ سرجن متعین تھے۔

ڈوگرہ قبضہ کے فوراً بعد سکردو میں ایک سو سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج متعین کی گئی تھی۔

لیکن 1842ء کی جد جہد آزادی اور اس کی ناکامی کے بعد سپاہیوں کی تعداد کو بڑھا کر تین سو کر دیا گیا۔ بعد میں جب یہاں بغاوت کے خطرات ٹل گئے اور ڈوگرہ قبضہ مستحکم ہو چکا تو 1899ء سے سکردو میں پچاس سے ایک سونفری پر مشتمل ایک کمپنی متعین کیجانے لگی۔ کبھی کوئی کیپٹن اور کبھی میجر اس کا کمانڈر رہوتا تھا۔ یہ جدید ترین اسلحہ سے مسلح اور تربیت یافتہ فوج ہوتی تھی جس کے ساتھ ہتھیاروں اور گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ بھی رکھا جاتا تھا۔ کھرپوچو قلعہ پر متعین گیارہ نفر توپخانہ والے اس فوج کے علاوہ تھے جن کے پاس دو توپیں ہوتی تھیں۔ قید خانہ چھاؤنی کے اندر تھا۔ جہاں فوجی پہرہ دیتے تھے۔ ان دنوں قلعہ کھرپوچو میں مقپون راجاؤں کے دور کی چھوٹی چھوٹی توپیں تھیں جن کوزمبورہ، شیر بچہ وغیرہ کہتے تھے جو گزرے دور کی یادگاریں تھیں۔ لیکن اب ان کا نشان نہیں ملتا۔ اُن دنوں اس قلعے پر پہرہ دار ہوتے تھے۔ دروازہ مقفل رہتا تھا اور ریاست کا جھنڈا الہراتا تھا۔

ڈوگرے یہاں بالکل اجنبی تھے۔ مذہب، نسل، زبان اور تہذیب وتمدن میں ان کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور حاکم کی حیثیت سے حکومت کی۔ سموتھ ایڈمنسٹریشن اور لا اینڈ آرڈر ان کے مقاصد تھے۔ کوئی ترقیاتی پروگرام ان کے پیش نظر نہ تھا۔ جو محکمے کام کر رہے تھے وہ تمام تر حکومتی مشینری کے ہی مفاد میں قائم کئے گئے تھے۔ ابتداء میں مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمت میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا لیکن بعد میں راجاؤں اور بااثر خاندانوں کے افراد کو چھوٹی چھوٹی اسامیوں پر مقرر کیا جانے لگا۔ ضلع لداخ کے لوگوں کو اسمبلی کے انتخابات میں رائے دہی کا حق حاصل نہیں تھا۔ ریاستی اسمبلی میں یہاں کے نمائندے راجاؤں میں سے نامزد کئے جاتے تھے۔ ہر تحصیل سے ایک نمائندہ نامزد ہوتا تھا۔ اس نامزدگی کی ہر تین سال بعد تجدید کی جاتی تھی۔ سکردو تحصیل سے ابتداء میں سکردو کے راجہ محمد علی شاہ کو نامزد کیا جاتا تھا لیکن آخری سالوں میں خپلو کے راجہ فتح علی خان کو نامزد کیا گیا تھا۔

مقامی راجاؤں کے دور میں بلتستان میں نقد مالیہ رائج نہیں تھا۔ البتہ راجہ کے محل اور خدمت گاروں کے لئے اجناس کی شکل میں لگان مقرر تھا۔ سٹیٹ کونسل حکومت نے 1902ء میں پہلی بار یہاں کا قانونی بندوبست ایک انگریز آفیسر آرٹی کلارک کی نگرانی میں مکمل کیا جس کے

ذریعے زمینوں کے اقسام اور فصلوں کی آمدن کی تشخیص کی اور اسی کے مطابق نقد مالیہ اور اجناس کا لگان عائد کر دیا۔ 1916ء میں بندوبست ثانی مکمل ہوا جس کے تحت حسب ضرورت مالیہ اور لگان کی شرح میں ترمیم کی گئی۔ زمین کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ البتہ یہاں کے ان زمیندار پیشہ پشتنی باشندوں کو آپس میں خرید وفروخت کی اجازت تھی جن کے آباؤ اجداد 1840ء سے قبل بلتستان میں آباد تھے۔ تجارت پیشہ لوگوں کو زمین خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ حکومت کرنے کے باوجود کوئی سکھ، ہندو وغیرہ مستقل یہاں آباد نہ ہوسکا۔ ڈوگروں نے قبضہ جمانے کے فوراً بعد بیگار سسٹم رائج کیا تھا۔ جس کے تحت بلتستان کے طول وعرض میں ہر پڑاؤ پر اسی کے گردونواح کے دیہاتوں میں سے پچاس قلی اور پانچ گھوڑے ہمہ وقت حاضر رکھے جاتے تھے۔ جس طرف سے بھی کوئی سرکاری مہمان پہنچتا اسے خورد ونوش اور دیگر خدمات کے بعد دوسرے پڑاؤ تک پہنچانا اور واپس پہلے پڑاؤ پر حاضر رہنا بیگار والوں کا فرض تھا۔ انہیں اپنے خرچ وخوراک اور گھوڑوں کے لئے گھاس کے علاوہ متوقع مہمانوں اور ان کے گھوڑوں کے خرچ وخوراک کا بھی بندوبست ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ تازہ دودھ کی خاطر گائے یا بکریاں بھی ساتھ رکھنا ضروری تھا۔ جب سرکاری ملازم پڑاؤ پر پہنچتا تو بیگار والوں کو ''تھب ستد،، یعنی باورچی کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بغیر وہ چولہے میں آگ نہیں جلاتا تھا۔ ہر گھرانے کو سال میں چالیس روز تک پڑاؤ پر بیگار کی ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ اگرچہ راشن، قلی اور سواری کے گھوڑوں کی مزدوری کے ریٹ مقرر تھے لیکن شاذ ہی کوئی ادا کرتا تھا۔ مالیہ اور لگان کی وصولی اور بیگار کے انتظامات کے لئے ہر موضع میں نمبردار مقرر تھا۔ ایک نائب نمبردار بھی ہوتا تھا جسے کنگ سکن یا ترانگ سکن کہتے تھے۔

......☆......

پانچواں باب

جنگ آزادی 1948ء

بلتستان میں صورت حال

آیئے اب ہم 1948ء کی جنگ آزادی سے قبل بلتستان کی صورت حال کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔اس وقت بلتستان کی معیشت کا دارومدار صرف زراعت پر تھا۔ساری ضروریات زندگی مقامی طور پر ہی پیدا کرنی پڑتی تھیں۔جس کے لئے کنبے کے سارے افراد کو پورا سال دن رات مسلسل محنت کرنا پڑتی تھی۔اس محنت ومشقت کے بعد تقریباً چالیس فیصد تک ہی سال بھر کے لئے کافی خرچ وخوراک وغیرہ کا بندوبست کر پاتے۔یہاں کی مشکل موسمی اور پیچیدہ طبعی خصوصیات کی وجہ سے آمدن میں اضافہ کرنا ناممکن تھا جس کے سبب یہاں کی اکثریت عام حالات میں انتہائی معاشی بدحالی سے دوچار رہتی تھی جو مرنے جینے اور شادی کی رسومات، تفریح، مذہبی اور قومی تہواروں، تعمیر مکان اور ملاؤں کے اخراجات، راجگان کے تحفے اور دیگر رسومات کے بوجھ تلے اور بھی بے بس تھی۔بیگار کے لئے ہر گھر سے ایک فرد کو اپنے اور متوقع مہمانوں اور مویشیوں کے خرچ وخوراک کے ساتھ سال میں چالیس روز پڑاؤ پر رہنا پڑتا جس سے گھر پر ان اخراجات کا ناقابل برداشت بوجھ پڑتا۔دوسری طرف کنبے کے ایک مضبوط فرد کے چالیس روز تک گھر سے باہر رہنے سے زراعت اور گھریلو کام بری طرح متاثر ہوتے تھے۔اجناس کی صورت میں لگان کی ادائیگی سے خوراک میں اور کمی پیدا ہو جاتی۔پھر نقد مالیہ کی ادائیگی تو بہت مشکل مسئلہ تھی۔نقد روپیہ نایاب تھا۔مزدوری کے مواقع سرے سے معدوم تھے۔زمینوں کی فروخت پر پابندی عائد تھی۔یہاں کی تجارت پر سکھ چھائے ہوئے تھے۔نقد مالیہ کی ادائیگی کے لئے لوگ غیر قانونی طور پر جائیدادیں فروخت کر دیتے جو سکھ دکاندار سستے داموں خرید لیتے تھے۔غرباء اپنی ضروریات کو امیروں سے

قرض لے کر پورا کرتے ۔لیکن امیروں کا یہ طبقہ ان سے آم کے آم اور گٹھلی کے دام وصول کرتا تھا۔ ملازمین گاؤں میں پہنچتے تو اجتماعی طور پر ان کی مہمانی کی جاتی تھی جس سے یتیم، بیوہ اور نادار بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ یہاں بھی بیگار لی جاتی تھی۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر پر موجود ملازموں کو دودھ، لکڑی اور ان کے مویشیوں کے لئے چارہ بھی فراہم کرنا پڑتا تھا۔ آفیسروں کی خواتین کو ڈولیوں میں بٹھا کر ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچانا پڑتا۔ ایک ڈولی کے ساتھ آٹھ قلی ہوتے تھے۔ چنانچہ آخری ڈوگرہ وزیر وزارت لالہ امرناتھ جب سکردو آیا تو اس کی دونوں بیویاں اور بچے تین پالکیوں میں سوار تھے اور چوتھی پالکی میں اس کے آٹھ کتے سوار تھے۔ ان جبری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ذرہ بھر روعایت کی گنجائش نہ تھی۔ معمولی غلطی یا کوتاہی پر پٹائی کی جاتی اور دردناک اذیتیں دی جاتی تھیں۔ عام باشندوں کے ساتھ ہمیشہ کی بدسلوکی ان کے علاوہ تھی۔ گائے کے تقدس کو بزور تھوپا گیا تھا جس کی بے حرمتی یا ذبح کرنے کے الزام میں سخت سزائیں بھگتنا پڑتی تھیں۔

مسلسل محنت ومشقت، معاشی بدحالی و پریشانی، محدود وسائل آمدنی، لامحدود اخراجات، قدم قدم پر ظلم وزیادتیوں اور بدسلوکیوں نے بلتستان کے ہر فرد کو ذاتی سطح پر مشکلات اور مایوسیوں سے دوچار کر رکھا تھا۔ قوم کے اجتماعی وجود کا احساس بھی مصائب وآلام کا شکار ہوگیا۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں۔ مادی تنزل بلتستانیوں کے ذہنی ارتقاء کو بھی لے ڈوبا۔ اسی مایوسی کے دوران بلتستان کے ہزاروں باشندے جائیدادیں چھوڑ کر ترک وطن کر کے یارقند، کاشغر، شملہ، منصوری اور برصغیر کے دوسرے مقامات کی طرف چلے گئے۔ جو رہ گئے وہ تنگ تھے اور دیکھ رہے تھے کہ خدا مظلوموں کو ظالموں سے کب اور کیونکر نجات دلاتا ہے۔ اسی پس منظر میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی خبریں بلتستان پہنچنے لگیں۔

1947ء تک بلتستان کے مقامی باشندوں میں سے ایک ایم۔اے، ایک بی۔اے، تین انٹرمیڈیٹ، چھ میٹریکولیٹ اور چند مڈل اور پرائمری پاس افراد ضلع کی ملازمتوں پر آچکے تھے۔ ان کے علاوہ مذہبی تعلیم یافتہ حضرات کی بھی ایک خاص تعداد ایران، عراق اور ہندوستان کی

درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہو کر آئی تھی جنہوں نے موضع نر کے آغا مہدی شاہ کی قیادت میں ایک مذہبی تنظیم 'انجمن امامیہ بلتستان، قائم کی تھی۔ لیکن ان کی اکثریت سماجی امور میں مداخلت کو سیاست اور سیاست میں شمولیت کو ذاتی طور پر غیر ضروری خیال کرتی تھی۔ ان کے اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان یوں ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ خواندہ حضرات میں سے بعض کے پاس روز نامے، ہفت روزے، پندرہ روزے، ماہنامے اور مذہبی رسالے باقاعدہ طور پر آتے تھے جن سے برصغیر کی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ سکردو میں ایک متمول سکھ تاجر گنڈا سنگھ، فوج کے کمانڈر اور میڈیکل آفیسر کے پاس ریڈیو سیٹ تھے جہاں سے تازہ ترین خبریں ملتی تھیں۔ لیکن تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں تفصیلی خبریں ان سینکڑوں لوگوں کے ذریعے بلتستان کے کونے کونے میں پہنچیں جو سرما کے آغاز میں کشمیر اور ہندوستان کے شہروں کی طرف مزدوری کے لئے جاتے اور گرمیوں کے دوران واپس آتے تھے۔ انہی مزدوروں کی زبانی ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں جموں اور مشرقی پنجاب میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے قتل ہو جانے کی خبر بھی گھر گھر پہنچ گئی۔ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آ رہا تھا اس لئے یہاں کے باشندے اس میں شمولیت کے خواہاں تھے اور سوچتے تھے کہ ڈوگروں سے نجات پانے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اسی دوران ایک مسلمان پلاٹون سکردو چھاؤنی میں تعینات ہو گئی۔

میجر محمد دین کی انقلابی مہم

اپریل 1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کی گیارہ بٹالین فوج تھی۔ مہاراجہ خود فوج کا کمانڈر انچیف، میجر جنرل سکاٹ چیف آف آرمی سٹاف اور ٹھاکر راجندر سنگھ، ٹھاکر فقیر سنگھ، ٹھاکر گھنسارا سنگھ، ٹھاکر چتر سنگھ اور خدا بخش بریگیڈیئر تھے۔ بعد میں تیرہ اور نئی یونٹیں تیار کی گئیں۔

سکستھ جموں اینڈ کشمیر انفنٹری بٹالین کو جولائی 1947ء کے دوران بونجی میں تعینات کیا گیا تھا۔ اس میں پانچ کمپنیاں تھیں جن میں سے دو مسلمان، دو سکھ اور ڈوگرہ اور ایک ہیڈ کوارٹر کمپنی مخلوط تھی۔ مسلمان کمپنیوں میں سے سی کمپنی کی ایک پلاٹون کو جولائی 1947ء کے آخر میں سکردو

چھاؤنی میں متعین کیا گیا تھا۔اس میں پچاس جوان تھے۔اس پلاٹون کے کمانڈر میجر محمد دین سمیت سارے جوان مسلمان تھے۔صرف ٹو آئی سی کیپٹن کرشن سنگھ غیر مسلم تھا۔ان سے قبل بھی مختلف اوقات میں دو مسلمان پلاٹونیں سکردو میں متعین ہوئی تھیں جن کے کمانڈر صوبیدار شمس الدین اور صوبیدار فیروز دین تھے۔ چھاؤنی کی مسجد اسی شمس الدین نے 1917ء میں بنوائی تھی۔ 1840ء کے بعد بلتستان میں اب پہلی بار خالص مسلمان فوج تعینات ہوئی تھی۔

جموں میں میجر محمد دین اور کیپٹن مرزا حسن خان سمیت مہاراجہ کی فوج کے بعض مسلمان آفیسروں نے ایک خفیہ میٹنگ میں طے کر لیا تھا کہ جہاں جہاں وہ تعینات ہو جائیں وہاں کا مسلح بغاوت کے ذریعے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا جائے گا۔محمد دین نے سکردو پہنچنے کے بعد اسے عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔اس کے علاوہ صوبہ جموں میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا اس کی خبروں نے بھی مسلمانوں کے جذبہ حمیت کو للکارا اور گیریزن کے مسلمان فوجیوں میں ہلچل ڈال دی کیونکہ ان کی اکثریت صوبہ جموں سے تعلق رکھتی تھی۔ چنانچہ راجہ محمد علی شاہ سمیت سکردو کے چند قابل اعتماد رؤساء کو ایک شام انہوں نے چھاؤنی میں کھانے پر بلایا اور بلتستان میں انقلاب برپا کرنے کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کیے۔ راجہ نے عوام کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین دلایا۔لیکن محمد دین نے اس خیال سے کہ رؤساء کبھی ابن الوقت بھی ثابت ہوتے ہیں براہ راست عوام کے خیالات معلوم کرنا چاہا۔مگر زبان کا مسئلہ عوام اور ان کے درمیان حائل تھا۔اس کام کے لئے انہوں نے نائیک رستم علی کو ساتھ لیا جس کا باپ نگر کا اور ماں گمبہ سکردو کی تھی اور وہ خود سرینگر میں پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ محمد دین نے شکار کے بہانے سندوس اور چونداہ سمیت سکردو کے اردگرد چند دیہاتوں میں جا کر نمبرداروں اور معززین سے تبادلہ خیال کیا۔لوگوں نے انقلاب کی حمایت اور بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ چونداہ سے وہ شکار کو چلے گئے۔اسی دوران ڈوگرہ سکیورٹی کو محمد دین کی سرگرمیوں کا علم ہو گیا اور انتظامیہ کو سخت تشویش لاحق ہوگئی۔ کیونکہ یہاں ایک طرف پوری فوج اور دوسری طرف تحصیلدار حکیم محمد لطیف، نائب تحصیلدار راجہ محمد حسین خان، پولیس کے کوتوال غلام رسول سارے مسلمان تھے۔ لالہ امرناتھ، چند غیر مسلم سرکاری ملازموں اور سکھ دکانداروں کو حراست میں لینا ہی

بس انقلاب کے لئے کافی تھا لیکن اب تک مہاراجہ نے پاکستان اور بھارت میں سے کسی کے ساتھ ریاست کے الحاق کا اعلان نہیں کیا تھا اور ویسے ہی پاکستان کے ساتھ الحاق کئے جانے کی امیدیں اب بھی باقی تھیں۔ اس لئے میجر محمد دین مہاراجہ کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔

سکردو میں غیر مسلموں کو جب محمد دین کے عزائم کا پتہ چلا تو ان کے بھی ہوش اڑ گئے۔ چنانچہ سکھوں کے سردار گنڈا سنگھ کے بیٹے گربچن سنگھ نے وزیر وزارت سے فریاد کی کہ ان کے جان و مال کی حفاظت کا فوری بندوبست کیا جائے۔ لالہ امرناتھ نے اسی وقت حکومت کو صورت حال سے مطلع کیا اور جلد از جلد غیر مسلم فوج بھیجنے کی درخواست کی۔ کہتے ہیں کہ راجہ محمد علی شاہ سکردو نے بھی اس ڈر سے کہ محمد دین کے ساتھ ان کے تعلقات کا راز نہ کھل جائے مہاراجہ کو تار دے دیا کہ بلتستان میں صورت حال بگڑ رہی ہے اس پر جلد قابو کیا جائے۔ ان تاروں کے نتیجے میں محمد دین کو جموں تبدیل کر دیا گیا۔ ان کی جگہ بونجی سے کیپٹن نیک عالم کو سکردو اور سرینگر سے میجر احسان علی کو بونجی تبدیل کر دیا گیا۔ میجر محمد دین ابھی شکار سے واپس نہیں پہنچے تھے۔ وزیر وزارت نے انہیں چونداہ سے بلا لیا اور تبادلے کا حکم نامہ تھما دیا۔ چنانچہ چارج کیپٹن کرشن سنگھ کو دے کر محمد دین 15 اکتوبر 1947ء کو سکردو سے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے نصف سے زیادہ جوانوں کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ ادھر کیپٹن نیک عالم سپاہی علی محمد کے ساتھ بونجی سے روانہ ہوئے اور براستہ دیوسائی 23 اکتوبر کو سکردو چھاؤنی پہنچ گئے۔ محمد دین کی روانگی کے بعد سکردو کی انتظامیہ نے نائیک رستم علی اور دیگر مشکوک لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ اسی دوران یکم نومبر 1947ء کو گلگت میں انقلاب برپا ہو گیا۔

گلگت کے حالات

گلگت ابتداء میں کوہ قراقرم اور کوہ ہندوکش کے درمیان میں واقع ایک چھوٹی سی وادی کا نام تھا جس پر 40-1838ء کے دوران نگر کے راجہ سکندر شاہ کی حکومت تھی۔ 1840ء میں یسین کی طرف سے اس پر راجہ گوہر امان نے حملہ کر کے سکندر شاہ کو قتل کیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ گوہر

امان کے حملہ کے دوران سکندر شاہ کا بھائی کریم خان استور کی طرف بھاگ نکلا جہاں سے سکھ حکومت کے صوبہ دار کشمیر کے پاس بغرض حصول امداد چلا گیا اور 1842 میں کشمیر سے سکھ فوج لے کر گوہر امان پر حملہ آور ہوا۔ گوہر امان یسین کی طرف بھاگ گیا۔ اس طرح گلگت پر لاہور کی سکھ حکومت کا قبضہ ہو گیا جس کی سرپرستی میں کریم خان برائے نام راجہ مقرر ہوا۔ 9 مارچ 1846ء کو لاہور کے مہاراجہ دلیپ سنگھ نے عہد نامہ لاہور کے تحت کشمیر اور اس سے ملحقہ کوہستانی علاقے ایک کروڑ روپے تاوان جنگ کے بدلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے حوالے کر دیئے جن میں گلگت بھی شامل تھا۔ 16 مارچ 1846ء کو یہی علاقے رسوائے عالم بیع نامہ امرتسر کے تحت جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض انگریزوں سے خرید لئے۔ کشمیر کے عوض ادا کردہ یہ رقم گلاب سنگھ نے نہایت سختی، جبر اور ظلم کے ساتھ بلتستان، لداخ، کشتواڑ، پوریگ اور جموں کے لوگوں سے نقد، سونا اور قیمتی اشیاء کی صورت میں جمع کر لی تھی۔ ایک طرف سکھوں کو کمزور کرنے اور دوسری طرف ان علاقوں میں کسی اسلامی سلطنت کے ممکنہ قیام کو روکنے کے لئے انگریز گلاب سنگھ کو مضبوط کر رہے تھے جو راجپوت تھا۔ انگریزوں نے اسے مہاراجہ کا اعزاز بھی دیا۔ غرض اس طرح گلگت پر سکھوں کی جگہ ڈوگروں کا تسلط قائم ہو گیا۔ 1852ء میں گلگت پر گوہر امان راجہ یسین نے دوبارہ قبضہ کیا اور کشمیر سے 1200 فوج کی جو کمک آ رہی تھی اسے بھوپ سنگھ کی پڑی پر ایمبش (AMBUSH) لگا کر فنا کر دیا۔ اس کے بعد آٹھ سال تک ڈوگروں کو دوبارہ گلگت پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ڈوگروں نے 1852ء میں چلاس کو، 1860ء میں گلگت کو، 1863ء میں یسین کو اور 1866ء میں داریل کو فتح کیا اور ان مفتوحہ علاقوں کو ملا کر ایک ضلع 'وزارت گلگت' تشکیل دیا جس میں بلتستان کے علاقے استور اور وادی ہراموش کو بھی شامل کر دیا۔ گلگت کے قصبہ کو اس ضلع کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا جو سطح سمندر سے 4890 فٹ بلند ہے۔ اس کے بعد سے اب تک یہ سارا علاقہ گلگت کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

1849ء میں سکھ سلطنت کے خاتمہ پر پورا پنجاب انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا۔ ادھر سے روس وسطی ایشیاء کے سارے علاقوں پر قبضہ کرتا ہوا چینی پامیر تک پہنچ چکا تھا۔ انہی دنوں روسی فوج

کا ایک کپتان زار کی طرف سے کچھ تحائف لے کر میر ہنزہ کے دربار میں پہنچا تھا۔ روس کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو روکنے کے لئے انگریزوں نے پہلے 1876ء میں اور پھر 1889ء میں گلگت کے دریائے سندھ کے داہنے علاقوں اور چیلاس پر مشتمل ایک پولیٹکل ایجنسی قائم کر دی۔ 1889ء میں کرنل ڈیورینڈ اس کا پہلا پولیٹکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ 1892ء میں نگر اور ہنزہ کو بھی فتح کر کے گلگت ایجنسی میں شامل کیا گیا۔ 1936 میں گلگت کو ساٹھ برس کے لئے انگریزوں نے اجارہ پر لے لیا۔

ایجنسی کے قیام کے ساتھ ہی کرنل ڈیورینڈ نے مسلح اور غیر مسلح رضا کاروں کی ایک فوج قائم کی تھی جو لیویز کہلاتی تھی۔ 1913ء میں لیویز کو توڑ کر گلگت سکاؤٹس کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں ساڑھے تین کمپنیاں تھیں۔ 1935ء میں اس فوج کو پھر سے منظم کیا گیا اور کمپنیوں کی تعداد بڑھا کر آٹھ کر دی گئی۔ ہنزہ کی دو، نگر کی دو، گلگت، پنیال، یسین اور گوپس کی ایک ایک کمپنی تھی جن میں جوانوں کی کل تعداد 582 تھی۔ کمپنی کمانڈر متعلقہ علاقوں کے میروں یا راجاؤں کے بیٹے یا بھائی ہوا کرتے تھے جن کو وائسرائے کمیشنڈ آفیسر یا وی۔ سی۔ او کہتے تھے۔ عام جوانوں میں سے بھی اکا دکا عہدہ داروں کو وی سی او کے عہدے پر ترقی دی جاتی تھی۔ سکاؤٹس کا کمانڈر انگریز میجر اور ٹو آئی سی کیپٹن یا لیفٹننٹ ہوا کرتا تھا۔ فوج کا ہیڈ کوارٹر گلگت خاص میں اور اس کی چوکیاں چلاس، گوپس اور قلندر چی میں تھیں۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں خبریں 1947ء کے آغاز سے گلگت میں پہنچ رہی تھیں۔ ہنزہ اور نگر کے میروں اور دیگر راجاؤں میں سے بعض کے پاس ریڈیو سیٹ تھے۔ چند سرکاری ملازموں کے پاس اخبارات بھی آتے تھے۔ ان کے علاوہ سرینگر اور گلگت کے درمیان چلنے والے مزدوروں کے ذریعے بھی برصغیر کی خبریں یہاں پہنچتی تھیں۔ تقسیم ہند کے فیصلے کے ساتھ ہی انگریزوں نے گلگت مہاراجہ کو واپس کر دیا۔ عوام میروں اور راجاؤں کے ساتھ کچھ وابستگی رکھتے تھے۔ اس لئے انہی میروں اور راجاؤں کو مہاراجہ ہری سنگھ نے سرینگر بلا لیا اور انہیں اندرونی خودمختاری وغیرہ کا لالچ دے کر اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مہاراجہ کی ہاں میں ہاں

ملائی بصورت دیگر اس کی مسلح اور تربیت یافتہ فوج کے ہاتھوں قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑتا۔ 29 جولائی 1947ء کو کمانڈنٹ گلگت سکاؤٹس کا چارج لینے کے لئے میجر ڈبلیوا ے براؤن گلگت پہنچ گیا۔ براؤن اس سے قبل بھی گلگت میں رہ چکا تھا اور اب مہاراجہ کی فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا ٹو آئی سی کیپٹن میتھی سن بھی انگریز تھا جس نے چیلاس پہنچ کر اگست میں اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ کیپٹن ایم سعید درانی اور سکینڈ لیفٹننٹ غلام حیدر کو اس سے پہلے گلگت سکاؤٹس کے ساتھ تعینات کیا گیا تھا۔ 30 جولائی 1947ء کو انگریز پولیٹکل ایجنٹ آر این بیکن سے سول انتظامیہ کا چارج لینے کے لئے بریگیڈئر گھنسارا سنگھ گلگت پہنچ گیا اور یکم اگست کو بحیثیت گورنر چارج سنبھال لیا۔

بریگیڈئر گھنسارا سنگھ کی آمد کے ساتھ یہ افواہ پھیلی کہ ریاستی فوج کو گلگت سکاؤٹس کی جگہ گلگت چھاؤنی اور سرحدوں پر تعینات کیا جانے والا ہے۔ اس صورت میں دو امکانات سامنے آتے تھے۔ یا تو سکاؤٹس کو سرے سے توڑ دیا جاتا یا ریاستی فوج میں ضم کر دیا جاتا۔ دونوں صورتوں میں سکاؤٹس کی تحقیر لازمی تھی۔ اس وقت وی سی او بننا میروں اور راجاؤں کے خاندانوں میں اور سپاہی بننا عوام میں بڑے شرف کی بات سمجھی جاتی تھی۔ سکاؤٹس کو سرے سے ہی رخصت کئے جانے کی صورت میں تو ظاہر تھا ایک تو بیروزگاری پھیلتی اور لوگوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ جاتی۔ لیکن اس کے ریاستی فوج میں ضم کئے جانے کی صورت میں یہ امر غور طلب تھا کہ فوج کے جے سی او کے مقابلے میں سکاؤٹس کے وی سی او کا کیا مقام ہوگا۔ اس وقت آٹھ وی سی او ہیڈ کوارٹر پر موجود تھے جن میں سے دو کے سوا باقی نگر اور ہنزہ کے تھے۔ چنانچہ اسی ابہام کے سلسلے میں ان آفیسروں نے 27 اگست 1947ء کو صوبیدار میجر محمد بابر خان کی صدارت میں ایک میٹنگ منعقد کی۔ میٹنگ کے فیصلے کے تحت بابر خان گورنر سے ملے اور سوالنامہ پیش کیا کہ ریاستی فوج کی موجودگی میں سکاؤٹس کا کیا کردار ہوگا۔ فوج کے جے سی او کے مقابلے میں وی سی او کی کیا حیثیت ہوگی اور یہ کہ گلگت چھاؤنی جو تقریباً پچاس برس سے سکاؤٹس کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کو ریاستی فوج کے حوالے کیوں کیا جارہا ہے۔ گورنر نے کہا کہ سکاؤٹس کو صرف دفاعی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا جائے گا۔ اسے ختم نہیں کیا جائے گا اور نہ فی الحال ریاستی فوج کو گلگت لایا جارہا ہے۔ گورنر نے مزید وضاحت کے

لئے جنرل سکاٹ سے ملنے کو کہا جو اگست کے تیسرے ہفتے میں گلگت آنے والا تھا۔ جنرل سکاٹ نے صاف لفظوں میں بابر خان سے کہہ دیا کہ گلگت سکاؤٹس ایک بے قاعدہ فوج ہے اس لئے وی سی او کا درجہ جے سی او سے کمتر ہو گا۔ گھنسارا سنگھ لکھتا ہے کہ پہلی ملاقات میں ہی بابر خان نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

آزادی گلگت

14 اگست 1947 کو مملکت خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔ لیکن ابھی تک مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کے پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ الحاق کا اعلان نہیں کیا تھا۔ مسلمان ہونے کے ناتے سکاؤٹس کے آفیسروں کی دلی وابستگی پاکستان کے ساتھ پہلے ہی سے تھی۔ لیکن اب ڈوگرہ حکومت کے خلاف ذاتی عناد کی بھی وجوہات پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ بابر خان کی صدارت میں ستمبر میں سکاٹ آفیسروں کی ایک اور میٹنگ منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر سے فوجی نقل و حرکت سے قبل یہاں ڈوگرہ حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے سکاؤٹس اور ریاستی فوج کے مسلمان آفیسروں اور جوانوں کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ ساتھ ہی حکومت پاکستان سے رابطہ قائم کیا جائے گا۔ ان فیصلوں کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ یہ تحریک میروں اور راجاؤں سے مخفی رکھی جائے گی۔ ستمبر کے دوران کیپٹن مرزا حسن خان بھی بونجی گیریزن میں تعینات ہوئے۔ یہ آتش بجاں نوجوان کشمیر سے ہی پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آئے تھے اور ریاستی حکومت ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کر چکی تھی۔ لیکن حالات کی نزاکت کی وجہ سے گھنسارا سنگھ کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی دوران کرنل عبدالمجید نے اسلامی ہمدردی کے تحت گورنر کو رپورٹ دی کہ مرزا حسن خان نے اس قسم کا کوئی نعرہ نہیں لگایا تھا۔ بلکہ وہ نعرے مذہبی نوعیت کے تھے۔ حسن خان اپنی جگہ اس قسم کی ایک تحریک کے علمبردار تھے۔ ان کے یہاں پہنچنے کے بعد دونوں تحریکیں متحد ہو گئیں۔ 10 اکتوبر تک کیپٹن سعید درانی، لیفٹننٹ غلام حیدر، گیارہ وی سی او اور سکاؤٹس کے سارے جوانوں کو اعتماد میں لیا گیا۔ دو وی سی او اور سارے میروں

اور راجاؤں سے یہ تحریک مخفی رکھی گئی۔ تحریک میں راجہ گلگت کے چچا راجہ شاہ رئیس سمیت چند سول کارکنوں کو بھی شریک کیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح، وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار عبد الرب نشتر اور صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خان کے نام ایک ہی مضمون کے خطوط ایک سکاؤٹ امیر جہانداد شاہ کے ذریعے پاکستان کے سب سے قریبی ڈاک خانہ ایبٹ آباد میں ڈالے گئے۔ جہانداد شاہ نے دو ہفتے مسلسل پیدل سفر کے بعد بابوسر کے راستے ایبٹ آباد پہنچ کر خطوط کو پوسٹ کر دیا تھا۔ شرکاء تحریک کو اعتماد میں لینے کی مہم پر اتنی رازداری سے عملدرآمد کیا گیا کہ گورنر ہاؤس کا ایک بیرا بھی خفیہ طور پر انقلابیوں میں شامل تھا لیکن ڈوگرہ سکیورٹی اب تک اس سے بے خبر تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے قتل عام کو روکنے کے لئے قبائلی لشکر کشمیر میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی دوران یہاں داریل تانگیر کی طرف سے قبائلی لشکر کی گلگت کی طرف روانگی کی افواہ پھیلائی گئی۔ ان حالات میں میجر براؤن نے گورنر کو حالات کے مطابق پالیسی اپنانے کا مشورہ دیا۔ لیکن گھنسارا سنگھ نے یہ سوچ کر کہ براؤن نے وفاداری تبدیل کر لی ہے گلگت میں بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ کی نمائش کا اہتمام کیا جس کو دیکھنے کے لئے عوام وخواص سب کو مدعو کیا گیا۔ بعض نیم دل حلقوں میں ڈوگروں کی فوجی طاقت سے مرعوب ہو کر تحریک آزادی کو احمقانہ حرکت خیال کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ تحریک کے بعض علمبرداروں نے بھی کارگہ نالہ سے براستہ داریل تانگیر پاکستان کی طرف بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن جلد ہی حواس درست کئے۔

اکتوبر کے وسط سے تحریک آزادی کی رفتار تیز کر دی گئی اور اسی مہینے کے تیسرے ہفتے میں سکاؤٹس کے آفیسروں نے انقلاب کے لئے قطعی وقت متعین کرنے کے سوا باقی سارے پروگرام طے کر لئے اور دور دراز چوکیوں پر متعین جوانوں کو ایک گھنٹہ کے نوٹس پر مارچ کے لئے تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ ادھر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ نے لیفٹننٹ کرنل عبدالمجید کو بونجی سے بلا کر لمبی بات چیت کی اور انہیں شارٹ نوٹس پر بطرف گلگت روانگی کے لئے تیار رہنے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی مسلمان فوجی آفیسروں کو بتایا کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا ہے جس کا جلد اعلان ہونے والا ہے۔ انقلاب سے دس روز قبل گھنسارا سنگھ معاینہ کے لئے

بونجی پہنچا۔اس کا کہنا ہے کہ اس دوران اس نے وہیں سے سری نگر کی طرف بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن گلگت میں موجود غیر مسلموں کی سلامتی کے پیش نظر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ 26 اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ نے دستاویز الحاق پر دستخط کئے جس کی رو سے 27 اکتوبر سے ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق کیا گیا۔ 31 اکتوبر کو ڈوگرہ انٹیلی جنس نے تحریک آزادی کو محسوس کیا۔ گورنر نے اسی وقت کرنل مجید کو بونجی سے ایک کمپنی فوج گلگت بھیجنے کا حکم دیا۔ میجر احسان علی کی تجویز پر کہ غیر مسلم کمپنی بھیجنے کی صورت میں لوگ مشتعل ہو جائیں گے کرنل مجید نے کیپٹن مرزا حسن خان کو اس کی مسلمان کمپنی سمیت فوری طور پر گلگت پہنچنے کا حکم دیا۔ حسن خان 31 اکتوبر کی شام کے پانچ بجے بونجی سے روانہ ہو گئے۔ انہیں دوسری صبح کو گلگت پہنچنا تھا۔ لیکن گلگت میں سکاؤٹس کو خبر ملی کہ بونجی سے ایک غیر مسلم کمپنی گلگت کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ اب حالات نازک ہو چکے تھے اور مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ شام کے چھ بجے سکاؤٹس کے آفیسروں نے ایک ہنگامی میٹنگ میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد رات کے دس بجے انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کے ٹھیک دس بجے بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ اور میجر براؤن کی گرفتاری، فوجی وائرلیس سٹیشن پر کنٹرول، ڈاک خانہ اور تار گھر پر قبضہ، بیرونی ٹیلیفون لائنوں کے منقطع کرنے اور گلگت میں موجود غیر مسلموں کو حراست میں لینے کے لئے سکاؤٹس کے مختلف دستے روانہ ہو گئے۔ کیپٹن سعید درانی اس وقت گلگت سے باہر تھے۔ لیفٹیننٹ غلام حیدر ایک فوجی دستے کے ساتھ میجر براؤن کے پاس پہنچے۔ گورنر میجر براؤن سے بدظن ہو چکا تھا۔ کیونکہ براؤن نے گھنسارا سنگھ کو مشورہ دیا تھا کہ چونکہ ساری آبادی مسلمان ہے جو پاکستان میں شامل ہونا چاہتی ہے اس لئے یہاں ریفرنڈم کرا کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے۔ یا چارج براؤن کو دے کر سری نگر فرار ہو جائے۔ ورنہ قبائلیوں کے ہاتھوں تباہ کن حالات کا سامنا ہونا یقینی ہے۔ گورنر اس کے لئے تیار نہ تھا۔ میجر براؤن کا کہنا ہے کہ وہ ابتداء ہی سے اس بات کے حق میں تھا کہ گلگت پاکستان میں شامل ہو جائے۔ اس لئے اس نے اور میتھی سن نے طے کر لیا تھا کہ وہ ان علاقوں کو فوجی انقلاب کے ذریعے پاکستان میں شامل کرائیں گے۔ جب غلام حیدر نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ چپکے سے

وی سی اومیس چلا آیا۔ ادھر بابر خان چودہ جوانوں کے ساتھ گورنر ہاؤس پہنچے اور انہوں نے کسی ضروری کام کے بہانے گورنر کو باہر بلا کر گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن سکاؤٹوں کو اسلحہ سمیت گورنر ہاؤس کے ارد گرد گھومتے دیکھ کر گورنر صورتحال کو سمجھ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اردلی، ایک بیرا اور ایک کلرک تین اور افراد بھی تھے۔ گورنر ہاؤس میں تین ہفتے تک کے مقابلے کے لئے کافی اسلحہ اور ایمونیشن کا ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ اندر سے سکاؤٹوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی جس سے ہنزہ کا سپاہی امیر حیات شہید اور نگر کا شفا علی زخمی ہو گیا۔ فائرنگ کا یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ ادھر صوبیدار صفی اللہ بیگ کو ایک پلاٹون کے ساتھ بھوپ سنگھ کی پڑی پر بونجی سے متوقع طور پر آنے والی ڈوگرہ فوج کے راستے میں گھات لگانے کے لئے روانہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہاں حسن خان کی مسلمان کمپنی نمودار ہو گئی۔ چنانچہ کمپنی کو بھوپ سنگھ کی پڑی چھوڑ کر مرزا حسن خان گلگت پہنچ گئے۔ رات ایک بجے تک انقلاب کی ابتدائی کاروائیاں مکمل ہو چکی تھیں لیکن گورنر ہاؤس کا محاصرہ رات بھر جاری رہا۔ بالآخر ایک مشہور بزدل نائب تحصیلدار مانی رام کو اس پیغام کے ساتھ گورنر کے پاس بھیجا گیا کہ گورنر ہاؤس کے گرد قبائلی لشکر نے محاصرہ ڈال رکھا ہے۔ اگر گورنر نے فی الفور پندرہ منٹ کے اندر ہتھیار نہ ڈالے تو گلگت میں موجود سارے غیر مسلموں کے قتل عام کے بعد گورنر ہاؤس کو آگ لگا دی جائے گی اور یہ کہ سکاؤٹس کے جوان گورنر کی جان کی حفاظت کی خاطر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مانی رام کے ساتھ پولیس انسپکٹر سلطان عبدالحمید بھی تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد گورنر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ گھنسارا سنگھ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ اسے بابر خان نے گرفتار کیا۔ غرض اسے گرفتار کر کے گلگت چھاؤنی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آزادی گلگت کا مشن پورا ہو گیا۔ شمالی علاقوں کی تاریخ میں یکم نومبر کا دن ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی دن صبح اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج میں گورنر ہاؤس پر ڈوگرہ پرچم کی جگہ پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا۔ انقلابیوں نے 3 نومبر کو ایک عارضی حکومت 'جمہوریہ گلگت' کے نام سے قائم کی۔ تحریک کے ایک سرگرم کارکن راجہ شاہ رئیس خان کو صدر جمہوریہ، لیفٹننٹ غلام حیدر کو کمشنر، سلطان عبدالحمید کو پولیس کا چیف، کیپٹن حسن خان کو فوج کا کمانڈر انچیف، کیپٹن سعید درانی کو چیف آف ملٹری سٹاف، میجر

براؤن کو چیف ملٹری ایڈوائزر اور کیپٹن میتھی سن کو اسسٹنٹ ایڈوائزر مقرر کیا گیا جبکہ بابر خان کو اسسٹنٹ کمانڈر انچیف بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ اگر چہ برائے نام ایک انقلابی کونسل تشکیل دی گئی تھی۔ حقیقی اقتدار کیپٹن مرزا حسن خان کے پاس تھا اور عملاً یکم سے 16 نومبر 1947ء تک گلگت پر انہی کی حکمرانی قائم رہی۔ حکومت پاکستان کو تار پر تار دیئے گئے کہ گلگت کو اپنا حصہ تسلیم کرتے ہوئے یہاں اپنا نمائندہ بھیج دے۔

بونجی چھاؤنی پر قبضہ

گلگت میں انقلاب تو برپا ہوا تھا لیکن 56 کلومیٹر (35 میل) کے فاصلہ پر بونجی میں ریاستی فوج کی چھاؤنی تھی جو اپر (UPPER) اور لوؤر (LOWER) دو کیمپوں میں منقسم تھی۔ اس وقت بونجی چھاؤنی سکستھ (6Th) جموں اینڈ کشمیر انفنٹری بٹالین کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ اس بٹالین میں چار رائفل کمپنیاں اور ایک ہیڈ کوارٹر کمپنی تھی۔ رائفل کمپنیوں میں سے دو مسلمان اور باقی دو سکھ اور ڈوگرہ کمپنیاں تھیں۔ ہیڈ کوارٹر کمپنی میں مسلمان اور غیر مسلم مخلوط تھے۔ مسلمان کمپنیوں میں سے ایک کا کچھ حصہ سکردو میں تعینات تھا۔ دونوں غیر مسلم کمپنیاں اور ہیڈ کوارٹر کمپنی لوؤر کیمپ میں اور مسلمان فوج اپر کیمپ میں تھی۔ ابتداء میں کیپٹن درگا سنگھ کے ساتھ ایک کمپنی یہاں متعین ہوئی تھی جسے بابر خان نے گلگت چھاؤنی میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ستمبر کے پہلے عشرے تک پوری بٹالین بونجی پہنچ گئی تھی۔ اس بٹالین کے کمانڈر لیفٹننٹ کرنل عبد المجید درانی تھے۔ دوسرے مسلمان آفیسروں میں کیپٹن مرزا حسن خان اور کیپٹن محمد خان جرال تھے۔ 28 اکتوبر کو سرینگر سے میجر احسان علی بھی بونجی آپہنچے تو ہیڈ کوارٹر کمپنی انہیں دی گئی۔ وہ شمالی علاقوں کے پہلے کمشنڈ آفیسر تھے۔ کیپٹن محمد خان بطور کوارٹر ماسٹر لوؤر کیمپ میں رہتے تھے۔ بونجی میں موجود فوج گلگت میں رونما شدہ انقلاب سے اب تک بے خبر تھی۔ چنانچہ اس کی بے خبری میں اسے زیر کرنے کی تدبیر کی گئی۔

انقلابی کونسل نے یکم نومبر کی رات کو میجر براؤن کی طرف سے چلاس میں متعین کیپٹن میتھی سن کو حکم بھیجا تھا کہ تین پلاٹونوں کے ساتھ آگے بڑھ کر جگلوٹ گاؤں اور اس کی کشتی سروس، استور

بونجی راستے پر رام گھاٹ پل اور گلگت بونجی روڈ پر تاپ پل پر 4 نومبر تک قبضہ کر لے۔ میتھی سن چلاس سے روانہ ہو گیا۔ یکم نومبر کو گورنر کی طرف سے بونجی میں کرنل مجید کے نام فوراً گلگت پہنچنے کا حکم بھیجا گیا۔ حسب حکم کرنل مجید گلگت روانہ ہوئے۔ حسن خان کی کمپنی نے اسے 2 نومبر کو بھوپ سنگھ کی پڑی پر حراست میں لے کر چھاؤنی میں نظر بند کر دیا۔ اسی روز میجر احسان علی بھی اپنے بال بچوں کو گلگت پہنچانے اور عزیزوں سے ملنے کے لئے گلگت پہنچے تو ان کو بھی حراست میں لیا گیا۔ اس کے بعد 3 نومبر کو انقلابی کونسل نے گھنسارا سنگھ کی طرف سے بونجی میں ڈوگرہ کمانڈروں کے نام پیغام بھیج دیا کہ سارا علاقہ قبائلی لشکر کے قبضے میں جا چکا ہے لہذا چپکے سے ہتھیار ڈال دیں۔ لیکن کمانڈروں نے کہا کہ جب تک گورنر کے دستخط کے ساتھ تحریری حکم نامہ نہ آ جائے ہتھیار نہیں ڈالے جائیں گے۔ چنانچہ گلگت کا نظم و نسق درست کرنے کے بعد مرزا حسن خان فوج لے کر بونجی پر حملہ کے لئے روانہ ہو گئے اور 3/4 نومبر کی درمیانی رات بارہ بجے پرتاب پل پر پہنچے تو دیکھا کہ پل جل رہا ہے۔ اس وقت میتھی سن ادھر پہنچ چکا تھا۔ ایک پلاٹون نے تھلی چی سے دریا عبور کر کے رام گھاٹ پل پر قبضہ کر لیا تھا۔ جگلوٹ گاؤں اور پرتاب پل پر دو ڈوگرہ فوجی دستے متعین تھے جنہیں تباہ کر کے ان جگہوں پر قبضہ کیا گیا۔ بظاہر بونجی میں ایک خونریز لڑائی یقینی نظر آ رہی تھی لہذا وہاں کے باشندے اپنے بال بچوں اور مال مویشی کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنے لگے۔ ڈوگرہ فوجیوں کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ سارے علاقے میں قبائلی لشکر آن پہنچا ہے جس کی دستبرد اور لوٹ مار سے بچنے کے لئے وہ ایسا کر رہے ہیں۔ مسلمان فوجی آفیسروں اور جوانوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کی طرف سے قبائلیوں کے پہنچنے کا فرضی پیغام بھی اسی دوران مل چکا تھا۔ جگلوٹ اور پرتاب پل پر متعین دستوں کی تباہی کے ساتھ بونجی میں ڈوگرہ فوجیوں کو قبائلی لشکر کی آمد کا یقین ہو گیا اور مقابلہ بے سود سمجھ کر اسی رات سب نے اسلحہ سمیت راہ فرار اختیار کر لی۔ 5 نومبر کی صبح جب مرزا حسن خان بونجی پر حملہ کی نیت سے آگے بڑھے تو دریا پار کیپٹن محمد خان مسلمان فوجی آفیسروں اور جوانوں کے ساتھ سفید جھنڈا ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ پرتاب پل جل چکا تھا اس لئے کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا۔ ساری دشمن فوج بھاگ چکی تھی لہذا کسی مزاحمت

کے بغیر چھاؤنی پر قبضہ ہو گیا۔ اسی دوران بابر خان بھی میجر براؤن سمیت بونجی آ پہنچے۔ بھاگنے والوں میں سے بہت سوں نے واپس آ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ حسن خان نے مفروروں کا گوریکوٹ تک تعاقب کر کے آخری سپاہی تک کو پکڑ لیا۔ صوبیدار (بعد میں میجر) غلام مرتضٰی کے ساتھ فوج کا ایک دستہ گریز کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اسی دوران 16 نومبر 1947ء کو سردار محمد عالم خان بحیثیت پولیٹکل ایجنٹ بذریعہ طیارہ گلگت پہنچ گئے اور سول انتظامیہ کا چارج سنبھال لیا۔

آزادی روندو

جب بونجی سے بھاگی ہوئی ایک پلاٹون نے رام گھاٹ پل کو مسدود پا کر روندو کے راستے سکردو کا رخ کیا تو مرزا حسن خان نے ہراموش کے ایک باشندہ بختاور شاہ کو روندو کی طرف روانہ کیا کہ اس پلاٹون کو سکردو پہنچنے نہ دیا جائے۔ روندو کے مرحوم راجہ محمد علی خان (تمغہ قائداعظم) ایک غیر تمند اور باہمت نوجوان تھے۔ 10 نومبر کو بختاور کی زبانی گلگت میں انقلاب اور سکھ پلاٹون کے فرار کی خبر سنی تو راجہ نے فوراً چالیس رضا کاروں کا ایک دستہ قدیم ماشہ دار اور ٹوپی دار بندوقوں سے لیس کر کے اسے ڈمبوداس کی طرف پل کے پہلو میں واقع ٹیکری پر مورچوں میں متعین کر دیا۔ اس کے علاوہ موضع ہرپوہ سے مینڈی پل تک کے راستے میں بھی جوانوں کو کمین گاہوں میں بٹھا دیا۔ اس وقت بونجی سے مینڈی تک دریائے سندھ کے بائیں پہلو سے آمدورفت قائم تھی لیکن دریا کی اسی جانب ہرکویو سے بشوتک کا علاقہ ناقابل گزر ہونے کے باعث مینڈی پر خچر گزار پل بنا ہوا تھا جہاں سے سکردو کی طرف دریا کی دوسری جانب سے راستہ موجود تھا۔ روندو کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ہرپوہ سے اس پلاٹون پر حملے شروع ہو گئے اور متعدد فوجیوں کو ہلاک کر کے ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کیا گیا۔ یہ پلاٹون دو دستوں میں مینڈی پل پر پہنچی۔ پہلے روز ایک دستہ پل عبور کرنے لگا تو مورچوں سے فائرنگ کی گئی۔ اس دستے نے خوفزدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔ دوسرے روز تقریباً بارہ بجے دوسرا دستہ پل پر پہنچا تو اسے بھی اسی طرح گرفتار کیا گیا۔ کل 26 ڈوگرہ فوجی گرفتار ہوئے جن میں ایک جے سی او بھی تھا۔ بختاور شاہ اور راجہ روندو کے رضا کاران قیدیوں کو لے کر ستق کے راستے گلگت کی

طرف روانہ ہو گئے ۔میندی پل کی اس کاروائی میں مجاہد بختاور شاہ کا مرکزی کردار تھا۔

یہ بڑی احسان ناشناسی ہو گی اگر اس موقع پر روندو کے راجہ محمد علی خان کی ناقابل فراموش خدمات اوران کی جرأت کو خراج تحسین نہ پیش کیا جائے ۔ بلتستان کے پسماندہ ترین علاقے میں جاگیرداری روایات میں پلا ہوا یہ نوجوان اپنے قرب وجوار میں ڈوگرہ فوج کی موجودگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے اسلامی فرض کی ادائیگی کے لئے بے خطر کود پڑا۔افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور 1952ء میں 27 سال کی عمر میں فوت ہو گئے ۔ دوسری طرف دنیوی نقطہ نظر سے ’’منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے،،۔ان کی دیوانہ وار شرکت کے بغیر آزاد فورس کے لئے سکردو ہیڈکوارٹر کی طرف پیشقدمی تقریباً ناممکن تھی۔

13 نومبر 1947ء کو سکردو چھاؤنی کے سامنے گراؤنڈ میں فوج پیریڈ میں مصروف تھی۔ کیپٹن نیک عالم اور کیپٹن کرشن سنگھ بھی سامنے کھڑے تھے۔اسی اثناء میں گلگتی روایتی کالی ٹوپی اور چغہ میں ملبوس دوافراد گراؤنڈ کے دوسرے کنارے پر آ کھڑے ہوئے ۔ پوچھنے پر بتایا کہ انہیں کمانڈر سے ملنے کا کام ہے۔ان کو کیپٹن نیک عالم کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے اسے ایک خط دے دیا۔ یہ دونوں ڈشکن استور کے باشندے نور خان اور رحمت خان تھے جو نیک عالم کے نام مرزا حسن خان کا خط لائے تھے۔ نیک عالم نے دونوں ایلچیوں کو قید کر دیا اور پیریڈ ڈسمس کر کے اسی وقت وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) کے پاس چلا گیا۔وزیر وزارت کو گلگت میں رونما شدہ انقلاب اور سکھ پلاٹون کے براہ روندو فرار ہونے کے واقعات سے آگاہ کر دیا۔اگر چہ اس صورت حال کو فوج کے جوانوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن نیک عالم کے اردلی کے ذریعے انہیں حقیقت حال کا علم ہو گیا۔انہی جوانوں کے ذریعے عوام میں بھی انقلاب گلگت کی خبر پھیل گئی۔

مرزا حسن خان نے خط میں انقلاب گلگت اور سکھ پلاٹون کے براہ روندو فرار کی خبر دینے کے علاوہ نیک عالم کو سکردو میں بھی انقلاب برپا کرنے کی ہدایت کی تھی اور لکھا تھا کہ وہ خود بھی فوج سمیت اس کی مدد کو پہنچیں گے ۔ چنانچہ اس نازک صورت حال کے پیش نظر لالہ امرناتھ نے کیپٹن نیک عالم کو بائیس فوجیوں کے ساتھ فوراً روندو کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ نیک عالم نے راتوں

رات تیاریاں مکمل کرلیں اور 14 نومبر کی صبح کو روندو روانہ ہوگیا۔اس کے ساتھ انتظامات کے لئے نائب تحصیلدار راجہ محمد حسین خان اور پولیس کے سپاہی بھی تھے۔ تھوار پہنچا تو نیک عالم نے وہیں رات قیام کا فیصلہ کیا لیکن شام تک مفصل حالات کا علم ہوگیا تو راجہ اور معززین کے اسلحے ضبط کر لئے اور ستق کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کرلیا۔تھوار سے آگے بڑھنے کی صورت میں مینڈی پل پیچھے رہ جاتا جہاں سے گلگت سے آزاد فورس کے پہنچنے کی افواہ تھی۔ لہذا پل کو کاٹ کر وہ تریکو کی طرف بڑھا۔ تریکو میں لوگوں نے بتایا کہ ستق میں گلگت سے سکاؤٹ پہنچے ہوئے ہیں۔اس خبر کی تصدیق کے لئے نائیک رستم علی اور پولیس کانسٹیبل غلام محمد کو ستق روانہ کیا گیا۔اس وقت بختاور شاہ ستق میں نمبردار کے ہاں کھانے پر مدعو تھا۔نیک عالم کے پہنچنے کی خبر دینے کے بعد رستم علی نے اس سے کہا کہ چاروں زخمیوں کو چھوڑ کر وہ فوراً چلا جائے۔ چنانچہ بختاور ستق سے روانہ ہوگیا۔رستم علی نے زخمیوں سے ملاقات کر کے انہیں تسلی دی اور واپس آ کر تریکو میں نیک عالم کو بتایا کہ ستق میں بختاور کے ساتھ پچاس سکاؤٹ موجود ہیں جو چھبیس ڈوگرہ فوجیوں کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ نیک عالم نے اسی وقت کوچ کیا اور ستق میں اس جگہ پر دھاوا بول دیا۔ چاروں زخمی فوجی ہاتھ آ گئے۔اس کے بعد ستق سے تین میل آگے جا کر مورچے قائم کر لئے۔لیکن شدید خطرات کے پیش نظر ادھر سے واپس داسو پہنچ گیا جہاں سے چاروں زخمیوں کو سکردو بھیج دیا گیا۔

گلگت میں انقلاب اور کرنل عبدالمجید کی گرفتاری کے بعد ریاستی حکومت نے لیہ چھاؤنی میں متعین میجر شیر جنگ تھاپا کو ترقی دے کر لیفٹننٹ کرنل بنایا اور اسے سکستھ جموں اینڈ کشمیر انفنٹری بٹالین کا کمانڈر مقرر کر کے سکردو پہنچنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ نیک عالم کی روندو کی مہم کے دوران لداخ سے کرنل شیر جنگ تھاپا اور کیپٹن گنگا سنگھ پچاسی (85) ڈوگرہ فوجیوں کے ساتھ 23 نومبر کو لیہ سے روانہ ہو کر 3 دسمبر کو سکردو چھاؤنی میں پہنچ چکے تھے جہاں جمعدار رحیم داد خان سمیت تیس مسلمان فوجی پہلے ہی موجود تھے۔ چنانچہ داسو میں نیک عالم کو کرنل تھاپا کا حکم نامہ ملا کہ چھری پر دفاعی مورچے قائم کرلے۔لہذا نیک عالم داسو سے چھری پہنچ گیا۔اسی اثناء میں راجہ محمد علی خان نے تین سو رضا کاروں پر مشتمل ایک رضا کار دستہ مرتب کیا جن کے پاس سکھوں سے حاصل کی

ہوئی رائفلوں کے علاوہ چالیس پرانی ماشہ دار اور ٹوپی دار بندوقیں تھیں۔اس دستے نے دریائے سندھ کی دائیں جانب داسولہ پر اور بائیں جانب ہرکویو پر مورچے قائم کر لئے۔داسولہ پر دو سو اور ہرکویو پر ایک سو رضا کار متعین کئے۔ ہرپوہ کے سابق فوجی محمد حسین کو اس فوج کا کمانڈر مقرر کیا۔ ان کے لئے راشن کے دو ڈپو تھوار اور ہرکویو میں قائم کئے۔اس کاروائی کے ساتھ ہی گربی داس تونگوس اور باغیچہ کے سوا رondo کا باقی سارا علاقہ ڈوگروں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔مورچہ بندی کے فوراً بعد راجہ محمد علی خان نے کرنل مرزا حسن خان کے نام ایک خط اپنے وزیر کے ساتھ گلگت بھیجا۔اس خط کے بارے میں کرنل مرزا حسن خان کہتے ہیں:

''گلگت کی آزادی کے فوراً بعد روندو کے راجہ محمد علی خان نے اہالیان بلتستان کی طرف سے میرے نام دعوت نامہ بھیجا کہ آپ نے تو اپنے علاقے کو آزاد کرالیا۔اب ہمارے غریب علاقے کی طرف بھی توجہ کریں۔ بلتستان کا ہر فرد بشر آزادی کے لئے اور پاکستان کے لئے تڑپ رہا ہے۔اب خدارا کچھ فورسز ہماری طرف بھیج دیجئے۔اس کے اخراجات، بار برداری اور مدد ہمارے ذمے ہوگی۔،،

کچھ دنوں کے بعد اس خط کا جواب موصول ہوا جس کا متن حسب ذیل ہے:۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ڈیئر راجہ صاحب السلام علیکم! ہم آپ کی استدعا کو قبول کرتے ہیں۔تسلی رکھیئے کہ بہت جلد ہم خداوند کریم کی مدد سے آپ کو کافروں کے پنجے سے خلاصی دلائیں گے۔فی الحال چند یوم کے لئے باہر یہ مشہور کر دیں کہ ہم نے آپ کی مدد سے انکار کیا ہے۔آپ ہماری راشن اور بار برداری کا موزوں بندوبست کریں۔انشاءاللہ بحق محمدؐ و آل محمدؐ یہ مہم جلد از جلد کامیابی کے ساتھ سرانجام ہوگی۔والسلام۔کرنل مرزا حسن خان کمانڈنگ آزاد فوج بونجی۔،،

سکردو کے مغرب میں 40 کلومیٹر بطرف روندو چھری کے مقام پر وادی سندھ تنگ ہو

جاتی ہے۔ چھری دریائے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے۔ گاؤں کے کنارے پہاڑ دامن سے چوٹی تک دھار کی شکل میں ہے۔ یہی صورت دریا پار موجود پرکشاق نامی پہاڑ کی بھی ہے۔ مورچہ بندی کے لئے یہ جگہ قدرتی طور پر موزوں تھی۔ عام آمدورفت کا راستہ چھری گاؤں کی طرف سے تھا۔ داسو سے واپس آکر نیک عالم اس جگہ پہنچا تو اس نے چھری اور آس پاس کے مواضعات کے لوگوں کو جمع کر کے گاؤں کے کنارے پہاڑ کی چوٹی تک مورچے بنوائے اور ان میں اپنے بائیس ساتھیوں کو متعین کر کے ایک دفاعی لائن قائم کر لی۔ اگرچہ اب راستہ بند ہو چکا تھا لیکن جنگ کے خطرات کے پیش نظر دریا پار پرکشاق کی طرف سے دشمن کے گزرنے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ کرنل تھاپا نے کیپٹن کرشن سنگھ کو 26 سکھ اور 3 مسلمان فوجیوں کے ساتھ پرکشاق کی طرف بھیج دیا۔ اس نے بھی پرکشاق کی دھار پر دامن سے چوٹی تک مورچے قائم کر لئے۔ چھری سے تقریباً دس کلومیٹر روندو کی طرف چند گھرانوں کی ایک آبادی گربی داس واقع ہے جہاں سے سوا کلومیٹر اور آگے ایک تنگ گھاٹی آتی ہے۔ اس جگہ دریا کے دائیں پہلو پر کھی نٹ پڑی واقع ہے جہاں سے اس وقت گھوڑے اور خچر گزر سکتے تھے۔ اس کے بالمقابل دریا پار ایک اور چھوٹی بستی کرابہ تھنگ واقع ہے۔ کھی نٹ پڑی کی نگرانی کے لئے نیک عالم نے اس جگہ مسلمان اور سکھ مخلوط چودہ نفریوں پر مشتمل ایک دستہ متعین کر دیا۔ دریا کے آر پار آمدورفت کے لئے مقپونی شوکپہ کے مقام پر زَخ سروس قائم کی۔ چھری کے مورچوں سے گربی داس اور تونگوس تک پٹرولنگ پارٹیاں جاتی تھیں۔

سکھ زخمیوں نے سکردو پہنچ کر روندو کے واقعات کی تفصیل سنائی تو وزیر وزارت نے کوتوال غلام رسول کے ساتھ پولیس فورس کو روندو والوں کی تادیب کے لئے روانہ کیا۔ راجہ روندو نے ان سب کو گرفتار کر کے قید کر لیا۔ لیکن بعد میں بڑی منت سماجت کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا تو انہوں نے سکردو میں ڈوگرہ انتظامیہ کو بتایا کہ روندو میں آزاد فورس پہنچی ہے۔ روندو کا گرداور بھی اسی قسم کی رپورٹ کے ساتھ سکردو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ امر ناتھ نے 10 جنوری 1948ء کو سری نگر میں سول انتظامیہ کے سربراہ کو تار دیا:

''روندو میں متعین وزیر حسن گرداور اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ 500 گلگت سکاؤٹ دس روز کے اندر سکردو پر حملہ کرنے والے ہیں اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے روندو سے واپس آیا ہے۔ کوتوال رپورٹ کے مطابق تقریباً 800 سکاؤٹ شنگوس پہنچے ہیں۔ 50 نفر انتظام کے لئے ستق پہنچے ہیں۔ گلگت سکاؤٹس کے کیپٹن مرزا حسن خان نے حکم بھیجا ہے کہ ان کے پہنچنے تک سارے سرکاری ملازمین کو گرفتار کر کے رکھیں۔ ان کے لئے ہر پڑاؤ پر 10 بکرے، 100 من آٹا، 10 من گھی، 50 درجن انڈے، 6 من پیاز اور 4 بیلوں کی ضرورت ہو گی...... روندو کے 50 نفر باغیچہ پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ کوتوال کا بکس چھین لیا گیا ہے جس میں اہم کاغذات تھے اور اسے جبراً نکال دیا گیا ہے۔''

وزیر وزارت امرناتھ کا اصرار تھا کہ فوج روندو میں ستق کے مقام پر ڈیفنس قائم کر لے۔ لیکن کرنل تھاپا اس کے لئے تیار نہ تھا۔ جب امرناتھ نے زیادہ زور ڈالا تو تھاپا نے 22 دسمبر 1947 کو چیف آف سٹاف کے نام ایک تار دیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا:

''موجودہ نفری کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کی مقامی ذمہ داریوں کو نبھانے کے بعد صرف کمزور سی دو پلاٹونیں ڈیفنس قائم کرنے کے لئے اگلے مورچوں میں متعین کی جا سکتی ہیں۔ ہم نے عارضی طور پر سکردو سے روندو کی طرف 25 میل کے فاصلے پر چھری پر ڈیفنس قائم کیا ہے۔ میں آج علاقے کی ریکی سے واپس آیا ہوں اور چھری کو واحد مناسب جگہ پایا ہے جہاں ہم دشمن کو روک سکتے ہیں...... وزیر بہت مجبور کر رہا ہے کہ سکردو سے 70 میل دور ستق میں ڈیفنس قائم کروں۔ میرے زیر کمانڈ اتنی قلیل فوج کے ساتھ اتنے لمبے اور انتہائی مشکل رسد کے راستے کو قائم اور محفوظ رکھنا جو صرف قلیوں کے بھروسہ پر منحصر ہے بہت مشکل ہے۔ کمک کے پہنچنے تک چھری سے آگے فوج کو لیجانا میرے خیال میں دانشمندی کے خلاف ہے۔ وزیر کو حکم دیا جائے کہ میرے کاموں میں بے جا

مداخلت کی بجائے پورے خلوص کے ساتھ ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ وزیر کو
یہ احساس دلایا جائے کہ فوجی معاملات میں مجھے حکم دینا اس کا کام نہیں بلکہ ایسے
معاملات میں اسے میرے ساتھ مشاورت کرنی چاہیے۔،،

سکردو میں اب حالات نازک ہو گئے تھے۔ میجر محمد دین کے ساتھ ساز باز کے انکشاف پر یہاں کے باشندوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ اب روندو کے واقعات نے ڈوگروں کے ساتھ بلتیوں کی عدم وفاداری بالکل بے نقاب کر دی۔ سکردو میں کوتوال سمیت سارے پولیس سپاہی مسلمان تھے۔ بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر لالہ امر ناتھ نے کرگل میں متعین خصوصی پولیس کو ڈوگرہ کوتوال سمیت سکردو بلا لیا تھا اور امر ناتھ کے حکم سے پولیس نے مشکوک گھروں کی تلاشی لی اور لائسنس والے ہتھیاروں سمیت تلوار، کلہاڑی، ڈھال، چاقو، تیر و کمان وغیرہ کو ضبط کر لیا۔ گلگت سکاؤٹس کے حملے کے خطرے کے پیش نظر دریائے سندھ پر کشتی سروس کو بند کر دیا گیا۔ سول ملازمین اور دیگر مشکوک لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ ملازموں کو دفتری اوقات کے علاوہ مل بیٹھنے سے منع کیا۔ ان پر کڑی نگرانی رکھی جانے لگی۔ مسلمان فوجیوں کے عوام سے ملنے جلنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ معززین کی ایک فہرست تیار کی گئی جنہیں ڈوگرہ فوجی کمک کے پہنچنے پر گرفتار کر کے سزائیں دینی تھیں۔ ادھر سکھ دوکاندار بلتیوں کو عبرتناک انجام کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ غیر مسلموں کے ہاتھوں مشرقی پنجاب اور صوبہ جموں میں لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کے قتل ہو جانے کی خبریں پہلے ہی گھر گھر پہنچ چکی تھیں۔ خوف و ہراس کی ان کاروائیوں کی وجہ سے یہاں کے عوام و خواص ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے۔ لیکن مسلح جدو جہد کے لئے گلگت کی طرح یہاں کوئی مقامی سکاؤٹس موجود نہ تھی۔ صرف چند سابق فوجی تھے۔ لیکن وہ بھی عوام کی طرح غیر مسلح تھے۔ لہذا سب کی نظریں مسلح امداد کے حصول کے لئے گلگت کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ سکردو چھاؤنی میں جمعدار رحیم داد خان سمیت تیس مسلمان فوجی تھے۔ بعض سابق فوجیوں اور سول جوانوں کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کر لیا گیا جنہوں نے چھری پر متعین مسلمان فوجیوں کو سکردو کی صورتحال سے مطلع کیا۔ چھری سے نائیک شیر احمد اور

نائیک رستم علی نے پٹرولینگ کے بہانے جا کر راجہ روندو کو سکردو کی خبریں پہنچا دیں۔ چنانچہ راجہ محمد علی خان نے روندو سے گلگت کی طرف خطوط پر خطوط پیغام پر پیغام بھیجے۔ اس طرح سکردو سے گلگت تک اطلاع رسانی کا ایک مستقل سلسلہ قائم ہو گیا جو فروری 1948 تک قائم رہا۔

داسولہ اور ہرکویو کے مورچوں سے اکا دکا فائرنگ بھی کی جاتی تھی۔ تاکہ نیک عالم اور سکھ فوج کو روندو میں آزاد فورس کی موجودگی کا یقین رہے۔ اگرچہ ڈوگرہ انتظامیہ کو اطلاع مل چکی تھی کہ روندو میں آزاد فورس ابھی نہیں پہنچی بلکہ راجہ روندو کے رضا کار ادھر مورچہ بند ہیں لیکن نیک عالم کے ساتھی مسلمان فوجی جوان اندورنی طور پر راجہ روندو سے ملے ہوئے تھے۔ اسی لئے پٹرولینگ سے واپسی پر وہ نیک عالم کو یہی رپورٹ دیتے تھے کہ داسولہ اور ہرکویو پر آزاد فورس پہنچی ہوئی ہے۔ چنانچہ ڈوگرہ انتظامیہ اور فوج کو اس بات کا یقین ہوا کہ روندو میں سچ مچ آزاد فورس پہنچ چکی ہے۔ اس لئے اس طرف پیشقدمی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ روندو والوں پر اس دوران دنیا تنگ ہوگئی۔ ان کے بعض لوگ غداری کے الزام میں سکردو میں بعض جاسوسی کے الزام میں گلگت میں قید ہو گئے۔ اسی دوران وزیر وزارت امرناتھ نے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے بلتستان کے راجاؤں اور معززین کی سکردو میں ایک کانفرنس بلائی لیکن اس میں روندو کے راجہ محمد علی خان نے شرکت نہ کی۔ ہندوستانی مورخ کمار مہاجن رقمطراز ہے:

> ''جب روندو کا راجہ اس کانفرنس میں شریک نہ ہوا تو امرناتھ کو تعجب نہ ہوا کیونکہ اسے اس سے قبل انٹیلی جنس رپورٹ مل چکی تھی کہ راجہ روندو مسلسل پاکستان اور گلگت سکاؤٹس کے ساتھ رابطہ قائم کئے ہوئے ہے اور انہیں فوراً سکردو پر حملہ کرنے کے لئے زور دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلگت سکاؤٹس کو اتنی جلدی سکردو آنے پر راجہ روندو نے ہی آمادہ کیا تھا۔ راجاؤں میں صرف چلو کا راجہ حکومت کا وفادار تھا۔ باقی سارے راجے موقع پرست تھے۔ وقتی طور پر غیر جانب دار تھے۔،،

بعد میں ڈوگرہ انتظامیہ نے روندو والوں کی تالیف قلب کے لئے راجہ روندو کی ضبط شدہ

رائفلوں اور کچھ رقوم کے ساتھ راجہ سکردو کو تونگوس بھیج دیا۔ رائفلیں واپس کی گئیں لیکن راجہ روندو قابو میں نہ آئے۔

کرنل تھاپا کا خیال تھا کہ چونکہ سری نگر سے سکردو تک رسد کا راستہ بہت ہی لمبا ہے۔ اس کے ساتھ موجود مختصر سی نفری کے ساتھ اس راستے کو بحال رکھنا اس کے لئے مشکل ہوگا۔ جبکہ ساری مسلمان آبادی ڈوگرہ فوج کے خلاف تھی۔ اس لئے اس کا ارادہ تھا کہ سول انتظامیہ اور فوجی ہیڈ کوارٹر کو کرگل میں منتقل کیا جائے اور سکردو تک پٹرولینگ کی جاتی رہے۔ کمک کے پہنچنے کے بعد سکردو کو پھر ہیڈ کوارٹر بنا کر گلگت کی طرف پیشقدمی کی جائے۔ اس نے یہ تجویز سری نگر کو پیش کی۔ فوجی اعلیٰ کمان نے اس سے اتفاق کیا لیکن سول اعلیٰ کمان نے مسترد کر دیا۔

اس وقت سکردو میں 250 سکھ اور ہندو اہل وعیال سمیت موجود تھے۔ سکھ تجارت کے سلسلے میں اور ہندو ملازمت کے سلسلے میں یہاں رہ رہے تھے۔ آزادی گلگت کی خبر نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب روندو کی آزادی کی خبر نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ چنانچہ سب نے اہل وعیال کو فوراً کرگل منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور انتظامات مکمل کر کے روانہ ہونے ہی والے تھے کہ وزیر وزارت امرناتھ نے علاقے میں خوف وہراس پھیلنے کے ڈر سے انہیں روک لیا۔ کہتے ہیں کہ بعض روانگی کے لئے گھوڑوں پر سوار بھی ہو چکے تھے۔ امرناتھ چاہتا تھا کہ سکردو کو فوج کے حوالے کرے اس لئے وہ شدت سے فوجی کمک کا انتظار کر رہا تھا۔

سکردو میں موجود غیر مسلموں کو گلگت کی طرف سے حملے کا سخت خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے سری نگر کی انتظامیہ کے سربراہ کو تار پر تار دیئے کہ انہیں جہاز کے ذریعے سری نگر پہنچایا جائے۔ اس پر کسی نے کان نہیں دھرا تو ہندو اور سکھ خواتین کی طرف سے مہارانی کو تار دیا گیا کہ سکردو میں موجود ہندوؤں اور سکھوں کے اہل وعیال کو ہوائی جہاز کے ذریعے سری نگر پہنچا کر ان کی جانیں بچائی جائیں۔ امرناتھ نے سکردو میں ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ تعمیر کیا تھا تا کہ فوری طور پر ہوائی جہاز کے ذریعے فوج اتاری جا سکے۔ اس نے بھی سول انتظامیہ کے سربراہ پر بذریعہ تار زور ڈالا کہ جلد از جلد ہوائی جہاز کے ذریعے سکردو میں فوج اتاری جائے۔ کرنل تھاپا نے بھی کمک جلد بھیجنے کے لئے حکومت پر

دباؤ ڈالا۔ان ساری پریشانیوں کے باوجود انہیں کمک کے پہنچنے کی امید تھی۔اس لئے مقامی باشندوں کے لئے ان کے دلوں میں کوئی نرم گوشہ موجود نہ تھا اور ڈوگرہ انتظامیہ انتقامی کاروائیوں پر عملدرآمد کے لئے فوجی کمک کا انتظار کر رہی تھی۔تحصیلدار حکیم محمد لطیف کی تنزلی، نائب تحصیلدار راجہ محمد حسین خان کی برطرفی اور وزیر غلام مہدی سول سپلائی انسپکٹر کی گرفتاری کا بھی خفیہ طور پر فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ان مخدوش حالات میں بلتستان کے لوگ گلگت کی طرف سے امداد کے سخت منتظر تھے۔اتنے میں گلگت کی طرف سے میجر احسان علی آزاد فورس کے ساتھ بلتستان پہنچ گئے۔

آزاد فورس چھری میں

16 نومبر 1947ء کو سردار محمد عالم خان نے پاکستان کے پہلے پولیٹکل ایجنٹ کی حیثیت سے گلگت میں سول انتظامیہ کا چارج سنبھال لیا تھا۔دسمبر 1947ء کے دوران میجر محمد اسلم کو گلگت سکاؤٹس کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔وہ اس سے قبل بونجی میں کمپنی کمانڈر رہ چکے تھے۔کرنل مجید زیر حراست تھا۔میجر اسلم کی پیشکش پر کرنل مجید نے اس بناء پر معذرت کی کہ اس کے رشتہ دار کشمیر میں ہیں اس لئے سکاؤٹس کی قیادت قبول نہیں کر سکتا۔چنانچہ اس کو راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ابتداء میں کیپٹن حسن خان کے حکم پر میجر براؤن کو بھی حراست میں لیا گیا تھا لیکن فوراً ہی اسے آزاد رکھا گیا۔ بعد میں سردار عالم نے انقلاب کے بارے میں تفصیلی رپورٹ کے ساتھ میجر براؤن کو حکومت پاکستان کے پاس بھیج دیا جس کے نتیجے میں حکومت نے صوبیدار میجر بابر خان اور نائب صوبیدار شاہ خان کو تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کے کارناموں کی بناء پر خصوصی کمیشن کی منظوری دے دی۔چنانچہ دونوں لیفٹننٹ کے عہدوں پر فائز ہوئے۔حکومت نے گلگت سکاؤٹس کی تعداد کو دو ہزار تک بڑھانے کی بھی منظوری دے دی تھی لیکن ہتھیاروں اور دیگر ضروریات کی کمی کی وجہ سے اس کی تعداد کو ایک ہزار چھ سو سے زیادہ نہ بڑھایا جا سکا جن میں گلگت سکاؤٹس کے 582 جوان، سابق سکستھ جموں اینڈ کشمیر انفنٹری بٹالین کی مسلمان نفری اور رنگروٹ شامل تھے۔پوری فوج کو چار ونگوں میں (WINGS) میں منظم کیا گیا۔

1۔اے ونگ:۔اس میں چارسو جوان تھے جن میں سابق ریاستی مسلمان فوجیوں کے علاوہ
استوراوریسین کی بھی تھوڑی سی نفری تھی۔کیپٹن محمد خان کواس کا کمانڈر مقرر کر
کے لوؤر کیمپ بونجی کواس کا ہیڈکوارٹرمقرر کیا گیا۔

2۔بی ونگ:۔ اس فوج میں پنیال،غذر، چلاس،استوراوریسین کے چارسوجوان تھے۔کیپٹن
حسن خان کواس کا کمانڈر مقرر کر کے چلاس میں متعین کیا گیا۔

3۔سی ونگ:۔ لیفٹیننٹ شاہ خان اس ونگ کے کمانڈر تھے۔اس میں ریاست ہنزہ کے چارسو
جوان تھے۔اس کا ہیڈکوارٹراپر کیمپ بونجی تھا۔

4۔ڈی ونگ:۔ ریاست نگر کے چارسوجوانوں پر مشتمل اس ونگ کا کمانڈرلیفٹیننٹ محمد بابرخان
تھے۔گلگت خاص اس کا ہیڈکوارٹرتھا۔

تنظیم نو کے بعد فوراً ونگ ہیڈکوارٹروں پر رنگروٹوں کی تربیت شروع کر دی گئی۔لیکن وقت کی سخت کمی تھی اور ہرطرف سے دشمن کے حملوں کا شدید خطرہ تھا۔سکردو میں ڈوگرہ چھاؤنی تھی جہاں سابق سکستہ جموں اینڈ کشمیرانفنٹری بٹالین کو پھر سے منظم کیا جارہا تھا۔ادھر سرینگر بھی زیادہ دور نہ تھا جہاں تربیت یافتہ ریاستی فوج تباہ کن ہتھیاروں سے لیس کھڑی تھی جس کی پشت پر انڈین آرمی اورایئرفورس بھی تھی۔اس کے مقابلے میں یہاں سکاؤٹس کی قلیل تعداد تھی۔گلگت سکاؤٹس کے جوانوں کوصرف چھوٹے اسلحہ کی تربیت حاصل تھی۔بڑا اسلحہ میسر ہی نہیں تھا۔دشمن کے حملوں کی صورت میں پاکستان سے فوری امداد بھی ناممکن تھی۔کیونکہ وہاں تک کوئی آسان زمینی راستہ موجود نہ تھا۔ہوائی سروس کے لئے پاکستان کے پاس ہوائی جہازوں کی سخت کمی تھی۔جو تھے ان کے لئے پہلے ہی مصروفیتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔مزید یہ کہ یہ جہاز زیادہ بلندی پر پرواز نہیں کر سکتے تھے۔ہوائی راستہ خطرناک ترین راستوں میں سے تھا اور موسم بھی ہوائی سروس کے لئے ناقابل اعتبار تھا۔اس لئے دشمن کے حملوں سے قبل ہی ان کے سروں پر پہنچنا مجاہدین کے حق میں بہتر تھا۔دوسری طرف بلتستان سے راجہ روندو کے ذریعے خطوط اور پیغامات موصول ہورہے تھے۔چنانچہ میجراسلم (علامتی نام کرنل پاشا) نے ان حالات کے پیش نظر رنگروٹوں کی تربیتی مہم مختصر کردی۔ایمونیشن کی کمی کی وجہ

سے اکثر رنگروٹوں کو تربیت کے دوران ایک رونڈ بھی فائر کرنا نصیب نہ ہوا۔ زیادہ خوش نصیب رنگروٹ دس رونڈ فائر کر سکے تھے۔

کرنل پاشا نے اے وینگ کے ایک سو پنجابی جوانوں اور ڈی وینگ کی ایک سو پچاس نفری پر مشتمل ایک فوج مرتب کی۔ کیپٹن محمد خان اے وینگ کے اور لیفٹننٹ بابر خان ڈی وینگ کے کمانڈر تھے۔ دوسو پچاس (250) جوانوں پر مشتمل اس فوج کو ''آئی بیکس فورس،، کا علامتی نام دے کر میجر احسان علی کی ماتحتی میں بلتستان کی طرف جانے کا حکم دے دیا۔ میجر احسان علی کو بلتستان کا ایریا کمانڈر مقرر کیا گیا اور انہیں بلتستان سے فوری طور پر بھرتی کر کے فورس کے جوانوں کی تعداد کو پورا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ فورس کے لئے انتظامات کی خاطر وزیر ولایت علی خان کو بلتستان کا اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ بنا کر فورس کے ساتھ بھیجا گیا۔ ڈی وینگ کے ڈیڑھ سو جوان اس وقت گلگت سے چلاس تک پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ 29 جنوری 1948 کو پوری آئی بیکس فورس ہراموش میں جمع ہوگئی۔ اس فوج کے دوسرے آفیسروں میں لیفٹننٹ محمد علی، لیفٹننٹ احمد علی، صوبیدار جان عالم، صوبیدار شاہ سلطان، صوبیدار ایوب، نائب صوبیدار جانان (اسماعیل) اور نائب صوبیدار بیکو شامل تھے۔ ہراموش میں انتظامات مکمل کرنے کے بعد اے وینگ کو آگے اور ڈی وینگ کو اس کے پیچھے روانہ ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ نے راجہ روندو کو فورس کی روانگی کی اطلاع بھیج دی۔ اس خط کا متن درج ذیل ہے:

> ''مشفق و مہربان دوستان راجہ صاحب۔ السلام علیکم! بعد از اشتیاق ملاقات تحریر خدمت ہے کہ ساسی سے 250 نفر قلیاں سامان لے کر آرہے ہیں۔ اس لئے آن مشفق کو تکلیف دی جاتی ہے کہ مورخہ 29 جنوری 1948ء کی شام 250 قلی بمقام برندو جوشینگوس سے ساسی کی طرف واقع ہے بذریعہ ماتحتان بندوبست فرماویں۔ امید ہے کہ آن مشفق بخیریت ہونگے۔ آپ کا اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ گلگت 48-1-27،،

چنانچہ آئی بیکس فورس ہراموش سے روانہ ہوگئی۔ اس وقت سردی شدت کی تھی اور برف

بہت پڑی ہوئی تھی۔ سردی سے بچنے کی کوئی سہولت دستیاب نہ تھی۔ مزید یہ کہ اس طرف سے کوئی آسان راستہ بھی موجود نہ تھا۔ خطرناک چڑھائیاں اور برف سے ڈھکے ہوئے خوفناک نشیب اور پھسلنیں قدم قدم پر راستے میں درپیش تھیں۔ 20 دن کا راستہ تھا جسے شیر دل سکاؤٹوں نے چودہ دنوں میں طے کر لیا۔ کیپٹن محمد خان اے ونگ کے ساتھ 4 فروری کو دو بجے ستق پہنچ گئے۔ میجر احسان علی اس وقت ستق پہنچ کر چھری کے مسلمان فوجیوں سے رابطہ قائم کر رہے تھے۔

اس وقت چھری کے مسلمان فوجی نہایت پریشانی کے عالم میں تھے۔ پٹرولنگ پارٹی ہمیشہ یہی خبر لاتی تھی کہ داسو میں آزاد فورس موجود ہے اور چھری پر حملہ کی تیاری میں ہے۔ نیک عالم کو اس بات کا یقین ہو گیا اور صورت حال کرنل تھاپا کو لکھ بھیجی۔ اسی دوران 14 جنوری کو تحصیلدار نے دورہ کر کے رپورٹ دی کہ وہ روندو کی طرف دو پڑاؤ سے آگے نہ جا سکا۔ کیونکہ روندو والے سابق سکاؤٹوں کی مدد سے باغیچہ کے اوپر مورچے سنبھالے ہوئے ہیں۔ بعد میں کرنل تھاپا نے اس کی تصدیق کے لئے دو سکیشن سکھ فوج کے ساتھ کیپٹن گنگا سنگھ کو چھری بھیج دیا۔ گنگا سنگھ نے شام کو اعلان کیا کہ صبح مسلمان اور سکھ مخلوط فوج روندو کی طرف پیشقدمی کرے گی۔ مسلمان فوجی اس بات سے سخت پریشان ہو گئے۔ کیونکہ داسولہ پر کوئی آزاد فوج موجود نہ تھی۔ وہاں تو راجہ روندو کے رضا کار بیٹھے تھے جو ڈوگرہ فوج کو دھوکہ دینے کے لئے کبھی اکا دکا فائرنگ کیا کرتے تھے۔ سکھ فوجیوں کے ساتھ ایڈوانس کی صورت میں یہ راز کھل جاتا اور انجام یہ ہوتا کہ روندو پر دوبارہ قبضہ کیا جاتا اور سینکڑوں مسلمانوں کو بغاوت کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ وہ خود بھی گولیوں سے اڑا دیئے جاتے۔ گلگت سے سکاؤٹس کی روانگی کی ابھی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہ روندو کی طرف ایڈوانس کو رکوانے کی تدابیر کرنے لگے۔ یہ واقعہ تقریباً 30 جنوری 1948 کا ہے۔ آخر کار انہوں نے ایک تدبیر سوچ لی اور اسی رات پٹرولنگ پارٹی اور مورچے والے مسلمان فوجیوں نے آپس میں فائرنگ کرنے کا منصوبہ بنایا کہ کیپٹن گنگا سنگھ کو یقین ہو جائے کہ آزاد فورس نے چھری پر حملہ کر دیا ہے۔ چنانچہ رات کے تین بجے پٹرول پارٹی کے چار جوانوں نے مورچوں کی طرف ہوائی فائرنگ کر دی تو مورچوں سے جوابی فائرنگ میں ایمونیشن کے بکس

کے بکس خالی کر دیئے گئے۔ ساری فائرنگ ہوا میں کی جارہی تھی۔ اسی دوران نیک عالم نے مورچوں کا معاینہ کیا۔ لیکن اس فرضی کام کو حقیقت کا ایسا روپ دیا گیا تھا کہ اس نے جوانوں کو شاباش دی اور فائرنگ کو اور تیز کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی دوران ایک جوان نے اپنے آپ کو زخمی کر دیا۔ پٹرول پارٹی نے میدان میں برف پر مختلف جگہوں پر جانوروں کا خون گرادیا جس کا پہلے ہی بندوبست کیا جاچکا تھا۔ اسی دوران گنگا سنگھ کے ساتھی سکھ فوجی بھاگ کر سورداس جا نکلے۔ صبح کے قریب فائرنگ بند کر دی گئی اور گنگا سنگھ نے میدان کارزار کا معاینہ کیا۔ برف پر گرائے گئے خون کو انگلی لگا کر دیکھا اور کہا کہ یہ انسان کا خون نہیں بلکہ کسی جانور کا ہے۔ اس کے بعد نیک عالم کے ساتھ لمبی بات چیت کی پھر سکردو واپس چلا گیا۔ اس فرضی لڑائی سے اگر چہ فی الحال روندو کی طرف پیشقدمی ملتوی ہوگئی لیکن گنگا سنگھ کے چہرے کے تاثرات اور نیک عالم کے ساتھ اس کی لمبی بات چیت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسے یہاں پر متعین مسلمان فوجیوں پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ اس صورت میں ان کا یہاں سے تبادلہ کیا جانا یقینی تھا۔ چنانچہ مسلمان فوجیوں نے گلگت کی طرف ایک اور خط بھیجا جس میں واضح کیا گیا کہ عنقریب ان کا چھری سے تبادلہ کیا جانے والا ہے اس لئے فوری اقدام کی خاطر فوج بھیجی جائے۔

یہ خط میجر احسان علی کو 4 فروری کو ستق میں ملا۔ محمد خان کا اے وینگ اس روز ستق پہنچا تھا اور اس کا آرام کرنے کا پروگرام تھا۔ احسان علی نے چھری کے نازک حالات کے پیش نظر اسے فوراً کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ تریکو پہنچے تو لوگوں نے احمد نامی ایک شخص کے بارے میں بتایا کہ وہ ڈوگرہ حکومت کا جاسوس ہے۔ میجر احسان نے احمد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ الغرض دن رات چل کر اے وینگ 7 فروری کو داسو پہنچ گئی جہاں سے راجہ روندو کے رضا کار دستے بھی ساتھ ہو گئے۔ 8 فروری کو یہ فوج تونگوس پہنچ گئی۔ اس وقت بابر خان کا ڈی وینگ تریکو سے آ رہا تھا۔ تونگوس سے تین کلومیٹر سکردو کی طرف کھی نہٹ پڑی واقع ہے جس کی نگرانی کے لئے ڈوگرہ فوج کا ایک دستہ دریا پار کرابہ تھنگ میں متعین تھا۔ لہٰذا 8 فروری کا دن تونگوس میں گزارا گیا۔ رات کے آٹھ بجے میجر احسان علی فورس سمیت تونگوس سے روانہ ہوئے اور نہایت نظم واحتیاط سے کھی نہٹ

پڑی کو عبور کیا۔ جس کا کرابہ تھنگ میں موجود ڈوگرہ پہرہ دار فوجی دستے کو علم نہ ہو سکا۔ آگے بڑھ کر مقپونی شوکپہ کے مقام سے ہنزہ کے عبادت شاہ کے ساتھ ایک سیکشن فوج کو بذریعہ زخ (مشکوں کی کشتی) دریا پار بھیج دیا گیا جس نے کرابہ تھنگ پر موجود ڈوگرہ فوجی دستے کا صفایا کر دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دستے میں مسلمان اور سکھ مخلوط تھے۔ عبادت شاہ نے ایک مسلمان سپاہی کالا خان کو صورت حال سے مطلع کرنے کے بعد اسے فورس میں شامل ہونے کو کہا تو اس نے کہا کہ مہاراجہ کا نمک کھایا ہے اس لئے نمک حرامی نہیں کرے گا۔ چنانچہ اسے بھی گولی سے اڑا دیا گیا۔

چھری کے مسلمان فوجیوں میں سے بعض نے کے بہانے راستے میں آزاد فورس کا استقبال کیا۔ بعض نے کیپٹن نیک عالم کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا جو مہاراجہ ہری سنگھ کے وفاداروں میں سے تھا۔ اس کا پستول اور سیٹی سپاہی علی محمد پہلے ہی چھپا چکا تھا تا کہ وہ شور کر کے کرشن سنگھ کو فورس کی آمد کی اطلاع نہ دے سکے۔ نیک عالم ایک سپاہی محمد حسین کو گرائیں کہتا اور اس کا خاص خیال رکھتا تھا۔ نائیک رستم علی نے جا کر نیک عالم سے کہا کہ اس کے گرائیں کو پیٹ میں سخت درد ہے اور وہ اسے یاد کر رہا ہے۔ نیک عالم فوراً اٹھ کر اس کے مورچہ میں جا پہنچا جہاں نائیک شیر احمد اور گلگت سکاؤٹس کے حوالدار میجر محمد خان بیٹھے تھے۔ نیک عالم کو گرفتار کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ اتنے میں میجر احسان علی فورس کے دستوں کے ساتھ چھری پہنچ گئے۔ اس دوران فورس نے بہترین نظم و نسق کا مظاہرہ کیا۔ دو سو میٹر پر دریا پار کیپٹن کرشن سنگھ کو اس واقعہ کا علم نہ ہو سکا۔ چائے کے بعد نیک عالم کو میجر احسان علی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ تاہم بعد میں اس نے آزاد فورس کے ساتھ وفاداری کا یقین دلایا لیکن اس کا خلوص کافی عرصہ بعد تک مشکوک رہا اور اس کی نگرانی کی جاتی رہی۔

سکردو چھاؤنی کا پہلا محاصرہ

ایریا کمانڈر میجر احسان علی نے چھری سے صوبیدار جان عالم کو ایک پلاٹون کے ساتھ قمراہ بھیج دیا تھا تا کہ سکردو چھری راستہ کی پہرہ داری کرے۔ ساتھ ہی ایک ایم ایم جی کے ساتھ نیک

عالم کی پلاٹون کو کچورہ کی طرف بھیج دیا جس نے کنڈور سے سکردو کا راستہ کاٹ دیا۔ جس کے نتیجے میں پرکشاق پر موجود ڈوگرہ فوج گھیرے میں آ گئی۔ اب تک نہ پرکشاق پر کیپٹن کرشن سنگھ کو اور نہ سکردو چھاؤنی میں کرنل تھاپا کو میجر احسان علی کی آمد کا علم ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی اسی بے خبری میں 10/9 فروری کی درمیانی رات کو دونوں جگہوں پر بیک وقت حملہ کرنے کا پروگرام طے کر لیا۔ اس پروگرام کے ساتھ نائیک شیر احمد کو سکردو روانہ کیا گیا تا کہ وہ عوام اور چھاؤنی میں موجود تمیں مسلمان فوجیوں کو صورت حال سے مطلع کرے۔ بابر خان کا ڈی ونگ ابھی چھری نہیں پہنچا تھا۔ اسے پیغام بھیجا گیا کہ گربی داس میں رک جائے۔ لیکن 9 فروری کی صبح کو کیا دیکھتے ہیں کہ پرکشاق کے سکھ فوجی مورچوں میں گھس کر پوزیشن لے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بابر خان سینکڑوں سکاؤٹوں اور قلیوں سمیت چھری گاؤں کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ انہیں گربی داس میں رکنے کا پیغام نہیں ملا تھا۔ کہتے ہیں کہ کرشن سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو فائر کرنے سے منع کیا تھا لیکن ضدی سکھوں نے مسلمان دشمنی کے خمار میں بابر خان اور ان کے ساتھیوں پر فائرنگ کر دی۔ ادھر چھری کے مورچوں سے پہلے مارٹر گنوں اور پھر ایم جی سے جوابی گولیاں برسائی گئیں۔ لیکن ایک گھنٹہ کے اندر ہی پرکشاق سے فائرنگ بند ہو گئی۔ پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ اسی دوران قمراہ کے باشندوں نے فورس کے لئے دعوت کا اہتمام کیا۔ لہذا سکردو کی طرف ایڈوانس کو دوسری رات کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

میجر احسان علی نے ایک سیکشن فوج کو 3 انچ مارٹر کے ساتھ اور دوسری کو ایم ایم جی کے ساتھ چھری گاؤں کے اوپر پرکشاق کے بالمقابل متعین کیا اور جمعدار بیکو کے ساتھ ایک پلاٹون کو پرکشاق کے سکھوں سے نمٹنے کے لئے چھری میں چھوڑ دیا۔ ایک سو جوانوں کے ساتھ بابر خان اور نیک عالم کو کچورہ کی طرف بھیج دیا۔ جنہیں ہدایت کی کہ مرر اور لیمپ سگنل کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے ہوئے سکردو کی طرف بڑھیں اور سندوس میں جمع ہو جائیں۔ باقی فوج کو ساتھ لے کر میجر احسان قمراہ کے راستے سندوس کی طرف روانہ ہو گئے۔ 10 فروری 1948ء کو سہ پہر چار بجے بابر خان اپنے دستوں سمیت کچورہ پہنچ گئے اور دریا پار سے سگنل کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں انہیں

پنسل سے لکھا ہوا ایک خط ملا کہ سکردو سے سکھ فوج آ رہی ہے۔ لہذا انہوں نے وہیں پر ایمبش لگالی۔ ادھر میجر احسان علی فورس سمیت روانہ ہو گئے۔ سکردو سے دونوں کشتیوں کو رضا کار سکردو سے آٹھ کلو میٹر نیچے رزسنہ (RZASNA) پر لائے تھے جو پچھلی رات سے فورس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ فورس دریا کو عبور کر کے رات کے تین بجے سندوس پہنچی تو معلوم ہوا کہ بابر خان ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا اور 11 فروری کی صبح قریب تھی۔ لہذا آگے بڑھ کر چھاؤنی کا محاصرہ کر لیا۔ چھاؤنی کے شمال میں میندوق کھر، جنوب میں پرانا ہسپتال، مشرق میں برباد قلعہ اور مغرب میں ابولی ٹوق پر مورچے قائم کئے۔ اسی دوران جمعدار رحیم داد خان تیس ساتھیوں سمیت ہتھیار چھوڑ کر اپنے کمرے کی کھڑکی کے راستے چھاؤنی سے نکل آئے۔ ان میں سے تین وائرلیس والے تھے۔ 4 فالوور بھی چلے آئے تھے۔ آٹھ سپاہی اسلحہ سمیت نکل آئے تھے۔

وزیر وزارت لالہ امر ناتھ اور سکردو میں مقیم غیر مسلموں کے تاروں کے نتیجے میں لداخ سے کرنل تھاپا پچاسی (85) غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ دسمبر میں سکردو پہنچ چکا تھا۔ جن میں سے 26 فوجی پرکشاق پر متعین تھے۔ لحہ بہ لحہ بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر مزید دو کمپنیوں کو سرینگر سے روانہ کیا گیا تھا اور بریگیڈیئر فقیر سنگھ کو سیکٹر کمانڈر بنا کر سکردو پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ درۂ زوجی لہ برفباری کی وجہ سے بند تھا۔ تاہم کیپٹن پربت سنگھ کے ساتھ تین سو ڈوگرہ فوجی چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں زوجی لہ عبور کر کے 27 جنوری کو کرگل میں جمع ہو گئے اور وہاں سے تین دستوں میں سکردو روانہ ہوئے۔ ایک سو فوجیوں کا پہلا دستہ 10 فروری کی شام کو سکردو پہنچ چکا تھا جس کے آفیسروں کو کشو باغ میں محکمہ تعمیرات عامہ کے دفاتر میں جگہ دی گئی تھی۔ دوسرا دستہ لیفٹننٹ اجیت سنگھ کی سرکردگی میں 13 فروری کو اور تیسرا دستہ 15 فروری کو سکردو پہنچ گیا۔ بریگیڈیئر فقیر سنگھ کے ساتھ باقی فوج نے فروری کے تیسرے ہفتے میں زوجی لہ عبور کیا۔

صبح کے پونے پانچ بجے میجر احسان علی نے چھاؤنی کے گرد محاصرہ مکمل کر لیا۔ لیکن حملہ سے قبل اس پر آسانی سے قبضہ کرنے کی ایک تدبیر سوچی گئی۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اور غیر معمولی جرأت کا کام تھا کہ چند جوان چھاونی میں خاموشی سے گھس کر بیرکوں کو باہر سے کنڈیاں لگا کر بند کر

لیں پھر سنتری کو قابو کرنے کے بعد کوارٹر گارڈ پر قبضہ کر لیں۔ سنتری پر قابو کرنے کے کام میں مدد کے لئے نائیک شیر احمد کو آٹھ جوانوں کے ساتھ گیٹ کے باہر متعین کیا گیا۔ سپاہی محمد حسین دو سکاؤٹوں کے ساتھ اس کھڑکی کے راستے چھاؤنی میں داخل ہو گیا جسے جمعدار رحیم داد خان اور اس کے ساتھی کھلا چھوڑ کر آئے تھے اور نہایت تیزی کے ساتھ کنڈیاں بند کرنا شروع کر دیں۔ محمد حسین نیک عالم کی پلاٹون کا سپاہی تھا اس لئے چھاؤنی کے اندرونی حصوں سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے تیزی سے کنڈیاں بند کرتا گیا۔ آخری کمرہ کی کنڈی دو بار لگالی لیکن ہر بار شدید سردی کی وجہ سے ہاتھ کے ساتھ چمٹ کر نیچے گر گئی تیسری بار کوشش کی تو اندر سے کسی نے کہا کہ کون ہے۔ محمد حسین نے کہا کہ اسے پیٹ میں درد کے باعث ملٹری پولیس کی تلاش ہے جو تالا کھولے تو وہ باہر جا سکے۔ اتفاق سے وہی بم پولیس تھا جو باہر نکل آیا۔ چاندنی تھی لیکن وہ محمد حسین کو نہ پہچان سکا۔ اس نے آگے جا کر تالا کھولا اور اسے باہر جانے کو کہا تو محمد حسین نے اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا اور گیٹ کو اندر سے بند کر کے واپس آیا اور جلدی سے آخری کمرہ کی کنڈی لگالی۔ اس دوران بم پولیس نے باہر سے چلا کر شور مچایا تو سنتری ہوشیار ہو گیا۔ محمد حسین کے ساتھی سکاؤٹوں میں سے ایک کو حکم تھا کہ کنڈیاں لگانے کی مہم کی تکمیل پر سبز ویری لائٹ فائر کر دے تا کہ باہر سے سکاؤٹ سنتری کو قابو کر کے کوارٹر گارڈ پر قبضہ کرنے کے لئے اندر داخل ہو سکیں۔ اور اس مہم میں ناکامی یا خطرے کی صورت میں لال ویری لائٹ فائر کر دے۔ اس جوان نے سبز ویری لائٹ فائر کرنے کے لئے گن لوڈ کی۔ بدقسمتی سے سبز کی جگہ لال کارتوس لوڈ ہوا تھا جس کی وجہ سے دھوکہ ہوا اور باہر سے سکاؤٹ اندر داخل نہ ہو سکے۔ اتنے میں سنتری نے پوزیشن لے کر برین گن کا برسٹ چھوڑ دیا جس سے وہ سکاؤٹ وہیں پر جان بحق ہو گیا۔ ایریا کمانڈر کرنل احسان علی کے مطابق اس شہید کا نام مہدی تھا۔ لیکن بعض اس کا نام سلطان بتاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اردگرد موروچوں سے چھاؤنی پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ محمد حسین پو پھٹنے تک اندر چھپا رہا جس کے بعد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈوگرہ فوجیوں نے دیواروں میں سوراخ کر کے چھتوں پر نکل کر موروچوں کی طرف فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ فائرنگ کی آواز سنی تو ایک مقامی رضا کار نے کورو کے مقام پر کرگل کی طرف

کی ٹیلیفون لائن کاٹ ڈالی۔

ادھر گھمسان کی لڑائی جاری تھی ادھر سرکاری خزانہ توڑ کر لانے کے لئے جمعدار رحیم داد خان کو اس کی پلاٹون سمیت رنبیر گڑھ کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس نے خزانہ کی کنڈیاں توڑ کر رقومات کو اپنے جوانوں اور ادھر اُدھر کے قلیوں پر چڑھا کر سیک میدان کے کسی گھر میں پہنچا دیا جہاں پر وزیر ولایت علی موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ رقومات کا ساٹھ فیصد حصہ اسی دوران ضائع ہو گیا۔ چھاؤنی کی طرف سے فائرنگ کی آواز حمید گڑھ میں سنائی دی تو وزیر وزارت امر ناتھ نے فوراً کپڑے بدلے، پستول لیا اور اپنے بنگلے کی چھت پر چڑھ کر دوربین سے نیچے چھاؤنی کی طرف دیکھا پھر ہندو پولیس سب انسپکٹر کو ساتھ لے کر فوراً خزانہ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک سکھ پولیس سپاہی کو بھی ساتھ لیا۔ اس وقت سپاہی سرفراز خان خزانہ کے سامنے موجود تھا۔ امر ناتھ نے اس سے پوچھا کہ نیچے چھاؤنی کی طرف فائرنگ کی آواز کیسے آ رہی ہے۔ سرفراز نے جواب دیا کہ پچھلی شام کو نئی نفری جو کرگل سے پہنچی ہے وہ اپنے ہتھیاروں کی صفائی کے بعد ٹیسٹ کر رہی ہے۔ امر ناتھ کو اس کی باتوں پر شک ہوا اور پستول نکال کر اس پر فائر کرنے لگا تو سرفراز نے گولی مار کر اسے ابدی نیند سلا دی۔ اس کے بعد ڈوگرہ کوتوال کو بھی گولی سے اڑا دیا گیا۔ ان کی لاشیں 14 فروری کو خزانہ کے قریب ایک گڑھے سے ڈوگرہ فوجیوں کے ہاتھ آئیں۔ جنہوں نے انہیں وہیں دفن کر دیا۔ اس وقت ان کے ساتھ امر ناتھ کا بیٹا سوراج بھی تھا۔

امر ناتھ کے قتل کے ساتھ ہی سکردو میں ڈوگرہ سول حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مقامی باشندے آزاد فورس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آمد پر لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور تلواروں کے ساتھ حاضر ہو گئے تھے۔ وزیر وزارت کے قتل کے بعد مشتعل ہجوم نے غیر مسلموں کے گھروں کا رخ کیا۔ رنبیر گڑھ (موجودہ حمید گڑھ) اور پرتاب گڑھ (موجودہ گرلز ہائی سکول کا علاقہ) پر غیر مسلموں کا قتل عام کیا گیا اور ان کے گھروں کو لوٹا گیا۔ مارے جانے والوں میں انجینئر بی ایل گوپتا اور ہیڈ ماسٹر مدل لعل بھی شامل تھے۔ انتہا پسندوں نے بعض غیر مسلم عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دیا جس کا کوئی جواز نہ تھا۔ یہ ناخوشگوار واقعات جموں اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے

ردعمل میں رونما ہوئے تھے۔

میجر احسان علی نے اچانک شبخون کے ذریعے چھاؤنی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن یہاں سخت لڑائی کا سامنا ہوا۔ فوج کا ایک حصہ بابر خان اور نیک عالم کے ساتھ کچورہ میں رہ گیا تھا۔ چنانچہ ان کی طرف ایلچی بھیجا گیا۔ مگر صبح سکردو میں فائرنگ کی آواز سنتے ہی بابر خان کچورہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ سکاؤٹس کی اکثریت کے پاس صرف رائفلیں تھیں۔ جن کے مقابلے میں دشمن بڑے ہتھیاروں سے فائر کر رہے تھے جن کے گولے سندوس تک پہنچ رہے تھے۔ مزید یہ کہ اس سے قبل دشمن سے ان کی معرکہ آرائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ناتجربہ کاری اور گھبراہٹ میں اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں بعض مورچوں میں ایمونیشن کی کمی محسوس ہونے لگی۔ حوالدار نذیر ہسپتال کی طرف سے مشین گن کے فائر کر رہے تھے۔ کشوباغ میں محکمہ تعمیرات عامہ کے دفاتر میں ڈوگرہ فوجی مقیم تھے۔ ایک کپتان نے ہسپتال کی دیوار کی آڑ میں آ کر حوالدار نذیر کو پستول کی گولی سے شہید کر دیا۔ ادھر گوردوارے سے سکھوں نے ابولی ٹوق کے مورچے پر فائرنگ کر دی جس سے حوالدار عبدالخالق شہید ہو گیا۔ اسی دوران برباد قلعہ کے مورچے میں بھی ایک سکاؤٹ شہید ہو گیا۔ چار جوانوں کی شہادت کے بعد کیپٹن محمد خان سمیت اکثر جوانوں نے مورچے چھوڑ کر پسپائی اختیار کر لی اور صوبیدار جانان کے ساتھ صرف دو سیکشن فوج باقی رہ گئی تو میجر احسان نے انہیں بھی پسپائی کا حکم دیا۔ چنانچہ دن کے گیارہ بجے محاصرہ اٹھایا گیا۔ جب بابر خان اور نیک عالم لڑانو ٹوق پر پہنچے تو پسپا ہونے والوں سے ملے۔ انہوں نے واپسی پر زور دیا لیکن کوئی بھی اس پر آمادہ نہ ہوا تو مجبوراً وہ بھی واپس ہو گئے۔ رزسنہ پر کشتیاں کھچا کھچ بھر جانے کی وجہ سے لوگ لٹک کر بھی پار جا رہے تھے۔ دن کے ایک بجے تک ساری فوج قمراہ جا پہنچی۔ بعض ادھر رک گئے لیکن کچھ تیز دستے سورداس، چھری اور رداسو تک پہنچ گئے۔ فوج کا ڈسپلن درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ وزیر ولایت علی خان نے سورداس اور کیپٹن محمد خان نے گربی داس پہنچ کر دم لیا تھا۔ گیارہ فروری کی شام کو کرنل تھاپا نے سری نگر تار دیا جس کی عبارت یوں تھی:

''آج صبح ساڑھے چھ بجے دشمن نے محاصرہ کر کے سکردو چھاؤنی پر حملہ کیا

دشمن 3 انچ مارٹر، 2 انچ مارٹر، ایم ایم جی، ایل ایم جی اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ ایک ایم ایم جی، 4 رائفلوں اور تھری ناٹ تھری ایمونیشن کے دو بکس ہاتھ آئے۔ دشمن کے 10 نفر مردہ پائے گئے ہیں۔ ہمارے 15 زخمی ہوئے ہیں۔ ساری مسلمان نفری بشمول وائرلیس سیٹ ڈپارٹمنٹ کے دشمن سے جاملی ہے۔ دشمن فوج میں ہماری مسلمان نفری، سکستھ انفنٹری بٹالین کی مسلمان نفری اور گلگت سکاؤٹس کی نفری شامل تھیں۔ ان کی مجموعی تعداد 200 سے زیادہ تھی۔ وزیر وزارت اور سب انسپکٹر پولیس لاپتہ ہیں۔ سول انجینئر مارا گیا ہے۔ بہت سے ہندو اور سکھوں نے چھاؤنی میں پناہ لی ہے۔ خزانہ غالباً لوٹا گیا ہے۔ کمک کا دوسرا دستہ کل یہاں پہنچنے کی توقع ہے۔ دشمن غالباً اسے نقصان پہنچانے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ ان کے لئے اور ہمارے لئے ہوائی مدد ناگزیر ہے۔ ہمارے آپس میں رابطے کا کوئی وسیلہ موجود نہیں......،،

آزاد فورس کی پسپائی کے بعد

آزاد فورس کی پسپائی کے بعد دن کے بارہ بجے ڈوگرہ فوج چھاؤنی سے باہر نکل آئی اور پورے قصبے میں پھیل کر پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ ذیلدار غلام محمد کے گھر سے چند معززین کو گرفتار کر کے چھاؤنی میں پہنچا دیا جو ادھر حالات کی نزاکت پر غور کر رہے تھے۔ انتقامی کاروائی کے طور پر سکھوں نے بہت سے مقامی شہریوں کو قتل کر کے ڈوگروں کے خلاف مزید نفرت پھیلائی اور بہت سوں کو گرفتار کر کے چھاؤنی میں قید کر دیا۔ چھومیک، سیز گرکھور، چھوپہ کھور اور سکمیدان میں درجنوں مکانات کو اور بازار میں مسلمانوں کی دکانوں کو نذر آتش کر ڈالا۔ راجہ کے محل سمیت مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا۔ چھاؤنی کے ارد گرد مندر، راجہ کے محل، میندوق کھر، پرتاب گڑھ، رنبیر گڑھ اور بر باد قلعہ پر مورچے قائم کر لئے۔ کھر پوچو کے بلند قلعہ پر بھی مورچہ قائم کر لیا گیا جو اب تک خالی پڑا تھا۔ سکردو میں سول حکومت ختم ہو چکی تھی۔ بعض غیر مسلم سرکاری ملازمین مارے

جا چکے تھے اور کچھ بھاگ نکلے تھے۔ باقی غیر مسلم ملازموں اور سکھ دکانداروں نے بال بچوں کے ساتھ چھاؤنی میں پناہ لے لی۔ ان پناہ گزینوں کی تعداد پانچسو (500) تھی۔ چھاؤنی میں سرکاری جیل خانہ تھا جہاں آٹھ سزا یافتہ قیدی تھے۔ ان کے علاوہ ڈشکن استور کے وہ دو آدمی بھی تھے جنہیں نیک عالم نے قید کر دیا تھا۔ آزاد فورس کی پسپائی پر ایک پنجابی سپاہی زخمی ہو کر ڈوگرہ فوج کے ہاتھ آیا تو اسے بھی قید کر دیا گیا۔ تقریباً دو درجن لوگوں کو اس روز پکڑ دھکڑ کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ ان قیدیوں سے مورچے کھدوانے، پانی بھرنے، صفائی کرنے اور مورچوں تک سامان کی ڈھلائی کے کام لئے جاتے رہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن ڈوگرہ فوج کو آزاد فورس کے تعاقب کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

میجر احسان کے ساتھیوں نے پسپائی کے وقت سکردو کے باشندوں کو بھی دور دراز جگہوں کی طرف بھاگنے کا مشورہ دے دیا تو ان کی پریشانی میں اور اضافہ ہوا اور سارے باشندے بے سرو سامانی کے عالم میں بال بچوں سمیت چونداہ، شگر، نر، ڈورو اور دیگر مقامات کی طرف بھاگ نکلے۔ جو رہ گئے وہ قتل یا گرفتار ہو گئے۔ راجہ محمد علی شاہ اپنے بڑے کنبے کو لے کر رگیایول اخوند اسماعیل کے ہاں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ ڈوگرہ حکومت کا یہاں کے باشندوں سے پہلے ہی اعتماد اٹھ چکا تھا اور انہیں عبرتناک سزائیں دینے کے لئے فوجی کمک کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ادھر 1840ء میں وزیر زور آور سنگھ کے ہاتھوں اور 1842ء میں وزیر لکھپت کے ہاتھوں قتل و غارت اور اذیتوں کی بھیانک تصویریں پھر سے نظروں کے سامنے پھرنے لگیں جن کے نقوش ڈوگرہ راج کے نت نئے ظلم و ستم کی وجہ سے اب ابھرنے لگے تھے۔ اگرچہ بلتی قوم کا اجتماعی وجود منتشر تھا لیکن ان خوفناک تصورات نے ہر فرد کو سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ ڈوگروں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے صرف گلگت کے راستے حکومت پاکستان سے مسلح امداد کی امید تھی جو ناامیدی میں بدل گئی۔ یہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات اس مسئلہ کے اور طرح کے حل کی راہ میں حائل تھے۔ اب لوگوں کے لئے صرف دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں کہ یا تو اپنے تئیں ڈوگروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں یا ڈوگروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ان سے آزادی حاصل کریں یا

شہادت کے درجہ پر فائز ہو جائیں۔ پہلی صورت میں جان و مال اور عزت و آبرو کی مزید تباہی یقینی تھی اس لئے منطقی راستہ دوسرا ہی تھا جس میں دینی جذبے کی تسکین کا سامان بھی تھا۔ لیکن اس کے لئے اسلحہ اور ایمونیشن کی ضرورت تھی جس کے حصول کی ایک ہی صورت تھی کہ پسپائی اختیار کرنے والی فوج سے رابطہ قائم کر کے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلا کر اسے واپسی پر مجبور کر دیا جائے اور واپسی پر آمادہ نہ ہونے کی صورت میں اسلحہ اور ایمونیشن چھوڑ کر واپس جانے پر زور دیا جائے۔ سکردو کے مغربی مواضعات کے رؤساء اس وقت رگیایول میں راجہ محمد علی شاہ کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ چنانچہ راجہ سکردو نے اپنے بیٹے حاتم خان کی سرکردگی میں ایک اٹھارہ رکنی وفد فورس کے تعاقب میں روانہ کر دیا جو 12 فروری کی صبح کو قمراہ میں میجر احسان علی سے ملا۔ اسی دوران مشرقی مواضعات کے رؤساء نے حسین آباد میں کاچو امیر بیگ کے گھر میں مشورہ کرنے کے بعد سابق فوجی غلام حسین کے ساتھ ایک وفد نر کے راستے قمراہ بھیج دیا۔ موضع گول کے مذہبی عالم آغا سید محمد ہادی اور شگر کے راجہ محمد علی شاہ بھی وفود کے ساتھ پہنچ گئے۔ ان نمائندوں نے رضا کار سپاہی، قلی، راشن، کپڑے، سراغرسانی اور دیگر انتظامات کی فراہمی کا یقین دلاتے ہوئے میجر احسان پر زور ڈالا کہ فوری طور پر سکردو واپس چلیں۔ میجر احسان اور بابر خان اس وقت قمراہ میں آغا سید علی کے گھر میں مقیم تھے۔ لیکن روندو کی جانب واپسی کی تیاری میں تھے۔ ان کی فوج داسو تک تتر بتر حالت میں بکھر چکی تھی۔ دوسری طرف ایمونیشن کا ذخیرہ پیچھے سے ابھی پہنچا نہ تھا۔ میجر احسان چاہتے تھے کہ دوبارہ سکردو کی طرف بڑھنے کی بجائے روندو میں کہیں پر ڈیفنس قائم کرے اور ڈوگرہ فوج کو گلگت کی طرف بڑھنے سے ادھر روک لے۔ بلتی وفود کے ساتھ بڑی بحث و تکرار کے بعد بابر خان نے بھی میجر احسان پر زور ڈالا کہ سکردو کی طرف پیشقدمی کرنی چاہیے۔ بالآخر میجر احسان واپسی پر رضا مند تو ہو گئے لیکن متذکرہ مجبوریوں کی بناء پر انہوں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگ لی۔

پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن دانی نے اپنی کتاب میں خیال ظاہر کیا ہے کہ اس جگہ راقم الحروف نے فورس اور اس کے کمانڈر کی صحیح تصویر کشی نہیں کی ہے۔ استاد محترم اسلام آباد میں بیٹھ کر دور سے ان واقعات پر نظر کرنے اور غیر متعلقہ لوگوں سے حاصل شدہ مواد پر تکیہ کرنے کی بجائے سکردو

تشریف لاکر ان واقعات کے سینکڑوں عینی شاہدوں کو سنتے یا میجر احسان علی کا ان واقعات کے حوالے سے انٹرویو کرتے تو انہیں یہ غلط فہمی لاحق ہی نہ ہوتی۔ راقم الحروف نے دونوں متعلقہ ذریعوں سے جانچ کر صحیح واقعات پیش کئے ہیں۔ اس جملہء معترضہ کے بعد ہم پھر اصل واقعات کی طرف لوٹتے ہیں۔

ادھر سکردو میں حالات بے قابو ہو رہے تھے۔ مقامی باشندے آزاد فورس سے ملے ہوئے تھے۔ اس لئے دشمن کو فورس کی تعداد اور اس کے پروگراموں کے بارے میں ابھی تک کوئی علم نہ تھا جس کی وجہ سے سکاؤٹوں کی اچانک واپسی کو انہوں نے جنگی چال پر محمول کیا تھا اور وہ بڑی تیزی سے مسلمانوں کے گھروں، بازار کی دکانوں اور سرکاری گودام کو لوٹ کر چھاونی میں اشیاء خوردنی، ایندھن اور دیگر ضروریات کا ذخیرہ کرنے میں مصروف تھے۔ حقیقت حال سے پردہ اٹھتا تو ایک طرف وہ آزاد فورس کا تعاقب کرتے اور دوسری طرف مقامی باشندوں کو کچل دیا جاتا۔ اس طرح سے آزادی بلتستان کا پلان ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جاتا۔ میجر احسان نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی تھی لیکن اتنے لمبے عرصے تک یہ صورت حال قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ڈوگروں پر یہی تاثر قائم رکھنے کے لئے کہ یہ سچ مچ جنگی چال ہے اور سکاؤٹ ابھی سکردو میں موجود ہیں کھر پوچو پہاڑی کی چوٹی پر سندوس کی طرف سے چڑھ کر ایک مورچہ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حاتم خان ایک بکس ایمونیشن ہمراہ سے ساتھ لائے تھے۔ کواردو سے سابق فوجی حاجی محمد علی بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ سندوس میں نائیک شیر احمد بھی رائفل سمیت موجود تھا۔ غلام حسن نمبردار اور سندوس کے دوسرے جوانوں کے ساتھ یہ لوگ کھر پوچو کی ٹیکری پر چڑھ گئے اور 12 فروری کو مورچہ قائم کر لیا۔ اس کے بعد اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ ڈوگرہ فوجی اور سکھ جو بازار اور محلوں میں لوٹ مار کے لئے گھسے ہوئے تھے چھاؤنی کی طرف بھاگنے لگے۔ اس مورچے سے زبردست فائرنگ کی جاتی رہی جس نے ڈوگرہ فوج کی نقل وحرکت کو چھاؤنی تک محدود کر دیا۔ اس مورچے کی وجہ سے دشمن اس درجہ بوکھلا گئے کہ 16 فروری کو کرنل تھاپا نے سری نگر تار دیا:

''سکردو کے شمال میں واقع (پوائنٹ) 8853 بلند پہاڑ کی چوٹی سے سخت

فائرنگ ہو رہی ہے۔ دشمن اس جگہ سے ایم ایم جی سے فائر کر رہے ہیں۔ دشمن دریائے سندھ کو کشتی کے ذریعے عبور کر کے ننگ سوق میں جمع ہو رہے ہیں۔ مذکورہ پہاڑی اور گاؤں پر ہوائی بمباری کا فوری بندوبست کیا جائے۔،،

حاجی محمد علی سمیت دیگر مقامی سابق فوجیوں اور سندوس کے جوانوں نے اس مورچے میں باقاعدہ ڈیوٹی دی۔ آج تک یہ مورچہ کواردو کے حاجی محمد علی سے منسوب ہے۔ کھرپوچو ٹیکری سے سکردو میں ڈوگرہ فوج اور سکھوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی اور قمراہ میں میجر احسان کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا جاتا رہا۔ اسی دوران ڈوگرہ فوج کی ایک پلاٹون نے عورتوں کے لباس میں چورونگ (ٹوکری) اٹھا کر مویشیوں کو ہانکتے ہوئے ہرگیسہ شق تھنگ سے کشمراہ کی طرف نکلنے کی ایک بار کوشش کی۔ لیکن کھرپوچو سے فائرنگ کے نتیجے میں واپس بھاگ گئی۔ دوسری دفعہ ایک پلاٹون نے کھرپوچو کے دامن کے ساتھ ساتھ چھپ کر آگے بڑھ کر سندوس کی طرف سے کھرپوچو مورچہ تک کا راستہ کاٹنے اور اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو اسے بھی ناکام بنا دیا گیا۔ دشمن کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور اس کی روز افزوں نقل و حرکت کے پیش نظر میجر احسان پر زور ڈالا گیا کہ جلدی سے سکردو پہنچ جائیں۔

فورس کو قمراہ میں روکنے اور کھرپوچو ٹیکری پر مورچہ قائم کرنے کے بعد سکردو کے لوگوں نے 19 فروری 1948ء کو گمبہ سکردو میں راجہ محمد علی شاہ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں آزاد فورس کے دوش بدوش جہاد کے انتظامات مکمل کئے گئے۔ ابتدائی انتظام کے طور پر دوسو رضا کار سپاہیوں کا دستہ مرتب کیا گیا۔ مفت راشن، کپڑے، لکڑی وغیرہ کی فراہمی اور سراغرسانی اور باربرداری کے انتظامات کے لئے ذیلداروں، نمبرداروں اور معززین کی نگرانی میں کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ سول آفیسروں اور دوسرے ملازموں کو بھی ان انتظامات کے سلسلے میں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ اس کام میں مذہبی حلقوں کی نمایندگی گول کے آغا ہادی نے کی۔ کرنل احسان کہتے ہیں:۔

''آغا ہادی گول...... میں انہیں بلتستان کا خمینی کہوں گا۔ لوگوں کو جہاد کی

ترغیب دینا، بھرتی کے لئے تیار کرنا، مجاہدوں کو کھلانے کی ترغیب دینا، یہ سب آغائے گول کی وجہ سے ہوا۔ مذہبی حلقوں سے میرے پاس وہی آئے تھے۔ مجھے خود مجاہد کمانڈر کی حیثیت سے انہوں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں ایک تقریر کی کہ ہمارا جوش وولولہ پھر سے تازہ ہو گیا۔،،

اس طرح فروری کے تیسرے ہفتے تک یہاں کے مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے سارے جہاد پر کمر بستہ ہو چکے تھے۔

پرکشاق پر ڈوگرہ فوج کا خاتمہ

9 فروری کی صبح پرکشاق پر متعین ڈوگرہ فوجیوں نے ایک گھنٹہ تک شدید فائرنگ کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی۔ 10 فروری کو معلوم ہوا کہ وہ مورچے چھوڑ کر پہاڑ کی چوٹیوں کی طرف بھاگ نکلے ہیں۔ 11 فروری کو کچورہ کا ایک جوان ہاتھ میں سفید جھنڈی لے کر ان کی تلاش میں گیا تو دیکھا کہ کرشن سنگھ اور اس کے ساتھی کئی فٹ برف میں بھوکے غاروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ ان سب کو نیچے لایا گیا۔ میجر احسان علی کرشن سنگھ سے واقف تھے اور انہوں نے حکم کیا تھا کہ اسے زندہ ان کے سامنے لایا جائے۔ کرشن سنگھ کا بچپن سکردو میں گزرا تھا۔ اس کا باپ ضلع لداخ بلتستان کا وزیر وزارت رہ چکا تھا جس کے ماتحت وزیر ولایت علی ملازمت کر چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان دوست انسان تھا۔ اس نے بھی اپنے تئیں میجر احسان کے حضور پیش کرنے کی درخواست کی تھی لیکن اسے اور اس کے ساتھیوں کو چنار پڑی پر گولی سے اڑا دیا گیا۔

آزادی شگر

شگر میں بارہ سکھ دکاندار تھے جو کاروبار کے پردے میں لوگوں کا خون چوستے تھے۔ قرض کے بدلے مقروض لوگوں کی زمینوں پر غیر قانونی طور پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس سے ان کے خلاف نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ہندو حکام کی وجہ سے لوگ بے بس تھے۔ اس سلسلے میں 1945ء میں شگر

کے پہلے گاؤں کوتھنگ سے لے کر علاقہ چھورکاہ تک کے لوگوں نے شرگوٹوق کے مقام پر جمع ہوکر راجہ شگر کے ساتھ میٹنگ کی اور سکھوں کو ملک بدر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈوگرہ انتظامیہ کواس کا علم ہوگیا تو اس نے نائب تحصیلدار کو شگر بھیج دیا جس نے لوگوں کو سکھی کھر میں جمع کر کے بہت ڈرایا دھمکایا۔ وزیر وزارت (ڈپٹی کمشنر) نے بھی راجہ کو بلا کر سخت دھمکیاں دیں۔ ان کاروائیوں سے مزید نفرت اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اگست 1947ء میں قیام پاکستان کی خبر پھر کچھ دنوں کے بعد گلگت اور روندو کی آزادی کی خبریں یہاں پہنچ گئیں جس سے امید کی نظریں روندو کی طرف لگ گئیں۔ 11/10 فروری کی درمیانی رات کوموضع کواردو کے حاجی تقی نے آزاد فورس کی آمد اور سکردو چھاؤنی پر حملہ کی خبر دی تو دوسری صبح شگر کے راجہ محمد علی شاہ اور عمائدین نے بارہ سکھ دکانداروں کو ان کے بال بچوں سمیت گوردوارے میں قید کر دیا۔ لیکن 11 فروری کی شام تک سکردو سے بیشمار پناہ گزین شگر پہنچ گئے جنہوں نے آزاد فورس کی پسپائی کی خبر دی تو وہاں سخت افراتفری پھیل گئی۔ ان گرفتاریوں کی وجہ سے ڈوگروں سے مزید رابطہ کی گنجائش بھی باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ آٹھ خاندانی وزیروں کو ساتھ لے کر راجہ محمد علی شاہ قمراہ میں میجر احسان علی کے پاس پہنچ گئے جو اس وقت روندو کی طرف واپس جارہے تھے۔ اس وقت ان کے پاس اور بھی بلتی وفود پہنچ چکے تھے۔ ان کے اصرار پر انہوں نے جمعدار اسماعیل (عرف جانان) کے ساتھ ایک پلاٹون کو شگر روانہ کر دیا جس نے 12 فروری کو شگر میں پاکستان کا پرچم لہرادیا۔ قیدی سکھوں میں سے پانچ کو قتل کر ڈالا گیا۔ بعد میں سپاہی سرفراز خان، سپاہی غیاث الدین اور کوتھنگ کے شمشیر نے مقروض لوگوں کے اصرار پر باقی سکھوں کو بھی ان کی عورتوں اور بچوں سمیت قتل کر ڈالا۔ صرف دو لڑکیاں زندہ چھوڑ دی گئیں جن سے سرفراز خان اور غیاث الدین نے شادی کر لی۔ اس کے بعد سکھوں کی جائیدادوں کو لوٹا گیا۔ شگر کے راجہ نے آزاد فورس کی مدد کے لئے رضا کاروں کا ایک دستہ مرتب کیا جن میں سے اکثر جوان جنگ کے اختتام تک شریک رہے۔ اس کے علاوہ گھوڑے، بھیڑ بکریاں، آٹا، گھی، نمک، پکا ہوا کھانا، پبو (پاپوش) کمبل وغیرہ کی فراہمی کا بھی بندوبست کرلیا۔ یہ سلسلہ جنگ بندی تک جاری رہا۔

سکردو چھاؤنی کا دوسرا محاصرہ

میجر احسان علی نے تین ہفتوں تک اپنا ہیڈ کوارٹر قمراہ میں رکھا۔ اس دوران میں گلگت سے پینتالیس تھری ناٹ تھری رائفلیں بمعہ ساٹھ ہزار رونڈ، چھ ایل ایم جی اور چار ٹو انچ مارٹر گنیں پہنچ گئیں۔ تحصیلدار حکیم محمد لطیف کے بال بچے سکردو قصبہ میں رہ گئے تھے۔ انہیں نکال لانے کے لئے 12 فروری کو صوبیدار محمد ایوب کو ایک پلاٹون کے ساتھ سرفہ رنگا اور نر کے راستے بھیج دیا۔ یہ پلاٹون اپنے مشن کی تکمیل کے بعد قمراہ واپس ہوگئی۔ فروری کے آخری ہفتے میں کھر پوچو پر لقپہ چن (ڈونگس کھر) کے پہلو سے توڑ کر راستہ نکالا گیا اور کھر پوچو قلعہ کے بالکل اوپر کھر ڈونگس پر ایک برین گن اور ایک 2 انچ مارٹر نصب کر دیا گیا۔ دو سیکشن فوج صبح قمراہ سے آتی اور شام کو واپس چلی جاتی تھی۔ قمراہ میں قیام کے دوران بابر خان نے روندو کے راجہ محمد علی خان کو ایک خط لکھا جس کا متن حسب ذیل ہے:

''ڈیئر راجہ محمد علی خان صاحب۔ السلام علیکم! یہاں پر خیریت ہے۔ جنگ کی حالت یہ ہے کہ 4 جوان شہید ہوئے ہیں۔ ان کے ساٹھ نفر سے اوپر واصل جہنم ہوئے ہیں۔ روزانہ رات کو ان پر ہماری پٹرول حملہ کر رہی ہے۔ شگر کے سکھوں کو قتل کر دیا ہے۔ سکوٹس جا کر دو کانوں پر قبضہ کیا ہے۔ راجہ صاحب شگر کے حوالے کئے ہیں۔ گول میں آگے بھی پیچھے بھی راستہ کاٹا ہے۔ کمک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم دوبارہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگلی دفعہ میجر محمد خان سکوٹوں کو چھوڑ کر بھاگنے کی وجہ سے ایسی گڑ بڑ ہوگئی تھی۔ میں راستے میں تھا۔ میجر احسان علی اور صوبیدار جان عالم کے ساتھ دو سیکشن سکوٹس کو چھوڑ کر بھاگ کر آ رہے تھے۔ بچے ہوئے نفریوں کو یہاں روک کر دوبارہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ فکر مت کریں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ دعا کریں۔ آپ ایک کام کریں۔ اپنے علاقے میں سے ہتھیار بند یعنی دیسی بندوق، کلہاڑیاں، تلوار، ڈنڈے وغیرہ

لے کر جان فروشوں کا ایک لشکر مشتمل پانچسو نفر فوراً روانہ کر دیں۔ان کے آنے پر حملہ کریں گے۔اپنی راشن کا خود بندوبست کریں۔فقط آپ کا بھائی لیفٹنٹ بابر فورتھ گلگت فورس حال قمراہ 48-2-14،،

چنانچہ فروری کے آخری ہفتے میں میجر احسان علی نے سکردو کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ 25 فروری کو بابر خان نے فوج سمیت دریا پار کر کے سندوس کو ہیڈ کوارٹر بنالیا اور نیورانگا، خلنگ رانگا، نیانیور اور شوشوپی چنار کے اطراف میں مورچے قائم کر لئے۔دوسرے روز کیپٹن محمد خان ایک پلاٹون اور چند رضا کاروں کے ساتھ حسین آباد (کھیپ چونگ) پہنچ گئے۔ادھر کاچو امیر بیگ کے گھر کو ہیڈ کوارٹر بنایا اور آگے بڑھ کر موضع اولڈ ینگ میں مورچے قائم کر لئے۔اب سکردو چھاونی مشرق، مغرب اور جنوب کی طرف سے محصور ہو چکی تھی۔لیکن شمال میں دریائے سندھ کی طرف کھلی تھی۔اتنے میں محمد حسن نیانیور کے ذریعے معلوم ہوا کہ ڈوگرہ فوج برق کرو پر مورچہ قائم کرنے والی ہے تو سرفہ رانگا میں ایک سیکشن پوسٹ قائم کر دی گئی۔کھر ڈونکس پر پہلے ہی سے مورچہ قائم تھا۔اس کے ساتھ ہی چھاونی چاروں طرف سے محصور ہوگئی۔

آزاد فورس کی سکردو میں دوبارہ آمد کے ساتھ ہی سراغرسانی کا کام مقامی رضا کاروں نے سنبھال لیا تھا اور اس وقت کرگل اور دراس سے سکردو تک خبر رسانی کا ایک مستقل سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ادھر میجر احسان علی چھاؤنی کا محاصرہ روز بروز تنگ کرتے ہوئے اسے فتح کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔اسی دوران سراغرسانوں نے انہیں اطلاع دی کہ بریگیڈیئر فقیر سنگھ کے ساتھ مزید ڈوگرہ فوج کرگل سے سکردو کی طرف روانہ ہوگئی ہے۔

واضح رہے کہ سکردو چھاؤنی کے دوسرے محاصرے تک بلتستان بھر میں جدوجہد آزادی کی تحریک منظم ہو چکی تھی۔آزاد فورس کے دوش بدوش جہاد لڑنے کے لئے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔اس مقصد کے لئے بستی بستی کمیٹیاں وجود میں آ چکی تھیں جن کے اراکین ہزاروں دیگر سر بازوں کے ساتھ والہانہ طور پر آزادی کی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔چنانچہ نجف علی کے ساتھ جو شیلے رضا کاروں کا ایک دستہ جو گوریلا پلاٹون نمبرون کہلاتا تھا جب کرگل کی طرف

سراغرسانی پر مامور ہوا تو کرگل کے حسنو، بلارگو کے راجہ صاحب، اولڈ ینگ کے اخوند فدا، باغیچہ کے غلام علی، طولتی کے مرحوم راجہ مہدی علی خان، کمنگو کے حسین، غاسنگ کے مرحوم آغا سید محمد اور مہدی آباد کے مرحوم حاجی غلام حسین نے قابل ذکر طور پر اس مہم میں حصہ لیا۔ انہی سراغرسانوں کے ذریعے فقیر سنگھ اور اس کی فوج کی روانگی کی اطلاع موصول ہو گئی۔

تھورگو پڑی پر ایمبش (AMBUSH)

بریگیڈیئر فقیر سنگھ کے ساتھ اس کا انڈین مشیر میجر کوٹس اور 350 فوجی تھے جن کے ساتھ اسلحہ، ایمونیشن، راشن، وردی اور دیگر ضروریات کا بڑا ذخیرہ تھا۔ جن کی باربرداری کے لئے چھ سو قلی اور دو سو گھوڑے بھی ساتھ تھے۔ یہ کمک سکردو پہنچ جاتی تو مجاہدین کے لئے دو طرفہ مقابلہ مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا میجر احسان علی نے راستہ ہی میں گھات لگا کر اسے تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لئے سکردو سے 19 کلومیٹر مشرق میں تھورگو پڑی کو منتخب کیا گیا جہاں پر وادی کے تنگ ہونے کے باعث دریائے سندھ کے بائیں پہلو پر واقع اونچے پہاڑ کی کمر سے راستہ گزرتا تھا جس پر سے ایک وقت میں ایک گھوڑا بوجھ اٹھائے گزر سکتا تھا۔ پڑی کے بالمقابل دریا کے دوسرے پہلو پر ایک اونچی پہاڑی اور ساتھ ہی نربوچونگ کا گاؤں واقع ہے۔ اگرچہ رضا کاروں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن مال غنیمت میں جتنا اسلحہ ملتا اس حساب سے انہیں سپاہی بنایا جا رہا تھا۔ اس طرح اب تک صرف چند ایک رضا کاروں کو رائفلیں مل چکی تھیں۔ چنانچہ سکردو کے محاصرین میں سے ایک سو جوانوں کو چن لیا گیا اور کیپٹن نیک عالم کو ایک پلاٹون کے ہمراہ گونگمہ تھورگو پڑی کی طرف اور کیپٹن محمد خان اور لیفٹننٹ محمد علی کو دو پلاٹونوں کے ساتھ دریا پار نربوچونگ کی طرف ایمبش کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ نیک عالم نے پڑی پر ایک کلومیٹر لمبائی میں خفیہ مورچے قائم کئے۔ نگر کے شاہ سلطان کو ایک پلاٹون کے ساتھ ان میں متعین کیا۔ ایک مشین گن سیکشن کو پڑی کے آخری کنارہ پر اور رضا کاروں کے ایک دستے کو پہاڑ کے اوپر پتھر لڑھکانے کے لئے متعین کر دیا۔ دوسری طرف کیپٹن محمد خان کے ساتھ ایک مارٹر سیکشن اور ایک مشین گن سیکشن بھی تھی۔ انہیں پڑی کے بالمقابل پوزیشنوں میں

بٹھادیا گیااور باقی دستوں کو وہاں سے دوکلومیٹرلمبائی میں نربوچونگ کی طرف کے مورچوں میں پھیلادیا۔16 مارچ 1948ء کوایمبش کرنے کا کام مکمل ہوگیااور دشمن فوج کا انتظار کیا جانے لگا۔ چونکہ پورا علاقہ ڈوگروں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اس لئے دشمن کے متعلق ہر تفصیل مجاہدین کو پہنچائی جاتی تھی۔ جبکہ دشمن گردوپیش کے حالات سے بے خبر تھے۔ بریگیڈیئر فقیر سنگھ جومہاراجہ ہری سنگھ کا معتمد خاص اور تجربہ کار فوجی آفیسر تھا،فوج کے آگے پٹرولینگ پارٹیاں بھیجتا اور او۔کے (O-K) رپورٹ ملنے پر پڑاؤ پر پڑاؤ آگے بڑھتا آرہا تھا۔ 17مارچ کو دن کے گیارہ بجے آگے ہراول دستہ اس کے پیچھے فقیر سنگھ اور کوٹس گھوڑوں پر سوار اور ان کے عقب میں فوج، قلی، گھوڑے بالترتیب تھورگو پڑی کے پہلو میں واقع میدان میں آپہنچے۔ دوربینوں سے ادھر ادھر دیکھ کر تسلی کی اور دوپہر کے کھانے کے لئے وہیں پر بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ہراول دستے (ایڈوانس گارڈ) کے تیس فوجی آگے اور باقی فوج سابقہ ترتیب میں چلنے لگی۔ ہراول دستے کا پہلا سپاہی پڑی کے آخری کنارے پر نصب مشین گن کے دہانے پر پہنچا تو اس وقت ہراول دستے کے دوسرے فوجیوں کے علاوہ فوج کا ایک حصہ بھی پڑی کے پیچ در پیچ راستوں میں سے گزرنے لگا تھا اور باقی فوج پڑی کے قریب میدان سے اور قلی اور گھوڑے ان کے پیچھے آرہے تھے اس طرح دشمن مکمل طور پر فائرنگ زون میں پہنچ گئے تو پڑی کی طرف سے ان پر شدید فائرنگ کی گئی۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی دشمن پر بڑے بڑے پتھر لڑھکائے گئے۔ دشمن فوج کی توجہ ابھی پڑی کی طرف ہی مرکوز تھی کہ دریا کے پار سے اس پر فائرنگ کھولی گئی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ دشمن پر اب قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے فوجی گھبراہٹ کے عالم میں دریا میں کود گئے۔ بہت سارے مارے گئے۔ بعض نے پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ شروع کی اور باقی میدان میں ہی گر پڑے۔ اس افراتفری میں سارے قلی اور گھوڑے بھاگ نکلے۔ اسی حالت میں شام ہوگئی۔ اتفاق سے موسم سخت خراب ہوگیا اور رات کو برف پڑی۔ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر دشمن کی بچی کھچی فوج بھی بھاگ نکلی۔ صبح ہوئی تو دیکھا کہ اٹھارہ زخمی درجنوں لاشوں کے درمیان پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ راشن، وردی، اسلحہ اور ایمونیشن کا بڑا ذخیرہ پڑا ملا جس میں تین انچ مارٹر، دو انچ مارٹر، ایم ایم

جی، رائفلوں، برین گنوں، سٹین گنوں اور گرینڈ وغیرہ کے علاوہ تھری ناٹ تھری کے چھتر ہزار رونڈ اور بیس وائرلیس سیٹ بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پوری فوج میں سے صرف ایک سو پینتیس (135) افراد زندہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے جن میں فقیر سنگھ اور کوٹس بھی تھے۔ فقیر سنگھ کی ناک پر گولی لگی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ 21 مارچ کو کرگل واپس پہنچا جہاں سے چارج میجر کوٹس کو دے کر سیدھا دہلی چلا گیا جہاں سے اسے قبل از وقت ریٹائرمنٹ پر بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھی فراریوں میں سے بہت سوں کو سرمیک، مہدی آباد (پرکوتہ) اور طولتی کے باشندوں نے ہلاک کر کے ہتھیار رضا کاروں کے سپرد کئے۔ نائب صوبیدار اسماعیل نے ایک پلاٹون کے ساتھ چرکتی تک دشمن کا تعاقب کیا لیکن خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ کرنل تھاپا کو سری نگر سے اطلاع ملی تھی کہ بریگیڈیئر فقیر سنگھ 18 مارچ کو سکردو پہنچنے والا ہے۔ فقیر سنگھ ایک روز پہلے پہنچ کر تباہی سے دوچار ہو گیا۔ 18 مارچ کو کرنل تھاپا نے لیفٹننٹ اجیت سنگھ کے ساتھ دو پلاٹونیں تھورگو کی طرف فقیر سنگھ کے استقبال کے لئے بھیجیں۔ یہ پلاٹونیں مجاہدین کے نرغے سے بمشکل بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئیں۔ یاد رہے کہ 17 مارچ کو جب تھورگو پڑی پر کارروائی ہو رہی تھی اس وقت سکردو چھاؤنی کے محصورین کو مصروف رکھنے کے لئے ان پر بھی زوردار حملہ کیا گیا۔ فقیر سنگھ کی تباہی کی خبر سے سکردو میں محصورین سخت پریشان ہو گئے۔ لیکن ان کے پاس ابھی سامان کا بڑا ذخیرہ موجود تھا اس لئے ہتھیار ڈالنے سے گریز کرتے رہے۔ دشمن کی تباہی پر مجاہدین کے ہیڈکوارٹروں سندوس اور حسین آباد میں خوشیاں منائی گئیں۔

تھورگو پڑی کی شاندار فتح نے ایک طرف مجاہدین کے حوصلے بڑھا دیئے اور دوسری طرف ہتھیاروں اور دیگر ضروریات کا بڑا ذخیرہ ہاتھ لگا جس نے مجاہدین کی مشکلات کو جزوی طور پر حل کر دیا۔ چنانچہ میجر احسان علی نے مقامی رضا کاروں کو فوج میں بھرتی کر کے آئی بیکس کالم (IBEX COLUMN) کی تعداد کو حسب ہدایت پورا کر دیا اور سکردو چھاؤنی کو فتح کرنے کے لئے باقاعدہ حملے کا پروگرام بنالیا۔ 24 مارچ کی رات کو حملے کے لئے وقت متعین کر دیا گیا اور مختلف دستوں کو ٹاسک (TASK) دے دیئے گئے۔ پرتاب گڑھ (موجودہ گرلز ہائی سکول) رنبیر گڑھ (موجودہ حمید گڑھ کچہری) اور ان کے درمیانی علاقوں پر قبضہ کرنے کا کام کیپٹن محمد خان کو سونپا گیا۔ کیپٹن نیک

عالم کی پلاٹون کومیندوق کھر کے اطراف پر قبضہ کرنے کا ٹاسک ملا اور پہلے مرحلے پر امامباڑہ کلاں ،راجہ کے محل اوران کے اردگرد کے راستوں پر قبضہ کرنا اور پھراس کے بعد مندر، پرانے قلعہ اور مسجد پر قبضہ کرنا بابر خان کے ٹاسک میں شامل تھا۔ چنانچہ رات کے گیارہ بجے باقاعدہ حملہ شروع ہوا۔ مجاہدین ہرطرف سے چھاؤنی کی طرف بڑھنے لگے۔میجر احسان علی نے شیخ علی (گنگوپی) کے گھر میں اپنا عارضی ہیڈکوارٹر قائم کیا۔شدید حملوں میں دشمن کے بہت سے مورچے مجاہدین کے ہاتھ آ گئے ۔سکمیدان، گنگوپی اور پرتاب گڑھ پر سرنگیں کھودتے ہوئے مجاہدین دشمن کے مورچوں تک پہنچ گئے ۔ 27 مارچ کو نیک عالم کی پلاٹون نے امامباڑہ کلاں اوراس کے اردگرد علاقے پر قبضہ کرلیا جس کے دوران لوئر ہائی سکول سکردو کا ایک ٹیچر غلام رضا شہید ہو گیا۔اسی روز محمد خان کی پلاٹون نے پرتاب گڑھ اور رنبیر گڑھ کے درمیانی علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بابر خان کے ساتھیوں نے راجہ سکردو کے محل اور مندر کے قرب و جوار پر قبضہ کرلیا۔اب دشمن کے باقاعدہ مورچے راجہ کے محل، مندر، ابولی ٹوق، سکول، برباد قلعہ اور کھر پوچو قلعہ پر تھے۔مجاہدین نے ان کے بالمقابل شیخ علی گنگوپی کے گھر، مندر سے پچیس (25) میٹر کے فاصلے پر، کھلہ ٹوق، رنبیر گڑھ اور برباد قلعہ کے بالمقابل مورچے قائم کر لئے ۔کھر ڈونکس کا مورچہ بھی حسب سابق قائم تھا۔طرفین میں فائرنگ کا سخت تبادلہ ہوتا رہا۔لیکن دشمن طویل محاصرہ کی تیاری کر چکے تھے اس لئے شدید حملوں کے باوجود مجاہدین ان مورچوں سے آگے نہ بڑھ سکے اور 14 اگست 1948ء تک یہی صورت حال قائم رہی۔مجاہدین کے پاس بڑے ہتھیار نہ تھے تاہم میجر احسان علی چھاؤنی کو فتح کرنے پر تلے ہوئے تھے۔لیکن اسی دوران انہیں خبر ملی کہ کرگل کرطرف سے دشمن کی کمک آ رہی ہے۔

مہدی آباد میں لڑائی

میجر احسان علی نے رضا کاروں کے ایک دستے کو کرگل کی طرف مخبری کے لئے روانہ کیا تھا۔جس نے حاجی مہدی (کورو) کے ذریعے انہیں اطلاع دی کہ دشمن کی زیڈ (Z) بریگیڈ کرگل میں جمع ہو رہی ہے جس کی دو بٹالین فوج عنقریب سکردو کی جانب روانہ ہونے والی ہے۔اس

وقت کرنل کرپال سنگھ 7- کشمیر لائٹ انفنٹری بٹالین کے ساتھ کرگل سے روانہ ہو چکا تھا۔ جبکہ کرنل سمپورن بچن سنگھ 5۔ کشمیر لائٹ انفنٹری بٹالین کے ساتھ تیاریوں میں مصروف تھا۔ چنانچہ میجر احسان نے اس فوج کو بھی ایمبش کے ذریعے تباہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے سکردو سے 45 کلومیٹر پر واقع موضع سرمیک کو منتخب کیا جو منگل باغ اور چرکتی کی دو گھاٹیوں کے درمیان تقریباً سات کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ منگل باغ کے قریب وادی ایک گھاٹی کی شکل اختیار کرتی ہے اور تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر چرکتی پر اس کی پھر یہی صورت بنتی ہے۔ ان دونوں گھاٹیوں کے درمیان دریائے سندھ کے بائیں کنارے سرمیک کا خوبصورت گاؤں اور دائیں جانب پہاڑ کی سنسان ڈھلوان واقع ہے۔ چنانچہ سکردو کے محاصرین میں سے دو سو نفر کو منتخب کر کے کیپٹن محمد خان اور کیپٹن نیک عالم کے ساتھ اس جگہ ایمبش لگانے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ محمد خان نے چرکتی پڑی کے بالمقابل ہوتو نگ چن میدان (دریا برد) کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور فوج کے ایک حصے کو نائب صوبیدار اسماعیل کے ساتھ منگل باغ اور سرمیک کی طرف اور دوسرے حصے کو اس کے بالمقابل دریا پار مورچوں میں متعین کر دیا۔ ایمبش لگانے کے کام کو مکمل کرنے کے بعد دشمن کا انتظار شروع ہوا۔

فقیر سنگھ کی تباہی کا نقشہ کرپال سنگھ کے سامنے تھا۔ لہذا وہ نہایت احتیاط سے دریا کے دونوں اطراف سے پٹرولینگ پارٹیاں بھیجتا اور اس کے بعد نصف پڑاؤ روزانہ چلتا ہوا 7 اپریل 1948ء کو مہدی آباد پہنچ گیا۔ 8 اپریل کو پٹرولینگ پارٹی سرمیک تک آئی اور واپس جا کر او۔کے (OK) رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ 9 اپریل کو ایڈوانس گارڈ کی دو کمپنیاں آگے روانہ ہوگئیں۔ تقریباً نصف کلومیٹر پیچھے فوج کے دستے بھی سرمیک کی طرف روانہ ہوگئے۔ فوج کا پچھلا حصہ ابھی مشکل سے مہدی آباد سے چلنے لگا تھا کہ ایڈوانس گارڈ کی دونوں کمپنیاں فائرنگ زون میں مجاہدین کی پہلی پلاٹون کے سامنے پہنچ گئیں۔ مجاہدین کو ایمبش لگائے ہوئے کئی دن ہوئے تھے اس لئے پار دریا سے مورچوں تک پانی لے جانے کے راستے نمایاں ہو چکے تھے۔ ایڈوانس گارڈ کو اس قسم کے ایک راستے پر شک ہوگیا۔ چنانچہ اس کا ایک سپاہی اس راستہ سے سیدھا چلا تو مجاہدین کے ایک

مورچے پر جا پہنچا۔ مورچے سے فائر کیا گیا تو دریا پار کے سارے مورچوں سے فائرنگ شروع ہوئی۔ دشمن فوج پتھروں اور دیواروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ میں مصروف ہوگئی۔ اتنے میں پشت کی جانب سے مجاہدین نے اس پر گولیاں برسائیں تو وہ پیچھے کی طرف بھاگ گئی۔ بعض مارے گئے۔ تین قیدی ہاتھ آگئے اور دو ایل ایم جی اور بیس (20) رائفلیں غنیمت میں ملیں۔ اس کاروائی میں دو مجاہد شہید ہو گئے۔

اب دشمن فوج نے آگے بڑھنا چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ کر مہدی آباد کو ہیڈ کوارٹر بنالیا اور دریا کے دونوں اطراف میں پنداہ، ڈوقبر، بوت بلنگس، مریم تھنگ، سرلینگ اور بیڈونگ کے اوپر ٹیکریوں پر مورچے قائم کر لئے۔ اب ایک دوسرے پر شدید حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دشمن نے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا عزم کر لیا تھا لیکن اس سرزمین کا ہر فرد اپنے وسائل کے مطابق جہاد میں شریک تھا۔ اس لئے اس کے شدید سے شدید حملے بھی کارگر نہ ہو سکے۔ کیپٹن نیک عالم مہدی آباد کی طرف اور کیپٹن محمد خان پنداہ کی طرف مصروف پیکار تھے۔ اسی دوران سخت گولہ باری کی وجہ سے پنداہ کی طرف کی سب سے اونچی ٹیکری دشمن کے قبضے میں چلی گئی۔ دشمن کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو محمد خان نے سکردو میں میجر احسان کو سگنل پر سگنل دے دیئے کہ حالات بے قابو ہو رہے ہیں۔ مزید یہ کہ دشمن کی ایک اور بٹالین فوج مہدی آباد پہنچ رہی ہے اس لئے وہ خود پہنچ جائیں۔ چنانچہ میجر احسان علی نے سکردو چھاؤنی کا محاصرہ لیفٹننٹ بابر خان اور رضا کاروں کے ایک دستے کے سپرد کیا اور خود باقی فوج کو ساتھ لے کر 29 اپریل کو مہدی آباد جا پہنچے اور دشمن پر باقاعدہ حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک پلاٹون کے ساتھ صوبیدار دوست محمد کو پنداہ کی طرف کھوئی ہوئی ٹیکری پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے بھیجا گیا جس نے چرکتی سے گھوم کر غواڑی کی طرف سے دشمن پر حملہ کر کے اس ٹیکری پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

دشمن کا رئیر (REAR) اب تک کھلا تھا اور کرنل سمپورن بچن سنگھ کے ساتھ ایک بٹالین فوج اس وقت طولتی پہنچ رہی تھی جس کا ایک حصہ 8 مئی کو مہدی آباد پہنچ چکا تھا۔ میجر احسان علی نے اس کمک فوج کو کمنگو ستغو اور سیرمون کے درمیان ایمبش کر کے تباہ کرنے کا پلان بنایا۔ صوبیدار شیر

احمد کے ساتھ ایک پلاٹون کو سیر مون کی طرف اور ایک دستہ فوج کو حوالدار میجر محمد خان کے ساتھ اس کے بالمقابل دریا پار متعین کر دیا۔10 مئی کو دن کے گیارہ بجے کرنل سمپورن سنگھ کے ساتھی ڈیڑھ سو فوجی فائرنگ زون میں پہنچ گئے تو دریا پار کے مورچوں سے مجاہدین نے فائر کھول دیا۔ دشمن فوج نے بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ شروع کی تو عقب سے سیر مون پر متعین پلاٹون نے گولیاں برسائیں۔ دشمن کی فوج مکمل طور پر نرغے میں تھی اس کے بارہ نفر ہلاک ہو گئے۔ باقی فوج نے کمنگو گونڈ اور کھری منڈیانگ میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ مجاہدین نے آگے بڑھ کر سخت حملہ کر دیا۔ ایک دن اور رات کے مقابلے کے بعد کرنل سمپورن سنگھ فوج سمیت وہاں سے مورول کے راستے لداخ کی طرف بھاگ نکلا۔ تیتہ دوتک اس کا تعاقب کیا گیا۔

اسی دوران دشمن کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر میجر احسان نے نائب صوبیدار وزیر شیر احمد کے ساتھ رضا کاروں کی ایک پلاٹون کو چلو کے راستے نوبراہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اتنے میں وائرلیس پر فتح کرگل کی خبر موصول ہوئی۔ دشمن پر شدید حملوں کا آغاز کیا جا چکا تھا۔15 مئی کو دو ایم ایم جی اور تھری انچ مارٹر کے کورینگ فائر میں آگے بڑھ کر مجاہدین نے دشمن کے چند مورچوں پر قبضہ کر لیا۔16 مئی کو دشمن کو اگلے مورچوں سے بھگایا گیا۔ کرنل کرپال سنگھ کو بھی اسی دوران فتح کرگل کی خبر مل چکی تھی۔ اس کے لئے بھاگنے کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور صرف جھولہ پل کھرمنگ کے پار حمزی گونڈ اور مورول کے راستے لیہ تک رسائی کا امکان باقی تھا۔ چنانچہ 16 مئی کا پورا دن اور آدھی رات اندھا دھند فائرنگ کے بعد 17/16 مئی کی درمیانی رات کو ڈوگرہ فوج مہدی آباد سے بھاگ نکلی۔17 مئی کو مہدی آباد کے باشندے جو عرصہ دراز سے گھروں سے بھاگے ہوئے تھے فوج کے جوانوں کے ساتھ مہدی آباد میں داخل ہو گئے۔ اسی روز مہدی آباد کے پار پنداہ کی طرف بھی دشمن کا صفایا کیا گیا۔

پوریگ (کرگل) کی آزادی

سرینگر۔ سکردو شاہراہ پر میجر احسان علی دشمن سے مصروف پیکار تھے۔ ادھر گرمیوں کا

موسم آ رہا تھا جس کے ساتھ سرینگر سے بلتستان اور گلگت کی طرف اور بھی راستے کھلنے والے تھے۔ان حالات کے پیش نظر کرنل اسلم (علامتی نام کرنل پاشا) نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر استور میں چلم کے مقام پر منتقل کر دیا جہاں صوبیدار (بعد میں میجر) غلام مرتضٰی ایک پلاٹون کے ساتھ پہلے سے ہی موجود تھا۔اس وقت دشمن کی زیڈ (Z) بریگیڈ کرگل میں جمع ہو رہی تھی جس کی ایک بٹالین پوریگ اور لداخ میں پھیلی ہوئی تھی اور دو بٹالینیں سکردو کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ بھارتی فوج زوجی لہ کے راستے اس طرف پوری طاقت کے ساتھ حملہ کرنے والی تھی۔میجر احسان علی (علامتی نام کرنل مختار) نے کرنل پاشا کو صورت حال سے مطلع کیا تو انہوں نے دشمن کی توجہ کو بلتستان سے ہٹانے کے لئے گلگت سکاؤٹس کے بی ونگ کو جو چار سو جوانوں پر مشتمل تھا ٹائیگر فورس کا علامتی نام دے کر کیپٹن حسن خان کی سرکردگی میں بانڈی پورہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ بانڈی پورہ چلم سے ایک سوتیس (130) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔گریز کی ساری آبادی مسلمان ہے۔اس وقت بانڈی پورہ میں ایک بریگیڈ ڈوگرہ فوج موجود تھی۔اپریل کے دوسرے ہفتے میں ٹائیگر فورس چھوٹے چھوٹے دستوں کی صورت میں برزل ٹاپ عبور کر کے منی مرگ میں جمع ہوگئی۔ برزل پر اس وقت پندرہ فٹ برف تھی۔کیپٹن حسن خان نے بانڈی پورہ پر حملہ کر دیا تو غنیم کے لشکر نے ہوائی جہازوں ،توپوں اور ٹینکوں کی مدد سے جوابی حملہ کر دیا۔دشمن کے حملوں کی شدت نے ٹائیگر فورس کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔لہٰذا اس نے پیچھے ہٹ کر گریز میں ڈیفنس قائم کر لی۔

اس کاروائی سے دشمن کی توجہ کو بلتستان سے ہٹانے کا مقصد کچھ حد تک پورا ہو گیا۔ تاہم اس طرف اس کی کافی طاقت جمع ہو چکی تھی اور اس وقت اس کی سپلائی لائن دراس سے مہدی آباد تک پھیلی ہوئی تھی۔گلگت سکاؤٹس کا سی ونگ لیفٹنٹ شاہ خان کے ساتھ اب تک ریزرو میں رکھا گیا تھا۔کرنل پاشا نے اسے اسکیمو فورس کا علامتی نام دے کر سطح مرتفع دیوسائی کے راستے دراس اور کرگل میں دشمن کی سپلائی لائن پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔چلم سے گلتری ساٹھ میل کا فاصلہ ہے جن کے درمیان 13000 فٹ بلند سطح مرتفع دیوسائی واقع ہے۔دیوسائی میں اس وقت بارہ سے

پندرہ فٹ کے درمیان برف موجود تھی۔ چنانچہ لیفٹننٹ شاہ خان 27 اپریل کو چلم پہنچے اور قلیوں کے بندوبست اور دیگر انتظامات کی تکمیل کے بعد چلم سے روانہ ہو گئے۔ اسکمیو فورس میں قلیوں سمیت چار سو پچاس (450) نفر تھے جنھوں نے تین برابر دستوں میں 28 اور 29 اپریل کو برزل کو عبور کیا۔ دیوسائی سے ایک ساتھ چل کر یکم مئی کو پوری فوج گلتری پہنچ گئی۔ گلتری میں اس وقت چار فٹ برف تھی۔ یہ ایک خطرناک مہم تھی۔ اس علاقے کی تاریخ میں پہلی بار کسی انسان نے اپریل میں دیوسائی کو عبور کیا تھا۔ سردی شدت کی تھی۔ سردی سے بچاؤ کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ قلیوں کی کمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا اور سردی کی وجہ سے ایک تندرست قلی چالیس پونڈ سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ قلیوں کا اپنا سامان بھی ہوتا تھا۔ اس طرف سے آسان راستہ موجود نہ تھا۔ خطرناک چڑھائیاں اور برف سے ڈھکی ہوئی خوفناک پھسلنیں قدم قدم پر درپیش تھیں۔ الغرض گلتری میں تین روز آرام کرنے کے بعد اسکیموفورس 4 مئی کو فرنساٹ اور دوسرے روز کونز پہنچ گئی۔ اب یہ فورس دشمن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ کونز سے دشمن پر حملے کے منصوبے کو آخری شکل دی گئی۔ ڈی کمپنی کے ساتھ صوبیدار شیر علی کو وہاں سے بیس میل کے فاصلہ پر دراس چھاؤنی کی طرف، اے کمپنی کے ساتھ صوبیدار صفی اللہ بیگ کو کھرول پل کی طرف اور سی کمپنی کے ساتھ صوبیدار غلام مرتضیٰ کو پہلے چولی سکمبو اور پھر کرگل کی طرف جانے کا حکم دے دیا گیا۔ 7 مئی کو تینوں کمپنیاں کونز سے مختلف سمتوں کو روانہ ہوگئیں۔ 10 مئی کی صبح چھ بجے کا وقت دراس چھاؤنی، کھرول پل اور کرگل پر ایک ساتھ حملے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ 10/9 مئی کی درمیانی رات تینوں دستے اپنی منزلوں پر پہنچ گئے۔ ان کے درمیان وائرلیس پر رابطہ قائم تھا۔ صوبیدار شیر علی نے 10/9 مئی کی درمیانی رات دراس چھاؤنی کا محاصرہ کر لیا اور وہ دشمن پر بے خبری میں حملہ کرنے والا ہی تھا کہ رضا کار ساتھیوں میں سے استور کے مولوی عبدالمنان نے اسے سمجھایا کہ شبخون مارنا اسلامی اصول جنگ کے خلاف ہے۔ اس بات سے متاثر ہو کر اس نے چھاؤنی میں ایلچی بھیج دیا کہ چھاؤنی محصور ہو چکی ہے لہٰذا ڈوگرہ بھارتی فوجی ہتھیار ڈال دیں۔ اس پیغام کے جواب میں دشمن نے شدید فائرنگ شروع کر دی۔ مجاہدین نے سخت حملہ کر دیا لیکن چھاؤنی فتح نہ ہو سکی۔ دراس چھاؤنی کے

محاصرہ کے وقت شیر علی نے زوجی لہ اور میچھوئی سے ممکنہ کمک کو روکنے کے لئے نائب صوبیدار امین کے ساتھ بیس سپاہیوں کو پندراس کی گھاٹی پر گھات میں بٹھایا تھا۔ جب چھاؤنی پر حملہ ہوا تو دراس سے میچھوئی سگنل کے ذریعے اس کی اطلاع دی گئی۔ چنانچہ میچھوئی سے ایک کمپنی ڈوگرہ فوج دراس کے محصورین کی مدد کے لئے روانہ ہوگئی۔ ایمبش سے بے خبر یہ کمپنی 11/10 مئی کی درمیانی رات پندراس کی گھاٹی پر پہنچی تو مجاہدین نے اس پر ایسا شدید حملہ کر دیا کہ اس کے ساٹھ فوجی ہلاک اور ساٹھ گرفتار ہوگئے۔ کافی فوجی سامان بھی ہاتھ آ گیا۔

ادھر صوبیدار صفی اللہ بیگ نے حسب پروگرام 10/9 مئی کی درمیانی رات کو کھرول پل پر پوزیشن لی۔ اتنے میں زیڈ بریگیڈ کی ایک کمپنی اولڈ ینگ کی طرف سے کرگل جانے کے لئے ادھر آ پہنچی۔ مجاہدین نے اس پر فائرنگ کی تو یہ واپس اولڈ ینگ کی طرف بھاگ نکلی۔ 11 مئی کو کھرول پل پر صفی اللہ بیگ کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد مفرور کمپنی کے تعاقب میں صفی اللہ بیگ براہ اولڈ ینگ مورول پہنچا۔ اس وقت کرنل سمپورن سنگھ اور میجر کوٹس کی کمپنی مورول سے مشکوں کی کشتی کے ذریعے دریا عبور کر رہی تھی۔ مجاہدین نے اس پر حملہ کر دیا۔ دشمن کے تیس فوجی ہلاک ہو گئے اور ایک صوبیدار، ایک جمعدار اور چوبیس (24) سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن سمپورن سنگھ اور میجر کوٹس ایک سو پچاس فوجیوں کے ساتھ اس سے پہلے ہی دریا عبور کر کے لیہ کی طرف بھاگ چکے تھے۔ میجر کوٹس اس سے قبل فقیر سنگھ کے ساتھ بھی بھاگ چکا تھا۔ 13 مئی کو سمپورن سنگھ ساتھیوں سمیت کھلسے پہنچا وہاں سے لیہ چلا گیا۔ ان کی شکست خوردہ حالت دیکھ کر لیہ میں موجود فوجیوں کا بھی حوصلہ ٹوٹ گیا۔ اسی دوران مہدی آباد سے بھی ڈوگرہ بھارتی فوج بھاگ نکلی تھی۔ چنانچہ آئی بیکس (IBEX) فورس کے جوانوں کے ساتھ اسکیموز کی یہ دونوں پلاٹونیں بھی علاقہ تورغون کے نالوں میں ڈوگرہ فراریوں کے تعاقب میں مصروف ہوگئیں۔

چولی سکمو پہنچنے کے بعد 10/9 مئی کی درمیانی رات کو صوبیدار (بعد میں میجر) غلام مرتضیٰ نے کرگل کے شمالی مورچوں پر فائرنگ کر دی اور دوسری رات تک بڑھتا ہوا کرگل کے نزدیک ہی پہنچ گیا تو اچانک دشمن کی طرف سے فائر بند ہوگیا۔ رات کے گیارہ بجے کرگل کے باشندوں نے

خبر دی کہ ڈوگرہ بھارتی فوج سورو اور لیہ کی طرف بھاگ چکی ہے۔ چنانچہ اسی وقت مرتضٰی نے دو پلاٹونوں کے ساتھ کرگل پہنچ کر چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ کرگل کے باشندوں نے مجاہدین کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ 11 مئی کو لیفٹننٹ شاہ خان نے اپنا ہیڈ کوارٹر کرگل میں منتقل کر دیا۔ ڈوگرہ بھارتی فوج کا ایک حصہ لیہ کی طرف کھلسے سے اور باقی سورو کے راستے بھاگ چکے تھے۔ شاہ خان نے ان کے تعاقب میں دونوں جانب فوجی دستے روانہ کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی دراس کے سوا پوریگ کے سورو کرتسے پشکم اور شگرچکتن کے علاقے آزاد ہو گئے۔

کھرمنگ پر ایمبش

اسی دوران مہدی آباد سے جب انڈین فوج بھاگنے لگی تو میجر احسان علی نے کیپٹن محمد خان کو تین پلاٹونوں کے ساتھ کھرمنگ میں ایمبش کرنے کے لئے آگے روانہ کر دیا اور خود کیپٹن نیک عالم کے ہمراہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ محمد خان (علامتی نام میجر تیمور) نے پوشیدہ راستوں سے کھرمنگ پہنچ کر اپنی فوج کو غندوس سے کرابہ تھنگ تک دریا کے دائیں جانب مورچوں میں متعین کر دیا۔ ایمبش لگانے کا کام 19 مئی کو مکمل ہوا جس کے بعد کرپال سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کیا جانے لگا۔ کھرمنگ پل کے قریب ایک کھلی جگہ ہے۔ 20 مئی کو کرنل کرپال سنگھ پوری فوج کے ساتھ ادھر آ پہنچا۔ یہ لوگ طولتی سے زبردستی قلی اور گھوڑے بھی ساتھ لائے تھے۔ یہاں سے انہیں پل عبور کرنا تھا۔ چنانچہ اس کھلی جگہ پر فوج نے آرام کیا جس کے بعد وہ جھولہ پل (رسیوں کا پل) عبور کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ تقریباً ساری فوج فائرنگ زون میں پہنچ چکی تھی۔ سب سے پہلے چار فوجی پل عبور کرنے لگے۔ اس وقت کرپال سنگھ فوج کو خطاب کرنے لگا تھا۔ اسی دوران مجاہدین نے ہر طرف سے ان پر فائرنگ کی بوچھاڑ کر دی۔ دشمن کے لئے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی لہٰذا میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ بچی کھچی فوج پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کرنے لگی۔ اسی حالت میں رات ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں کرپال سنگھ رہی سہی فوج کے ساتھ باغیچہ کی طرف بھاگ نکلا جہاں سے اس کی فوج نے گرخ اور تورغون کے نالوں کا رخ کیا۔

کھر منگ سے میجر احسان علی نے کیپٹن نیک عالم کو ایک فوج کے ساتھ گرخ اور تورغون کی طرف دشمن کے تعاقب میں بھیج دیا۔ اسکیموز کی دو پلاٹونیں اور آئی بیکس کی گوریلا پلاٹون ون بھی اس کاروائی میں شریک تھیں۔ نیک عالم دشمن کے تعاقب میں مصروف تھے کہ انہیں ہیڈ کوارٹر سے ایک خط ملا کہ ''ہم دشمن کا اولڈ ینگ کی طرف سے راستہ بند کر دیں گے آپ فوراً واپس آ جائیں''۔ مجاہدین واپس آ گئے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے دھوکہ دیا تھا۔ دوبارہ تورغون نالے کی طرف چلے۔ ان کاروائیوں میں دشمن کے قریباً پینتیس (35) آدمی ہلاک اور ایک سو ساٹھ گرفتار ہو گئے۔ مہدی آباد سے بھاگی ہوئی ڈوگرہ فوج میں سے کرنل کرپال سنگھ کے ساتھ صرف ایک سو فوجی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے جو پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے ایک ماہ بعد سری نگر پہنچ گئے۔

کرنل کرپال سنگھ جب تلیل پہنچا تو اس وقت وہاں ٹائیگر فورس کی ایک پلاٹون متعین تھی۔ مقامی باشندے بوجوہ اس سے تنگ آ چکے تھے۔ لوگوں نے ڈوگرہ فوجیوں کو مقامی لباس پہنا کر اپنے گھروں میں رکھ لیا اور رات کو جب مسلمان پلاٹون اطمینان کے ساتھ سو گئی تو انہوں نے ڈوگرہ فوج کو ادھر پہنچا دیا جس نے پلاٹون کے پچاس جوانوں کو شہید کر ڈالا۔ یہ جنگ آزادی میں سب سے بڑا جانی نقصان تھا۔ یہ ایک سبق بھی تھا کہ مقامی آبادی کے ساتھ بدسلوکی کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

دراس کی فتح

مہدی آباد سے ڈوگرہ فوج کے فرار، کھر منگ پل پر کامیاب ایمبش اور گرخ اور تورغون نالوں میں دشمن کے تعاقب کی کاروائیوں کے بعد کرگل میں آئی بیکس اور اسکیموز کی تنظیم نو عمل میں لائی گئی۔ لیفٹننٹ کرنل احسان علی نے ایریا کمانڈر کی حیثیت سے کرگل کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ اسی دوران سابق کنٹرول انسپکٹر وزیر غلام مہدی کو کرگل کا تحصیلدار تعینات کیا گیا جنہوں نے نئے عہدے کا چارج سنبھالنے کے بعد راشن اور بار برداری کے انتظامات اور دیگر انتظامی امور ہاتھ میں لے لئے۔

تنظیم نو کے بعد کرنل احسان علی نے میجر محمد خان کو سیکٹر کمانڈر بنا کر دراس کی طرف مامور

کیا۔ ایک پلاٹون کے ساتھ نائب صوبیدار رستم کو درچیک کی طرف اور ایک پلاٹون کو دوسرے راستے لیہ کی طرف بھیج دیا۔ چنانچہ لیفٹننٹ شاہ خان کے ساتھ میجر محمد خان 3 جون کو دراس پہنچے۔ دراس چھاؤنی اب تک محاصرے میں تھی جس میں کیپٹن کشمیر سنگھ کے ساتھ ایک کمپنی ڈوگرہ فوج موجود تھی۔ یہ فوج میجر محمد خان کے ساتھ نئی کمک کی آمد کی خبر سن کر 5 جون کی رات کو کشمیر کی طرف بھاگ نکلی۔ پندراس کی گھاٹی میں مجاہدین گھات میں تھے جنہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ڈوگرہ فوجی افراتفری میں پہاڑوں کی طرف بھاگے جن کو 7 جون کو گرفتار کیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ماہ کی شدید جھڑپوں اور محاصرے کے بعد دراس چھاؤنی فتح ہوگئی۔ راشن، وردی، اسلحہ، ایمونیشن وغیرہ کا بڑا ذخیرہ بھی ہاتھ آ گیا۔

زوجی لہ کی فتح

دراس کی فتح کے بعد 8 جون کو میجر محمد خان کو زوجی لہ فتح کرنے کا حکم ہوا۔ زوجی لہ تین کلو میٹر لمبا درہ ہے جو سطح سمندر سے 3529 میٹر (11578 فٹ) بلند ہے۔ یہ درہ سرینگر سے 102 کلو میٹر (64 میل) کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس وقت سرینگر سے سونا مرگ تک 76 کلو میٹر لمبی جیپ روڈ موجود تھی۔ زوجی لہ تک باقی 26 کلو میٹر کا راستہ خچر اور گھوڑوں کے گزرنے کے قابل تھا۔ دراس کی طرف سے مچھوئی سے پہاڑ کی ڈھلوان شروع ہو کر زوجی لہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس دوران مچھوئی سے زوجی لہ تک پٹیالہ کی ایک بٹالین پھیلی ہوئی تھی جس کے ساتھ آٹھ تھری انچ مارٹر اور چار ایم جی کے علاوہ توپخانہ بھی تھا۔ اس کے مورچے کھدے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں زوجی لہ سے تیرہ کلو میٹر مغرب میں بالتل کے مقام پر 77 انڈین بریگیڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان حالات میں صرف آگے کی طرف سے حملہ کر کے دشمن کو شکست دینا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ لیفٹننٹ شاہ خان نے دو کمپنی فوج لے کر گومری نالہ کے راستے تین دن رات مسلسل سفر کے بعد 17 جون کو بٹالین ہیڈ کوارٹر کے عقب میں صرف پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک اونچی پیکٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران باقی مجاہدین نے دشمن کو سامنے سے مصروف رکھا۔ اس کے بعد

آ گے اور پیچھے ہر دو طرف سے حملوں کا آغاز کیا گیا۔ دشمن نے تقریباً تین ہفتے سخت مقابلہ کیا۔ لیکن بالآخر حملوں کی تاب نہ لا کر 6 جولائی کو میدان خالی کر دیا۔ 7 جولائی کو زوجی لہ پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے یہاں مضبوط مورچے قائم کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی سرینگر سے لداخ تک کا واحد زمینی رابطہ مکمل طور پر مسدود ہو گیا۔

اسی دوران خبر ملی کہ تلیل میں متعین پلاٹون کرنل کرپال سنگھ کے ہاتھوں تباہ ہو گئی ہے تو نائب صوبیدار نجف علی کے ساتھ ایک پلاٹون کو تلیل بھیج دیا گیا۔ اگست کے آخر میں مزید پندرہ جوانوں کو بھی تلیل بھیجا گیا۔

لیہ کی طرف پیش قدمی

زانسکر، لیہ، نوبراہ اور روپشو پر مشتمل علاقہ لداخ کے نام سے معروف ہے۔ نوبراہ کی 10 فیصد آبادی مسلمان اور باقی ساری آبادی بدھ مت کی پیرو ہے۔ یہاں کے باشندے منگول نسل کے ہیں لیکن کرگل کے شمال میں دا، ہنو اور درچک کے باشندے خالص آریائی ہیں۔ روپشو کی آبادی خانہ بدوش ہے۔ لداخیوں کی زبان تبتی ہے اور یہی زبان لب و لہجہ کے کچھ فرق کے ساتھ بلتستان اور پوریگ میں بھی بولی جاتی ہے۔ لداخ کی زیادہ تر آبادیاں ساڑھے تین ہزار میٹر سے ساڑھے چار ہزار میٹر کے درمیان اور بعض ساڑھے سات ہزار میٹر بلند ہیں۔ اس علاقے میں گرم چشمے بہت ہیں۔ بہت سی جھلیں بھی ہیں جن میں سے پنگونگ، ژھوموری ری اور کرژھو مشہور ہیں۔ پنگونگ سب سے بڑی جھیل ہے جو 218 کلومیٹر لمبی ہے۔ حالیہ سالوں میں زانسکر کو نکال کر باقی علاقوں پر مشتمل لداخ کا ایک ضلع قائم کیا گیا ہے جس کی آبادی 1980ء کی مردم شماری کے مطابق 105291 نفوس پر مشتمل ہے۔ لداخ کا صدر مقام لیہ ہے جو سطح سمندر سے 3500 میٹر بلند ہے۔

ابتداء میں یہاں ایک کمپنی ڈوگرہ فوج متعین تھی۔ بعد میں ہر طرف سے شکست خوردہ فوج وہاں جمع ہوتی گئی۔ اس طرح اب یہاں ایک بٹالین بن چکی تھی جس کا کمانڈر کرنل پرتھوی

چند تھا۔اس وقت لیفٹیننٹ بابر خان سکردو میں چھاونی کے محاصرے پر مامور تھے۔ تنظیم نو کے بعد انہیں سکردو سے بلا کر لیہ کی طرف سیکٹر کمانڈر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ سکردو چھاؤنی کا محاصرہ مقامی رضا کاروں کے حوالے کرنے کے بعد پانچ سو جوانوں کے ساتھ بابر خان لداخ کی طرف روانہ ہو گئے۔نصف فوج کو براہ مورول اور نصف کو براہ کرگل لیہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ بابر خان آگے بڑھے تو دشمن کی فوج کے ان دستوں سے مڈبھڑ ہوگئی جنہوں نے مجاہدین کے دو پہرہ دار دستوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ یہ دستے گھبراہٹ میں منتشر ہو کر بھاگ نکلے۔ بابر نے آگے بڑھ کرداہ، بیامہ کے بعد 21 جون کووارچھ پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد سکیور بوچن اور دمکھور پھر کھلسے پر قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بھی فوجی سامان کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ بعد ازاں ہمیس شوکپہ چن میں دشمن نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔شدید لڑائی کے بعد دشمن کی فوج میدان میں لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر یہاں سے بھی بھاگ گئی۔مجاہدین نیورلہ (NYURLA) بازگو اور ساسپول پر قبضہ کرنے کے بعد 23 جولائی کو نیمو پر قابض ہو گئے۔ڈوگرہ فوج شکست پر شکست کھانے کے بعد حوصلہ ہار چکی تھی۔ نیمو پر مجاہدین کے قبضہ کے بعد اس نے لیہ کو بھی خالی کر دیا۔لیفٹیننٹ بابر خان لیہ پر قبضہ کر نے کے لئے پیشقدمی کرنے لگے تو اسی دوران ہیڈ کوارٹر سے تاکیدی حکم ملا کہ پیشقدمی کو فی الفور روک کر مجاہدین جہاں ہیں وہیں پر ڈیفنس قائم کرلیں۔لہٰذا بابر خان نے نیمو کو ہیڈ کوارٹر بنا کر آگے لیہ سے چار میل کے فاصلے پر مورچے قائم کر لئے۔تین روز بعد ڈوگرہ فوج نے لیہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

نوبراہ میں پیشقدمی

اپریل کے وسط میں حوالدار محمد علی شاہ کے ساتھ ایک سیکشن کو چلو کے راستے کی پہرہ داری کے لئے بیوغدنگ بھیج دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب مہدی آباد میں لڑائی زوروں پر جاری تھی کرنل احسان علی نے چلو کے راستے دشمن کے ممکنہ حملے کو روکنے کے لئے نائب صوبیدار وزیر شیر احمد المعروف وزیر شمشیر کو ایک پلاٹون کے ساتھ نوبراہ کی طرف روانہ کر دیا۔ شیر احمد چلو پہنچے تو راجہ

ناصر علی خان اور عوام نے ان کا استقبال کیا۔ راجہ چھلو ڈوگروں کے زمانے میں جاگیردار تھے۔ ان کے ہاں جدوجہد آزادی کے آغاز سے اب تک چھلو میں موجود غیر مسلم افراد پناہ گزین تھے۔ ان کے ولیعہد فتح علی خان پچھلے دس برس سے ریاستی اسمبلی میں بلتستان کی طرف سے نامزد ممبر تھے۔ راجہ فتح علی خان نے فروری 1948ء کے دوران قمراہ میں کرنل احسان علی سے ملاقات کر کے انقلابیوں کے ساتھ مکمل تعاون کا یقین دلایا تھا۔ چنانچہ راجہ چھلو نے شیر احمد کی پلاٹون کے لئے راشن اور بار برداری کے تسلی بخش انتظامات کئے۔ اس مقصد کے لئے غلام محمد مونڈ وقپہ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دے کر فوج کے ساتھ کر دی۔ چھلو میں تین روز کے اندر انتظامات کی تکمیل کے بعد یہ پلاٹون بیوغدنگ پہنچ گئی جو بلتستان کی طرف نوبراہ کی آخری بستی ہے۔ ابتداء میں نوبراہ میں ایک کمپنی ڈوگرہ فوج متعین تھی۔ بعد میں بھارتی حکومت نے تین سو مقامی رضا کاروں کو بھی فوجی تربیت دے کر ایک مقامی رضا کار دستہ سالہ رنچن کی سرکردگی میں یہاں متعین کر دیا تھا۔

مئی کے آخری ہفتے میں تھری ناٹ تھری کے دس ہزار رونڈ ہیڈ کوارٹر سے بیوغدنگ پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ فتح کرگل کی خبر اور نوبراہ میں پیشقدمی کا حکم بھی موصول ہوا۔ چنانچہ وزیر شیر احمد نے دریا کی ایک جانب سے حوالدار غلام حسین کو اور دوسری طرف سے حوالدار محمد علی شاہ کو اود مارو پر حملہ کے لئے روانہ کر دیا۔ مجاہدین نے ویرس اور ڈونکپہ لہ سے دشمن کو بھگانے کے بعد اود مارو پر حملہ کر دیا۔ ایک دن رات کی سخت لڑائی کے بعد دشمن نے راہ فرار اختیار کی اور اود مارو فتح ہو گیا۔ دشمن کے دو سپاہی گرفتار ہو گئے۔ تیئیس (23) رائفلوں، پانچ برین گنوں، ایک تین انچ مارٹر اور تین ٹو انچ مارٹر گنوں کے علاوہ ایمونیشن، وردی اور راشن کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ اس کے بعد غلام حسین نے حملہ کر کے ہندر پر قبضہ کر لیا۔ باقی فوج نے سکورو پر حملہ کر کے اس کے نصف پر قبضہ کر لیا۔ شدید جوابی حملوں کی وجہ سے مجاہدین اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس محاذ پر چند مجاہدین شہید ہو گئے۔ دشمن کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو کرنل احسان علی سے امداد کی درخواست کی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد صوبیدار امیر حیات کے ساتھ ایک پلاٹون لداخ سے مدد کے لئے سکورو پہنچ گئی۔ متحارب فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن مجاہدین اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اکتوبر کے وسط

میں دشمن نے حملہ کر کے ہندر کے ایک مورچہ پر قبضہ کرلیا۔لیکن غلام حسین نے جوابی حملہ کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔اس کے بعد دشمن نے سکورو پر سخت حملہ کیا جسے مجاہدین نے پسپا کر دیا۔اس کاروائی میں دشمن کے ستر (70) آدمی ہلاک اور تیس قید ہو گئے۔اس ایکشن میں نمایاں بہادری کے صلے میں نائیک شکور علی کو حوالدار بنایا گیا۔دشمن نے تیور سے میدان کے مورچوں پر پے در پے حملے کئے جو ہر بار پسپا کر دیئے گئے۔

سکردو چھاؤنی کی فتح

ادھر سکردو چھاؤنی کا محاصرہ فروری سے بدستور جاری تھا۔مجاہدین نے دائرہ تنگ کر کے محصور علاقہ اب صرف 1500 گز x 600 گز رہ گیا تھا۔چھاؤنی میں 80 نفر کے لئے اگست کے آخر تک کے لئے راشن موجود تھا۔لیکن محصورین کی تعداد دس گنا زیادہ تھی۔کیونکہ 280 فوجیوں کے علاوہ پناہ گزینوں کی بڑی تعداد بھی چھاؤنی میں رہ رہی تھی۔اگرچہ بازار کی دوکانوں، لوگوں کے گھروں اور سرکاری گوادم کو لوٹ کر چھاؤنی میں اشیاء خوردونوش جمع کی جا چکی تھیں۔پھر بھی یہ ذخیرہ ناکافی تھا۔چونکہ سری نگر سے سکردو تک کا رسد کا راستہ بہت لمبا تھا جو پاکستان کی حامی مسلمان آبادی کے رحم وکرم پر موقوف تھا۔اس لئے شروع میں کرنل تھاپا سول اور فوجی ہیڈ کوارٹر کو کرگل منتقل کرنا چاہتا تھا تا کہ فوجی کمک کے پہنچنے پر سکردو پر قبضہ کر کے گلگت پر حملہ کریں۔سری نگر میں فوجی کمان نے اس پلان کے ساتھ اتفاق کیا لیکن سول انتظامیہ کے سربراہ نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے تھاپا کو حکم دیا کہ آخری دم تک سکردو میں ڈٹے رہیں۔تھاپا نے اب تار پر تار بھیجا کہ فوراً ہوائی اڈہ کے ذریعے کمک فوج اتاری جائے۔دوائی، راشن، اسلحہ اور ایمونیشن ڈراپ کئے جائیں۔سول پناہ گزینوں کو جہاز کے ذریعے سری نگر منتقل کیا جائے۔ہوائی ریکی کے لئے جہاز بھیجے جائیں۔مجاہدین کے مورچوں خصوصاً کھرپوچو کی چوٹی پر واقع مورچے پر بمباری کی جائے۔محصورین کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے سکردو میں جہاز لینڈ کئے جائیں۔امرناتھ نے سکردو میں چھوٹا سا ہوائی اڈہ پہلے ہی تعمیر کرلیا تھا۔تھاپا نے زور ڈالا کہ زمینی کمک بھی جلدی بھیج دی جائے۔

کرنل تھاپا کے تاروں کے جواب میں سری نگر سے 2 مئی کو پہلی بار تار کے ذریعے بتایا گیا کہ حکومت کے پاس موجود جہاز پندرہ ہزار فٹ کے اوپر سے سامان اٹھا کر پرواز نہیں کر سکتے۔ مناسب جہازوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ تب سامان ڈراپ کریں گے۔ اسی دوران 12 مئی کو کرگل پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت مہدی آباد اور طولتی میں بھی انڈین فوج محصور تھی۔ اس صورتحال سے تنگ آ کر جنرل تھمیا نے پروگرام بنایا کہ سکردو چھاؤنی سے کرنل تھاپا کی فوج کرگل کی طرف مارچ کرے اور مہدی آباد اور طولتی میں موجود فوج سمیت اولڈ ینگ تھنگ میں جمع ہو کر کرگل پر دوبارہ قبضہ کر لیں۔ اسلحہ، ایمونیشن اور سول پناہ گزینوں کو بھی کرگل ساتھ لے آئیں اور جو اسلحہ ساتھ نہ لا سکیں انہیں تباہ کیا جائے۔ اس کے جواب میں تھاپا نے 17 مئی کو تار دیا کہ ایک بٹالین فوج مہدی آباد سے سکردو نہیں پہنچ سکی ہے تو ہم صرف دو کمپنی کرگل کیسے پہنچ سکیں گے۔ راستہ مجاہدین کے قبضے میں ہے۔ ایمونیشن کی کمی ہے، آٹھ سٹریچر کیس ہیں، عورتیں اور بچے ساتھ ہیں اور قلی بالکل نایاب ہیں۔ ان حالات میں اگر ہم نے پھر بھی کوشش کی تو راستے میں پچاس فیصد فوج اور اسی فیصد سول پناہ گزینوں کی تباہی یقینی ہے۔ میجر کوٹس وغیرہ لیہ پہنچ چکے ہیں۔ لہذا طولتی سے فوج کو واپس نہ بلایا جائے۔ سری نگر سے جلدی فوج بھیجی جائے اور اسلحہ اور ایمونیشن ڈراپ کئے جائیں۔ غرض سکردو چھاؤنی کے محصورین سری نگر سے فوجی کمک اور ہوائی امداد کے بھروسہ پر اب تک دلجمعی سے مجاہدین کے ساتھ برسرپیکار تھے۔

سکردو چھاؤنی کے محاصرے پر لیفٹننٹ بابر خان نئے بھرتی شدہ رضا کاروں کے ساتھ متعین تھے۔ جون میں لیہ کے محاذ پر مزید فوج کی ضرورت ہوگئی تو انہیں وہاں بلا لیا گیا۔ چنانچہ بابر خان پانچ سو مجاہدین کے ساتھ 12 جون 1948ء کو سکردو سے بطرف لداخ روانہ ہو گئے۔ اسی دوران 12 تا 16 جون کے درمیان مہتر چترال کے خاندان کے ایک فرد کرنل مطاع الملک کے ساتھ چترال کے دو سو رضا کار براہ شغر تھنگ سکردو پہنچ گئے اور اس فوج نے سکردو چھاؤنی کا محاصرہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ فوج چترال کے علاقوں کا قبائلی لشکر تھی جسے عارضی طور پر گلگت سکاؤٹس میں شامل کیا گیا تھا۔ مطاع الملک اور چترال فورس کو چترال کے مہتر مظفر الملک نے یہ

وعدہ کر کے گلگت کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ انہیں گلگت چھاؤنی میں تعینات کیا جائے گا اور سکاؤٹوں کے برابر فری راشن اور تنخواہ دی جائے گی۔ گلگت سکاؤٹس کے کمانڈر نے ان وعدوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا تو چترال فورس کے ان آدمیوں نے چترال واپسی کا فیصلہ کیا۔ مطاع الملک کہتے ہیں کہ وہ بمشکل انہیں روک سکے کہ چترالیوں پر بدنما داغ نہ لگ جائے۔ اس میں تھری ناٹ تھری رائفل چلانے والے تربیت یافتہ صرف چند ایک ہی تھے باقی رنگروٹ تھے جن کے پاس ایک خاص قسم کی بندوقیں تھیں۔ اس فوج کے دوسرے آفیسران کیپٹن وزیر محمد خان اور لیفٹننٹ شاہ عبدالحسن تھے۔

سکردو پہنچتے ہی مطاع الملک نے رنگروٹوں کو ٹریننگ دینے کا بندوبست کیا۔ انہیں تربیت دینے کے بعد رہے سہے فوجی بھی محاذوں پر چلے گئے۔ مجاہد فورس کا ہیڈ کوارٹر سندوس میں تھا جہاں سول انتظامیہ کے سربراہ وزیر ولایت علی بھی مقیم تھے۔ 17 جون کو مطاع الملک نے دشمن فوج کے کمانڈر کرنل تھاپا کے نام ایک خط لکھ کر مہدی آباد سے پکڑے گئے ففتھ بٹالین کے ایک ڈوگرہ سپاہی امرناتھ کے ہاتھ سفید جھنڈے کے ساتھ چھاؤنی میں بھیج دیا۔ اس خط کی عبارت یوں تھی:

''منجانب کرنل شہزادہ مطاع الملک کمانڈر آزاد چترال فورس سکردو، بنام آفیسران و جوانان کشمیر ریاستی فوج سکردو چھاؤنی۔

نمبر1۔ آپ لوگوں کو چھڑانے کی بریگیڈیئر فقیر سنگھ، کرنل کرپال سنگھ اور کرنل سمپورن بچن سنگھ کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں ان کے بہت سے آدمی مارے گئے ہیں اور بہت سے قید ہوئے ہیں۔ آزاد فورسز اس وقت کانگن، سونا مرگ اور بانڈی پورہ کے علاقوں میں اور بعض مقامات پر سری نگر سے صرف پندرہ میل کی حدود میں کارروائیوں میں مصروف ہیں۔

نمبر2۔ آپ ایک حقیقی سپاہی کی طرح اپنے فرائض ادا کر چکے ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اس پہاڑی علاقے میں آپ کو کوئی مدد نہیں پہنچ سکے گی۔ آپ کی چھاؤنی کے انجام کے بارے میں اب کوئی شک باقی نہیں رہا اور مجھے اس انجام کا پورا یقین

ہے۔ایسی جدو جہد کے مزید جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں جس کے نتیجے میں آپ کی مکمل تباہی یقینی ہو۔

نمبر3۔ لہٰذا میں آپ کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیتا ہوں اور میں آپ میں سے ہر ایک کی سلامتی کی ذمہ داری لیتا ہوں۔آپ میری باتوں پر یقین کریں اور مجھ پر اعتماد کریں۔کیونکہ میں نہ صرف ایک فوجی ہوں بلکہ میں ایک شاہی خاندان کا فرد بھی ہوں۔میں نے اپنے آفیسروں اور سپاہیوں کو ہدایات جاری کر دی ہیں کہ سفید جھنڈا لئے کوئی آ جائے تو اس پر فائر نہیں کرنا بلکہ اسے حفاظت میں لینا ہے۔

نمبر4۔ آخر میں میری طرف سے خیر سگالی کے ثبوت میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ اب تک کسی بھی غیر مسلم کی جائیداد کو نہ لوٹا گیا ہے اور نہ نقصان پہنچایا گیا ہے اور وہ اپنے کام اس طرح سے جاری رکھے ہوئے ہیں جیسے کچھ بھی واقع نہ ہوا ہو۔لہٰذا میں آپ کو ہتھیار ڈالنے اور اس طرح سے اپنی جانیں بچانے کا مشورہ دیتا ہوں۔اگر آپ میری باتوں کو مخلصانہ اور دیانتداری پر مبنی سمجھیں تو سفید جھنڈے کے ساتھ کسی آفیسر کو آنا چاہیے،،

کرنل تھاپا کی طرف سے کوئی جواب تو نہ آیا۔مگر اس قیدی کے ذریعے دشمن کو مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر اور مورچوں کی نشاندہی ہوگئی۔چنانچہ 19 جون کو دو انڈین بمبار طیاروں نے سکردو قصبہ کے مضافات میں مجاہدین کے مورچوں کے ارد گرد اور حسین آباد، کت پناہ اور رانگا پر بمباری کر دی۔دشمن نے غلطی سے سندوس کی بجائے کت پناہ پر بم پھینکے تھے۔مگر کسی مورچے پر بھی بم نہ لگا اور خوش قسمتی سے اکثر گولے پھٹ بھی نہ سکے۔اس طرح کسی قسم کا کوئی نقصان نہ ہوا۔اس سے قبل دشمن کے طیاروں نے روندو میں راجہ کا محل سمجھ کر ایک اونچے پتھر کو اپنے بموں کا نشانہ بنایا تھا۔بعد میں بعض کسانوں نے ان گولوں کو جو نہیں پھٹے تھے آلات زراعت بنا کر کام میں لانے کی کوشش کی تو اس سے کت پناہ، رانگا اور راولڈ ینگ میں کچھ نقصان ہوا۔چونکہ دشمن کو سندوس میں ہیڈ کوارٹر کی نشاندہی ہو چکی تھی اس لئے ہیڈ کوارٹر کو موضع کھر پتو میں منتقل کر دیا گیا۔اسی دوران 12 جولائی

کوصوبیدار رحمت خان کی سرکردگی میں ہزارہ اورسوات کے ایک سو رضا کاروں کا ایک لشکر براہ شغر تھنگ سکردو پہنچ گیا۔اسے بھی عارضی طور پر گلگت سکاؤٹس میں شامل کیا جا چکا تھا۔اس فوج نے رنبیر گڑھ اور پرتاب گڑھ کی طرف مورچے سنبھال لئے۔

مسلسل کئی ماہ کے محاصرے سے محصورین کو اشیاء خوردنی کی قلت محسوس ہونے لگی تھی۔چنانچہ بھارتی طیاروں نے 26 جون سے راشن، وردی وغیرہ ڈراپ کرنا شروع کر دیئے۔یہ سلسلہ 7 اگست 1948 تک جاری رہا۔ڈراپ شدہ اشیاء کا زیادہ تر حصہ مجاہدین کے ہاتھ آتا اور اس کی تھوڑی سی مقدار محصورین کو ملتی رہی۔ڈراپنگ کے عمل میں تیزی آئی تو یہ بات واضح ہوگئی کہ کرنل تھاپا کے ہتھیار ڈالنے کا وقت قریب آچکا ہے۔

اس وقت سکردو مجاہدین کی باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوج سے یکسر خالی ہو چکا تھا جو یہاں سے دور محاذوں پر دشمن سے مصروف پیکار تھی۔سکردو میں دشمن کے طیاروں کی آمدورفت کے آغاز کے ساتھ ہی یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ دشمن سکردو کے اردگرد میدانوں اور دیوسائی میں چھاتہ بردار فوج اتار کر دوبارہ قبضہ نہ کر لے۔ایسی صورت میں دشمن کا مقابلہ مطاع الملک اور اس کے مٹھی بھر ساتھیوں کے بس کا روگ نہ تھا۔چنانچہ جون میں راجہ محمد علی شاہ کی سربراہی میں بلتستان نیشنل گارڈز کی ایک رضا کار فورس مرتب کی گئی جس کے جوانوں کی تعداد ایک ماہ کے اندر پانچ سو ہوگئی۔پرویز محمود اس کے کمانڈر اور غلام مہدی مرغوب ٹو آئی سی تھے۔ اسلحہ کے استعمال کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اس فوج نے مذکورہ مقامات پر باقاعدہ پہرہ دینا شروع کیا۔امن عامہ کے علاوہ دیگر جنگی انتظامات بھی اس نے ہاتھ میں لے لئے۔چونکہ سکردو چھاؤنی کا محاصرہ غیر ضروری طور پر طول پکڑ رہا تھا اور یہاں پر متعین فوج کی دوسرے محاذوں پر ضرورت ہو رہی تھی اس لئے چھاؤنی پر فیصلہ کن حملے کے لئے استور سے دو 3.7 توپیں لانے کا فیصلہ ہوا۔توپوں کو سکردو پہنچانے کے لئے تھور گو حسین آباد سے کچورہ قمراہ تک سے تین سو نیشنل گارڈز جمع ہو گئے جو جولائی کے آخری ہفتے میں گودائی (استور) پہنچ گئے۔ان جوانوں نے توپوں کے مختلف حصوں کو ایمونیشن سمیت 5 اگست کو سکردو پہنچا دیا۔اس مہم کے دوران راستے کی مشکلات سے پانچ رضا کار جان بحق ہو گئے۔

توپوں کے ساتھ توپخانہ والے بھی سکردو پہنچ گئے جہاں ان توپوں کو پھر سے جوڑ کر تیار کیا گیا۔

کرنل مطاع الملک نے ایک توپ کو سکردو کے جنوب میں چنار پر اور دوسری کو مغرب میں سندوس کے قریب لڑانوٹوق نامی ٹیلہ پر نصب کر دیا۔ 11 اگست 1948ء کے صبح ساڑھے چھ بجے دونوں توپوں نے چھاؤنی، کھرپوچو، مڈل سکول، برباد قلعہ، مندر، راجہ کے محل اور پرانے قلعہ پر گولہ باری شروع کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس دوران پچھتر، پچیس پونڈ والے گولے فائر کئے گئے۔ 12 اگست کی صبح ساڑھے چھ بجے دشمن کے ٹھکانوں پر پھر گولہ باری کی گئی۔ اس روز اٹھائیس گولے فائر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی مارٹر، مشین گن، برین گن اور رائفلوں سے ہر طرف سے چھاؤنی پر حملہ کیا گیا۔ اسی دوران پٹھان پلاٹون نے کشو باغ تک ایڈوانس کیا۔ 13/12 اگست کی درمیانی رات دشمن نے مجاہدین کے مورچوں پر شدید گولہ باری کی۔ 13 اگست کی صبح ساڑھے چھ بجے دونوں توپوں نے پھر گولہ باری شروع کی جو سوا سات بجے تک جاری رہی۔ اس دوران پچاس گولے دشمن کے ٹھکانوں پر برسائے گئے۔ 13 اگست کا پورا دن طرفین کے درمیان سخت فائرنگ ہوتی رہی۔ مجاہدین کئی روز سے مورچوں میں سے چلا چلا کر دشمن کو ہتھیار ڈالنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ 13 اگست کی رات کے آٹھ بجے ڈوگرہ فوجیوں نے مورچوں سے چلا کر کہا کہ انہیں صبح آٹھ بجے تک سوچنے کی مہلت دی جائے۔ خوش قسمتی سے 11 اگست سے اب تک موسم سخت خراب رہا تھا جس کی وجہ سے نہ تو مجاہدین کے ٹھکانوں پر بمباری کی جا سکی تھی اور نہ اس دوران محصورین کے لئے سامان رسد ڈراپ ہو سکا تھا۔ دشمن کے لئے اب ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سکردو چھاؤنی کے محصورین سری نگر سے کمک اور امداد کے پہنچنے کی امید پر اب تک ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ امید اب مایوسی میں بدل چکی تھی۔ زخمیوں کے لئے دوائیاں نایاب تھیں۔ بیہوشی کی دوا دیئے بغیر اپریشن کی نوبت پہنچی ہوئی تھی۔ میڈیکل آلات بھی پورے نہ تھے۔ اگرچہ چھاؤنی میں دو سول اور دو فوجی کل چار ڈاکٹر موجود تھے۔ ایک سپاہی کی انگلی زخمی ہوئی۔ دوا نہ ہونے کی وجہ سے پورے بدن میں زہر پھیل کر مر گیا۔ گرمیوں کے پہنچنے کے ساتھ ہی اسہال اور دوسری بیماریاں

بھی پھیل گئیں۔ راشن کا سٹاک ختم ہو کر قوت لا یموت پر گزارہ کیا جا رہا تھا۔ گندم کا جو آٹا تھا اسے خواتین اور بچوں کے لئے رکھ کر فوجی جوان جو کے آٹے پر گزارہ کر رہے تھے جس کی وجہ سے 70% جوان بیمار ہو چکے تھے۔ چاول کے چھلکوں، استعمال شدہ چائے کی پتیوں اور درختوں کے پتوں کو خشک کر کے تمباکو کی جگہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ادھر مجاہدین کا دباؤ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس لئے زخمیوں کو بھی مورچوں میں ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ بڑے اسلحہ اور ایمونیشن کی کمی کا مسئلہ بھی شدید تھا۔ بغیر دودھ کی چائے پیتے تنگ آ چکے تھے۔ سری نگر سے جھوٹے وعدوں اور بیہودہ تعریفوں کے علاوہ محصورین کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔ اگست کے پہلے ہفتے تک کرنل تھاپا کی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ اس نے سری نگر کو تار دیا تھا کہ جھوٹے وعدوں کی وجہ سے ماتحتوں نے آفیسروں کا حکم ماننا چھوڑ دیا ہے۔ اب خطرہ ہے کہ وہ ہمارا ساتھ ہی نہ چھوڑ جائیں۔ اگر اجازت دیں تو ہم سول پناہ گزینوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر کرگل کی طرف پسپا ہو جائیں گے۔ سری نگر نے اس پسپائی کی اجازت نہ دی بلکہ وعدہ کیا کہ بہت جلد سامان ڈراپ کریں گے۔ محصورین کا حوصلہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا اب دو اطراف سے 3.7 توپوں کی گولہ باری سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے انجام سے اب بے حد خوفزدہ تھے اور ماتحتوں نے آفیسروں کا حکم ماننا چھوڑ دیا تھا اور سارا نظم و نسق درہم برہم ہونے لگا تھا۔

13 اگست کی شام کو ڈوگرہ فوج کے آفیسروں اور این سی اوز (NCOs) نے ایک میٹنگ کی جس میں اپنے مصائب و آلام کی فہرست پر ایک ایک کر کے غور کیا اور بالآخر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ محصورین میں سے جو بھاگنا چاہیں انہیں ان کی خواہش کے مطابق اسلحہ اور ایمونیشن ساتھ لے جانے کی اجازت دی۔ آفیسروں اور این سی اوز نے نہ بھاگنے کا فیصلہ کیا تاکہ دیگر محصورین کو اخلاقی مدد حاصل رہے۔ ہتھیار ڈالنے کے فیصلے کے ساتھ ہی چھاؤنی میں ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ بھاگنے والوں نے تیزی میں تیاری کی اور مختلف اطراف کو روانہ ہو گئے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو چترال فورس کے ہاتھوں موت سے بھی بدتر انجام نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ چنانچہ بہت سی عورتوں نے دریائے سندھ میں کود کر خودکشی کی۔ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی تین بار دریا میں کود گئی

تینوں بار پانی نے اسے ساحل پر پھینک دیا۔ بہت سی عورتوں نے زہر کھا کر خودکشی کی۔ لیکن زہر ڈیٹ ایکسپائرڈ تھا اس لئے نہ مریں۔ تاہم تین ایسی زہر خوردہ لڑکیوں کو نیم مردہ حالت میں ہی عزیزوں نے دفن کر دیا۔ ساری رات فوجی آفیسر خودکشی کرنے والیوں کو بچانے کے لئے ان کے پیچھے دوڑتے رہے۔ صبح ہوگئی تو کرنل تھاپا نے سری نگر تار دیا:

''جیسا کہ متوقع تھا اور آپ کو مطلع بھی کیا گیا تھا ساری محصور فوج 14/13 اگست کی درمیانی رات کو ہمارا ساتھ چھوڑ گئی۔ میرے آفیسروں نے انہیں روکنے کی پوری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ انہوں نے حکم ماننا چھوڑ دیا تھا اور گستاخی پر اتر آئے تھے۔ صرف مندرجہ ذیل افراد رہ گئے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ایک دومنٹ میں ہمارا کیا انجام ہونے والا ہے۔ الوداع! اب جہاز نہ بھیجیں،،

کرنل شیر جنگ تھاپا، کیپٹن گنگا سنگھ، کیپٹن پربت سنگھ، لیفٹننٹ اجیت سنگھ، ڈاکٹر لیفٹننٹ پرکاش سنگھ، ڈاکٹر لیفٹننٹ امرت لال، جمعدار لکشمی سنگھ، حوالدار پریم سنگھ، حوالدار چیت سنگھ، حوالدار سیوا سنگھ، لانس حوالدار سرب سنگھ، نائیک سورت سنگھ، نائیک رام چند، نائیک رتن سنگھ، نائیک سنت رام، نائیک بھوپندر سنگھ، لانس نائیک سمن دورجے، لانس نائیک جگ رتھ سنگھ۔،،

کرنل تھاپا نے یہ تار پاس کیا۔ پھر وائرلیس سیٹ توڑ دیا۔ فائلوں اور دیگر کاغذات کو جلا ڈالا، بچے ہوئے اسلحوں کو ناکارہ بنایا۔ اس کے بعد سپاہی امرناتھ کو جس نے 17 جون کو کرنل مطاع الملک کا خط لایا تھا سفید جھنڈے کے ساتھ مجاہدین کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک حوالدار کو اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ ڈوگرہ فوج جنیوا کنونشن کے تحت ہتھیار ڈالنے کے لئے بالکل تیار ہے۔ وہ حوالدار پیشکش کی قبولیت کے پیغام کے ساتھ واپس پہنچا۔ وہ آزاد فورس کے فیاضانہ سلوک سے بیحد متاثر ہو کر آیا تھا۔ محصورین کی سلامتی کی مکمل ضمانت دی گئی تھی۔ آفیسروں زخمیوں اور سویلین افراد کی فہرست مانگی گئی تھی۔ وہ حوالدار کے ساتھ بھیج دی گئی۔ اب تمام آفیسروں کو ہتھیار کے بغیر قطار میں چھاؤنی سے نکلنے کا حکم ہوگیا۔

چنانچہ 14 اگست 1948ء کی صبح کو کرنل تھاپا پانچ آفیسروں، ایک جے سی او، بارہ این سی اوز اور اکیاون سپاہیوں کے ساتھ وردیوں میں فوجی ڈسپلن کے ساتھ چھاؤنی سے باہر نکل آیا اور اپنے آپ کو آزاد فورس کے حوالے کر دیا۔ چترال فورس کے کیپٹن محمد خان نے ان سب کو کرنل مطاع الملک کے پاس کھرپتو پہنچا دیا۔ 280 میں سے باقی ڈوگرہ فوجی رات کے اندھیرے میں برگے، سدپارہ اور حسین آباد کے نالوں کے راستے بھاگ چکے تھے۔ سکاؤٹس اور بلتستان نیشنل گارڈز کے دستے ان کے تعاقب میں دوڑے اور مختلف مقامات سے ایک سوتیس (130) آدمیوں کو پکڑ کر کھرپتو پہنچا دیا۔ تقریباً اسی (80) افراد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ اس عہد کا نقطہ اختتام تھا جس کی بنیاد 1840ء میں بلتستان کے مقامی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے جرنیل وزیر زور آور سنگھ نے رکھی تھی اور 1842ء میں وزیر لکھپت نے اس کا احیاء کیا تھا۔ منظر وہی تھا لیکن فرق یہ تھا کہ اس وقت بلتستان کے حکمران احمد شاہ کو جھوٹی قسم کے ذریعے دھوکے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر اب ڈوگرہ افواج اور کمانڈر کو طاقت کے ذریعے زیر کر لیا گیا تھا۔ اور مقپون شہزادیوں اور چوامیر حیدر کی رضاعی ماں کی بجائے اب زور آور سنگھ اور وزیر لکھپت کے لشکریوں کی خواتین اپنی تباہی پر نوحہ کناں تھیں۔

14 اگست 1948ء کو جو حسن اتفاق سے پاکستان کا یوم آزادی ہے، سکردو چھاؤنی فتح ہو گئی اور اس پر پاکستان کا ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ اسی روز ان مسلمان قیدیوں کو بھی رہائی ملی جو بلا جرم ڈوگرہ فوج کے پاس قید با مشقت کی سزا بھگت رہے تھے۔ چھاؤنی میں پناہ گزین غیر مسلموں کو بھی کھرپتو پہنچا دیا گیا جن میں چند پنڈت سول ملازمین، سکھ دکاندار اور ان کے بچے شامل تھے۔ جن فوجیوں نے بھاگ کر فوجی اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی ان کو اور ان سکھ دکانداروں کو جنہوں نے مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے تھے مقپون پل پر گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیپٹن گنگا سنگھ کو بھی گولی سے اڑا دیا گیا جس نے چھاؤنی میں قید مسلمانوں کو سخت اذیتیں دی تھیں اور چھاؤنی کے اندر واقع مسجد کو طوائف خانہ بنا رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ کرنل مطاع الملک اور ان کے ساتھی چترال فورس کے آفیسروں اور جوانوں نے غیر مسلم قیدی عورتوں کے ساتھ سخت بے رحمانہ اور

مجرمانہ سلوک کیا جس کا کسی طرح بھی کوئی جواز نہ تھا۔ کچھ روز تک قیدی خواتین کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد سارے قیدیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ اس دوران بعض نیک لوگوں نے انہیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے ان قیدیوں کو ایک کیمپ میں منتقل کر کے سرکاری طور پر ان کے خرچ وخوراک کے انتظامات کر لئے۔ بعد میں سارے قیدیوں کو پشاور بھیج دیا گیا جہاں سے راولپنڈی کے راستے لاہور اور وہاں سے انڈیا روانہ کر دیا گیا۔

26 اگست کو سکردو کی پولوگراؤنڈ میں کرنل مطاع الملک کی صدارت میں تقریب آزادی کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں راجہ محمد علی شاہ، اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ وزیر ولایت علی خان، فوجی اور سول ملازمین اور عوام نے شرکت کی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اللہ کے حضور شکرانہ پیش کیا گیا۔ پھر پاکستان زندہ باد، قائداعظمؒ زندہ باد اور آزاد کشمیر زندہ باد کے نعروں میں پاکستانی پرچم لہرایا گیا۔ سکاؤٹوں اور بلتستان نیشنل گارڈز کے دستوں نے پاکستانی پرچم کو سلامی دی۔ شام کو بینڈ کے ساتھ سواروں کا ایک جلوس کھرپتو لے جایا گیا۔

چھاؤنی کی فتح کے فوراً بعد ایک نئی فوج مرتب کر کے کرگل روانہ کر دی گئی۔ دونوں توپوں کو بھی 21 اگست کو کرگل بھیج دیا گیا جہاں سے کرنل احسان علی نے ایک توپ کو زوجی لہ اور دوسری کو لیہ محاذ پر بھیج دیا۔ سکردو پر 19 جون سے انڈین طیاروں نے بمباری کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو 11 اگست کو موسم کی خرابی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ 21 اگست سے یہ سلسلہ پھر شروع ہوا جو 31 دسمبر تک جاری رہا۔ چھاؤنی، کھرپتو، مجاہدین کے سابق مورچوں اور قرب و جوار کی آبادیوں پر بمباری ہوتی رہی لیکن کوئی نقصان نہ ہوا۔ 24 اکتوبر کو سات جہازوں کی بمباری کے نتیجے میں چھاؤنی میں قید ایک ڈوگرہ سپاہی اور پوسٹل کلرک پنڈت نندلال کی لڑکی ہلاک ہو گئی۔

3 ستمبر کو چارج کیپٹن وزیر محمد خان کو دے کر مطاع الملک براہ شغر تھنگ استور چلے گئے۔ 6 ستمبر کو چترالی لشکر کے جوانوں کی ایک بڑی تعداد کمانڈروں کی اجازت کے بغیر سکردو سے واپس روانہ ہو گئی۔ 11 ستمبر کو کیپٹن محمد خان اور لیفٹننٹ شاہ عبدالحسن سمیت رہی سہی ایک پلاٹون بھی براہ

شغر تھنگ واپس چلی گئی۔ پٹھان پلاٹون اگست کے آخری ہفتے میں واپس جا چکی تھی۔ استور سے چترالی لشکر کو کیپٹن برہان الدین کے ساتھ گریز سیکٹر کی طرف بھیج دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ چترالی لشکریوں نے سکردو میں قیام کے دوران مقامی باشندوں کے ساتھ نہایت بدسلوکی کی۔ ان کے گھروں میں بے جا مداخلت اور لوٹ مار کی۔ یہ سلسلہ ان کی واپسی تک جاری رہا۔ چھاؤنی کی فتح کے بعد 14 اگست کو اسے بھی لوٹ لیا جس میں فوجی ساز وسامان اور قیدیوں کے مملوکہ سامان کے علاوہ راجہ کے محل اور مسلمانوں کے گھروں سے لوٹ کر لایا ہوا سامان بھی تھا۔ راجہ کے محل کے سامان میں مغل دور کی بندوقیں بھی شامل تھیں جن پر صاحبقران ثانی محمد شہاب الدین شاہ جہاں کی مہر تھی۔ ان میں سونا اور چاندی کے زیورات، قالین، شال، کمبل، برتن، نقد روپے وغیرہ تھے۔ یہ سارا سامان چترالی لشکر اپنے ساتھ لے گئے۔ رنبیر گڑھ (حمید گڑھ) میں محکمہ مال کے ریکارڈ روم کو بھی انہوں نے غارت کیا۔ قیمتی کاغذات اور دستاویزات کو بھی تباہ کر ڈالا۔ محکمہ مال کی جمعبندیوں کی جلدوں کو پانی میں بھگو کر ان کا کپڑا اتار لیا گیا۔ بستوں کے کپڑوں کو بھی مال غنیمت میں شامل کر لیا گیا۔ ان قیمتی دستاویزات کے یوں تلف ہونے سے بعد میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ کرنل مطاع الملک کو کیپٹن گنگا سنگھ کے بلا جواز قتل اور سکردو میں لوٹ مار کی وجوہات کی بناء پر 12 ستمبر 1948ء کو پشاور سے گرفتار کیا گیا اور پورے ایک سال بعد ستمبر 1949ء میں صاحبزادہ خورشید گورنر سرحد کی مداخلت کی وجہ سے سنٹرل جیل پشاور سے رہائی نصیب ہوئی۔

کمانڈروں کے تبادلے

جولائی 1948ء کے آخر میں جی ایچ کیو نے کرنل اسلم کا یہاں سے تبادلہ کر کے کرنل غلام محی الدین جیلانی کو گلگت سکاؤٹس کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ یہاں جنگ زوروں پر تھی اور محاذ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ کرنل اسلم کے برعکس جیلانی کو اس علاقے کے جغرافیہ اور محاذ کے حالات سے عملاً کوئی واقفیت نہ تھی۔ ان حالات میں وہ کسی بھی طرح سے کرنل اسلم کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتے تھے جو بعد کے واقعات نے بھی سچ کر دکھایا۔ لوگ یہ نکتہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے

کہ "CHANGING HORSES IN THE MIDSTREAM" میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی اور یہ کہ اس بے وقت تبدیلی کے پیچھے کونسا ہاتھ کارفرما تھا۔ جیلانی نے چارج سنبھالتے ہی تمام محاذوں پر حکم بھیج دیا کہ حملوں کی پالیسی ترک کر کے دفاعی پالیسی اختیار کی جائے جب تک کہ وہ خود محاذوں کا دورہ نہ کریں۔ اب تک دشمن فوجیں ہر طرف سے پسپا ہو رہی تھیں اور ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی مجاہدین ان کے سروں پر پہنچ رہے تھے۔ حملوں اور پیشقدمیوں کے یکسر رکنے پر دشمن کو منظم ہونے کا موقع مل گیا۔

مسلسل فتوحات نے مجاہدین میں شوق جہاد کو تازہ کر رکھا تھا جس نے انہیں دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب جو فتوحات کا سلسلہ رک گیا تو سابق سکستھ (6Th) کشمیر انفنٹری بٹالین کے پنجابی فوجی چھٹی مانگنے لگے جو کافی عرصے سے گھروں سے دور تھے اور تقسیم ہند کے دوران کے ہنگاموں اور قتل و غارت کی وجہ سے اپنے عزیزوں کی خیریت کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ چنانچہ میجر محمد خان پنجابی فوجیوں کے ساتھ چھٹی پر چلے گئے۔ ان کی جگہ میجر قریشی کو زوجی لہ کا سیکٹر کمانڈر مقرر کیا گیا جو بلتستان اور گلگت کے علاقوں سے نئے بھرتی شدہ آٹھ سو رنگروٹ ساتھ لائے تھے۔

اکتوبر کے دوران کرنل احسان علی کو سانس کی تکلیف لاحق ہوگئی اور انہوں نے زور دیا کہ یا تو انہیں فارغ کر دیا جائے یا علاج کے لئے ڈاکٹر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ میجر اسماعیل نے کرنل احسان علی سے ایریا کمانڈر کا چارج لے لیا۔ کرنل احسان کو علاج معالجے کے سلسلے میں کرگل میں رکھا گیا جہاں انہوں نے سپلائی کے کاموں کی نگرانی ہاتھ میں لے لی۔ زوجی لہ کی طرف سے لیفٹننٹ شاہ خان کو اسی دوران زانسکر کی طرف بھیج دیا گیا جہاں سے دورہ کرنے کے بعد وہ 10 اکتوبر کو کرگل ہیڈ کوارٹر پر پہنچ گئے۔

محاذوں کا حال

زوجی لہ پر مجاہدین نے قبضہ مستحکم کر لیا تھا۔ سکاؤٹس کی ایک کمپنی زوجی لہ کے مشرق میں،

ایک کمپنی گھاٹی کی ٹیکریوں پر اور تیسری کمپنی ان کے عقب میں دراس تک کی حفاظت پر مامور تھی۔ زوجی لہ کے مورچے کھدے ہوئے اور مضبوط تھے۔ یہاں سے سونا مرگ اور بالتل تک پٹرولینگ کی جاتی تھی۔ زوجی لہ کو فتح ہوئے سات ہفتے ہو رہے تھے کہ یکم ستمبر سے مسلسل چھ روز تک انڈین طیاروں نے بمباری کی۔ 7 ستمبر کو اصلی حملہ شروع ہو گیا جس میں دشمن کی تین بٹالین فوج حصہ لے رہی تھی۔ سخت ہوائی بمباری اور توپوں کی گولہ باری کے بعد آگے پٹیالہ اس کے بعد 5 مرہٹہ اور اس کے بعد 3 جاٹ بٹالین آگے بڑھی۔ جب ساری فوج درہ میں پہنچ گئی تو مجاہدین نے سارے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے اس پر فائرنگ کر دی۔ دو سو دشمن فوجی ہلاک ہوئے اور باقی بھاگ گئے۔ اس شکست کے بعد دشمن نے دوبارہ ہوائی بمباری پھر توپوں کی گولہ باری شروع کی اور اس کے بعد 14/13 ستمبر کی درمیانی رات پھر چار بٹالین فوج حملہ آور ہوگئی۔ آگے مرہٹہ بٹالین جس کے پیچھے دو جاٹ بٹالینیں تھیں۔ پوری فوج درہ میں وارد ہو کر جب کچھ گزوں کے فاصلے پر پہنچی تو مجاہدین نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ دشمن کے ایک سو اسی (180) افراد ہلاک ہو گئے جس کے بعد ساری فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک سو سینتیس (137) رائفلیں، بارہ سٹین گنیں اور بارہ وائرلیس سیٹ غنیمت میں ملے۔ اسی حملے میں ایک گورکھا بٹالین بھی شریک تھی جو بوٹوکل کے راستے دراس پر حملہ کے لئے آگے بڑھی اور راستہ بھٹک کر ایک گلیشئر پر جا پہنچی تو وہیں سے واپس چلی گئی۔ ایک گورکھا کمپنی میجر راج سنگھ کے ساتھ سورو کی طرف حملہ آور ہوگئی۔ مجاہدین نے اس کی ایک پلاٹون کو قید اور باقیوں کو ہلاک کر دیا۔ ان کارروائیوں کے بعد زوجی لہ کے سیکٹر کمانڈر میجر محمد خان ساتھیوں سمیت 21 ستمبر کو چھٹی پر چلے گئے۔

زوجی لہ پر دو حملوں کی ناکامی کے بعد دشمن نے مجاہدین کو دھوکہ دینے کے لئے زوجی لہ کی مغربی ڈھلوانوں میں جھونپڑے تعمیر کئے جس سے یہ تأثر ملا کہ سردیاں گزرنے تک ان کا زوجی لہ پر دوبارہ حملوں کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ مجاہدین کی توجہ کو زوجی لہ سے ہٹانے کے لئے دشمن نے لیہ پر نقل و حرکت کو تیز کر دیا۔ لیہ میں ہنگامی طور پر ایک کچا ہوائی اڈہ تعمیر کیا اور سرینگر سے براہ زانسکر ہوائی سروس شروع کی جس کے ذریعے فوج، اسلحہ، ایمونیشن اور دیگر ساز و سامان پہنچائے

جانے لگے۔انڈین طیارے مجاہدین کے مورچوں کے اوپر سے پرواز کرتے اوران کے ٹھکانوں کا پتہ لگاتے تھے۔مجاہدین کے پاس طیارہ شکن توپیں نہیں تھیں۔اسی دوران اپنے جاسوسوں کے ذریعے دشمن نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ وہ لیہ کی طرف سے بہت جلد حملہ کرنے والے ہیں۔دشمن کی ان چالوں سے مجاہدین زوجی لہ پر حملوں کے خطرے سے سچ مچ مطمئن ہو گئے اوران کی ساری توجہ لیہ محاذ پر مرکوز ہوگئی۔دشمن نے سرما کے مکمل طور پر پہنچنے سے پہلے زوجی لہ کے ذریعے فیصلہ کن حملہ کرنے کا عزم کرلیا تھااوراس مقصد کے لئے وہ سونامرگ سے زوجی لہ تک 26 کلومیٹر کا فاصلہ توپوں کی گولہ باری کی آڑ میں بلاسٹینگ کرتے ہوئے ٹینک کے لئے راستہ بنانے میں مصروف تھے۔تلیل میں متعین پلاٹون نے میجر قریشی کو اس امر کی اطلاع دی لیکن کسی کو بھی اس خبر کی صداقت پر یقین نہ آیا۔15 اکتوبر کو زوجی لہ پر دشمن کی ایک جیپ دیکھی گئی تو کرنل احسان علی نے ٹینک شکن ہتھیار کا تقاضا کیالیکن یہ بات بھی صدا بصحرا ثابت ہوگئی۔

سکردو چھاؤنی کی فتح کے بعد جب دونوں توپیں کرگل پہنچیں تو کرنل احسان نے ایک کو زوجی لہ اور دوسری کو لداخ بھیج دیا تھا۔لداخ میں مجاہدین کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر اس وقت نیمو میں تھا۔ چنانچہ توپخانہ کو اس کے عقب میں بزگو میں رکھ دیا گیا جس پر ہنزہ کی ایک سیکشن فوج متعین تھی۔ لداخ کی غیر مسلم آبادی بالعموم اور بزگو والے بالخصوص مسلمان فوجیوں سے تنگ آ چکے تھے۔کہتے ہیں کہ بازگو والوں نے ایک بوڑھی عورت کے ذریعے توپخانہ والوں کو چھنگ (شراب) میں بیہوشی کی دوا ملا کر پلا دیا اور جب سب کے سب بیہوش ہو گئے تو انڈین کمانڈوز کو وہاں پہنچا دیا جنہوں نے توپخانہ کے سارے جوانوں کو قتل کر ڈالا۔صرف ایک آدمی بچ گیا جس نے نیمو پہنچ کر اس تباہی کی اطلاع دی۔توپخانہ کو بھی آگ لگا کر تباہ کر دیا گیا۔اس وقت کرنل جیلانی دورہ پر کرگل پہنچنے والے ہی تھے۔

پسپائی

11 اکتوبر کو مجاہد سکاؤٹس کے کمانڈر کرنل جی ایم جیلانی محاذوں کے دورہ پر استور سے

سکردو پہنچ گئے اور چار روز قیام کے بعد 15 اکتوبر کو وہ کرگل روانہ ہو گئے۔ کرگل سے زوجی لہ پہنچے۔ زوجی لہ میں اس وقت برف پڑ چکی تھی جس کی وجہ سے آمدورفت بند ہوگئی تھی۔ لیکن سرما کا موسم ابھی مکمل طور پر پہنچا نہ تھا۔ تاہم دشمن فوج کی سوچی سمجھی خاموشی نے جیلانی کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس میں یہاں کے کمانڈر پہلے ہی مبتلا تھے۔ زوجی لہ پر دشمن کی طرف سے خاموشی اور لیہ محاذ پر اس کی روز افزوں نقل وحرکت اور بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر جیلانی نے فیصلہ کر لیا کہ چونکہ زوجی لہ برف کی وجہ سے بند ہو چکا ہے اور اب سے موسم بہار تک کے دوران اس طرف انڈین فوج کے حملوں کا کوئی خطرہ نہیں۔ لہٰذا اسی دوران پوری طاقت کے ساتھ لیہ کو فتح کر کے موسم بہار سے قبل ہی ساری فوج کو زوجی لہ پر جمع کیا جائے گا۔ سابق ایریا کمانڈر کرنل احسان علی نے ہر چند کرنل جیلانی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ زوجی لہ پر جب تک ایک گز برف نہ پڑے اسے بند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے دشمن کے حملوں کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن ان کی یہ کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی۔ غرض صرف دوسو فوجیوں کو زوجی لہ پر چھوڑ کر باقی فوج کو کرنل جیلانی نے فوراً لیہ محاذ پر پہنچنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں سارے تجربہ کار فوجی لیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس وقت لداخ کے اکثر غیر مسلم باشندے در پردہ مجاہدین کے دشمن بن چکے تھے۔ اس لئے وہ باقاعدگی سے بھارتی فوج کے لئے جاسوسی کرنے لگے تھے۔ بلتستان کے برعکس یہاں دشمن کی فوج کو مجاہدین کے متعلق ہر تفصیل ملتی تھی اور مجاہدین اس سے بے خبر تھے۔ عبدالرحمٰن نامی ایک کشمیری نائب صوبیدار کو مجاہدین نے دشمن فوج کے خلاف کارروائیوں کے دوران بطور قیدی پکڑ لیا تھا اور محض اس کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس پر اعتبار کر کے اسے کرگل میں وائرلیس سیٹ پر متعین کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی بھارتی فوج کے لئے جاسوسی کر رہا تھا۔ جب مسلمان فوج زوجی لہ سے لیہ کی طرف چلی آئی تو ان جاسوسوں نے دشمن کو صورت حال سے مطلع کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سکردو چھاؤنی کی فتح پر دو ہندو موچی ہاتھ آئے تھے۔ اکتوبر کے اواخر میں ان دونوں کو زوجی لہ کی طرف مجاہدین کے پھٹے ہوئے بوٹوں کی مرمت کے لئے روانہ کر دیا گیا تو یہ دونوں کسی

طرح سے دشمن کی طرف جانکلے اور انہیں اصل صورت حال کی اطلاع کر دی۔ زوجی لہ بند ہوا تھا اور نہ بند قرار دیا جاسکتا تھا۔ جیلانی نے محض دشمن کے دھوکے میں آ کر حالات کا غلط اندازہ کر لیا تھا۔ اس وقت زوجی لہ پر صرف ایک سو سولہ (116) سکاؤٹ موجود تھے۔ باقی کھدے ہوئے اور مضبوط مورچے اب خالی تھے۔ دو سو میں سے باقی چوراسی (84) سکاؤٹ دراس تک پھیلے ہوئے تھے۔ جیلانی 28 اکتوبر کو نیمو پہنچ چکے تھے۔ باقی فوج دراس سے لیہ تک کے راستوں میں بکھری ہوئی تھی۔ ادھر دشمن اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ چنانچہ یکم نومبر 1948ء کو کرنل راجندر سنگھ کی قیادت میں دشمن کی تین بٹالین فوج نے ٹینکوں کے ساتھ زوجی لہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہوائی اور توپخانے کی امداد بھی تھی۔ دھندلے موسم کی آڑ میں دشمن فوج مجاہدین کی اگلی دو پلاٹونوں اور پچھلی دو پلاٹونوں کے بیچ میں پہنچ چکی تھی۔ سارا دن رائفلوں سے ٹینکوں پر فائر کرتے رہے لیکن کچھ اثر ہوتا ہوا نظر نہ آیا تو راہ فرار اختیار کی۔ تین دن رات چل کر پچپن (55) نفر دراس پہنچے۔ باقی افراتفری میں دیگر اطراف کو بھاگ گئے۔ نو مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ توپخانہ بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ سقوط زوجی لہ کی خبر دراس پہنچی تو میجر قریشی نے پندراس کی گھاٹی پر دشمن کو روکنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن دشمن کی ہوائی بمباریوں اور توپخانے کی گولہ باریوں میں جان خطرے میں نظر آئی تو ایک دن کے مقابلے کے بعد پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ اسی گھبراہٹ میں ایمونیشن کے ذخائر کو دریا میں ڈالنے کے بعد دراس کو بھی خالی کر دیا۔ 15 نومبر کو بھارتی فوج نے بلا مزاحمت دراس پر قبضہ کر لیا۔

ادھر کرنل جیلانی نیمو میں 28 اکتوبر سے مجاہدین کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک سقوط زوجی لہ کی خبر موصول ہوئی تو انڈین فوج کو دراس میں روکنے کے لئے نیمو سے روانہ ہو گئے۔ 3 نومبر کو کھلسے ریسٹ ہاؤس میں انہیں یہ اطلاع ملی کہ انڈین فوج کی تین کمپنیاں یوروونگ کے مقام پر ان کی راہ میں گھات میں بیٹھی ہیں تو انہوں نے سکیور بوچن۔ داگرکون کا راستہ پکڑ لیا۔ کرگل پہنچنے پر زوجی لہ کے سیکٹر کمانڈر میجر قریشی کی زبانی دشمن کے حملوں کی شدت کا علم ہو گیا تو فوراً کرگل کو بھی خالی کر دیا۔ چنانچہ جیلانی کرگل سے فوج کے آفیسروں، جوانوں اور سول کارکنوں کے ساتھ میموش

تھنگ پہنچ گئے۔ان کے ساتھ پوریگ کے وہ بیشتار باشندے بھی گھر بار چھوڑ کر وطن کو خیر باد کہہ آئے جنہوں نے آخری دم تک انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا۔کرنل جیلانی کے ساتھیوں نے دشمن کی طرف سے تعاقب کے خوف سے کھہ رول پل کو آگ لگا کر جلا دیا۔انڈین فوج نے بآسانی کرگل پر قبضہ کرلیا۔

کرگل سے پسپائی کے وقت کرنل جیلانی نے لیہ سیکٹر کے مجاہدین کو بھی پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔چنانچہ 17 نومبر کو لیہ کا محاصرہ اٹھا کر مجاہدین نے پسپائی شروع کی۔دشمن کے حوصلے بڑھ چکے تھے لہٰذا اس نے تعاقب کیا۔نیمو میدان،اوملہ اور کھلسے پر طرفین میں سخت لڑائی ہوئی۔یہاں پر مجاہدین میں سے بعض شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔وہاں سے داگرکون پھرڈ مبوچن اور وہاں سے پوری فوج 27 نومبر کو دنسر پہنچ گئی۔28 نومبر کو دو سیکشن مجاہدین نے دنسر سے دریا پار دشمن فوجیوں پر چار انچ مارٹر سے گولیاں برسا کر انہیں پیچھے بھگا دیا۔مجاہدین کے ساتھ لداخ کے وہ مسلمان باشندے بھی بے سروسامانی میں ہجرت کر آئے جو اب تک مجاہدین کے دوش بدوش جدو جہد آزادی میں شریک رہے تھے۔

سردیاں شروع ہوگئی تھیں جس کے ساتھ دراس سے تلیل کی طرف کے راستے بند ہونے والے تھے چنانچہ تلیل میں متعین پلاٹون بھی واپس آ گئی۔یہ پلاٹون مٹائن پہنچ گئی تو اس وقت دراس پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔لہٰذا گلتری کے راستے ہرواس کی طرف چلی گئی۔گلتری میں صوبیدار شیر علی اور ان کے ساتھیوں سے اس کی ملاقات ہوگئی جو اس وقت استور کی طرف عازم سفر تھے۔یہ لوگ کھہ رول پہنچے تو معلوم ہوا کہ مجاہدین کرگل سے پسپا ہو چکے تھے۔چنانچہ حاجی مہدی (کورو)،حمید (چپلو) اور جواد (کت پناہ) تین حوالداروں کی سیکشنوں کو کھہ رول نہر پر چھوڑ کر نائب صوبیدار نجف علی میموش تھنگ چلے آئے جہاں فوج کے آفیسر سکردو کی طرف مزید پسپائی پر غور کر رہے تھے۔اسی دوران کھہ رول نہر کے مورچوں کے سامنے دریا پار دو سو میٹر کے فاصلے پر میدان میں دشمن کی ایک بٹالین فوج پہنچ گئی جس کے ساتھ قلیوں اور خچروں کا ایک قافلہ بھی تھا۔ادھر آرام کرنے کے بعد یہ فوج آگے بڑھنے کے لئے جمع ہوگئی تو مجاہدین نے مورچوں سے ایسی

شدید فائرنگ کر دی کہ چالیس لاشیں اور بیشمار زخمی چھوڑ کر دشمن فوج تتر بتر ہوگئی۔ شام تک چولی سکمبو سے دشمن نے بڑے ہتھیاروں سے نہر کے مورچوں پر گولیاں برسانا شروع کیں۔ اس کاروائی میں اسد (حسین آباد) اور کچورہ کا ایک جوان شہید ہو گئے۔ بعد میں اس پلاٹون کی جگہ سکاؤٹس کی ایک اور پلاٹون کھہ رول پر متعین ہوئی۔ اس دوران دریا عبور کر کے دشمن نے ہرداس کی ٹیکری پر قبضہ کر لیا جس کے ساتھ ہی سکردو سے براہ کھر منگ گلتری کا مستقل راستہ مسدود ہو گیا۔ ادھر لیفٹننٹ غلام مرتضیٰ نے اسی دوران ہندورمو کی طرف ٹیکریوں پر مورچے قائم کر لئے۔ دشمن کی ایک گورکھا کمپنی نے ان پر حملہ کر دیا۔ مرتضیٰ نے دشمن کے اسی (80) فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ باقی بھاگ گئے۔ اسی اثناء میں انڈین فوجی دستے بریسل چھوتک پٹرولینگ کے لئے پہنچ گئے جن میں سے بعض کو ہلاک کر دیا گیا اور باقی بھاگ گئے۔

لداخ سے پسپائی کے وقت نوبراہ بھی سگنل دیا گیا۔ چنانچہ کچھ پس وپیش کے بعد ادھر سے بھی مجاہدین نے پیچھے ہٹ کر بیوغدنگ میں بونگ لہ، لہ چوروک اور بیڈونگ پر مورچے قائم کر لئے۔ تعاقب کرنے والی گورکھا فوج نے اودماروکی طرف سے بونگ لہ پر حملہ کر دیا۔ تین روز کے مقابلے کے بعد مجاہدین نے پیچھے ہٹ کر چھولونکھا کے قریب ڈیفنس مضبوط کر لیا۔ دسمبر کے دوران دشمن نے تیپسے نالہ پر حملہ کر کے پہاڑی پر قبضہ کر لیا جس کے دوران محمد نذیر، کریم (کچورہ) اور شیر علی (شگری خورد) شہید ہو گئے۔ ایک سیکشن مجاہدین دشمن کے گھیرے سے بمشکل بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ادھر بانڈی پورہ پر پہلے حملے کے بعد ٹائیگر فورس نے گریز تک پسپائی اختیار کی تو دشمن نے گریز کی وادی پر آسانی قبضہ کر لیا۔ ٹائیگرز کی مدد کے لئے پہلے سکاؤٹس کی ایک پلاٹون پھر ایک فوج کے ساتھ کیپٹن نیک عالم اور اس کے بعد ایک بڑی فوج کے ساتھ میجر قریشی کو گریز سیکٹر کی طرف بھیجا گیا تھا۔ بعد میں جب میجر قریشی کو زوجی لہ کی طرف بھیجا گیا تو میجر برہان الدین کے ساتھ چترالی باڈی گارڈز تراگبل کی طرف متعین ہوئے۔ بایں ہمہ گریز پھر فتح نہ ہوسکا۔ تلیل میں متعین پلاٹون کی واپسی کے بعد انڈین فوج نے یہاں پر بھی قبضہ کر لیا۔

جنگ بندی

کرنل جیلانی 10 دسمبر کو سکردو سے براہ روندو گلگت چلے گئے۔ اس وقت تیرہ ہزار مربع میل کا آزاد شدہ علاقہ دشمن کے حوالے ہو چکا تھا اور اس ''خدمت،، کے صلے میں انہیں بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ بلتستان کی سرحدوں پر چھولونکھا، تورتوک، دنسر، واچرا، کافر پہاڑ، گنگنی اور گلتری کے ارد گرد مجاہدین کے مورچے تھے کہ اسی دوران یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی ہو گئی۔ لہٰذا سول انتظامیہ اور فوج کے ہیڈ کوارٹر کو کھرپتو سے سکردو میں منتقل کر دیا گیا۔ اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ وزیر ولایت علی خان 3 نومبر سے دو ماہ کی رخصت پر جا چکے تھے۔ ان کی جگہ تحصیلدار حکیم محمد لطیف کو بلتستان کا اے پی اے اور وزیر غلام مہدی کو تحصیلدار تعینات کیا گیا۔ انتظامیہ کی یہی صورت قائم رہی یہاں تک کہ ستمبر 1949ء میں محمد بہرام خان پی سی ایس نے ایڈیشنل پولیٹکل ایجنٹ بلتستان کی حیثیت سے انتظامیہ کا چارج سنبھال لیا۔

اسی دوران رنبیر گڑھ میں ایک کیپٹن حمید قیام کرتا تھا جس نے رنبیر گڑھ کی بجائے اپنے نام کی نسبت سے ''حمید گڑھ،، کا سائن بورڈ لگا دیا جس کے بعد سے اس جگہ کا یہی نام پڑ گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس جگہ کا نام آزادی بلتستان کے مرکزی کردار کرنل احسان علی (متوفی 1996ء) کے نام سے منسوب کر دیا جاتا جنہوں نے رنبیر سنگھ سمیت سارے ڈوگروں کا نام ونشان ہمیشہ کے لئے اس خطے سے مٹا کر رکھ دیا تھا!

ڈوگروں نے گمبہ سکردو میں ایک چھوٹا سا ہوائی اڈہ تعمیر کیا تھا لیکن وہ کبھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ حکومت پاکستان نے 19 اکتوبر 1948ء سے اس کی تعمیر نو کا حکم دے دیا۔ چنانچہ تین سو قلیوں نے روزانہ کام کیا اور نومبر کے آخر تک 1200x200 گز کا کچا ہوائی اڈہ تعمیر ہو گیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتے میں پاکستان ائیر فورس کے ایک بلتستانی پائلٹ سید محمد اصغر زیدی رات کے وقت فوجی برسٹل جہاز پشاور سے سکردو لائے اور سامان ڈراپ کر کے واپس ہوئے جو اس سرزمین میں پہلا پاکستانی جہاز تھا۔ اس کے بعد سے 31 دسمبر تک پاکستانی جہاز رات کے ایک دو بجے آتے اور

میر بول کے ریتلے میدان پر ڈراپینگ کر کے واپس جاتے رہے کیونکہ دن کے وقت انڈین فائٹر جہاز پاکستانی جہازوں پر حملہ کرتے تھے۔ جنگ بندی کے بعد سے یہ جہاز دن کے وقت آنے لگے۔ لیکن برف کی وجہ سے لینڈ نہ کر سکے۔ 16 مارچ 1949 کو پاکستانی جہاز پہلی بار سکردو اڈہ پر اتر گیا۔ اس کے بعد پشاور سے فوجی برسٹل اور پاکستان اور رینٹ ائیرویز کے ڈکوٹہ جہازوں کی باقاعدہ سروس شروع ہوگئی۔ انہی ابتدائی ایام میں ایک طیارہ غلطی سے میر بول میں اتر گیا۔ بعد میں پشاور کی بجائے راولپنڈی سے ہوائی سروس شروع ہوگئی۔

جنگ بندی کے بعد جنگ کے دوران کی بدعنوانیوں اور کوتاہیوں پر تنقید کرتے ہوئے ایک گمنام قلمی ہفت روزہ 'صدائے جرس، سکردو میں شائع ہوا۔ اس موضوع پر مسلم لیگ کی سکردو کی شاخ نے بھی ایک قلمی پندرہ روزہ 'جمہور، جاری کیا جو کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

پدم سے مجاہدین کی واپسی

پدم زانسکر کا صدر مقام ہے جو کرگل سے 240 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ پدم کی تھوڑی سی آبادی مسلمان اور زانسکر کی باقی ساری آبادی بدھ مت کی پیرو ہے۔ یہاں ابتداء میں ہنزہ کے چھتیس (36) جوان متعین تھے۔ سکردو چھاؤنی کی فتح کے بعد جب ایک نئی فوج کرگل پہنچی تو کرنل احسان علی نے کواردو کے نائب صوبیدار حاجی محمد علی کے ساتھ ایک بلتی پلاٹون کو بھی پدم بھیج دیا۔ سرما کی آمد آمد تھی اسی دوران ہنزہ کے جوانوں کو واپس بلا لیا گیا اور ان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے پدم کے بعض رضا کاروں کو سکاؤٹس میں بھرتی کر لیا گیا۔

سرما کی آمد کے ساتھ ہی پدم سے کرگل اور دراس کی طرف راستے بند ہونے والے تھے۔ اسی دوران زوجی لہ، دراس، کرگل، لیہ اور نوبراہ سے مجاہدین کی اچانک پسپائی ہوئی جس کی اطلاع پدم میں حاجی محمد علی کو نہ بھیجی جا سکی۔ کیونکہ ان کے پاس وائرلیس سیٹ نہ تھا اور نہ ایلچی بھیج کر خبر دینے کی ہی فرصت تھی۔ چنانچہ انڈین فوجوں نے سورو اور لیہ کی طرف سے آگے بڑھ کر پدم کو محاصرے میں لے لیا اور مورچوں سے چیخ کر مجاہدین کی پسپائی کی خبر دی۔ حاجی محمد علی نے دشمن

کے اس فعل کو جنگی چال پر محمول کر کے زبردست مقابلہ شروع کیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ لیہ کو مجاہدین نے فتح کیا ہے جہاں سے یہ انڈین فوج براہ زانسکر کشتوار کی طرف بھاگ رہی ہے۔ اسی دوران جنگ بندی ہو گئی۔ دشمن کی فوج نے پھر مورچوں سے چلا کر اس کی اطلاع دیتے ہوئے ہتھیار ڈالنے پر زور دیا۔ لیکن مجاہدین نے اسے بھی جنگی چال خیال کیا اور ڈٹ کر مقابلہ جاری رکھا۔ 5 جنوری 1949ء کو عبد اللہ (کواردو) سکندر (روندو) اور حاجی حسین (حسین آباد) پٹرولینگ پر تھے کہ دشمن نے ان پر فائرنگ کر دی۔ حاجی حسین وہیں پر شہید ہو گیا۔ عبد اللہ بچ نکلا اور سکندر زخمی ہو کر دشمن کے پاس قید ہو گیا۔

جنگ بندی لائن سے 256 کلومیٹر کے فاصلے پر پدم میں مجاہدین کا یہ دستہ دشمن کے مکمل نرغے میں تھا۔ لیکن اب تک اسے حقیقی صورت حال کا کوئی علم نہ تھا۔ پدم کے باشندے مجاہدین کے ساتھ اب تک ہر قسم کا تعاون کرتے رہے تھے۔ انہیں اپریل کے پہلے ہفتے میں اصل صورت حال کا علم ہو گیا کہ زانسکر بھارت کے قبضے میں جا چکا ہے اور انہیں بھارتیوں کے ساتھ رہنا ہے اور یہ کہ حاجی محمد علی اور ان کے ساتھیوں کی جلد یا بدیر تباہی یقینی ہے۔ خیر مجاہدین تو شہید ہونے پر تیار تھے لیکن مقامی باشندوں کے لئے گھر بار اور بال بچوں کے ساتھ دشمن کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا ممکن نہیں تھا جو مسلمان پلاٹون کی تباہی کے بعد یقینی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں اور انڈین فوج کے کمانڈر کے نام ایک خفیہ خط لکھ بھیجا جس میں ان کے ساتھ وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ فوج کے ایک صوبیدار بیر بہادر نے طنزاً سکندر سے اس خط کا ذکر کیا جو اب تک زخمی حالت میں اس کے پاس قید تھا۔ 7 اپریل کو سکندر قید خانے سے بھاگ کر ساتھیوں کے پاس آ پہنچا اور اس نے حاجی محمد علی کو اس خط کے بارے میں اطلاع دے دی۔ تفتیش کی گئی تو اس کی صداقت ثابت ہو گئی۔ لیکن کیا چارہ تھا۔ ان پر کڑی نگرانی رکھی گئی۔

اپریل کے وسط تک حاجی محمد علی کو بھی زوجی لہ اور لیہ سے مجاہدین کی پسپائی اور جنگ بندی کے بارے میں افواہوں پر شک ہو گیا۔ کیونکہ سردیاں گزر چکی تھیں لیکن کرگل، دراس اور لیہ کی طرف سے مجاہدین سے ان کا رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ دو جوانوں غلام علی (چپلو) اور موسیٰ

عرف سولو کو انہوں نے بطرف کرگل مخبری کے لئے روانہ کر دیا جو گداگروں کے بھیس میں چلتے ہوئے مئی کے پہلے ہفتے میں کرکت سے پاکستانی علاقے میں داخل ہوئے اور پدم کے حالات بیان کئے۔ حکومت پاکستان کو پدم پارٹی کے بارے میں اب تک کوئی خبر نہ تھی۔ اور یہ اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ وہاں پر متعین مجاہدین یا تو شہید یا گرفتار ہو چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا اور پدم سے مجاہدین کی بحفاظت واپسی کے لئے حکومتی سطح پر ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

ادھر پدم میں ایمونیشن کا ذخیرہ خالی ہونے لگا تھا۔ جاسوسوں کے ذریعے دشمن کو اس کا علم ہو گیا تو حملوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ نائب صوبیدار حاجی محمد علی ایک با تدبیر اور جر□ تمند انسان تھے۔ انہوں نے ایمونیشن کے خالی بکسوں میں کنکر اور ریت بھروایا اور میخیں لگا کر بند کر کے چند بودھ قلیوں کے ذریعے دوسرے کمرے میں منتقل کروایا۔ ان بودھوں نے سوچا کہ یہ ایمونیشن کے بند بکس ہیں اور جا کر دشمن کی فوج کو بتا دیا کہ ابھی مسلمان پلاٹون کے پاس ایمونیشن کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس تدبیر سے حملوں کی شدت میں کچھ تخفیف ہو گئی۔ اس چال کے ساتھ ہی حاجی محمد علی نے ٹیم بنا کر پولو کھیلنا شروع کر دیا جس سے دشمن کو اور بھی یقین ہو گیا کہ محصوروں کے پاس لڑائی جاری رکھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن اسی دوران ایک مسلمان لداخی رضا کار عبدالرزاق بھاگ کر دشمن کی امان میں چلا گیا جو اب تک حاجی محمد علی کے پاس بطور کوارٹر ماسٹر کام کرتا رہا تھا۔ سندوس کے محمد امین سمیت پدم کے بعض مجاہدین اس شخص کا نام حسن رزاقپہ بتاتے ہیں۔ لیکن دوسرے مجاہدین کا کہنا ہے کہ اس کا نام عبدالرزاق تھا۔ اس نے مجاہدین کی ساری کمزوریوں کی نشاندہی کر ڈالی۔ مجاہدین پر اب وقت بڑا سخت آ پہنچا تھا۔ کمک اور امداد کی راہیں بند تھیں۔ ایمونیشن، راشن اور کپڑوں کا سٹاک ختم ہو چکا تھا۔ مقامی باشندے منہ پھیر چکے تھے۔ اب ساتھی بھی چھوڑ کر جانے لگے تھے۔ حاجی محمد علی کی مضبوط قوت ارادی ہی انہیں ہتھیار ڈالنے سے روک سکتی تھی۔ شیر دل جوانوں نے ان حالات کا بھی نہایت دلجمعی سے مقابلہ کیا۔ عبدالرزاق دشمن کے پاس بہت عزیز ہو چکا تھا۔ چنانچہ حاجی محمد علی نے عبدالرزاق کے

نام ایک جھوٹا خط لکھا:

''تم نے کہا تھا کہ جلدی کچھ خبر لے کر آؤں گا لیکن اب تک نہ تم خود واپس آ گئے اور نہ اپنی خیریت کے بارے میں کوئی خبر بھیجی جس سے ہم تمہاری خیریت کے بارے میں پریشان ہیں۔ خدارا جلدی پہنچ جاؤ،،

ایک قیدی کے ہاتھ یہ خط عبدالرزاق کو بھیج دیا۔ اس قیدی کو مخفی طور پر عبدالرزاق کو پہنچانے اور کسی اور کو نہ دکھانے کی اتنی تاکید کی کہ اسے خط کے متن پر شک ہو گیا اور سیدھا لے جا کر دشمن کی فوج کے حوالے کر دیا۔ کمانڈر کو یقین ہو گیا کہ عبدالرزاق مسلمان فوجیوں کی طرف سے یہاں جاسوسی کے لئے آیا ہے اور اس کی بتائی ہوئی ساری باتیں غلط ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی وقت عبدالرزاق کو بلا کر لیہ کی طرف روانہ کر دیا اور اس کے پیچھے دو فوجیوں کو بھیجا جنہوں نے اسے قتل کر کے کسی گڑھے میں ڈال دیا۔ اس طرح وہ کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

جون 1949ء میں بھارتی حکومت کی اجازت سے لیفٹننٹ غلام مرتضیٰ سولو سمیت آٹھ جوانوں کے ایک وفد کے ساتھ کرگل کے راستے پدم پہنچ گئے اور حاجی محمد علی کو صورت حال سے آگاہ کیا کہ وہ انہیں بحفاظت واپس لینے کے لئے آئے ہیں۔ حاجی محمد علی نے یہ سوچ کر کہ مرتضیٰ دشمن کے پاس قید ہوں گے جن کے دباؤ کے تحت انہیں دھوکہ دے رہے ہیں ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں مرتضیٰ نے قسمیں کھائیں تو بمشکل ان پر اعتبار کیا گیا۔ دوسرے روز بھارتی فوجیوں نے مجاہدین کے لئے دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد میجر کشندر نے تقریر میں پدم پارٹی کی دلیری اور شجاعت کی داد دی۔ اس دوران غلام مرتضیٰ نے زانسکر کے باشندوں کو ان سے لی ہوئی اشیاء کی قیمتیں ادا کر دیں۔ زانسکر سے چل کر یہ پارٹی کرگل پہنچی۔ ان کے ساتھ پدم کے وہ باوفا نوجوان بھی گھر بار اور خویش و اقارب چھوڑ کر ہجرت کر آئے جو آخری دم تک مجاہدین کے ہمرکاب رہے تھے۔ کرگل میں بھارتی فوجیوں نے اس پارٹی کا شاندار استقبال کیا اور اس کی بڑی تعریف کی۔ کرگل سے چل کر یکم جولائی 1949ء کو یہ پارٹی کھرول سے بلتستان میں داخل ہوئی۔ قریہ قریہ اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ 6 جولائی کو پارٹی سکردو پہنچ گئی تو اسے اکیس (21) توپوں کی

سلامی دی گئی۔ ہزاروں باشندوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس سلسلے میں ایک پر تکلف تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد سارے مجاہدین کو دو مہینے کی رخصت پر گھروں کو بھیج دیا گیا۔

1949ء کے دوران ریاست جموں و کشمیر کی تحریک آزادی کے قائد چوہدری غلام عباس مرحوم بلتستان کے دورہ پر سکردو پہنچے۔ (ڈرائی سیل سمیت پانچ ریڈیوسیٹ ساتھ لائے تھے جو تقسیم کر دیئے گئے۔ یاد رہے کہ بلتستان میں ریڈیوسیٹ پہلی بار 1935ء میں ایک انگریز مبلغ مسٹر ریڈ ساتھ لایا تھا)۔ چوہدری صاحب نے پدم پارٹی کے جوانوں سے ملاقات کی اور ان کی بہادری کی بڑی تعریف کی۔ سکردو میں اس وقت مسلم لیگ کی شاخ قائم تھی۔ چوہدری صاحب نے اسے توڑ کر یہاں مسلم کانفرنس کی شاخ قائم کر لی۔

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم نے پدم پارٹی کے بہادر جوانوں کو ملاقات کے لئے راولپنڈی بلالیا۔ بعد میں وزیر اعظم نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ان سے گلگت میں ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت یہ پارٹی راولپنڈی پہنچ چکی تھی۔ اس لئے جی ایچ کیو میں کمانڈر انچیف اور دیگر فوجی آفیسروں نے ان سے ملاقات کر کے ان کی شجاعت اور جوانمردی کی داد دی۔ 1949ء کے اواخر میں وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم گلگت کے دورہ پر آئے۔ بلتستان سے ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے گلگت گیا جس میں موضع گول کے آغا ہادی، راجہ سکردو، راجہ روندو، راجہ شگر، راجہ کریس، راجہ خپلو، راجہ طولتی، راجہ کھرمنگ، پدم پارٹی کے نمائندے اور تحصیلدار وزیر غلام مہدی تھے۔ آغا ہادی نے ملاقات کے دوران فارسی زبان میں بلتستان کے بارے میں ایک تقریر کی۔ وزیر اعظم نے اس ملاقات میں پدم پارٹی کے جوانوں کو نقد انعامات دے دیئے۔

......☆......

چھٹا باب

آزادی کے بعد

ایف سی آر کا نفاذ

یکم نومبر 1947ء کو ہنزہ، نگر، گلگت، پنیال، یاسین اور گوپس سے تعلق رکھنے والی نفری پر مشتمل گلگت سکاؤٹس نے مسلح بغاوت کے ذریعے گلگت میں ڈوگرہ حکومت کا خاتمہ کر ڈالا۔ انقلابیوں نے ''جمہوریہ گلگت'' کے نام سے ایک حکومت قائم کی۔ تحریک کے ایک سرگرم کارکن شاہ رئیس خان کو صدر جمہوریہ اور کیپٹن مرزا حسن خان کو فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ جمہوریہ گلگت کے حکومتی اراکین نے حکومت پاکستان سے بذریعہ تار درخواست کی کہ وہ اپنا نمائندہ بھیج دیں تاکہ اس علاقے کا پاکستان کے ساتھ الحاق عمل میں آئے۔

گلگت میں انگریزوں نے 1889ء سے ایک پولیٹیکل ایجنسی قائم کر رکھی تھی اور اتفاق سے صوبہ سرحد سے متصل مغربی سرحدی علاقوں میں بھی انگریزوں نے پولیٹکل ایجنسیاں قائم کر رکھی تھیں۔ تقسیم ہند سے پہلے ان ایجنسیوں کا انتظام وائسرائے ہند نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ ایجنسیاں کسی صوبے میں شامل نہیں تھیں بلکہ ان کا انتظام براہ راست گورنر جنرل پاکستان کے ہاتھ میں ہوتا تھا جنہوں نے ان ایجنسیوں کا انتظام گورنر جنرل کے نمائندے برائے پولیٹکل ایجنسیز کی حیثیت سے صوبہ سرحد کے گورنر کو سونپا ہوا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل پاکستان نے گورنر سرحد کو گلگت میں نمائندہ بھیجنے کا حکم دیا۔ گورنر سرحد نے صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے ایک تحصیلدار سردار محمد عالم خان کو پولیٹکل ایجنٹ بنا کر گلگت روانہ کر دیا جس نے 16 نومبر 1947ء کو گلگت پہنچ کر نئے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔

جمہوریہ گلگت کے قائدین کی درخواست پر پاکستان کا نمائندہ گلگت پہنچ گیا لیکن ان

قائدین کی طرف سے نہ صرف دستاویز الحاق کے حوالے سے کوئی شرائط یا تجاویز سامنے نہ آئیں بلکہ دستاویز الحاق مرتب کرنے کی بات ہی نہیں کی گئی۔ یہ وہ خطا تھی جو لمحوں میں سرزد ہوگئی جس کی سزا نہ معلوم کتنی صدیوں کو بھگتنا پڑے۔ اگر اس موقع پر جمہوریہ گلگت اور حکومت پاکستان کے مابین دستاویز الحاق مرتب کی جاتی جو اس وقت آسانی سے ہوسکتا تھا تو اس علاقے کے باسیوں کے ساتھ بعد میں ہونے والی ناانصافیوں کا لامتناہی سلسلہ وقوع پذیر ہی نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں جمہوریہ گلگت کے قائدین کو اس تاریخی غلطی کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

صوبہ سرحد سے متصل جو پولیٹکل ایجنسیاں تھیں ان میں قبائلی طرز معاشرت رائج تھا۔ قبائل کے آپس میں دشمنیاں تھیں، مسلح لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور جرائم عام تھے۔ لوگ باغیانہ مزاج کے تھے۔ امن نامی چیز کا وجود ہی نہ تھا۔ جرائم کی اسی غیر معمولی شرح کی وجہ سے انگریزوں نے ان سرحدی ایجنسیوں میں فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن 1901ء (سرحدی جرائم کا قانون) نافذ کر رکھا تھا۔ لیکن گلگت ایجنسی کا علاقہ قطعاً ایسا نہ تھا جہاں ایف سی آر کے نفاذ کا جواز موجود ہو۔ یہاں نہ قبائلی نظام زندگی کا وجود تھا۔ نہ اس طرح کی دشمنیاں تھیں اور نہ کوئی مسلح لڑائی ہوتی تھی۔ جرائم کی شرح بھی معمول سے زیادہ نہ تھی۔ اسی لئے انگریزوں نے گلگت ایجنسی کو ایف سی آر کے نفاذ سے مستثنیٰ رکھا تھا۔ اپنے پیشرو انگریز حکمرانوں کی اس واضح پالیسی کا تجزیہ کر کے صورت حال کو سمجھنے کی بجائے سردار عالم خان نے سطحی سوچ کے ساتھ بلا جواز گلگت ایجنسی میں بھی ایف سی آر کا کالا قانون نافذ کر دیا جس کے ساتھ ہی یہاں کے باشندے نہ صرف تنظیم، تحریر اور تقریر وغیرہ کی آزادی کے بنیادی حقوق سے یکسر محروم ہو گئے بلکہ انصاف کے حصول کے لئے ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے بھی ان پر بند ہو گئے۔ فروری 1948 میں جنگ آزادی کے آغاز کے ساتھ ہی بلتستان بھی گلگت ایجنسی کے ماتحت آ گیا اور یوں ایف سی آر کا طوق بلتستانیوں کے گلے میں بھی پڑ گیا۔

بلتستان میں لوگ مہذب اور علاقہ پرامن تھا جہاں جرائم کی شرح ہمیشہ سے صفر یا اُس کے آس پاس ہی رہی ہے جس سے نبٹنے کے لئے عام قوانین ہی کافی تھے۔ ایف سی آر یعنی سرحدی

جرائم کا قانون ایسے سرحدی علاقوں کے لئے بنایا گیا تھا جہاں جرائم کی غیر معمولی شرح کی وجہ سے عام قوانین کے ذریعے ان کا انسداد ممکن نہ تھا۔ان حالات میں صفر فیصد جرائم کی شرح والے علاقے بلتستان میں ایف سی آر کا نافذ کیا جانا بلتستان کے باسیوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ اقدام ہونے کے علاوہ سردار عالم خان کی اہلیت پر ایک سوالیہ نشان بھی تھا۔اسی لئے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اگر اس وقت چھوٹی پوسٹ پر کام کرنے والے ایک رینکر کی بجائے سپیریئر سروس کے کسی اعلی عہدہ دار کو گلگت میں پولیٹکل ایجنٹ متعین کیا گیا ہوتا تو گلگت بلتستان میں ایف سی آر نافذ کرنے جیسا غیر ذمہ دارانہ بلکہ جاہلانہ اقدام نہ ہوا ہوتا۔

واضح رہے کہ اس وقت تانگیر اور داریل کا علاقہ گلگت ایجنسی میں شامل نہیں تھا جنہیں نومبر 1951 کے بعد گلگت ایجنسی میں شامل کیا گیا تھا۔

مسئلہ کشمیر کی لپیٹ میں

گلگت کی آزادی کے بعد جب بلتستان میں آزادی کی جنگ زوروں پر تھی اس وقت 21 اپریل 1948ء کو اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ جموں وکشمیر کے ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے جمہوری طریقے سے کیا جائے گا۔اس وقت انڈیا کی عیاری سے پردہ نہیں اٹھا تھا اور رائے شماری کا مسئلہ زیادہ سے زیادہ مہینوں کا معاملہ نظر آتا تھا۔چنانچہ حکومت پاکستان کے فیصلہ سازوں کو اب گلگت بلتستان یاد آ گیا تاکہ بظاہر مستقبل قریب میں منعقد ہونے والی رائے شماری میں ان علاقوں کے ووٹ پاکستان کے حق میں پڑیں جو یقینی امر تھا۔اس سلسلے میں 28 اپریل 1949ء کو کراچی میں حکومت پاکستان، حکومت آزاد کشمیر اور آزاد کشمیر کی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت گلگت بلتستان کو ریاست جموں وکشمیر کے تنازعے کا حصہ بنا دیا گیا۔یہ معاہدۂ کراچی کے نام سے مشہور ہے۔اس معاہدے پر حکومت پاکستان کے وفاقی وزیر بے محکمہ مشتاق احمد گورمانی، آزاد کشمیر کے صدر سردار ابراہیم خان اور مسلم کانفرنس کے صدر چوہدری غلام عباس نے دستخط کئے۔اس

معاہدے میں گلگت بلتستان کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔گلگت بلتستان والوں نے اس معاہدے کو کبھی قبول نہیں کیا۔ان کا ہمیشہ سے اٹل اور دوٹوک موقف رہا ہے کہ گلگت بلتستان کا پاکستان کے ساتھ الحاق عمل میں آچکا ہے اور ان کا کشمیر اور مسئلہ کشمیر دونوں سے کوئی تعلق نہیں۔

واضح رہے کہ جموں وکشمیر کا مسئلہ کوئی حادثاتی واقعہ نہیں جو اچانک رونما ہوا ہو۔ یہ ایک سوچی سمجھی پلاننگ کا نتیجہ ہے جس کے پیچھے انڈین کانگریس اور اس کی ہمدرد انگریز حکومتی مشینری، ہندوستان بھر سے قیام پاکستان کے مخالف مسلمان لیڈروں، مذہبی وغیر مذہبی تنظیموں اور ان کے وظیفہ خور کشمیری ایجنٹوں کی بڑے پیمانے پر سازشیں کارفرما تھیں۔اگر ان منصوبہ سازوں کی کاوشیں کامیاب ہو جاتیں تو آج ''ریاست جموں وکشمیر وتبت ہا'' کا سارا علاقہ انڈیا کے قبضے میں ہوتا۔ ان حالات میں گلگت بلتستان کے بہادر باسیوں نے قیام پاکستان کے مخالف ان طاقتور عناصر کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملایا، اُنہیں شکست دے کر اپنے علاقے کو آزاد کرایا اور متفقہ طور پر اس کا پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا۔ چنانچہ 16 نومبر 1947ء سے گلگت بلتستان پاکستان کے حصے کے طور پر پاکستان میں شامل تھا اور پاکستان کے گورنر جنرل کے اپریل 1948ء میں جاری کردہ ایک حکم نامے کے تحت پاکستان میں شامل دوسری ایجنسیوں کی طرح اسے بھی صوبہ سرحد کے گورنر کے زیر انتظام رکھا گیا تھا جو پولیٹکل ایجنسیوں کے لئے گورنر جنرل کا نمائندہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن پاکستان کے ارباب حکومت نے ان کی قربانیوں، کارناموں اور رضا کارانہ الحاق کے اس تاریخی عمل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہاں کے باشندوں کی مرضی کے خلاف ریاستی طاقت کے زور پر مسئلہ کشمیر کا پھندا ان کے گلے میں ڈال دیا۔اس جابرانہ اقدام نے پاکستان کے نام پر مر مٹنے والے گلگت بلتستان کے باسیوں کے اُن سُہانے خوابوں کو چکنا چور کر دیا جو اُنہوں نے پاکستان میں شمولیت کے حوالے سے دیکھے تھے اور آگے بڑھ کر اتنی کٹھن منزلیں طے کر لی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان وطن کے پرستاروں کے خلاف آئینی حقوق سے محرومی اور دیگر زیادتیوں اور ناانصافیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کا آغاز ہی ارباب اقتدار کے اسی اندھیر نگری پر مبنی اقدام سے ہو گیا۔گلگت بلتستان کے باشندے پہلے ہی ایف سی آر کے نفاذ کی وجہ سے بنیادی

حقوق سے محروم ہو چکے تھے اور انصاف کے حصول کے لئے ان پر ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔اب مسئلہ کشمیر سے منسلک ہو جانے سے پاکستان کے ایوانوں میں نمائندگی کے آئینی حقوق سے بھی محروم ہو گئے۔

بیوروکریسی کا راج

1950ء میں گلگت بلتستان کا انتظام چلانے کی ذمہ داری پاکستان کے گورنر جنرل کے نمائندے برائے پولیٹکل ایجنسیز گورنر سرحد سے اٹھائی گئی اور گلگت بلتستان کو وزارت امور کشمیر کے ماتحت کر کے اسی وزارت میں پولیٹکل ریزیڈنٹ کا عہدہ نکال کر اسے یہاں کا انتظامی سربراہ متعین کیا گیا جبکہ وہی مشیر اعلیٰ برائے حکومت آزاد جموں وکشمیر بھی ہوتا تھا۔اس انتظامی تبدیلی کے ساتھ ہی گلگت بلتستان پر بیوروکریسی کا راج قائم ہو گیا جنہیں بیک وقت انتظامیہ اور عدلیہ دونوں کے اختیارات حاصل تھے۔صوبائی حکومت کے اختیارات وزارت امور کشمیر کے سکریٹری اور اس کے ماتحت بیوروکریٹس کے پاس ہوتے تھے جنہوں نے 2009 تک بلا شرکت غیرے گلگت بلتستان پر مزے سے حکومت کی۔

پولیٹکل ریزیڈنٹ مقامی انتظامیہ کا سربراہ ہونے کے علاوہ ریونیو کمشنر، کمشنر برائے ایف سی آر اور ہائی کورٹ کا جج بھی ہوتا تھا۔1952ء میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کا عہدہ ختم کر کے اُسے ریزیڈنٹ اِن گلگت اینڈ بلتستان بنایا گیا اور وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سکریٹری کو اس عہدے کا اضافی چارج دیا گیا۔1967ء میں اس عہدے کو علیحدہ کر کے ریزیڈنٹ اِن گلگت اینڈ بلتستان کو گلگت میں متعین کیا گیا۔

پولیٹکل ایجنٹ کے پاس مروجہ اختیارات کے علاوہ کلکٹر برائے ریونیو، ڈسٹرکٹ وسیشن جج، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ڈی آئی جی پولیس، ڈائریکٹر محکمہ تعلیم اور آفیسر موسمیات کے اختیارات بھی تھے۔بعد میں نئے محکموں کے قیام کے ساتھ اسے کنزرویٹر فارسٹ، ڈائریکٹر محکمہ زراعت، ڈائریکٹر اینمل ہسبنڈری، سپرنٹنڈنٹ پی ڈبلیو ڈی، ڈائریکٹر سول سپلائیز، ڈائریکٹر محکمہ دیہی

ترقیات، کنٹرولنگ آفیسر کو آپریٹیو سوسائٹیز اور چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل کے اختیارات بھی دیئے گئے۔ اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کو اسسٹنٹ کلکٹر، سب ڈویژنل مجسٹریٹ، سب جج، اور ایس پی کے اختیارات حاصل تھے۔ تحصیلدار کے پاس مجسٹریٹ درجہ دوم، سول جج، اور ڈی ایس پی کے اختیارات اور نائب تحصیلدار کے پاس مجسٹریٹ درجہ سوم، سول جج اور انسپکٹر پولیس کے اختیارات ہوتے تھے۔ یوں یہاں مضبوط نوکر شہنشاہی مسلط ہوگئی۔ عدالتی اور انتظامی اختیارات کے ایک ہی فرد میں ارتکاز سے انصاف کا حصول تقریباً ناممکن ہوگیا۔ ظلم بھی وہی کرتے تھے۔ انصاف بھی انہی سے مانگنا پڑتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے لئے کسی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا دروازہ کھلا نہ تھا۔ ان کے علاوہ تعلیم، صحت، مواصلات، بے روزگاری، مہنگائی اور رفاہ عامہ کے اور بھی بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ غرض جس آزادی کا یہاں کے باسیوں نے خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوا بلکہ ایف سی آر، ایجنسی اور آئینی اور بنیادی حقوق سے محرومی کی صورت میں انتہائی ظالمانہ نظام ان پر مسلط ہوگیا۔ اس دور میں گلگت بلتستان والوں کا خوب استحصال کیا گیا۔

بلتستان کا قانونی بندوبست 1902ء میں پہلی بار اور 1916ء میں دوسری مرتبہ ہوا تھا جس کے بعد ڈوگروں نے نقد مالیہ اور اجناس کے لگان کی شرح معین کی تھی۔ حکومت پاکستان نے آزادی کے بعد بھی یہاں کے غریب عوام سے اسی شرح سے مالیہ اور لگان کی وصولی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اکثر علاقوں میں بیگار لئے جانے کی رسم بھی بدستور جاری رکھی گئی۔

فروری 1948ء سے ستمبر 1949ء تک گلگت ایجنسی کی طرف سے ایک اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ بلتستان میں انتظامیہ کا سربراہ رہا۔ اس کے بعد ستمبر 1949ء میں بلتستان کو سب ایجنسی بنا کر پولیٹکل ایجنٹ گلگت کے ماتحت سکردو میں ایک ایڈیشنل پولیٹکل ایجنٹ تعینات کردیا گیا۔ جنوری 1964ء میں بلتستان کو علیحدہ پولیٹکل ایجنسی بنا کر براہ راست وزارت امور کشمیر کے جوائنٹ سیکریٹری کے ماتحت یہاں ایک پولیٹکل ایجنٹ متعین کیا گیا۔ اسی سال چھلو کو الگ سب ڈویژن کا درجہ دیا گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گلگت کے پولیٹکل ایجنٹ سردار عالم خان نے اپنے صوبے

سے تعلق رکھنے والے ریٹائرمنٹ کے قریب تین عمر رسیدہ افسروں سردار بہرام خان کو بحیثیت ایڈیشنل پولیٹکل ایجنٹ بلتستان، بریگیڈیئر (بعد میں فیلڈ مارشل) ایوب خان کے بھائی سردار اقبال خان کو بحیثیت تحصیلدار اور میر خلیل الرحمٰن نامی ایک شخص کو بحیثیت نائب تحصیلدار سکردو میں تعینات کردیا۔ پاکستان کی طرف سے سکردو میں متعین ان تینوں اولین پاکستانی افسروں کو بلتستان کے لوگ اچھے الفاظ سے یادنہیں کرتے ہیں۔

احتجاج

پاکستان میں شامل دوسرے سارے علاقوں کو تقسیم ہند کے فیصلے کے نتیجے میں آزادی ہاتھ آئی تھی۔ انہیں کسی جنگ کے لڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود انہیں تمام حقوق حاصل تھے جب کہ گلگت بلتستان کے لوگوں نے انڈین فوج کے خلاف ایک زبردست جنگ لڑ کر بے شمار جانی و مالی قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی تھی اور اپنی مرضی سے پاکستان میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کے باوجود ایف سی آر کے کالے قانون کے نفاذ کے ذریعے انہیں آئینی اور بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا تھا اور نوکر شاہی بری طرح سے ان کا استحصال کر رہی تھی۔ عملاً انہیں دوسرے درجے کا شہری بنا رکھا تھا۔ ظاہر ہے یہ قابل برداشت چیز نہ تھی۔ چنانچہ ان اقدامات کے خلاف احتجاجی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

راجاؤں کے دور میں یہاں سیاسی تنظیموں کا کوئی تصور نہ تھا۔ ڈوگرہ دور میں بھی یہاں کے باشندوں کا سیاست سے کوئی تعلق نہ رہا۔ بلتستان بھر میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے تنظیمیں قدیم زمانوں سے قائم چلی آرہی تھیں جن کی قیادت مذہبی علماء کے پاس تھی۔ لیکن یہ علماء سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کو لہو ولعب کی طرح خیال کرتے تھے۔ اسی لئے بلتستان کے اندر لوگوں کا سیاسی شعور خفتہ ہی رہا۔

ڈوگرہ دور میں بلتستان کے ہزاروں باشندے روزگار کی تلاش میں ہندوستان کے مختلف شہروں شملہ، رام پور، راج گھاٹ، دھیرادون، امباڑی، ہری پور، کالسی گیٹ، چکراتا، مسوری،

جھاڑاپانی، نینی تال، رشی کیس، پتھوڑا گھر، ڈلہوزی وغیرہ میں جاکر آباد ہوئے تھے۔اس قوم میں صلاحیتوں کی کمی تو تھی نہیں۔سازگار حالات میسر آگئے تو انہوں نے بہت ترقی کی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے گرمائی صدر مقام شملہ شہر کا منتخب نائب رئیس بلدیہ خان بہادر سید مہدی شاہ بلتی تھے۔اُس وقت رئیس بلدیہ ایک غیر منتخب انگریز ہوا کرتا تھا۔ان کے علاوہ بلتستان کے ایک اور فرزند مرزا بدرالدین کو بھی حکومت نے خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ٹھیکیدار شکور علی نے بھی بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں آباد ان بلتستانیوں نے اپنے بھلے وقتوں میں اپنی غریب قوم کو بھولا نہیں بلکہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھا اور ان کی خدمت کی۔

تقسیم ہند کے بعد ایسے بلتی تارکین وطن کی کثیر تعداد پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کراچی، لاہور، کوئٹہ اور راولپنڈی وغیرہ میں منتقل ہوگئی۔ان کی اکثریت کراچی میں سکونت پذیر ہوئی۔شہروں میں رہنے کی وجہ سے یہ لوگ ملکی اور بین الاقوامی سیاست اور شہریوں کے حقوق سے بخوبی واقف تھے۔گلگت بلتستان کی صورت حال کا انہیں علم ہوا تو ان سے رہا نہ گیا۔قوم کے اولین محسن یہی لوگ تھے جنہوں نے یہاں پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ان کے وفود اور نمایندوں نے اعلیٰ حکام اور ملکی لیڈروں سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں اور مطالبات پیش کئے۔اس کے علاوہ انہوں نے وقتاً فوقتاً پوسٹر شائع کئے اور مظاہرے کئے۔بعد میں ان کے بعض نمایندوں نے بلتستان کا دورہ کر کے یہاں کے مسائل کا عینی مشاہدہ کیا اور واپس جاکر مطالبات اور اپیلوں کے خصوصی مجموعے چھپوا کر حکومت کو پیش کئے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مقامی باشندوں میں بھی سیاسی شعور کو بیدار کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔

قوم کے ان بے لوث خدمت گاروں میں سے محمد اسحاق شگری، ٹھیکیدار سلطان مہدی، ٹھیکیدار محمد الیاس، محمد علی شگری، مرزا حسین عباس، سعید حسن، سردار محمد ابراہیم، مرزا غلام محمد، مرزا ظفر علی، مظفر علی سالم، مرزا انور علی، محمد رضا، رضا انصاری، غلام احمد، غلام، غلام مہدی، غلام محمد، رضا حسرت نکوباری، محمد عباس، علی محمد، عیسیٰ چنگیزی، فدا حسین، محمد اسماعیل خان، محمد حسن، عباس خان، محمد علی جعفری، محمد نذیر خان، رضا جہانگیر، فرحت علی، عیسیٰ خان، سید محمد اصغر، عبدالحمید، غلام حیدر،

ذکاوت علی شگری، ٹھیکیدار عزیز، کرنل (ر) حامد شگری، محمد شاہ، نسیم چنگیزی، ملکہ بلتستانی، سید محمد عسکری، آغا ہاشم، آغا مقبول حسن، کاچو اکبر اور جعفر علی کلوی کے نام ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔ جبکہ ایسے افراد بھی ہونگے جن کے نام ہمیں دستیاب نہیں ہوئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مختلف اوقات میں دامے، درمے، سخنے اور قدمے ہم وطنوں کی خدمت کی۔ محمد اسحاق شگری نے قومی معاملات میں سرپرستی کرنے کے علاوہ غریب نوازی اور سماجی خدمت کے میدان میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ انہی وجوہات کی بناء پر انہیں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کراچی سے وفاقی دارالحکومت جب اسلام آباد منتقل ہوگیا تو ادھر بلتستان کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں سید محمد عسکری (متوفی 1980ء) بذات خود ایک تنظیم ثابت ہوئے۔ ارباب حکومت تک یہاں کے مسائل پہنچانے کے علاوہ انہوں نے بلتی پریشان مسافروں کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا۔ انہی مطالبات کے سلسلے میں انہوں نے کئی بار بھوک ہڑتال کی۔ انہوں نے کئی بار بلتستان کا دورہ کیا۔ بعد میں وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے جس کے برسر اقتدار آنے کے بعد انہیں او ایس ڈی (O.S.D) بنایا گیا۔ اس دوران انہوں نے یہاں کے بے شمار مسائل حل کر ڈالے۔ سید محمد عسکری اور ان کے چچا آغا ہاشم کے اہتمام سے بلتستانی مسافروں کی سہولت کی خاطر انگت پورہ راولپنڈی میں 1972ء میں ایک مسافر خانہ تعمیر ہوا۔

گلگت بلتستان کے حقوق کے لئے جدوجہد کے سلسلے میں چند تنظیموں اور اخبارات کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ 1957ء میں محمد اسحاق شگری کی صدارت میں کراچی میں ''گلگت بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن'' کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ امان اللہ خان (جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین) اس تنظیم کے جنرل سکریٹری تھے۔ محمد اسحاق شگری 1961ء تا 1964ء کشمیر کونسل کے بھی ممبر رہے۔ 1958ء میں مرزا غلام محمد نے ''بادشمال'' کے نام سے لاہور سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو دو سالوں تک شائع ہوتا رہا۔ 65-1963ء کے دوران سردار محمد ابراہیم بلتستانی کی سربراہی میں 'لداخ بلتستان متحدہ محاذ، سرگرم عمل تھی۔ اس تنظیم کے نمایندوں نے بلتستان کا دورہ کرکے یہاں کے مسائل کو کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا۔ 1970ء کے آغاز میں 'لداخ

بلتستان متحدہ محاذ، کی وائس چیئر مین کی حیثیت سے ملکہ بلتستانی منظر پر نمودار ہوئیں اور اگلے چند سالوں تک گلگت بلتستان کے حقوق کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ اس وقت نسیم چنگیزی اس تنظیم کے چیئر مین تھے۔ اس تنظیم نے دیگر کاروائیوں کے علاوہ اکتوبر 1970ء میں ہفتہ احتجاج بھی منایا۔ اکتوبر 1970ء ہی کے مہینے میں کراچی میں سلطان مہدی کی سربراہی میں ''گلگت بلتستان ایکشن کمیٹی'' کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ بعد میں 1972ء کے اوائل سے ''گلگت لداخ بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن'' نام کی تنظیم ملکہ بلتستانی کی سربراہی میں فعال ہوئی۔ رضا انصاری نے 1972ء میں صدائے بلتستان کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو چند سالوں تک شائع ہوتا رہا۔

چند طلباء تنظیموں نے بھی گلگت بلتستان کے حقوق کے لئے مؤثر کردار ادا کیا۔ 1963ء میں کراچی میں زیر تحصیل طلباء نے محمد اسحاق شگری کی سرپرستی میں ''گلگت بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ مارچ 1968ء میں ''گلگت بلتستان سٹوڈنٹس سنٹرل آرگنائزیشن'' کے نام سے ایک طلباء تنظیم وجود میں آئی۔ 1969ء تک بلتستان کے مختلف علاقوں سے طلباء کی ایک خاصی تعداد کراچی میں جمع ہو چکی تھی۔ کراچی کی ایف سی آر سے آزاد فضا میں سانس لینے کے بعد انہیں اپنے وطن اور ہم وطنوں کی بدحالی کا شدت سے احساس ہوا۔ چنانچہ کراچی میں پہلے سے مقیم بلتستانیوں کی سرپرستی میں ان نوجوانوں نے ''بلتستان یوتھ مومنٹ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ان تنظیموں نے اخباری بیانات اور پمفلٹوں کے ذریعے حکومت سے اپیلوں اور مطالبات کا سلسلہ قائم کیا۔

1968ء میں سکردو میں بلتستان کے ممتاز عالم دین شیخ غلام محمد کی سرکردگی میں انجمن تحفظ حقوق بلتستان کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ اس وقت کے مجتہد اعلم عراق کے آیت اللہ محسن الحکیم نے سوشلزم کے خلاف کفر والحاد کا فتویٰ دیا تھا۔ کچھ عرصہ سوشلزم کے خلاف تبلیغ کرنے کے بعد یہ تنظیم خاموش ہوگئی۔ 1970ء کے دوران ایف سی آر کے خلاف سکردو کے چند نوجوانوں نے ایک دلچسپ پوسٹر کارٹون سمیت سائنکلو سٹائل کر کے تقسیم کیا ان میں فدا محمد ناشاد، محمد رضا اور سید محمد عباس کاظمی شامل تھے۔

ایڈوائزری کونسل کا قیام

نومبر 1970ء میں صدر پاکستان جنرل آغا محمد یحییٰ خان نے گلگت بلتستان کے لئے چودہ ممبروں پر مشتمل ایڈوائزری کونسل فار ناردرن ایریاز قائم کی۔ گلگت سے آٹھ اور بلتستان سے چھ ممبر بالغ رائے دہی کے ذریعے منتخب ہوئے۔ ریزیڈنٹ اس کا چیئر مین تھا اور سات دیگر سرکاری ممبران بھی ریزیڈنٹ نے نامزد کر دیئے۔ انتظامی امور کی بہتری کے لئے مشورے وتجاویز دینا اور ترقیاتی سکیموں کی ترجیحات معین کرنا اس کے دائرہ کار میں شامل تھے۔ سکیموں کی منظوری کے لئے پانچ ممبروں پر مشتمل ڈیویلپمنٹ ورکنگ پارٹی تشکیل دینا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ ریزیڈنٹ اس کا بھی چیئر مین ہوتا تھا۔ یہ مشاورتی کونسل کسی اسمبلی کا نعم البدل تو ہونہیں سکتی تھی۔ تاہم اب حکومت ان علاقوں کے مسائل کی طرف متوجہ ہو چکی تھی اور یہ ان کے حل کی طرف پہلا قدم تھا۔ لوگوں نے جزوی اصلاحات کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔

بھٹو کے اصلاحاتی اقدامات

دسمبر 1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو برسر اقتدار آ گئے۔ وہ ایک عوامی لیڈر تھے اور عوام کے مسائل سے انہیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ 1972ء میں انہوں نے گلگت بلتستان سے ایف سی آر کا قانون ہٹا دیا اور ایجنسی نظام کو ختم کر کے گلگت اور بلتستان کے نام سے دو اضلاع بنا دیئے۔ دسمبر 1972ء میں دیامر کا نیا ضلع قائم کیا۔ نقد مالیہ اور اجناس کا لگان معاف کر دیئے اور بیگار لئے جانے پر پابندی عائد کر دی۔ اسی سال کھرمنگ کو الگ سب ڈویژن کا درجہ دیدیا۔ بیرون بلتستان تحصیل علم میں مصروف طلباء کے وظائف بڑھا دیئے۔ ملک کے اعلیٰ فنی وغیر فنی تعلیمی اداروں میں یہاں کے طلباء کے لئے سیٹوں کا کوٹہ مختص کر دیا۔ صحت، تعلیم اور مواصلات کے شعبوں میں ترقی پر خاص توجہ دینے کے علاوہ مہنگائی کو کم کرنے کی مؤثر کوشش کی۔ ملازمت کے مواقع پیدا کئے اور بہت سے مقامی تعلیم یافتہ افراد کو اعلیٰ عہدوں پر بھرتی کیا۔ گندم، نمک، چینی اور مٹی تیل کے کوٹوں میں

اضافہ کیا۔ واضح رہے کہ بنیادی ضرورت کی ان اشیاء کی عوام کو فراہمی کے لئے حکومت نے آزادی کے فوراً بعد سے ہی سول سپلائیز کے نام سے ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ گندم، نمک اور مٹی کا تیل سبسڈائزڈ نرخ پر جبکہ چینی بلا نفع نقصان نرخ پر عوام کو فراہم کی جاتی تھی۔ گندم اور نمک سیر کے حساب سے، چینی پاؤ کے حساب سے اور مٹی کا تیل چھٹانگ کے حساب سے چٹوں پر ایشو ہوتے تھے۔ 1980ء میں سکردو میں ٹرک کے پہنچنے تک ان اشیاء کی فراہمی کے لئے عوام کا اسی محکمے پر مکمل انحصار تھا۔

ریزیڈنٹ کو 1972ء میں ریزیڈنٹ اینڈ کمشنر کا نام دیا گیا۔ ریزیڈنٹ اینڈ کمشنر کو صوبائی حکومت کے اختیارات حاصل تھے اور وہی گلگت بلتستان کا چیف ایگزیکٹیو ہوتا تھا۔ ستمبر 1972ء میں کھرمنگ اور خپلو میں رائج جاگیر سسٹم کو ختم کردیا گیا۔ 25 اکتوبر 1974ء کو خپلو اور کھرمنگ سب ڈویژنوں پر مشتمل ایک نیا ضلع گنگچھے کے نام سے قائم کیا گیا۔ 1975ء میں عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر کے گلگت میں ایک جوڈیشنل کمشنر اور ایک ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تعینات کئے گئے اور سکردو اور چلاس کے لئے ایک ایک ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کا عہدہ نکالا گیا۔ دوسرے ضلعی ہیڈکوارٹروں کی طرح سکردو میں بھی ایک سول جج تعینات ہوا۔ 1972ء میں ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کو ختم کر کے گلگت میں شامل کرلیا گیا تھا۔ چنانچہ 1975ء میں این اے کونسل کے انتخابات کے موقع پر کونسل میں ان دونوں علاقوں کو بھی ایک ایک سیٹ دی گئی۔ اس طرح اب نشستوں کی کل تعداد چودہ سے بڑھ کر سولہ ہوگئی۔

غرض ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں گلگت بلتستان کی قسمت جاگ اٹھی۔ انہوں نے بنیادی اصلاحات کے ذریعے اس علاقے کو نہ صرف ظلم واستبداد پر مبنی ایف سی آر اور جاگیرداری نظام کے شکنجوں سے نجات دلادی بلکہ یہاں کے غریب عوام کی بہبود اور علاقے کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں انقلابی اقدامات کئے۔ انہی وجوہات کی بناء پر بلتستان میں انہیں ایک محسن کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

1972ء کے دوران سکردو میں پاکستان پیپلز پارٹی کی شاخ قائم ہوگئی۔ سید محمد عسکری اس

کے صدر مقرر ہوئے۔ دوسرے عہدیداروں میں مہدی آباد کے وزیر صادق اور سکمید ان کے خواجہ رضا جو وغیرہ شامل تھے۔ اس پارٹی کے منشور میں اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی شامل تھا جسے یہاں کے کٹر مذہبی حلقوں میں الحاد گردانا جاتا تھا۔ بلتستان کے مذہبی علماء نے اس خیال سے کہ اس پارٹی کے ذریعے یہاں لادینیت نہ پھیل جائے 1972ء میں سابقہ نیم سیاسی تنظیم 'انجمن تحفظ حقوق بلتستان، کو پھر سے زندہ کیا۔ شیخ غلام محمد اس کے صدر تھے۔ عوام کی اکثریت انجمن تحفظ حقوق بلتستان کے ساتھ تھی۔ چنانچہ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تصادم شروع ہوگیا۔ ''پیپلز پارٹی'' اور اس کے اراکین کے خلاف جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے، نعرے لگائے گئے اور فتوے جاری کئے گئے۔ ان کاروائیوں سے کام نہ چلا تو ''گلگت بلتستان پیپلز پارٹی'' کے نام سے ایک پارٹی متوازی طور پر بنائی گئی۔ شیخ غلام محمد اس کے بھی صدر تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سحر انگیز شخصیت، سید محمد عسکری کی خدمات اور پیپلز پارٹی کے ابتک کے اصلاحی اقدامات کی وجہ سے پیپلز پارٹی بہت جلد یہاں مقبول ہوگئی۔ 1973ء میں نصر من اللہ کی جگہ اجلال حسین شمالی علاقوں کا کمشنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے برسر اقتدار پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جس کے نتیجے میں پیپلز پارٹی کی مخالف پارٹیوں کے اراکین کو تصمیم پر رضامند ہونا پڑا۔ چنانچہ 1974ء کے دوران باقی پارٹیوں کو توڑ کر سب پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اس پارٹی کو ازسرنو منظم کیا گیا۔ بلتستان کے معروف مذہبی عالم شیخ غلام محمد کو پیپلز پارٹی شمالی علاقہ جات کا صدر بنالیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں سوشلزم کا نعرہ جوں کا توں موجود تھا۔ اس لئے مذہبی حلقوں سے شیخ غلام محمد پر شدید تنقید کا سلسلہ بہت عرصہ تک جاری رہا۔ 1974ء میں بلتستان بھر کے امامیہ علماء نے ''ہیئت علماء بلتستان'' کے نام سے ایک مذہبی تنظیم قائم کرلی۔ آغا سید علی موسوی اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس تنظیم کے قیام سے سیاسی اور مذہبی حلقوں کی پھر سے حدود بندی ہوگئی۔ اس تنظیم کی طرف سے دو سالوں تک ایک ماہ نامہ ''حبل المتین'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اسی دوران سکردو میں ''تنظیم ملازمین'' بھی قائم ہوگئی۔ 1974ء میں تنظیم ملازمین کے ایک زیر حراست رکن کو چھڑوانے کے سلسلے میں حوالات توڑنے کا ایک واقعہ

پیش آیا جس نے پولیس کولوگوں پر جی بھر کر تشدد کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

ستمبر 1974ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بلتستان کا دورہ کیا اور سکردو کے علاوہ شگر، خپلو اور کھرمنگ میں بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ 9 جنوری 1975ء کو اجلال حسین کی جگہ لداخ کے خواجہ عطاء اللہ کو گلگت بلتستان کا کمشنر مقرر کیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں مشاورتی کونسل کا نام بدل کر ناردرن ایریاز کونسل رکھا گیا اور اس کے انتخابات کرائے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد بلتستان کے ہزاروں باشندے نقل مکانی کر کے کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور وغیرہ میں آباد ہو گئے تھے جو سب کے سب پیپلز پارٹی کے سپورٹر تھے۔ اسی وجہ سے بھٹو صاحب ان علاقوں کے مسائل کو حل کرنے میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کا مسئلہ حل کرنا ان کی ترجیحات میں شامل تھا لیکن مارشل لا کے نفاذ کے سبب یہ کام ادھورا رہ گیا۔

مارشل لا کا نفاذ

5 جولائی 1977ء کو ملک کے دوسرے حصوں کی طرح گلگت بلتستان میں بھی مارشل لا نافذ کیا گیا اور اسے زون ای قرار دیکر فورس کمانڈر شمالی علاقہ جات میجر جنرل کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ سکردو میں متعین بریگیڈیئر کو بلتستان کا ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ اس سے قبل 1958 اور 1969ء کے دوران ان علاقوں کو مارشل لا کے نفاذ سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ اب کی بار شاید ان علاقوں میں پیپلز پارٹی اور اس کے قائد کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے لا اینڈ آرڈر میں خلل کے خوف سے حکومت یہاں مارشل لا نافذ کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد فروری 1978ء میں شیخ غلام محمد کی سرکردگی میں بعض لوگوں نے سابقہ مردہ تنظیم انجمن امامیہ ،کو زندہ کر کے رجسٹرڈ کر دیا۔ واضح رہے کہ انجمن امامیہ کی تنظیم 1946ء میں موضع نر کے آغا مہدی شاہ کی صدارت میں قائم ہوئی تھی اور چند سالوں کے بعد غیر فعال ہو گئی تھی۔

30 جون 1978ء کو گنگچھے کے ضلع کو توڑ دیا گیا۔ اسی سال حکومت نے شگر تحصیل کو سب

ڈویژن کا درجہ دیدیا۔ 1978ء میں گلگت بلتستان کو سول ڈویژن کا درجہ دے کر ریزیڈنٹ کمشنر کو کمشنر بنا دیا گیا۔ ستمبر 1979ء میں شمالی علاقہ جات کے چیف ایگزیکٹیو اور صوبائی حکومت کے اختیارات کمشنر سے وزارت امور کشمیر وشمالی علاقہ جات کو منتقل ہو گئے۔ فروری 1980ء میں سکردو میں ایک ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی تقرری عمل میں آئی اور جولائی 1987ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج یہاں تعینات ہو گیا۔

1979ء میں بلتستان میں 46 یونین کونسلوں، میونسپل کمیٹی سکردو اور ضلع کونسل بلتستان کا بذریعہ انتخابات قیام عمل میں آیا۔ اس طرف پہلا قدم 1956ء میں اٹھایا گیا تھا جب دیہات سدھار (ویلیج ایڈ) کا محکمہ قائم کر کے اس کے تحت قریہ قریہ اصلاحی کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔ 1961ء میں بنیادی جمہوریت کے تحت 23 یونین کونسلیں، ٹاؤن ایریا کمیٹی سکردو اور ضلع کونسل بلتستان کے ادارے قائم ہوئے۔ اس وقت یونین کونسل کا چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل کا ممبر ہوتا تھا اور پولیٹکل ایجنٹ کو ضلع کونسل کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ 1979ء میں اس سیٹ پر منتخب نمائندہ لایا گیا جس سے یہ ادارہ بیورو کریسی کی گرفت سے برائے نام آزاد ہو گیا۔ اسی سال سکردو کی ٹاؤن ایریا کمیٹی کو میونسپل کمیٹی بنا دیا گیا۔

1982ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے شمالی علاقہ جات کے تینوں اضلاع گلگت، بلتستان اور دیامر کے لیے وفاقی مجلس شوریٰ میں ایک ایک مبصر کی سیٹ مختص کی۔ بلتستان سے اس سیٹ پر ضلع کونسل کے چیئرمین وزیر غلام مہدی کو، جبکہ گلگت سے میر آف ہنزہ میر غضنفر علی خان کو اور دیامر سے وزیر محمد افلاطون کو مبصر لیا گیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے کسی قومی سطح کے ادارے میں گلگت بلتستان کی رسائی ہوئی تھی۔ 1983ء میں اگلی مدت کے لیے این اے کونسل اور بلدیات کے انتخابات کرائے گئے۔

1984ء میں کمشنر کا نام بدل کر ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر فار ناردرن ایریاز رکھ دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد ڈپٹی کا لفظ ہٹا کر اُسے ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔

1985ء میں بلتستان میں مسلم لیگ کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ کریس کے راجہ حامد حسین کو صدر

اور وزیر غلام مہدی کو سرپرست بنایا گیا۔ مئی 1987ء میں وزیراعظم محمد خان جونیجو نے بلتستان کا دورہ کیا اور سکردو میں مسلم لیگ کے دفتر کا افتتاح کیا۔ اسی سال این اے کونسل اور بلدیات کے انتخابات ہوئے۔ وزیراعظم نے 1987ء میں سکردو سے ناردرن ایریاز کونسل کے ممبر آغا سید احمد علی شاہ موسوی کو وفاقی مشیر مقرر کیا۔ ان کا مرتبہ وزیر مملکت کے برابر تھا۔

محمد خان جونیجو کی حکومت کے آخری ایام میں مئی 1988ء میں گلگت میں فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر نے صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں سے پوری تیاری کے ساتھ مسلح ہوکر گلگت پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ بلتستان کی طرف ان کی آمد کو روکنے کے لیے رونددو، سکردو اور شگر کے لوگوں نے ہراموش پر مورچے سنبھال لئے۔ کچھ جھڑپیں ہوئیں جس کے نتیجے میں یہ لشکر اس طرف نہ بڑھ سکا۔ اس دوران اندرون بلتستان جس انداز سے امن وامان قائم رہا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ حیران کن راز اب تک سربستہ ہے کہ لشکر کا اتنا بڑا قافلہ کئی ضلعوں اور پولیس اور فوجی ہیڈ کوارٹروں سے گزر کر حملہ آور ہوا لیکن کسی نے اسے روکا تک نہیں اور نہ ہی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی اور اقدام کیا۔ ان ایام میں حکومت کی مجرمانہ خاموشی کی وجہ سے گلگت بلتستان میں حکومت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ لوگوں کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے خود اٹھ کھڑا ہونا پڑا۔ ان وجوہات کی بناء پر لوگوں کا آج بھی یہی خیال ہے کہ شاید یہ حملہ حکومت کی شہ پر اور اسی کی سرپرستی میں کیا گیا تھا۔ اس وقت مانسہرہ کے سید قاسم شاہ امور کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے وفاقی وزیر تھے۔

جمہوریت کی بحالی کے بعد

ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو پہلی بار برسرِ اقتدار آئیں۔ وزیراعظم بینظیر بھٹو نے نومبر 1989ء میں گنگچھے کے ضلع کو بحال کر دیا۔ اسی سال آغا سید احمد علی شاہ موسوی کی وفات پر پیپلز پارٹی شمالی علاقہ جات کے اس وقت کے صدر قربان علی کو ان کی جگہ وفاقی مشیر مقرر کیا گیا۔ بھٹو صاحب کے دور میں پیپلز پارٹی بلتستان کی واحد مقبول ترین

سیاسی پارٹی تھی۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد عہدیداروں نے اس پارٹی سے وابستگی کا اظہار کرنا چھوڑ دیا اگرچہ دل سے اب بھی پیپلز پارٹی کے بہی خواہ تھے۔ 1988ء میں بینظیر بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس پارٹی میں پھر سے جان آ گئی۔

بینظیر بھٹو نے گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے اس دوران تین بار کمیٹیاں بنائیں لیکن مختلف رکاوٹوں کی وجہ سے یہ مسئلہ وہیں پھنسا رہ گیا جہاں پہلے تھا۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر 1990ء میں ناردرن ایریاز کونسل کے ممبروں نے متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کر کے حکومت کو پیش کی کہ گلگت بلتستان کو پاکستان کا پانچواں صوبہ بنایا جائے۔ یا ادھر آزاد کشمیر کے طرز پر اسمبلی، عدالت اور حکومت بنائی جائیں۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو ان علاقوں کو آزاد کشمیر میں شامل کر دیا جائے۔ اس قرارداد کو این اے کونسل کے ممبروں نے انتہائی خفیہ رکھنے کی کوشش کی کیونکہ یہاں کے لوگوں کی اکثریت آخری شق کے حق میں نہ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ صورت حال میں اس مسئلے کے حل کی یہی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ناردرن ایریاز کونسل کی متفقہ قرارداد کے باوجود اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک طرف نوکر شاہی اپنے خداداد اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی اور دوسری طرف جب بھی حکومت کے ایوانوں میں گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کے مسئلے کو حل کرنے کی بات چلتی ہے تو آزاد کشمیر کے لیڈر یہ دعویٰ کر کے اسے سبوتاژ کرتے رہتے ہیں کہ گلگت بلتستان کشمیر کا حصہ ہے۔

ہم آج تک یہ نکتہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ کشمیری لیڈر اس بے بنیاد دعوے کے ذریعے گلگت بلتستان کو آئینی حقوق سے محروم رکھنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ ڈوگرہ ریاست کی ہیئت ترکیبی دیکھ لیجئے جو کشمیری لیڈروں کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے۔ ریاست کا سرکاری نام ''قلمرو جموں وکشمیر وتبت ہا'' یعنی ''ریاست جموں وکشمیر ولداخ بلتستان'' تھا۔ تبت ہا سے مراد لداخ بلتستان ہے کیونکہ لداخ کو رقبے کے لحاظ سے بڑا تبت اور بلتستان کو چھوٹا تبت کہا جاتا ہے۔ اس طرح ڈوگرہ ریاست کی تین اکائیاں تھیں: جموں، کشمیر اور لداخ بلتستان۔ جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے لداخ کو 1835ء میں اور بلتستان کو 1840ء میں فتح کیا تھا جبکہ کشمیر کو مشہور زمانہ بیع نامہء

امرتسر کے تحت 16 مارچ 1846ء کو 75 لاکھ روپے کے عوض انگریزوں سے خرید لیا تھا۔گلاب سنگھ نے 75 لاکھ روپے کی یہ رقم جموں، کشتواڑ، پوریگ، لداخ اور بلتستان کے لوگوں سے نقد، سونا اور قیمتی اشیاء کی صورت میں نہایت سختی کے ساتھ وصول کی تھی۔

اگر کشمیری لیڈر اس بنیاد پر گلگت بلتستان کو اپنا حصہ کہنے پر مصر ہیں کہ 108 سال ان علاقوں پر جموں کے راجاؤں کی حکومت رہی ہے تو ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ خود کشمیر پر 1752ء سے لیکر 1819ء تک افغانوں کی حکومت رہی ہے۔کیا کشمیری عوام افغانوں کو کشمیر پر ایسا دعویٰ کرنے کا حق دینگے؟ یقیناً نہیں دیں گے کیونکہ کسی علاقے پر صرف زبردستی حکومت کرنے سے کوئی علاقہ کسی ریاست کا مستقل حصہ نہیں بنتا بلکہ عوام کی مرضی سے ہی کوئی علاقہ کسی ریاست یا ملک کا حصہ بن جایا کرتا ہے۔یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ گلگت بلتستان کے عوام نے ڈوگرہ حکومت کو ایک لمحے کے لئے بھی خوشی سے تسلیم نہیں کیا۔1842ء میں بلتستان والوں نے ڈوگروں کے خلاف بغاوت کی جو ناکام ہوئی۔48-1947ء میں موقع ملا تو ڈوگروں اور انڈین فوج کے خلاف ایک سال تک زبردست جنگ لڑتے ہوئے بے شمار جانی و مالی قربانیوں کے بعد گلگت بلتستان کے عوام نے آزادی حاصل کر لی اور اپنی مرضی سے اپنے علاقے کا مملکت پاکستان کے ساتھ الحاق کر دیا۔لیکن حالات کے جبر نے مسئلہ کشمیر سے منسلک کر کے گلگت بلتستان کے عوام کو ملک کے ایوانوں میں نمائندگی، اعلیٰ عدالتوں تک رسائی اور دیگر آئینی حقوق سے محروم کر رکھا ہے جو ایک المیے سے کم نہیں۔

دعوے تو بہت سے حلقے کر رہے ہیں کہ وہ کشمیر کاز کے لئے قربانی دے رہے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف گلگت بلتستان اس مسئلے کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے۔جنگ بندی لائن کے دونوں طرف ہمارے کشمیری بہن بھائی صوبے کے برابر اختیارات اور مراعات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔جبکہ گلگت بلتستان عرصہ دراز تک ایف سی آر کے تحت اذیتوں میں مبتلا رہا۔اس کے بعد مارشل لا کے تحت سختیاں جھیلتا رہا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 1950ء سے 2009 تک انتہائی طاقت ور نوکر شاہی کے پنجوں میں گرفتار آئینی حقوق سے محرومی سمیت ہر قسم کے استحصال کا شکار

رہا۔1988ء میں ایک بہت بڑے لشکر نے گلگت بلتستان پر حملہ کیا۔لیکن ہمارے آزاد کشمیر کے لیڈروں کے منہ سے کبھی بھی گلگت بلتستان پر ہونے والی ظلم وستم کی ان کاروائیوں کے خلاف احتجاج میں دولفظ نہیں نکلے۔

1985ء کے دوران اس وقت کی ڈسٹرکٹ کونسل بلتستان کے ممبروں نے چیئر مین حاجی فدامحمد ناشاد کی سرکردگی میں مظفرآباد کا دورہ کیا۔اس دوران انہوں نے تجویز دی کہ اگر آزاد کشمیر والے سچ مچ گلگت بلتستان والوں کو اپنا سمجھتے ہیں تو آزاد کشمیر حکومت اپنی طرف سے خیر سگالی کے طور پر آزاد کشمیر کے تاؤبٹ سے استور کے رٹو تک راستہ تعمیر کرے، آزاد کشمیر کی سول سروس میں گلگت بلتستان والوں کے لیے کوٹہ مخصوص کرے اور تعلیمی اداروں میں سیٹیں مختص کرے۔لیکن آزاد کشمیر کے ہمارے بھائیوں نے ''گلگت بلتستان ہمارا اٹوٹ انگ ہے،، کے رٹنے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔

وزیر اعظم نواز شریف نے سردار مہتاب احمد خان کو امور کشمیر وشمالی علاقہ جات کا وفاقی وزیر مقرر کیا۔1991ء میں این اے کونسل اور بلدیات کے انتخابات ہونے والے تھے۔انتخابات سے کچھ عرصہ قبل سردار مہتاب احمد خان نے گلگت کے این اے کونسل کے انتخابی حلقہ نمبر 1 اور حلقہ نمبر 2 میں کچھ اس طرح سے ردو بدل کیا جس سے ان کے ایک پسندیدہ امیدوار کی جیت یقینی ہوگئی۔فرقہ واریت کے حوالے سے اسے سنگین مسئلہ بنایا جاسکتا تھا۔اس لئے جب وزیر نے حلقہ بندی میں ردو بدل کا ارادہ ظاہر کیا تو سکردو کے معروف قلمکار سید محمد عباس کاظمی نے ہفت روزہ سیاچن میں ایک آرٹیکل لکھ کر بروقت اس مسئلے کی سنگینی کی طرف حکومت اور سیاستدانوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔لیکن کسی نے بھی اس وقت اس پر توجہ نہ دی۔ بعد میں الیکشن کا وقت آپہنچا تو تحریک جعفریہ شمالی علاقہ جات کے صدر شیخ غلام محمد کی قیادت میں این اے کونسل اور بلدیات کے انتخابات سے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔مسلم لیگ کی حکومت کے لیے مسائل پیدا کرنے کی نیت سے یہاں کی پیپلز پارٹی اس مہم میں تحریک کی پشت پر تھی۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی نمایندگی آیت اللہ روح اللہ خمینی کے مقلدین کے ہاتھوں

1985ء میں سکردو میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن یہاں کی اکثریت اس وقت عراق کے آیت اللہ ابوالقاسم خوئی کی مقلد تھی اس لئے اسے مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ 1989ء میں آیت اللہ خمینی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر نشر ہوتے ہی سکردو میں ان کے ایصال ثواب کے نام سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں علماء نے عوام کو آیت اللہ ابوالقاسم خوئی کی تقلید کی طرف رہنمائی کی۔ چنانچہ آیت اللہ خمینی کے مقلدین کی اکثریت نے بھی علماء کی ہدایت کے مطابق آیت اللہ خوئی کی تقلید پر رجوع کیا۔ اس یک رنگی کے نتیجے میں 1991ء میں تحریک جعفریہ کو یہاں منظم کیا گیا اور شیخ غلام محمد اس کے صدر بن گئے۔ اس وقت تحریک کے مرکزی قائد سید ساجد علی نقوی کا عروج شروع ہو چکا تھا اور ان کے پاس وسائل بھی مہیا تھے۔ ادھر انقلاب ایران کے اثرات کے نتیجے میں مذہبی علماء کے حلقوں میں سیاسی کردار ادا کرنے کے لئے ہل چل مچا ہوا تھا۔ اس دوران آئی ایس او اور آئی او کے نام سے بھی مذہبی تنظیمیں بہت فعال ہو چکی تھیں۔ ان تنظیموں نے بھی تحریک کے لئے خوب کام کیا۔ لیکن ان کے نعروں اور وال چاکینگ کے رد عمل میں اسلامی جمعیت طلباء اور سپاہ صحابہ وغیرہ فرقہ وارانہ تنظیمیں گلگت بلتستان میں بھی سرگرم عمل ہوگئیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے اس علاقے کے بارے میں بنیاد پرست ہونے کا ایک بے بنیاد تأثر ابھرا جس نے خصوصی طور پر یہاں سیاحت کی انڈسٹری کو بری طرح متاثر کر دیا جو اس علاقے کی معیشت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

غرض 1991ء کے الیکشن سے بائیکاٹ میں ان سارے عناصر نے اپنا اپنا کردار ادا کیا یہاں تک کہ الیکشن سے بائیکاٹ کی مہم نے مذہبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ دوسری طرف حکومتی مشینری نے بائیکاٹ کو ناکام بنانے کے لئے اپنا پورا زور دکھلایا۔ انتخابات کے بعد دونوں متحارب فریقوں نے اپنی اپنی کامیابیوں کا دعویٰ کیا۔ وائٹ پیپر، گرین پیپر اور بلیک پیپر طرفین نے شائع کئے۔ گنگچھے بائیکاٹ میں شامل ہی نہیں تھا۔ کھرمنگ اور شگر میں ساری سیٹوں پر لوگ انتخاب جیت کر یا بلا مقابلہ منتخب ہو کر آ گئے۔ صرف سکردو اور روندو میں مذہب کے زور پر بائیکاٹ نے اپنا رنگ دکھایا اور بہت سی سیٹیں خالی رہ گئیں جس کی وجہ سے ان علاقوں کی ترقی سخت متاثر ہوگئی۔ بائیکاٹ نہ کرنے والوں کے خلاف دوسرے فریق نے فتوے لگا دیئے۔ لیکن بائیکاٹ نہ کرنے والوں نے

موقف اختیار کیا کہ یہ کوئی مذہبی یا اجتماعی مسئلہ نہیں بلکہ بعض لوگوں کو اپنی شکست اور اپنے سیاسی حریفوں کی جیت یقینی نظر آ گئی تو انہوں نے مذہب کی آڑ میں انتخابات کو سبوتاژ کرنے کی سازش کی ہے۔ بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں اس فتنے نے یہاں کے خوبصورت معاشرے میں نفرتوں کو جنم دیا جن کے رفع ہونے میں برسوں لگیں گے۔

گلگت 1970ء کے عشرے سے فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں تھا جبکہ سکردو اس لعنت سے اب تک آزاد تھا۔ لیکن الیکشن سے بائیکاٹ کے تنازعے کے حوالے سے یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں بلتستان کو بھی فرقہ واریت کی دلدل میں نہ گھسیٹا جائے۔ چنانچہ بلتستان کے بعض ہم خیال افراد نے سکردو میں فرقہ واریت کی ممکنہ درآمد کو روکنے کے لئے 1992ء میں 'اہل فکر فورم' کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ اس فورم میں بلتستان کے سارے علاقوں اور سارے مذہبی فرقوں کی نمائندگی تھی۔ فورم نے بلتستان کے کئی مقامات پر اتحاد بین المسلمین کانفرنسیں منعقد کرائیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن و آشتی کے فروغ کے سلسلے میں کوشش کی۔ 1993ء میں بعض فرقہ واریت زدہ افراد نے فورم کے خلاف گمنام پوسٹر بازی کر دی۔ 1994ء میں جماعتی بنیادوں پر ہونے والے این اے کونسل کے انتخابات نے فرقہ واریت کو دبا دیا۔ اس کے بعد سے یہ تنظیم غیر فعال حالت میں موجود تھی۔ جولائی 2002ء میں اس کے بانیوں نے اسے ختم کر ڈالا۔

بلتستان یوتھ مومنٹ کے بعد راولپنڈی میں زیر تحصیل بلتستانی طلباء نے جنوری 1972ء میں بلتستان سٹوڈنٹس یونین کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی لیکن یہ دونوں تنظیمیں اب فعال نہ تھیں۔ نومبر 1986ء میں بلتستانی طلباء نے کراچی میں بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم نے اپنی تمام تر توجہ بلتستان کے اجتماعی مسائل پر مرکوز رکھی اور مذہبی اور اختلافی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ 1991ء کے انتخابات کے سلسلے میں ہونے والے جھگڑوں میں بھی بی ایس ایف کو کوئی فریق اپنے مقاصد کے لئے آلہ کار نہ بنا سکا۔ بی ایس ایف بلتستان کی اب تک کی فعال ترین طلباء تنظیم ہے جس نے یہاں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا کردار بھرپور انداز میں ادا کیا ہے۔

انتظامی و عدالتی اصلاحات 1994

1993ء میں نگران وزیر اعظم معین قریشی نے گلگت بلتستان کے لئے ریفارمز پیکیج کے نام سے ایک اصلاحی پیکیج منظور کیا۔ اس پیکیج پر عملدرآمد پیپلز پارٹی کے دور میں ہوا اور جون 1994ء میں لیگل فریم ورک آرڈر 1994ء کا اجراء عمل میں آیا جس کے ذریعے ناردرن ایریاز کونسل کی نشستوں کو 16 سے بڑھا کر 24 کردیا گیا۔ خواتین کی دو نشستیں علیحدہ تھیں۔ ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو کا ایک عہدہ دیا گیا جس پر منتخب نمائندوں میں سے کسی کو اکثریتی ووٹوں سے منتخب کیا جانا تھا۔ ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت وزیر مملکت کے برابر تھی۔ تین سے پانچ مشیروں کو این اے کونسل کے منتخب نمائندوں میں سے مقرر کیا جانا تھا جن کی حیثیت صوبائی وزیر کے برابر تھی۔ ان کی تقرری چیف ایگزیکٹیو کی صوابدید پر موقوف تھی۔ چیف ایگزیکٹیو وفاقی وزیر کے برابر تھا جسے وفاقی حکومت کو مقرر کرنا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر کو چیف سکریٹری بنادیا گیا جس کے ماتحت چار سکریٹریوں کو مقرر کیا جانا تھا۔ جوڈیشل کمشنر کا عہدہ ختم کر کے ایک تین رکنی چیف کورٹ تشکیل دی گئی جس کا کسی ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج کو چیئرمین مقرر کیا جانا تھا۔

1994ء میں اس ریفارمز پیکیج کے تحت این اے کونسل کے انتخابات ہونے تھے۔ اس وقت ملک میں بینظیر بھٹو دوسری بار وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز تھیں۔ انہوں نے جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پیپلز پارٹی، تحریک جعفریہ اور مسلم لیگ مقابلے کے لئے سیاسی اکھاڑے میں اتر گئیں۔ پیپلز پارٹی یہاں کی مقبول ترین سیاسی جماعت تھی لیکن 1991ء میں مسلم لیگ حکومت کے خلاف الیکشن سے بائیکاٹ مہم کو مذہبی قوت کے ذریعے کامیاب بنانے کے لئے پیپلز پارٹی کے اراکین نے تحریک جعفریہ کی قیادت کو آگے کردیا تھا جس کی وجہ سے اب پیپلز پارٹی ثانوی حیثیت میں آگئی تھی۔ کیونکہ تحریک جعفریہ اس وقت تک سیاسی پارٹی بن چکی تھی۔۔ الیکشن مہم میں مسلم لیگ برائے نام شریک تھی۔ اصل مقابلہ پیپلز پارٹی اور تحریک جعفریہ کے درمیان تھا۔ مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ انہوں نے خوشنما وعدوں اور

اہم اعلانات کے ساتھ الیکشن مہم پر وفاقی وزیر تعلیم خورشید شاہ، اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن ذاکر حسین شاہ اور نیئر حسین شاہ بخاری وغیرہ کی ایک ٹیم کو بھیجا جنہوں نے الیکشن جیتنے کے لئے کمزور سی مہم چلائی۔ ادھر تحریک جعفریہ کے مرکزی قائد سید ساجد علی نقوی تحریک کے سینئر عہدے داروں اور علماء سمیت الیکشن مہم پر یہاں پہنچے۔ پیپلز پارٹی کے صوبائی اور ضلعی عہدیداروں میں سے بعض کو تحریک جعفریہ کی مذہبی قوت سے مقابلے کی صورت میں اپنی شکست کا سخت ڈر تھا۔ اس لئے انتخابی مفاہمت کے نام پر تحریک کے عہدیداروں کے ساتھ الیکشن کے قریبی دنوں تک مذاکرات کرتے رہے۔ تاکہ کم از کم ان کی اپنی سیٹوں پر تحریک کے ساتھ مقابلہ کرنا نہ پڑے۔ لیکن تحریک کے عہدیدار ان کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ تجاویز قبول نہ کیں۔ 1994ء کی انتخابی مہم کے بارے میں پیپلز پارٹی شمالی علاقہ جات کے صدر اور ناردرن ایریاز کونسل کے ممبر سید جعفر شاہ ایڈووکیٹ رقمطراز ہیں:

> ''تحریک جعفریہ پاکستان نے شیعہ عقائد رکھنے والوں کے مذہبی جذبات کا خوب فائدہ اٹھایا اور انتخابات کا اعلان ہوتے ہی جماعت الیکشن کے لئے کمر بستہ ہوگئی۔ کل پانچ اضلاع میں سے دیامر، گانگچھے اور غذر میں تو ان کو کوئی امیدوار نہ مل سکا۔ ہاں البتہ دو اضلاع یعنی گلگت اور سکردو میں اس نے پی پی پی کے مقابلے کے لئے امیدار کھڑے کئے۔ پیپلز پارٹی کے قائدین نے ان دو اضلاع میں جہاں شیعوں کی اکثریت ہے تحریک جعفریہ سے انتخابی اتحاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور سکردو، راولپنڈی اور گلگت میں اس سلسلے میں دونوں کے کئی اجلاس ہوئے۔ لیکن تحریک جعفریہ نے تمام شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ پیپلز پارٹی کے قائدین نے 10 نشستوں میں سے 6 نشستوں پر تحریک جعفریہ کے امیدوار کھڑے کرنے کی پیشکش کی جسے انہوں نے بوجوہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر یہ انتخابی اتحاد ہو جاتا تو کم از کم یہاں کے لوگ تین حصوں میں تقسیم نہ ہوتے۔ ادھر مسلم لیگ نواز گروپ اور تحریک جعفریہ یعنی ساجد نقوی

گروپ نے آپس میں انتخابی اتحاد قائم کیا اور بالآخر تحریک جعفریہ نقوی گروپ کے سینٹر جواد ھادی نے اخباری بیان کے ذریعے پیپلز پارٹی اور تحریک جعفریہ کے انتخابی اتحاد کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع سکردو اور ضلع گلگت میں پیپلز پارٹی اور تحریک جعفریہ آپس میں صف آرا ہو گئیں۔ تحریک جعفریہ کے پاس اس کا اپنا فنڈ نواز شریف اور سردار عبدالقیوم کے دئے ہوئے بھاری رقوم کے عطیات کے علاوہ بہت سے دلفریب نعرے بھی تھے جنہیں انہوں نے الیکشن میں خوب استعمال کیا۔ مثلاً ساجد علی نقوی نمائندہ ولی فقیہ ہیں۔ ان کا حکم مجتہد یعنی ولی فقیہ کا حکم ہے اور ولی فقیہ کا حکم امام مہدیؑ کا حکم ہے۔ امام مہدیؑ کا حکم رسالت مآبؐ کا حکم ہے۔ ان کا حکم امر الٰہی ہے۔ نہ ماننے والے جہنمی ہیں۔ ساجد علی نقوی صاحب نے خود اپنی تقاریر میں کہا کہ نمائندہ ولی فقیہ کی حیثیت سے ان کا شرعی حکم ہے کہ ووٹ تحریک جعفریہ کو دیئے جائیں۔ پھر تحریک جعفریہ سے تعلق رکھنے والے مولوی حضرات نے بھی چادر حضرت زینبؑ، خون حسینؑ، علم عباسؑ کے نام پر سادہ لوح عوام کے ووٹ مانگے اور کہا کہ دراصل مغربی تعلیم یافتہ بے نظیر اور خاتون جنت کا مقابلہ ہے۔ خاتون جنت کو ووٹ نہ دینے والا جہنمی ہے۔ خود علامہ ساجد علی نقوی نے ان انتخابی سرگرمیوں کی نگرانی کی اور الیکشن کی رات کو عاشورا کی رات سے تشبیہ دی۔ اور پھر ضمیروں کی خریداری اس سے الگ۔ نیز پیپلز پارٹی کو لادین و کافر اور بینظیر بھٹو کو امریکی ایجنٹ وغیرہ القابات سے نوازا۔ انتخابی سرگرمیوں کے دوران تحریک جعفریہ کا رویہ نہایت ہی ترش اور غیر موزون رہا اور انہوں نے بعض جگہ اخلاقی حدود کو بھی پھلانگنے کی کوشش کی۔ ادھر پیپلز پارٹی والوں نے روایتی طور پر انتخابی مہم چلائی۔ ان کے پاس مذہب کا کوئی کارڈ نہ تھا۔ اگرچہ شمالی علاقہ جات میں علماء حق کی کثیر تعداد تحریک جعفریہ کی اس پالیسی کے خلاف تھی

لیکن باہمی اتحاد کی خاطران علماء نے بڑھ چڑھ کر پیپلز پارٹی کے حق میں انتخابی مہم میں حصہ نہ لیا۔ بالآخر 25 اکتوبر 1994ء کو انتخابات ہوئے۔''

غرض مذہبی حلقوں نے الیکشن جیتنے کے لئے مذہب کے استعمال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس دوران یہ بات مشہور ہوئی کہ اکثر جگہوں پر مذہبی علماء نے عوام سے کہا کہ اگر انہوں نے تحریک کو ووٹ نہ دیئے تو ان کی مذہبی رسوم کی ادائیگی سے وہ لاتعلق ہوں گے۔ اس طرح بعض مفاد پرستوں نے یہاں اسلام اور کفر کی جنگ کی سی صورتحال پیدا کر کے سادہ لوح لوگوں بالخصوص عورتوں کے جذبات کو خوب بھڑکایا تھا۔ تحریک کے امیدواروں کے بالمقابل ان کے ہم مذہب و ہم مسلک امیدوار تھے جو اپنی پارٹی کے منشور اور عوامی خدمت کے پروگراموں کے حوالے سے ووٹ مانگ رہے تھے۔

انتخابات کے نتائج نے پیپلز پارٹی اور تحریک جعفریہ دونوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالا۔ ناردرن ایریاز کونسل کی کل چوبیس نشستوں میں سے پیپلز پارٹی نے سات، تحریک جعفریہ نے آٹھ اور مسلم لیگ نے ایک سیٹ جیت لی اور آٹھ آزاد امیدوار منتخب ہو گئے۔ انتخابات سے قبل تحریک جعفریہ کے ساتھ مذاکرات کرنے والے پیپلز پارٹی کے سرکردہ لیڈروں میں سے اکثر ہار گئے۔ پیپلز پارٹی کو اپنی مقبولیت کے اس حد تک گرنے کا اندازہ نہ تھا۔ دوسری طرف تحریک جعفریہ کا خیال تھا کہ اس کے سامنے ٹھہرنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن پوری قوت صرف کرنے کے باوجود تحریک جعفریہ اپنے بڑے حریف حاجی فدا محمد ناشاد اور سید اسد زیدی کو نہ ہرا سکی۔

اب دونوں پارٹیوں نے حکومت بنانے کے لئے جدوجہد شروع کی۔ اس دوران چار آزاد ممبران پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے جبکہ دیگر چار آزاد ممبران نے مسلم لیگ جونیجو گروپ میں شمولیت اختیار کر کے پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کا اعلان کیا۔ دو خواتین ہنزہ کی ڈاکٹر پروین اشرف اور استور کی بیگم شائستہ شمیم بھی پیپلز پارٹی کی منتخب ہوئیں۔ اس طرح سے پیپلز پارٹی یہاں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ چنانچہ 29 نومبر 1994ء کو پیپلز پارٹی کے سید کرم علی شاہ 17 ووٹ لے کر کونسل میں قائد ایوان بنے اور شمالی علاقوں کے پہلے ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو منتخب ہو گئے۔

اس کے بعد کابینہ کے پانچ مشیروں کی تقرری کا مرحلہ آیا۔تحریک جعفریہ نے مشیری کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ شروع کردی۔اس وقت پختونخوا ملی عوامی پارٹی کے صدر افضل خان پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت میں امور کشمیر وشمالی علاقہ جات کے وزیر تھے۔افضل خان یہاں کے امن وامان کے حوالے سے حکومت میں تحریک جعفریہ کی شمولیت کو ناگزیر سمجھتے تھے اور پیپلز پارٹی شمالی علاقہ جات کے اراکین کی مرضی کے مطابق چلنے پر تیار نہ تھے۔حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہ اگر تحریک جعفریہ کو مشیری سے محروم رکھا گیا تو یہاں امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوگا تحریک جعفریہ نے 25 نومبر 1994ء کو لاہور میں مینار پاکستان پر ملکی سطح پر شیعہ کنونشن کا انعقاد کر کے پیپلز پارٹی کو خوب دھمکایا۔اس کے ساتھ 'شیعوں پر پی پی کی نوازشات' کے عنوان سے پیپلز پارٹی کے خلاف ایک پمفلٹ بھی شائع کیا گیا۔اسی دوران حکومت سے رابطہ بھی قائم رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ بالآخر آصف علی زرداری تک تحریک جعفریہ کے علمبرداروں کی رسائی ہوگئی جنھوں نے بینظیر سے تحریک جعفریہ کو مشیری کی دو سیٹیں دلوائیں۔چنانچہ تحریک جعفریہ کے دوممبروں سکردو سے غلام حسین سلیم اور گلگت سے سید رضی الدین رضوی کو مشیر مقرر کیا گیا۔پیپلز پارٹی کے کھرمنگ سے سید اسد زیدی اور ہنزہ سے نذیر صابر دو مشیر لئے گئے اور ایک مشیر داریل کے حیدر خان مسلم لیگ جونیجو گروپ سے مقرر ہوئے۔

اسی سال ایڈمنسٹریٹر کا نام بدل کر چیف سیکریٹری رکھا گیا۔چنانچہ چیف سیکریٹری اور چار سیکریٹریوں نے گلگت میں سرکاری محکموں کا چارج سنبھال لیا۔اس کے ساتھ ایک چیئرمین سمیت تین ججوں پر مشتمل چیف کورٹ کا قیام بھی عمل میں آیا۔

1994ء کے انتخابات اور آئینی حقوق کے حوالے سے تحریک جعفریہ کے ملکی سطح کے بعض سادہ لوح لیڈروں نے ملکی اخبارات میں گلگت بلتستان کے بارے میں جی بھر کر بیانات دیئے۔ اس سے ملک کے اکثریتی فرقے کے ذہنوں میں یہ تاثر ابھرا کہ شمالی علاقوں میں ایک شیعہ سٹیٹ کا قیام عمل میں آرہا ہے۔اس صورت حال نے گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کے خالص علاقائی مسئلے میں فرقہ واریت کا عنصر ملا دیا۔چنانچہ اس کے صوبہ بنائے جانے کے خلاف مختلف حلقوں

سے اسی حوالے سے صدائیں اٹھنے لگیں۔ یہ صورت حال ایک المیے سے کم نہیں۔ کیونکہ گلگت میں انقلاب اور بلتستان میں جنگ آزادی کے دوران یہاں کے لوگ فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر صرف اسلام کے حوالے سے پاکستان میں شمولیت کے لئے تڑپتے رہے ہیں۔اس لئے اب ملک کے اکثریتی فرقے پر فرض عائد ہوتا ہے کہ صرف اسلام اور پاکستان کے حوالے سے سوچیں اور ہر طرح کی منفی سوچوں کا قلع قمع کریں۔فرقہ وارانہ سوچ قومی سلامتی اور ملکی ترقی کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔

مسلم لیگ حکومت نے 1999ء میں ناردرن ایریاز لیگل فریم ورک آرڈر 1994ء میں ترمیم کر کے ناردرن ایریاز کونسل کو قانون ساز کونسل قرار دیا اور اسے 49 آئٹموں پر قانون سازی کے اختیارات دیدیئے۔کونسل میں ٹیکنو کریٹ کی پانچ تا سات نشستیں بھی نکالیں۔اس کے بعد اکتوبر 1999ء میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔اس وقت کے وزیر امور کشمیر ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل عبدالمجید ملک نے شمالی علاقوں کا دورہ کر کے مسلم لیگ کو از سر نو منظم کیا اور الیکشن کی تیاریاں مکمل کرلیں۔لیکن اسی دوران 12 اکتوبر 1999ء کو ملک کا انتظام جنرل پرویز مشرف نے اپنے ہاتھ لے لیا۔نئی حکومت نے انتخابات کو شیڈول کے تحت مکمل کرایا۔ بلدیات کے بھی انتخابات ہوگئے۔

جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے 2000ء میں لیگل فریم ورک آرڈر 1994ء میں مزید ترمیم کر کے ناردرن ایریاز قانون ساز کونسل کے لئے سپیکر کی ایک سیٹ نکالی۔کونسل کے اجلاس کی صدارت کا اختیار سپیکر کو دیا۔اس سے قبل وزیر امور کشمیر کونسل کا چئیر مین ہوتا تھا۔ٹیکنو کریٹ کی سیٹوں کو ختم کر دیا۔اس کی بجائے شمالی علاقوں کے پانچوں اضلاع گلگت، سکردو، گنگچھے، دیامر اور غذر کو خواتین کی ایک ایک نشست دیدی اور یوں خواتین کی نشستوں کی تعداد کو دو سے بڑھا کر پانچ کر دیا۔اس طرح کونسل کی نشستوں کی کل تعداد 29 ہوگئی۔ چنانچہ جولائی 2000ء کے آخری ہفتے میں خواتین کی سیٹوں کے لئے بالواسطہ انتخابات ہوئے۔اس کے بعد 27 جولائی 2000ء کو بلا مقابلہ حاجی فدا محمد ناشاد شمالی علاقوں کے ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو اور صاحب خان قانون ساز کونسل

کے پہلے سپیکر منتخب ہوگئے۔حاجی فدا محمد ناشاد تحریک جعفریہ کی طرف سے اس عہدے کے لئے امیدوار تھے۔تحریک جعفریہ کے علاوہ انہیں مسلم لیگ کے ممبروں،بعض آزاد حیثیت میں منتخب شدہ ممبروں اور پیپلز پارٹی کے ایک ممبر کی بھی حمایت حاصل تھی۔2001ء میں شگر سے عمران ندیم، گلگت سے سیف الرحمٰن اور نگر سے شیخ غلام حیدر کو مشیر مقرر کیا گیا۔جون 2002ء میں گنگچھے سے انجینئر محمد اسماعیل کو اور دیامر سے جانباز خان کو بھی مشیر مقرر کیا گیا۔

18 نومبر 2002ء کو صدر جنرل پرویز مشرف کی طرف سے شمالی علاقوں کے چیف ایگزیکٹیو نثار میمن نے شمالی علاقوں کے لئے ایک ڈپٹی سپیکر برائے قانون ساز کونسل اور ایک خاتون ایڈوائزر دو نئے عہدوں کی منظوری کا اعلان کیا۔اس اعلان کے پانچ روز بعد صوبہ بلوچستان کے میر ظفر اللہ خان جمالی نے ملک کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ان کا تعلق گلگت بلتستان کی طرح کے ایک پسماندہ علاقے سے ہونے کے ناتے یہاں کے لوگوں نے امید قائم کر لی تھی کہ گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے تعین کے سلسلے میں وہ فیصلہ کن اقدامات کریں گے اور ترقیات کے حوالے سے اس پسماندہ علاقے کو خصوصی توجہ ملے گی۔لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ قلیل عرصے بعد جمالی صاحب کی جگہ چوہدری شجاعت حسین پھر شوکت عزیز وزیر اعظم بنے اور گلگت بلتستان کا آئینی مسئلہ جوں کا توں رہ گیا۔

اکتوبر 2004ء میں بلدیات اور قانون ساز کونسل کے انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں ہنزہ کے میر غضنفر علی خان ڈپٹی چیف ایگزیکٹو اور دیامر کے ملک مسکین کونسل کے سپیکر منتخب ہوئے۔ کھرمنگ کے سید اسد زیدی کو چلو کے محمد جعفر کی جگہ ڈپٹی سپیکر منتخب کیا گیا۔محمد جعفر کو اکتوبر 2003ء میں ڈپٹی سپیکر منتخب کیا گیا تھا۔چلو کے محمد ابراہیم ثنائی،روندو کے ایم سکندر علی،نگر کے مرزا حسین، غذر کی نور العین،استور کے عبدالحمید اور چیلاس کے عبدالقدوس مشیر مقرر ہوئے۔

2006ء میں گلگت میں ایک چیئرمین سمیت تین ججوں پر مشتمل ایک اپیلیٹ کورٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

20 اکتوبر 2007ء کو صدر پرویز مشرف نے آئینی اصلاحات کے پیکیج کا اعلان کیا جس

کے ذریعے ناردرن ایریاز قانون ساز کونسل کا نام بدل کر اسمبلی رکھ دیا گیا۔ چیف ایگزیکٹو کو چیئرمین اور ڈپٹی چیف ایگزیکٹو کو چیف ایگزیکٹو بنادیا گیا۔ چیف ایگزیکٹو، سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کے قانون کی بھی منظوری دے دی گئی۔ ایڈیشنل چیف سکریٹری ڈویلپمنٹ کی ایک پوسٹ نکالی۔ سنگل انٹری بجٹ کی منظوری دے دی گئی اور پرنسپل اکاونٹنگ آفیسر کے اختیارات وزارت امور کشمیر کے سکریٹری سے چیف سکریٹری ناردرن ایریاز کو منتقل کردیئے گئے۔ 23 اکتوبر 2007ء کو ہنزہ اور نگر کے علاقوں پر مشتمل ایک ضلع کے قیام اور ڈغونی اور روندو کو سب ڈویژن بنانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

2007ء ہی میں چیف کورٹ کے چیئرمین کا نام بدل کر 'چیف جج، اور ممبر کا 'جج'، چیف کورٹ نام رکھ دیا گیا۔ 20 اپریل 2009ء کو ناردن ایریاز قانون ساز اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر سید اسد زیدی گلگت میں قتل ہو گئے۔ مئی 2009ء میں اُن کی جگہ سکردو کے وزیر ولایت علی ایڈووکیٹ کو اسمبلی کا ڈپٹی سپیکر منتخب کیا گیا۔

غیر آئینی صوبہ گلگت بلتستان

اگست 2009ء میں بلتستان کو علیحدہ ڈویژن بنانے کی منظوری دی گئی۔ اسی دوران 29 اگست 2009ء کو پیپلز پارٹی کی وفاقی کابینہ نے گلگت بلتستان کے لئے ایک خصوصی آئینی (قانون سازی، انتظامی اور عدالتی) اصلاحات پیکیج کی منظوری دے دی۔ ستمبر کے اوائل میں ''گلگت بلتستان امپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر 2009ء'' کا اجراء عمل میں آیا۔ اس پیکیج کے ذریعے اس علاقے کا نام ''شمالی علاقہ جات'' کے بجائے عوام کی خواہش کے مطابق اُس کا اصلی نام یعنی ''گلگت بلتستان'' رکھ دیا گیا۔ چیف ایگزیکٹیو کا نام بدل کر وزیر اعلیٰ اور چیئرمین کا نام گورنر رکھ دیا گیا۔ گلگت بلتستان کابینہ کے لئے وزرا کی 06 سیٹیں نکالی گئیں۔ گلگت بلتستان اسمبلی کے 24 منتخب ممبران کے علاوہ خواتین کے لئے ہر ضلع سے ایک ایک کل 06 سیٹیں مختص کی گئیں جنہیں بالواسطہ ووٹنگ کے ذریعے منتخب کیا جانا تھا۔ ٹیکنوکریٹ کی 03 سیٹیں بھی دی گئیں۔ پیکیج کے

ذریعے' گلگت بلتستان اسمبلی، کے اوپر'' گلگت بلتستان کونسل'' کے نام سے ایک ایوان بالا کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے پندرہ ممبران ہوں گے۔ وزیراعظم پاکستان متعلقہ وزراء اور وفاقی سیکریٹریوں میں سے 06 ممبران کا تقرر کرینگے۔ 06 ممبران کو اسمبلی کے منتخب ممبران ووٹنگ کے ذریعے منتخب کریں گے۔ گلگت بلتستان کے وزیراعلیٰ، گورنر اور وفاقی وزیر اُمور کشمیر و اُمور گلگت بلتستان بھی اس کے ممبر ہوں گے۔ وزیراعظم ایوان بالا کے چیئر مین ہوں گے۔ 61 بلتستان آئٹمز پر قوانین سازی اسمبلی کے سپرد جبکہ 55 آئٹمز پر قوانین سازی کونسل کے دائرہ اختیار میں رکھی گئی۔ چیف کورٹ کے اراکین کی تعداد کو 03 سے بڑھا کر 05 کر دیا گیا۔ پیکیج میں گلگت بلتستان کے لئے علیحدہ الیکشن کمیشن اور پبلک سروس کمیشن کے قیام کی منظوری دی گئی۔

اس پیکیج کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اُس وقت تک رائج گلگت بلتستان کے حکومتی سسٹم پر نظر کرنا ضروری ہے۔ ملک کے چاروں صوبوں میں صوبائی حکومت کے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے پاس ہوتے ہیں۔ وہی اپنے صوبے کے عوام کی بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے قوانین بناتے ہیں، ترقیاتی پروگراموں کے متعلق فیصلے کرتے ہیں اور منتخب نمائندوں پر مشتمل کابینہ کے اراکین اپنے صوبے کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ بدقسمتی سے گلگت بلتستان کے حوالے سے صوبائی حکومت کے اختیارات 1950ء سے اب تک وزیر امور کشمیر اور اُس کے ماتحت کام کرنے والے بیوروکریٹس کو حاصل تھے۔ دوسرے الفاظ میں پچھلے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے گلگت بلتستان پر بعض سرکاری عہدیداروں کی شخصی حکومت قائم تھی۔ یہ حکمران کسی کے سامنے جوابدہ بھی نہیں تھے۔ اپنی پسند کے قوانین کا نفاذ، ترقیاتی پروگراموں اور ملازمتوں پر بھرتیوں کے حتمی فیصلے اور نظم و نسق وغیرہ سے متعلق تمام امور انہی کی مرضی کے مطابق طے ہوتے تھے۔ مزید برآں گلگت بلتستان کے آئینی مسئلے کے بارے میں جب بھی کسی پیش رفت کا موقع آتا یہ حکمران بیوروکریٹس اپنے اختیارات بچانے کی خاطر طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتے اور معاملات کو الجھاتے رہتے تھے۔ گلگت بلتستان کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں کوئی اختیار نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ حالیہ زمانوں میں یہاں برائے نام ایک کابینہ بنائی گئی تھی لیکن اُس کے اراکین کے

پاس بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا تھا۔ الغرض وزارت اُمور کشمیر کی غلام گردشوں میں خوار ہوئے بغیر گلگت بلتستان کے عوام کا یا کسی فرد کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔

ان حالات میں یہ اصلاحات پیکیج نافذ ہوا جس کے ذریعے صوبائی حکومت کے اختیارات وزارت امور کشمیر سے اُٹھا کر تاریخ میں پہلی بار گلگت بلتستان کے منتخب نمائندوں کو منتقل کئے گئے جو گلگت بلتستان کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اگرچہ مکمل صوبہ بننے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاہم مذکورہ بالا اقدامات کے ساتھ ہی عملا انتظامی اور عدالتی طور پر گلگت بلتستان کا غیر آئینی صوبہ وجود میں آ گیا۔ ان حقائق کے تناظر میں ''گلگت بلتستان امپاورمنٹ اینڈ سیلف گورننس آرڈر 2009ء'' کا نفاذ پیپلز پارٹی حکومت کا بلاشبہ بہت بڑا تاریخی کارنامہ اور نہایت جرأت مندانہ اقدام تھا۔

پیکیج پر عملدرآمد کا آغاز کرتے ہوئے 15 ستمبر 2009ء کو وزیر امور کشمیر اور ناردرن ایریاز اسمبلی کے چیئر مین قمر زمان کائرہ نے گلگت بلتستان کے پہلے گورنر کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔ گورنر نے 18 ستمبر 2009ء کو سکردو میں کمشنر بلتستان ڈویژن کے دفتر کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ آصف بلال لودھی کو بلتستان کا پہلا کمشنر مقرر کیا گیا۔

اصلاحات پیکیج پر عملدرآمد کے آغاز کے ساتھ ہی حکومت نے گلگت بلتستان اسمبلی کے انتخابات 12 نومبر 2009ء کو منعقد کرانے کا اعلان کر دیا اور نہایت عجلت میں الیکٹورل رول کی تیاری اور دیگر انتظامات کی تکمیل میں مصروف ہوگئی۔ اصلاحات پیکیج کے اعلان سے اب تک گلگت بلتستان کو ملکی میڈیا میں خوب کوریج مل چکی تھی۔ اب الیکشن کے اعلان نے قومی سیاسی جماعتوں میں ہل چل ڈال دی۔ چنانچہ ملکی سطح کے تقریباً سارے سیاسی رہنماؤں نے بلتستان کے دورے کئے، سیاسی اجتماعات سے خطاب کئے اور ترقیاتی پروگراموں کے اعلانات بھی کئے۔

17 اکتوبر 2009ء کو انتخابی مہم کے سلسلے میں سکردو شہر میں حاجی گام چوک پر پیپلز پارٹی کا ایک جلسہ ہوا جس سے نیئر حسین بخاری نے خطاب کیا۔ اسی روز وفاقی وزیر اور گورنر قمر زمان کائرہ نے چھلو میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اسی تاریخ کو وفاقی وزیر خورشید شاہ نے کھرمنگ میں جلسے

سے خطاب کیا۔ گورنر نے سرمیک گاؤں میں انٹر کالج کے قیام کا اعلان کیا اور کنٹریکٹ ملازمین کی تقرریوں کو پکا کرنے کا بھی اعلان کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گورنر گلگت بلتستان قمر زمان کائرہ نے الیکشن سے صرف چار دن پہلے 8 اکتوبر 2009ء کو ڈگری کالج سکردو کی عمارت میں قراقرم یونیورسٹی کے سکردو کیمپس کا فیتہ کاٹ کر افتتاح کیا جبکہ بالکل انہی لمحوں میں وائس چانسلر قراقرم یونیورسٹی کا سکردو آفس والوں کو فون آیا کہ اس افتتاح کا قراقرم یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں اس لئے قراقرم یونیورسٹی کا کوئی ملازم اس نام نہاد افتتاحی تقریب میں شرکت نہ کرے۔

5 اکتوبر 2009ء کو نواز شریف نے پولیس گراؤنڈ سکردو میں ایک بہت بڑے عوامی جلسے سے خطاب کیا۔ ان کے ساتھ شہباز شریف، سردار مہتاب احمد خان عباسی، چوہدری نثار علی خان، پرویز رشید اور صدیق الفاروق بھی تھے۔ شہباز شریف نے اسی روز چھلو میں ایک جلسے سے خطاب کیا۔ نواز شریف نے پنجاب کے پروفیشنل اور دیگر تعلیمی اداروں میں گلگت بلتستان کے لئے مخصوص سیٹوں کے کوٹے کو فی الفور ڈبل کرنے کا اعلان کیا اور فوری طور پر اس پر عملدرآمد بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ گلگت بلتستان کے مریضوں کو پنجاب کے ہسپتالوں میں مفت علاج کی سہولیات فراہم کرنے کا بھی اعلان کیا۔

5 اکتوبر ہی کو ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے یادگار چوک سکردو پر ایک جلسہ عام سے ٹیلی فونک خطاب کیا۔ اس جلسے سے ایم کیو ایم کے رہنما حیدر عباس رضوی نے اصالتہً خطاب کیا۔ 7 اکتوبر کو پاکستان مسلم لیگ (ق) کے مشاہد حسین سید اور ماروی میمن بھی سکردو پہنچے اور سیاسی جلسوں سے خطاب کیا۔ 10 اکتوبر کو مولانا فضل الرحمٰن بھی انتخابی مہم پر سکردو پہنچ گئے۔

10 اکتوبر 2009ء کو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے سکردو شہر میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ اُنہوں نے دیگر رہنماؤں کے دوروں خصوصاً نواز شریف کے دورے کے اثرات کو زائل کرنے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ بہت سے اعلانات کئے۔ جن میں سکردو کو بگ سٹی بنانا، سکردو ہوائی اڈے کو انٹرنیشنل ایئرپورٹ بنانا، قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی کا سکردو کیمپس قائم کرنا، پولیس کی تنخواہ ڈبل کرنا، فیڈرل گورنمنٹ کے محکموں میں ملازمتوں کے کوٹے میں اضافہ

کرنا، اور سینز ملازمتوں کے کوٹوں میں اضافہ کرنا، نئے اضلاع بنانا وغیرہ شامل تھے۔

غرض ان حالات میں 12 نومبر 2009ء کو گلگت بلتستان اسمبلی کی سیٹوں کے لئے انتخابات منعقد ہو گئے۔ بلتستان میں اسمبلی کی کل نو سیٹوں میں سے سات پر پیپلز پارٹی کو جبکہ ایک ایک سیٹ پر ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ن) کو کامیابی نصیب ہوئی۔

13 نومبر 2009ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں گلگت بلتستان میں انتخابی دھاندلیوں کے حوالے سے علامتی واک آوٹ کیا گیا۔ حکومت کے مخالفوں نے الزام لگایا کہ وزیراعظم، وزیروں اور گورنر نے پراجیکٹس کے اعلانات کئے۔ ملازمین کو کنوسینگ پر مامور کیا۔ بیک ڈیٹ میں سرکاری محکموں میں سینکڑوں تقرریاں کی گئیں۔ تحصیلیں بنائیں۔ بگ سٹی بنایا۔ ووٹنگ کے دن دھاندلی ہوئی، ڈی سی اور کمشنر نے دھاندلی کی۔ پیکیج کے اعلان کے فوراً بعد انتخابات منعقد کئے تاکہ اس اعلان کا ووٹنگ پر اثر ہو۔ ووٹروں کی لسٹوں میں پی پی پی کے زیادہ نام درج تھے۔ مخالفوں کے نام درج نہ تھے۔ انتظامیہ والے حکومتی امیدواروں کو جتانے میں لگے ہوئے تھے۔ الیکشن سٹاف پی پی پی کے من پسند ہمدردوں کو لگایا گیا۔ بہت بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی۔ ماروی میمن اور حیدر عباس رضوی اس احتجاجی مہم میں پیش پیش تھے۔ کچھ حلقوں کی طرف سے یہ بھی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلم لیگ (ن) طالبان کی پارٹی ہے لہٰذا پیپلز پارٹی کے امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالیں۔

انتخابات میں پیپلز پارٹی اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چنانچہ 11 دسمبر 2009ء کو سید مہدی شاہ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اس کے چار ماہ بعد 06 اپریل 2010ء کو کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ محمد جعفر کو سینئر وزیر اور وزیر شکیل احمد، انجینئر محمد اسماعیل، محمد علی اختر، ڈاکٹر علی مدد شیر اور حاجی گلبر کو صوبائی وزیر مقرر کیا گیا۔ ان کے علاوہ سعدیہ دانش اور آفتاب حیدر ایڈووکیٹ وزیر اعلیٰ کے مشیر مقرر ہوئے اور نصیر خان اور محمد موسیٰ کو خصوصی معاون برائے وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ 24 اپریل 2010ء کو کابینہ کے اراکین نے حلف اُٹھایا۔ بعد میں 2013ء میں ایم کیو ایم کے راجہ اعظم خان بھی صوبائی وزیر مقرر ہوئے۔

اس کے بعد گلگت بلتستان کونسل کے ممبروں کے بالواسطہ انتخابات عمل میں آئے۔ بلتستان

سے غلام حسین سلیم اور محمد ابراہیم کو ممبر منتخب کیا گیا۔03 اپریل کو کونسل کے ممبروں نے حلف اُٹھایا۔ بعد میں گلگت بلتستان سے غلام حسین سلیم، عطاء اللہ شہاب اور امجد ایڈووکیٹ کو مشیر مقرر کیا گیا۔ 12 اپریل کو ان مشیروں نے حلف اُٹھایا۔

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے الیکشن سے قبل ووٹ حاصل کرنے کے لئے اعلان کیا تھا کہ سکردو شہر کو بگ سٹی بنائیں گے، سکردو کے ہوائی اڈے کو انٹرنیشنل ایئرپورٹ بنائیں گے، فیڈرل گورنمنٹ کے محکموں میں ملازمتوں کے کوٹے میں اضافہ کریں گے، اور سینز ملازمتوں کے کوٹوں میں اضافہ کریں گے، شگر اور کھرمنگ کے نئے اضلاع قائم کریں گے اور قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی کا سکردو میں کیمپس قائم کریں گے۔ الیکشن جیتنے کے بعد پیپلز پارٹی کے حکومتی اراکین نہ صرف وعدہ وفا کرنا بھول گئے بلکہ عوامی مسائل کی طرف متوجہ ہونے کے لئے بھی ان کے پاس فرصت نہ تھی۔ عوام کے شدید دباؤ کے باوجود قراقرم یونیورسٹی سکردو کیمپس کا قیام معطل رہا۔ بعد میں بلتستان کے جی ایم سکندر اور افضل علی شگری قراقرم یونیورسٹی کی سینیٹ کے چیئرمین اور رکن بن گئے تو ان کی وجہ سے بالآخر 31 جولائی 2011ء کو سکردو کیمپس کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح نئے اضلاع کے قیام کے سلسلے میں عوام کے شدید دباؤ پر وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ شگر ضلع 21-03-2013 سے اور کھرمنگ ضلع 23-03-2013 سے قائم ہو کر کام شروع کرے گا۔ لیکن پیپلز پارٹی حکومت کی مدت پوری ہوگئی مگر یہ اضلاع قائم نہ ہو سکے۔

03 اپریل 2010ء کو گلگت بلتستان کونسل کے ممبروں نے حلف اُٹھایا۔ کونسل کے حوالے سے یہ افواہیں زوروں پر تھیں کہ کچھ عناصر انکم ٹیکس نافذ کر کے اس غریب علاقے کے لوگوں کو نچوڑنے کے عزائم رکھتے ہیں۔ 21-03-2012 کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی صدارت میں کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں (روزنامہ کے۔ٹو 22-03-2012 کے مطابق) گلگت بلتستان میں انکم ٹیکس نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی اجلاس میں مشیروں کی مراعات میں اضافے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس خبر کے بعد (روزنامہ کے۔ٹو مورخہ 25 اکتوبر 2012ء کے مطابق) یہ خبر نشر ہوگئی کہ یکم نومبر 2012ء سے انکم ٹیکس وصول کیا جائے گا۔ اس کے ردعمل میں گلگت بلتستان چیمبر آف

کامرس نے اس فیصلے کے خلاف بھرپور مزاحمت کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ معاشرے کے دیگر بااثر حلقوں کی طرف سے بھی اس فیصلے کو مسترد کر دیا گیا۔ بلکہ ہر طرف سے اس کے خلاف شدید ردِّعمل سامنے آیا۔ عوام کا غیر متوقع ردِّعمل دیکھ کر عملدرآمد کے سلسلے میں خاموشی اختیار کی گئی اور کچھ ہی عرصے بعد خاموشی سے بینکوں کے ذریعے ٹیکس کی کٹوتی کا آغاز کیا گیا۔

اگرچہ گلگت بلتستان میں پیپلز پارٹی حکومت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اپریل 2013ء کے انتخابات کے نتیجے میں 11 مئی 2013ء کو میاں نواز شریف نے وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھال لیا تھا لیکن انہوں نے یہاں پیپلز پارٹی کی حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے تک نہیں چھیڑا۔

پیپلز پارٹی حکومت کی پانچ سالہ مدت پوری ہونے پر 11 دسمبر 2014ء کو گلگت بلتستان کی ایک غیر متنازعہ شخصیت شیر جہاں میر نے نگران وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔ جنوری 2015ء کے تیسرے ہفتے میں انہوں نے 12 وزیروں پر مشتمل نگران کابینہ تشکیل دی جو سکردو کے حاجی ثناء اللہ، فوزیہ سلیم عباس، گنگ چھے کے فدا حسین زیدی، استور کے مشتاق احمد، نعمت اللہ، عطیع اللہ، غذر کے عبدالجہان، مراد علی، گلگت کے ناصر زمانی، ہنزہ نگر کے زوار قلب علی، دیامر کے عنایت اللہ شمالی، اور بشارت اللہ پر مشتمل تھی۔ نگران وزیر اعلیٰ نے کوشش کی کہ کابینہ میں حتی الامکان غیر متنازعہ اور سب کے لئے قابل قبول افراد کو شامل کیا جائے اور یہ بھی کہ ہر علاقہ اور ہر طبقہ فکر کی نمائندگی بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کابینہ کے بارے میں وزیروں کی تعداد زیادہ ہونے کے علاوہ اور کوئی اعتراض سننے میں نہیں آیا۔ شفاف اور غیر جانبدارانہ الیکشن کے انعقاد میں نگران حکومت نے الیکشن کمیشن کو ہر قسم کی سروس فراہم کی۔ اس کے ساتھ ساتھ کاروبار حکومت کو بھی نہایت حُسن وخوبی کے ساتھ چلایا۔

2015ء کے قابل ذکر واقعات میں سے ایک مجلس وحدت المسلمین (ایم ڈبلیو ایم) کا ظہور ہے۔ اپریل 2014ء میں اس جماعت نے گندم کے ریٹ گھٹانے کے سلسلے میں سکردو شہر میں 2 ہفتے دھرنا دے کر لوگوں کے درمیان اپنے لئے جگہ بنالی۔ اس دھرنے میں تمام فرقوں کی شرکت کرا کر اس جماعت نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا قائم کر کے لوگوں کے دلوں کو کسی حد تک

اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان کا یہ اقدام یقیناً ایک تاریخی کارنامہ تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس خطے کو آج سب سے زیادہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہی کی ضرورت ہے۔ اس اقدام کے بعد اس جماعت نے 18-05-2014 کو سکردو شہر میں ایک کامیاب جلسہ کر کے یہاں کے سیاسی میدان میں ایک بڑی سیاسی جماعت کے طور پر اپنا وجود تسلیم کرایا۔ ان کی سرگرمیوں سے یہ واضح تھا کہ یہ آنے والے انتخابات کی تیاری کر رہے ہیں۔

اس صورت حال کو ان کے حریف تحریک اسلامی والوں نے سنجیدگی سے محسوس کیا اور موجودہ حالات اور مستقبل کے سیاسی منظرنامے میں اپنی کامیابیوں کے امکانات پر غور کرنے کے لئے اپنے قائد سید ساجد علی نقوی کو پکارا جو 13 جون کو سکردو پہنچ گئے۔ سید ساجد علی نقوی صاحب 1994ء میں ایک مذہبی جماعت کے سربراہ کے طور پر الیکشن میں بہت کامیابیاں حاصل کر چکے تھے۔ شاید اسی تجربے کی روشنی میں انہوں نے آنے والے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ نگران حکومت گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے انتخابات 8 جون 2015ء کو منعقد کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔ ایم ڈبلیو ایم اور تحریک اسلامی کے علاوہ ملک کی دیگر ساری جماعتیں بھی الیکشن لڑنے کے لئے کمربستہ ہو گئیں اور پوسٹروں، بینروں، جلوسوں اور جلسوں کے ذریعے کنونسنگ مہم میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

14 اپریل 2015ء کو وزیراعظم نواز شریف نے گلگت بلتستان کا دورہ کیا اور اعلان کیا کہ مسلم لیگ (ن) شگر اور کھرمنگ دو اضلاع بنائے گی، سکردو میں بلتستان یونیورسٹی قائم کرے گی، چالیس ارب روپے کی لاگت سے جگلوٹ سکردو روڈ کی توسیع اور تعمیر نو عمل میں لائے گی، ہنزہ نگر کو دو ڈسٹرکٹ بنائے گی اور 1200 لیپ ٹاپ تقسیم کرے گی۔ مزید برآں سرتاج عزیز کی سربراہی میں آئینی کمیٹی بنائی جو جائزہ لیکر سفارش مرتب کرے گی۔ اسی کے مطابق آئینی مسئلہ حل کرے گی۔

08 جون 2015ء کو گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہو گئے۔ بلتستان میں انتخابات کے نتائج حسب توقع سامنے آئے۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) کو نو میں سے چھ سیٹوں پر جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی، تحریک اسلامی اور ایم ڈبلیو ایم کو ایک ایک سیٹ پر کامیابی ملی۔

گلگت بلتستان میں ووٹ، عہدوں اور دیگر دنیوی مفادات کے حصول کے لئے مذہب کا

استعمال کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں کے باسیوں کی اکثریت کوان کے ووٹ اوران کے اپنے مسائل کے درمیان کے تعلق کے بارے میں شعور نہیں۔ اس لئے ان کے ووٹ وقتاً فوقتاً مذہبی نعروں کی نذر ہوتے رہے ہیں۔ کچھ باتدبیر افراد مذہب کے نام پر بلا یا بالواسطہ ان سادہ لوح لوگوں کے ووٹوں سے مستفیض ہوتے رہے ہیں جبکہ یہ صاحبان ووٹ خود پینے کا صاف پانی، ہسپتال، سکول، سڑک وغیرہ ایسی بنیادی سہولتوں اور روزگار کے مواقع سے سے اب تک محروم چلے آرہے ہیں۔ شاید یہی احساس تھا جس کی وجہ سے حالیہ انتخابات میں بلتستان ایسے مذہبی علاقے میں مذہبی جماعتوں کو قابل ذکر کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ تحریک اسلامی اور ایم ڈبلیو ایم دونوں کو بلتستان میں ایک ایک سیٹ پر کامیابی ہوئی۔ کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ یہ ووٹ ان امیدواروں کے ذاتی ووٹ تھے ان جماعتوں کا ان ووٹوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس الیکشن میں پیپلز پارٹی کا انجام عبرت انگیز رہا۔ بلتستان پیپلز پارٹی کا گڑھ ہوا کرتا تھا۔ اس الیکشن میں یہاں سے صرف ایک امیدوار اس پارٹی کے ٹکٹ پر جیتا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی اس امیدوار کے ذاتی ووٹ تھے پیپلز پارٹی کے نہیں۔ اصلاحات پیکیج آرڈر کے نفاذ کے علاوہ گلگت بلتستان میں پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور میں دوسرا بڑا قابل ذکر کارنامہ ان کے دامن میں نظر نہیں آتا۔ بلکہ یہاں کی پیپلز پارٹی حکومت کے بارے میں بھی وہی باتیں اور شکایتیں زبان زد عام وخاص رہیں جو پیپلز پارٹی کی وفاقی اور سندھ حکومتوں کے بارے میں عام تھیں۔ اس صورتحال نے ان علاقوں میں اس پارٹی کی مقبولیت کو بری طرح متاثر کیا جس کا اظہار اس الیکشن میں عوام نے بھرپور طریقے سے کیا۔ گلگت بلتستان کی پیپلز پارٹی حکومت کی مبینہ کرپشن، نوکریاں فروخت کرنے اور دیگر بدعنوانیوں کے بارے میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کی طرف سے ایک ضخیم وائٹ پیپر نومبر 2012ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انتخابات گلگت بلتستان کے الیکشن کمیشن کے زیر انتظام منعقد ہوئے۔ 2009ء سے قبل گریڈ 18 کا ایک سرکاری افسر چیف الیکشن کمشنر متعین ہوا کرتا تھا۔ 2009ء کے اصلاحات پیکیج کے نفاذ کے بعد رحیم نواز خان درانی نے 19 اکتوبر 2009ء کو چیف الیکشن کمشنر کے عہدے کا چارج

سنبھال لیا۔ 12 نومبر 2009ء کو منعقدہ قانون ساز اسمبلی کے انتخابات اُنھوں نے کروائے تھے۔ رحیم نواز خان درانی 20 اکتوبر 2013ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ 5 دسمبر 2014ء کو سپریم اپیلیٹ کورٹ گلگت بلتستان کے سابق جج سید طاہر علی شاہ نے چیف الیکشن کمشنر گلگت بلتستان کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ 8 اپریل 2015ء کو منعقد شدہ گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے انتخابات اُنہی کے زیر انتظام منعقد ہوئے۔ چیف الیکشن کمشنر گلگت بلتستان کو اب وہ سارے اختیارات تفویض ہو چکے ہیں جو چیف الیکشن کمشنر پاکستان کو حاصل ہیں۔ بلتستان میں انتخابات کے انعقاد کے حوالے سے الیکشن کمیشن اور نگران حکومت کی کارکردگی مثالی رہی۔ انتخابات فوج کی نگرانی میں منعقد ہوئے۔ اتنے صاف شفاف اور غیر جانبدارانہ کہ کسی کو بھی کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔

انتخابات کے بعد 23 جون 2015ء کو خواتین اور ٹیکنو کریٹ کی مخصوص سیٹوں کے بالواسطہ انتخابات منعقد ہوئے۔ 25 جون 2015ء کو اسمبلی کے ممبروں اور سپیکر نے حلف اٹھایا۔ چنانچہ 26 جون 2015ء کو حافظ حفیظ الرحمٰن نے وزیر اعلیٰ گلگت بلتستان کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں اُنہوں نے سات رکنی کابینہ تشکیل دی۔ ابراہیم ثنائی ، جانباز خان، محمد وکیل، ڈاکٹر اقبال، فرمان علی اور ثوبیہ مقدم نے 07 جولائی 2015ء کو صوبائی وزراء کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ کچھ روز بعد حاجی اکبر تابان نے سینئر وزیر کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔

مسلم لیگ نون حکومت نے کھرمنگ اور شگر کے اضلاع کا قیام فی الفور عمل میں لایا۔ چنانچہ 20 ستمبر 2015ء کو بشارت حسین نے ڈپٹی کمشنر ضلع کھرمنگ کی حیثیت سے اور رحمان شاہ نے ڈپٹی کمشنر ضلع شگر کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔

18 اپریل 2016ء کو گلگت بلتستان کونسل کی 6 سیٹوں کے لئے انتخابات ہوئے۔ سکردو سے تحریک اسلامی کے سید محمد عباس رضوی، نون لیگ کے وزیر اخلاق اور اشرف صدا اور گنگچھے سے نون لیگ کے سلطان علی ممبر منتخب ہو گئے۔ گلگت سے نون لیگ کے ارمان شاہ اور آزاد امیدوار سعید افضل منتخب ہوئے۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں "No taxation without representation" کا اُصول رائج

ہے۔ ایوانوں میں نمائندگی دینے کا کام تو نون لیگ حکومت سے نہ ہو سکا۔ البتہ کئی قسم کے ٹیکس وصول کرنے کا کام ریاستی طاقت کے ذریعے دسمبر 2015ء سے جاری کر دیا گیا۔ عوام حیران تھے کہ ان سے کس بات کا انتقام لیا جا رہا ہے! حقوق دینے سے انکار اور ٹیکس کے لئے اصرار! عوام کا ایک ہی نعرہ تھا کہ حقوق دو ٹیکس لو۔ عوام کی طرف سے مسلسل احتجاج کے نتیجے میں حکومت کو بعض ٹیکس ستمبر 2017 میں اور باقی ٹیکس جنوری 2018 میں موقوف کرنے پڑے۔ واضح رہے کہ زبردستی ٹیکس وصول کرنے کا کام پیپلز پارٹی حکومت نے 2012 میں شروع کیا تھا۔

25 اگست 2017 کو حکومت نے بلتستان یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دیدی اور ستمبر 2017 میں بلتستان ہائی وے (جگلوٹ سکردو روڈ) کے تعمیر نو پراجیکٹ پر بھی کام شرع کیا۔ 25 اکتوبر 2017 کو وزیر اعظم شاہد خاقان عباسی نے کیڈٹ کالج سکردو کی عمارت میں ان دونوں پراجیکٹس کا رسمی افتتاح کیا جس کے ساتھ ہی بقول نون لیگی ذرائع الیکشن سے قبل بلتستان کے بارے میں کئے گئے نواز شریف کے سارے وعدے پورے ہو گئے۔

گورنمنٹ آف جی بی آرڈر 2018

مسلم لیگ نون کی حکومت نے گلگت بلتستان کے آئینی حقوق کے مسئلے کے حل کے سلسلے میں تجاویز مرتب کرنے کے لئے 29 اکتوبر 2015 کو سینیٹر سرتاج عزیز کی سربراہی میں ایک نو رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی۔ کمیٹی نے اس مسئلے کے سارے پہلوؤں کا گلگت بلتستان کی تاریخ، اقوام متحدہ کی قراردادوں اور مسئلہ جموں وکشمیر کے پس منظر میں تجزیہ کرنے کے بعد 10 مارچ 2017 کو اپنی تجاویز وزیر اعظم پاکستان کو پیش کیں کہ گلگت بلتستان کو عبوری صوبہ بنایا جائے اور پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 51، 57 اور 59 میں ضروری ترامیم کرتے ہوئے گلگت، بلتستان اور دیامر کے تین ڈویژنوں میں سے ہر ڈویژن کو قومی اسمبلی اور سنیٹ میں ایک ایک سیٹ دی جائے اور ایک اضافی سیٹ قومی اسمبلی میں خواتین کے لئے مختص کی جائے۔ کمیٹی نے یہ بھی واضح طور پر لکھا کہ ان اقدامات سے جموں وکشمیر کے مسئلے پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا بلکہ اس کاروائی سے ایک طرف

الجہاد ٹرسٹ کیس کے حوالے سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے 28 مئی 1999 کے فیصلے پر عملدرآمد ہو جائے گا جب کہ دوسری طرف گلگت بلتستان کے نمائندوں کو جی بی اسمبلی کی 17 اگست 2015 کو متفقہ قرارداد کے ذریعے پیش کئے گئے مطالبے کا مثبت جواب بھی مل جائے گا۔ ان تجاویز پر عملدرآمد کی بجائے حکومت نے پراسرار طور پر خاموشی اختیار کر لی جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشمیری لیڈر یاسین ملک نے نواز شریف کو خط لکھ کر آئینی اصلاحات کے عمل کو سبوتاژ کر دیا تھا۔ تقریباً سوا سال کی خاموشی کے بعد اچانک مئی 2018 میں گورنمنٹ آف گلگت بلتستان آرڈر 2018 کے نفاذ کی خبریں میڈیا پر آنے لگیں۔ چونکہ آرڈر کے حتمی متن کو مبہم رکھا گیا جس کی وجہ سے عوام نے اسے آئینی حقوق کے خلاف سازش قرار دے کر مظاہروں اور ہڑتالوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی پہیہ جام ہڑتال کے دوران مسلم لیگ نون کے پانچ سالہ دور حکومت کے ختم ہونے سے صرف چار دن پہلے 27 مئی کو وزیر اعظم شاہد خاقان عباسی نے نہایت عجلت میں گلگت میں جی بی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے گورنمنٹ آف گلگت بلتستان آرڈر 2018 کے نفاذ کا اعلان کر دیا جسے عوام نے یہ کہہ کر اسے مسترد کر دیا کہ نہ صوبہ بنایا گیا اور نہ ہی آزاد کشمیر کی طرح آئینی تحفظ اور دیگر حقوق و مراعات دیئے گئے بلکہ بنیاد پرستوں کے ساتھ مل کر 2009 میں دیئے گئے صوبائی حیثیت اور اختیارات و مراعات کو واپس لینے کی سازش کی گئی ہے۔ گلگت بلتستان ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں اور انجمن تاجران گلگت بلتستان کے لیڈروں کا مطالبہ تھا کہ پاکستان کے دیگر صوبوں کی طرح دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کے علاوہ دیگر تمام امور سے متعلق اختیارات کسی بھی نام سے فی الفور گلگت بلتستان کو منتقل کئے جائیں۔ اس احتجاجی تحریک کی قیادت گلگت کے مولانا سلطان رئیس اور بلتستان کے آغا علی رضوی کر رہے تھے۔ جون 2018 میں گلگت بلتستان کی سپریم اپیلٹ کورٹ نے گلگت بلتستان کونسل کے ایک رکن سعید افضل کی درخواست پر عوامی جذبات اور ملکی مفاد کے پیش نظر آرڈر 2018 کو معطل کر کے 2009 کے آرڈر کو بحال کر دیا۔ بعد میں وزارت اُمورِ کشمیر کی اپیل پر سپریم کورٹ آف پاکستان نے 8 اگست 2018 کو گلگت بلتستان اپیلٹ کورٹ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیا۔

ملک میں نئے انتخابات کے نتیجے میں اگست 2018 میں مرکز ، پنجاب اور خیبر پختون خوا میں تحریک انصاف کی حکومت قائم ہوگئی۔ وزیر اعظم عمران خان نے گلگت بلتستان میں نون لیگ کی حکومت کو قائم رہنے دیا۔ البتہ 30 ستمبر 2018 کو ہنزہ سے تعلق رکھنے والے نون لیگ کے میر غضنفر علی خان کی جگہ تحریک انصاف گلگت بلتستان کے صدر سکردو کے راجہ جلال حسین خان مقپون کو گلگت بلتستان کا گورنر مقرر کر دیا۔

عمران خان کے وزارت عظمی کا عہدہ سنبھالنے پر گلگت بلتستان کے باشندوں کو امید ہوگئی کہ عمران خان ان کے آئینی مسئلے کو گروہی مصلحتوں سے بالا ہو کر میرٹ کی بنیاد پر حل کریں گے۔ حسب توقع اس سلسلے میں انہوں نے 14 نومبر 2018 کو وزیر امور کشمیر علی امین گنڈا پور کی سربراہی میں ایک بارہ رکنی کمیٹی قائم کی جس نے 19 نومبر کو اپنی پہلی میٹنگ میں ماہرانہ رائے کے لئے آئینی ماہرین کی ایک ذیلی کمیٹی بھی تشکیل دی۔ ان کمیٹیوں کی حتمی تجاویز کو منظور کرتے ہوئے 28 نومبر کو وزیر اعظم عمران خان نے گلگت بلتستان کو عبوری صوبہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ میڈیا پر اس خبر کے نشر ہوتے ہی گلگت بلتستان کے باسیوں سے خصوصی قلبی تعلق رکھنے والے عناصر پھر سے متحرک ہوگئے۔ اب کی بار ایک اور کشمیری لیڈر سردار عتیق احمد خان نے عبوری صوبے کے خلاف تحریک انصاف کے فیصلہ ساز حلقوں کو مبینہ طور پر مس گائڈ کیا جس کے نتیجے میں مرکزی حکومت نے اس حوالے سے وقتی طور پر پھر خاموشی اختیار کر لی۔ کیا ہی اچھا ہوتا یہ کشمیری لیڈر سات عشروں سے اپنی انرجی گلگت بلتستان کے محبّ وطن پاکستانیوں کو آئینی حقوق سے محروم رکھنے پر بے جا صرف کرتے رہنے کی بجائے اپنے لوگوں کو پاکستانی بنانے پر صرف کرتے ! 11 جنوری 2019 کو آزاد کشمیر کی اسمبلی نے گلگت بلتستان کے حقوق کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس کر کے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا جسے گلگت بلتستان کے بعض افراد نے سراہا اور بعض نے سازش کا حصہ قرار دیا۔

اسی دوران گلگت بلتستان بار کونسل کی طرف سے پہلے سے دائر ایک آئینی درخواست پر سپریم کورٹ آف پاکستان نے 7 جنوری 2019 کو اپنا فیصلہ محفوظ کیا تھا جو 17 جنوری 2019

کو سنایا گیا جس کے تحت مسئلہ جموں وکشمیر کے مستقل حل کے سلسلے میں رائے شماری تک گلگت بلتستان کی موجودہ آئینی صورت حال کو قائم رکھنے اور دیگر حقوق دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔

آئینی حقوق کا مسئلہ

پاکستان میں شامل دیگر سارے علاقوں کے باشندوں کو تمام آئینی حقوق حاصل ہیں جنہیں بغیر کسی جنگ کے صرف تقسیم ہند کے فیصلے کے نتیجے میں آزادی حاصل ہوئی تھی جبکہ گلگت بلتستان والوں نے انڈین فوج کے خلاف ایک زبردست جنگ لڑ کر بے شمار قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کر کے اپنے علاقے کا پاکستان کے ساتھ الحاق کیا تھا۔ اس کے باوجود گلگت بلتستان کے لوگ آزادی سے اب تک صوبائی اسمبلی، قومی اسمبلی اور سنیٹ میں نمائندگی، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک رسائی اور دیگر بنیادی حقوق سے محروم زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان کے شہریوں کے برابر حقوق مانگتے ہیں تو انہیں کہا جاتا ہے کہ گلگت بلتستان مسئلہ جموں وکشمیر کا حصہ ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ دوسری جانب جب آزاد کشمیر والوں کے برابر سیاسی اور قانونی حقوق و مراعات مانگتے ہیں تو حکومتی حلقوں میں کسی کشمیری مَلِک یا سردار یا کسی اور بنیاد پرست لیڈر کی سازشیں ملکی مفاد پر غالب آتی ہیں جس کے نتیجے میں عملی طور پر اس سے بھی انکار ہی کیا جاتا رہا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ واقعات اپنی مثال آپ ہیں۔ ملکوں میں تو الحاق کی نہیں اور طرح کی تحریکیں چلا کرتی ہیں لیکن گلگت بلتستان والے اتنے لمبے عرصے سے پاکستان کے ساتھ الحاق کی تحریک چلاتے چلاتے ابھی تک تھکے نہیں ہیں۔ یہ پاکستان کے ساتھ مثالی وفاداری کا بہترین ثبوت نہیں تو اور کیا ہے! اس طویل عرصے میں کئی نسلیں جوان بلکہ بڑی ہو چکی ہیں۔ یہ نئی نسلیں ان محرومیوں کو نہایت سنجیدگی سے محسوس کرنے لگی ہیں اور نہایت بے صبری کے ساتھ دیکھ رہی ہیں کہ مستقبل قریب میں الحاق کی اس جاری تحریک کا کوئی ٹھوس نتیجہ نکلے گا بھی یا یہ ارباب اقتدار تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہوئے کمزوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے کی بجائے ان وطن کے پرستاروں کے حقوق کو یوں ہی گروہی سیاست کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔

گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے تعین کا مسئلہ یہاں کے باسیوں کی مرضی کے برخلاف اپریل 1949ء سے جموں وکشمیر کے مسئلے سے وابستہ ہو کر لٹکا چلا آرہا ہے۔ پاکستان کا موقف ہے کہ مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کے مطابق آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے حل کیا جائے۔ انڈیا کو بخوبی علم ہے کہ رائے شماری کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اس لئے وہ جموں وکشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دے کر اس کے متنازعہ ہونے سے ہی انکاری ہے اور اپنے اسی موقف کی پہرہ داری کے لئے سات لاکھ فوج کشمیر میں بٹھائی ہوئی ہے۔

تقسیم ہند سے اب تک تنازعۂ جموں وکشمیر کے حل کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ کئی جنگیں بھی اس مسئلے کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور نہ ہی کوئی سفارت کاری نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اس لئے مقامی مبصرین کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں اس مسئلے کے حل کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔ اس تنازعے کے حقیقی سٹیک ہولڈر بھارتی مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں اور کنٹرول لائن کے دونوں طرف ہمارے کشمیری بہن بھائیوں کو صوبے کے برابر حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ یہ تنازعہ صدیوں تک بھی حل نہ ہو جائے ان دو فریقوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن ادھر گلگت بلتستان والے ہیں جن کے لئے ہر گزرنے والا لمحہ صدیوں پر بھاری ہو رہا ہے۔ کیونکہ ارباب اقتدار نے جبراً اس تنازعے کا حصہ بنا کر ان کے آئینی حقوق کے حصول کو معلق کر رکھا ہے جس کی وجہ سے انہیں نہ پاکستان کے شہریوں کے برابر حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی آزاد کشمیر کے باشندوں کے برابر۔

گلگت بلتستان کے باسیوں کا مطالبہ ہے کہ اسے ملک کا پانچواں صوبہ بنایا جائے۔ یہ یاد رہے کہ صوبے کا مطالبہ کرنے والی یہ آبادی وہی ہے جس نے یکم نومبر 1947ء کو گلگت میں انقلاب لانے کا فیصلہ کیا تھا اور انقلاب لایا تھا۔ اس کے بعد پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ بھی کیا تھا اور 16 نومبر 1947ء کو یہ علاقہ پاکستان کے نمائندے کے حوالے بھی کیا تھا۔ غرض انہی لوگوں کے فیصلے اور کارروائیوں کی وجہ سے آج گلگت بلتستان کا علاقہ پاکستان کے پاس ہے۔ اس لئے انصاف اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ ارباب حکومت تمام گروہی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر

صوبہ بنانے کے مطالبے پر سنجیدگی سے غور کریں۔

لیکن اگر صوبہ بنانے میں کوئی ناگزیر رکاوٹ درپیش ہے تو وقت آچکا ہے کہ اس علاقے کو مزید تاخیر کے بغیر عبوری صوبے کے قیام کے ذریعے یا کسی بھی نام سے وہ آئینی اور قانونی حقوق ومراعات دیے جائیں جو ملک کے دیگر باشندوں کو عشروں پہلے سے حاصل ہیں۔

سرحدوں کا حال

2 مارچ 1963 کو پاکستان اور چین کے درمیان سرحد کے تعین کا معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت مجموعی طور پر سلسلہ قراقرم کی اس دھار کو رواج کے مطابق سرحد مانا گیا جہاں سے پانی کا بہاؤ پاکستان اور چین کی طرف علیحدہ ہو جاتا ہے۔

1971ء کی جنگ میں کرگل کے بالمقابل جنگی نقطہ نگاہ سے نہایت ہی اہمیت کے حامل کافر پہاڑ سمیت بلتستان کے چند دیہات کرکت، ہندورمو ، مزبر، تورتوک ٹیقشی، چھولونکھا اور تھنگ انڈیا کے قبضے میں چلے گئے۔ بعد میں انڈیا نے موقف اختیار کیا کہ کشمیر متنازعہ علاقہ ہے جس پر بھارت کا دعویٰ ہے اس لئے پرانی سیز فائر لائن کا وجود ہی نہ رہا۔ یوں بھارت نے بلتستان کے مقبوضہ علاقوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

28 نومبر 1972ء کو لاہور میں پاکستان اور بھارت کی افواج کے سربراہوں کے درمیان میٹنگ ہوئی اور کنٹرول لائن کا از سر نو تعین کیا گیا۔ ضلع سیالکوٹ میں پاک ہند سرحد سے لے کر چھمب کے گاؤں ٹھاکو چک تک 220 کلومیٹر کے فاصلے کو ورکنگ باؤنڈری کا نام دیا گیا۔ ٹھاکو چک سے چین کی سرحد تک کو کنٹرول لائن تسلیم کیا گیا۔ ورکنگ باؤنڈری سے آگے 450 کلومیٹر لمبی لائن کی ہر 20 اور 30 کلومیٹر کے فاصلے پر نشانات نصب کر کے لائن کی نشاندہی کی گئی۔ چونکہ اس سے 130 کلومیٹر آگے چین کی سرحد تک کے علاقوں میں سوائے پہاڑ، گلیشئر اور ویرانوں کے کوئی آبادی نہ تھی اس لئے ان علاقوں میں لائن کی نشاندہی نہیں کی گئی۔

تاہم سیاچن پر پاکستان کا قبضہ قائم رہا اور ادھر واقع پہاڑوں اور گلیشئر وں پر جانے کے

لیے پرمٹ حکومت پاکستان اشیو کرتی رہی۔نقشوں میں بھی یہ علاقے پاکستان میں دکھائے جاتے رہے۔لیکن 13اپریل 1984ءکو بھارت نے فوج کے بعض سپیشل یونٹوں کواتار کر سیاچن پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعد سیاچن پر پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

کرگل کا واقعہ

مارچ1999ءمیں کشمیر کی آزادی کے لیےلڑنے والے مجاہدین نے بلتستان کی حدود میں بٹالک ،کرگل اور دراس کی طرف کنٹرول لائن پار بعض ایسے پہاڑی علاقوں میں اپنے اڈے قائم کئے جنہیں انڈیا کےفوجیوں نے سردیوں کے دوران برف کی وجہ سے خالی کر دیا تھا۔مئی 1999ء میں جب بھارتی فوج نے ان علاقوں کی طرف واپسی شروع کی تو مجاہدین نے ان پر فائرنگ کی اور 250فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا۔سری نگر- لیہ سپلائی لائن کا واحد راستہ بھی مجاہدین نے بند کردیا۔انڈیا کی زمینی فوج مجاہدین کے سامنے بے بس ہوگئی۔لہٰذا بھارتی حکومت نے سات سکواڈرن ائیرفورس کوان علاقوں پر بمباری کے لئے متعین کیا۔27مئی 1999ءکوانڈیا کے مگ 27اور مگ 21 دو فائٹر جہاز فضائی حدود کی خلاف وزری کرنے پر بلتستان میں مارگرائے گئے۔ آخرکار پاکستان اور بھارت کے درمیان تصادم کے خطرے کے پیش نظر امریکی صدر نے مداخلت کی جس کے نتیجے میں پاکستان کے وزیراعظم نوازشریف کی اپیل پرمجاہدین نے ان مقبوضہ علاقوں کو خالی کردیا۔اس دوران انڈیا کا مسلسل پروپیگنڈہ جاری رہا کہ یہ گھس بیٹھیے مجاہدین نہیں بلکہ پاکستانی فوجی ہیں جنہیں کنٹرول لائن کے پار جھونکنے کے بعد حکومت پاکستان نے ان سے لاتعلقی اختیار کی اوردور سے ان کی تباہی کا تماشہ دیکھتی رہی۔

بلتستان کی سرحدوں پرانہی لڑائیوں کے دوران بہت سے فرزندان وطن نے اپنی جانیں مادرِوطن پر نچھاور کردیں۔ان میں سے دوممتاز شہیدوں غذر کے حوالدار لالک جان اور ضلع صوابی کے کپٹن کرنل شیر خان کو بعد میں پاکستان کے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشان حیدر سے نوازا گیا۔

منقسم خاندانوں کی فریاد

1948ء اور 1971ء کی جنگوں کے دوران جنگ بندی لائن کے نزدیک آباد بلتستان کے بہت سے خاندان افراتفری میں بکھر گئے اور تقسیم ہو کر مجبوراً کنٹرول لائن کے دونوں طرف رہ گئے ہیں۔ان کے علاوہ بلتستان کے سینکڑوں خاندان تقسیم ہند کے نتیجے میں سرحد کے دونوں طرف بٹ کر رہ گئے ہیں۔ بلتستان کے یہ منقسم خاندان آپس میں ملاقات کے لئے کرگل ۔سکردو روڈ کو کھولنے کا مطالبہ کرتے آ رہے ہیں اور اپنی یہ فریاد ہر با اختیار دروازے تک پہنچا چکے ہیں کہ ان کے عمر رسیدہ عزیزوں کے اس دنیا سے چلے جانے سے پہلے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر جلد از جلد انہیں ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع فراہم کریں۔لیکن اب تک ان غریبوں پر کسی کو رحم نہیں آیا اور ایک راستہ بھی ان کے لئے نہیں کھولا گیا۔دوسری طرف آزاد کشمیر میں ایسے منقسم خاندانوں کی آپس میں ملاقات کے لئے کنٹرول لائن پر ضلع راولاکوٹ میں ٹیٹر ینوٹ کے مقام پر، ضلع مظفر آباد میں چکوٹھی کے مقام پر اور ضلع نیلم میں چلایانہ کے مقام پر تین راستے 07 اپریل 2005ء کو کھولے جا چکے ہیں۔ یہ بلا جواز امتیازی سلوک معاشرے میں بہت سے اندیشوں کو جنم دے رہا ہے۔عوام کے درمیان میں یہ تاثر عام ہے کہ بعض تعصّبات زدہ عناصر کرگل ۔سکردو روڈ کے کھولنے کے سلسلے میں بد نیتی پر مبنی من گھڑت رپورٹوں کے ذریعے مسلسل رکاوٹیں ڈالتے آ رہے ہیں۔تاہم یہ محبّ وطن مجبور و مقہور متاثرین اب بھی یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وزیر اعظم اور آرمی چیف اس ظلم کا نوٹس لیں گے اور اسے ایک انسانی مسئلہ سمجھ کر جلد از جلد سکردو۔ کرگل روڈ کو کھلوا کر ان بے بسوں کی دادرسی کریں گے۔

……☆……

ساتواں باب
ثقافتی ورثہ

بلتی زبان اور رسم الخط

بلتی زبان تبّتی زبان کی انتہائی مغربی شاخ ہے۔اس زبان کا تعلق سائنو تبتن زبان کی تبتو برمن شاخ سے ہے۔ بلتستان، تبت، لداخ، بھوٹان، سکم اور شمالی نیپال میں اسی زبان کی مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ان کے علاوہ بھارت کے بعض شہروں اور چین کے چار صوبوں چھینگائی، یونن، سیچون اور گانسو میں بھی اس زبان کے بولنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔تبّتی ادب وثقافت کے ماہرین کو اس زبان کی بولیوں کی کثرت اور ان کے درمیان موجود اختلاف پر سخت حیرت ہے۔

لیکن بولیوں میں شدید اختلاف کے باوجود مذکورہ سارے علاقوں کی تحریری زبان ایک ہی ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ماہرین یہ فیصلہ نہ کر سکے ہیں کہ یہ تحریری زبان وسطی تبت یعنی لہاسہ کی زبان تھی یا کسی اور وادی کی۔ یا یہ کہ اس زبان کے رسم الخط کی ایجاد کے وقت یہی سارے علاقوں کی واحد بولی تھی جو تحریر میں محفوظ ہو چکی ہے۔

تبّتی تحریری زبان کا ارتقائی دور ساتویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف سے شروع ہوتا ہے۔تبت کے بادشاہ سرونگ تسان گمپو (50-617ء) نے اپنے انو نامی وزیر کو جس کا تعلق تھونمی قبیلے سے تھا اور جو بعد میں تھونمی سامبھوتہ کے نام سے بھی معروف ہوا، اپنے بیٹے اور شاگردوں کی ایک ٹیم کے ساتھ 632ء میں ہندوستان بھیج دیا تاکہ فن تحریر کا مطالعہ کرے۔ادھر سنسکرت زبان و علوم کے مطالعے کے بعد تھونمی سامبھوتہ نے تبّتی زبان کے لئے اس کے تقاضوں کے مطابق ایک رسم الخط ایجاد کیا جو تیس حروف اور چار اعرابی علامات پر مشتمل تھا۔اس رسم الخط کی ایجاد سے قبل

یہاں براہمی رسم الخط رائج تھا۔ انُو نے پہلی بار تبّتی زبان کی گریمر بھی لکھی جو 653ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے اس کارنامے کے ساتھ ہی سنسکرت سے مذہبی کتابوں کا تبّتی زبان میں ترجمہ ہونے لگا۔ مذہبی تاریخ، شاہی خاندان کی تاریخ اورنسب نامے بھی زیرِ تحریر آئے۔ غنائیہ شاعری کے علاوہ افسانے اور کہانیاں بھی مدون ہوگئیں۔ ان کہانیوں میں کیسر کی کہانی بھی شامل تھی۔ کیسر تبت کی قرون وسطی کی رزمیہ شاعری کا ہیرو تھا۔ کیسر کی بارہ ابواب پر مشتمل کہانی بلتستان میں اس وقت بھی مقبول عام ہے۔

محقق فرینکی کی تحقیق کے مطابق تھونمی سامبھو تہ پہلا شخص نہیں تھا جس نے تبّتی رسم الخط ایجاد کیا۔ بلکہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں ختن میں دو بدھسٹ عبادتگاہیں تھیں۔ اس وقت بدھ مت کے تبّتی علماء نے تبّتی میں مذہبی کتب کا ترجمہ کرنے کی خاطر ایک رسم الخط ایجاد کر کے ان عبادت گاہوں میں رکھ چھوڑا تھا جو بعد میں انو کے ہاتھ لگ گیا جس نے اس میں ترامیم کر کے اسے آخری شکل دیدی۔ لیکن تبّتی تاریخ و ثقافت کے ماہرین کو فرینکی سے اس بات پر شدید اختلاف ہے۔ یہ لوگ تھونمی سامبھو تہ کے نام ہی اولیت کا سہرا باندھ دیتے ہیں۔

842ء میں تبت کے بادشاہ لنگ درما کے قتل کے بعد بلتستان سیاسی طور پر تبت سے علیحدہ ہوا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخری ربع کے دوران یہاں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہاتھوں اشاعت اسلام کا آغاز ہوا اور سولہویں صدی کے اوائل تک سارا علاقہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بلتستاں کا تبت کے ساتھ مذہبی و روحانی رابطہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس سے قبل یہاں سے طلباء حصول علم کے لئے تبت کے مدارس تک جاتے اور تیس سالوں کی تحصیل کے بعد گیشے کی سند لے کر وطن واپس آتے تھے۔ اس طرح تبت سے روحانی وابستگی کے انقطاع نے لسانی تعلق کو بھی متاثر کر دیا۔ یہیں سے بلتی نے تبّتی زبان سے الگ ہو کر اپنے علیحدہ تشخص کی جانب سفر کرنا شروع کیا۔ اس سے قبل اس کا اپنا الگ ادبی سرمایہ موجود نہ تھا۔ جو کچھ تھا وہ تبّتی زبان کے ساتھ مشترک تھا۔ لہٰذا بلتی ادب کی تاریخ کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

اشاعت اسلام کے ساتھ بلتی میں بدھ مت کی مذہبی اصطلاحات کی جگہ عربی و فارسی کی

اسلامی اصطلاحات نے لی۔ نئے حالات نے نت نئے الفاظ اس زبان میں داخل کر دیئے۔ اس تبدیلی نے بلتی میں بعض نئی آوازوں کو جنم دیا۔ مزید یہ کہ بدھ مت اور بودھوں کی یادگار سمجھ کر مسلمان آبادی کی دلچسپی اس سے اٹھ گئی جس کی وجہ سے اس وقت تک رائج اس کا اپنا رسم الخط متروک ہوگیا۔ اس کا ترک ہونا تھا کہ بالکل بھلا ہی دیا گیا۔ حالانکہ رسم الخط کسی مذہب کا اثاثہ نہیں ہوتا۔ مرور ایام کے ساتھ بلتی زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ بھی منتقل ہوئے۔ لیکن تبتیات کے ایک مشہور ماہر ایچ اے یشکہ کا کہنا ہے کہ بعض ہندی کے الفاظ تبتی زبان میں وارد ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ بعد میں مذہبی شاعری کو فروغ ملا تو مختلف مضامین سے متعلق عربی و فارسی الفاظ اور فقرے مزید ادھار لائے گئے۔ اس کے علاوہ نئے علوم و فنون، صنعت و حرفت اور تجارت کے میدانوں میں بھی بدلے ہوئے حالات نے بلتی زبان کو متاثر کر دیا۔ اکثر نئے الفاظ اب اس کا حصہ بن چکے ہیں۔

تبت سے مذہبی و روحانی تعلق کے انقطاع پر بلتی زبان نے ادبی زبان کی حیثیت سے گر کر مقامی بولی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن یہ حقیقت بھی تعجب انگیز ہے کہ اتنے سارے لسانی عوامل کے باوجود بلتستان کی جغرافیائی تنہائی نے بلتی زبان کو پٹری سے نکلنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی تبت کی تحریری زبان کے ساتھ بلتی زبان کے ذخیرہ الفاظ کا بہت بڑا حصہ مشترک ہے۔

اصلی رسم الخط کے متروک ہونے پر بلتی نظموں کی تدوین کے لئے فارسی رسم الخط کو بروئے کار لایا جاتا رہا۔ چونکہ راجاؤں کے دور میں خطوط، لین دین کی تحریریں، معاہدے، وثیقے اور دیگر دستاویزات فارسی زبان میں ہی لکھی جاتی تھیں۔ اس لئے بلتی میں نظموں کے علاوہ اور کسی چیز کے لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لیکن فارسی رسم الخط کا دامن بلتی میں موجود آوازوں کو ضبط تحریر میں لانے کی وسعت نہیں رکھتا جس کی وجہ سے اس میں لکھی گئی بلتی عبارت صحیح طور پر پڑھی نہیں جا سکتی۔ اس طرح مکمل اور موافق رسم الخط کے نہ ہونے نے ایک مشکل پیدا کر دی جو بلتی زبان و ادب کے فروغ میں حائل رہی۔ بعد میں جب عربی فارسی پڑھے ہوئے افراد کی ایک تعداد ہوگئی تو ان کے لئے یہ ایک معمہ بن گیا کہ بلتی زبان کا اصلی رسم الخط کیا تھا۔ اسی دوران کسی نے ایک نامکمل

رسم الخط کو بلتی کے ساتھ منسوب کر دیا۔ خپلو کے راجہ فتح علی خان مرحوم کے مطابق اس رسم الخط کو ان کے دادا حاتم خان نے ایجاد کیا تھا جو بعد میں شگر میں بیاہی گئی خپلو کی ایک شہزادی کے ساتھ شگر پہنچا تھا۔ اس کے حسن و قبح پر تبصرے کی ضرورت نظر نہیں آتی کیونکہ حروف تہجی بھی اس کے مکمل نہیں۔ تاہم محققین اور آنے والی نسلوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے ہم نے اس کا ذکر ضروری سمجھا۔ اس کے حروف تہجی، اعراب اور گنتی کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

حروف تہجی:

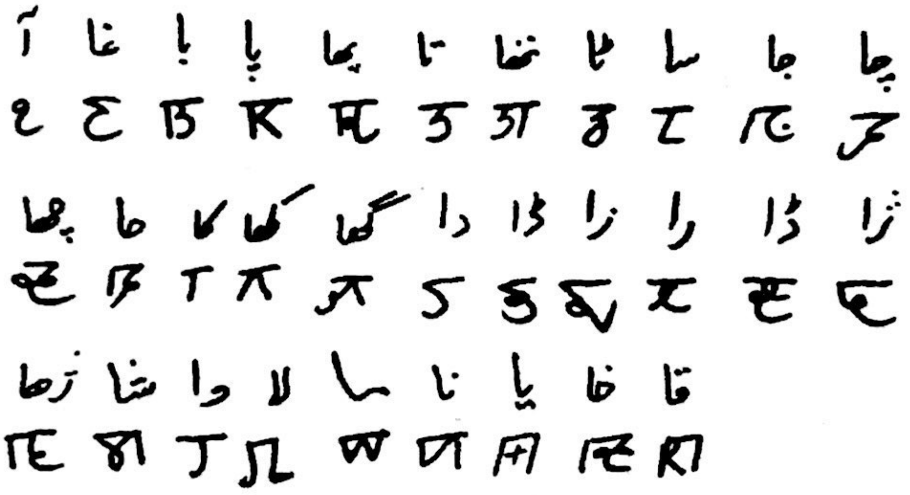

اعراب:

گنتی:

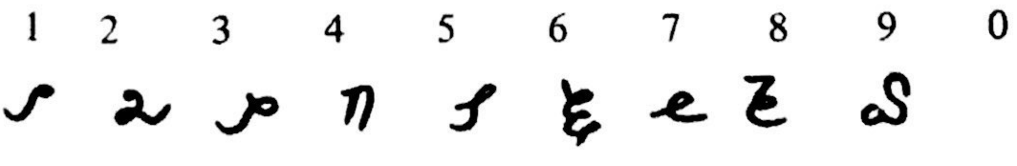

بلتی زبان کا اصلی رسم الخط بلتستان میں صدیوں کے بعد پہلی بار 1984ء میں '' بلتستان پر

ایک نظر'' میں منظر عام پر آیا جو مقامی باشندوں کے لئے تب تک معمہ بنا ہوا تھا۔ اگر چہ یہ رسم الخط بلتی کے لئے آج بھی مناسب ترین ہے لیکن جدائی کی خلیج اب اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اسے پاٹ کر انہیں یک جان بنانا اس وقت ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صدیوں سے بلتی زبان کے لئے فارسی رسم الخط کا استعمال رائج رہنے کی وجہ سے بلتی ادب کا سارا ذخیرہ اسی رسم الخط میں موجود ہے اور اس سے دامن چھڑانا بلتی زبان کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن بلتی زبان میں موجود سات آوازوں کے لئے فارسی رسم الخط میں حروف موجود نہیں۔ اس رسم الخط میں 1973ء میں بلغار چپلو کے مولوی خلیل الرحمٰن نے بلتی زبان کے لئے ایک قاعدہ مرتب کیا ہے۔ لیکن یہ قاعدہ اسی نامکمل رسم الخط میں ہے۔ 1988ء میں بلتی ترجمہ قرآن مجید کے سلسلے میں راقم الحروف کو کچھ حروف وضع کرنا پڑے جنہیں ستمبر 1990ء میں حلقہ علم وادب بلتستان کی میٹنگ میں بلتی زبان کے لئے معمولی ترمیم کے ساتھ منظور کیا گیا۔ نومبر 1990ء میں ''بلتی زبان'' کے عنوان سے بلتی زبان کے اصلی رسم الخط اور فارسی رسم الخط دونوں کا قاعدہ شائع ہوا۔ فارسی رسم الخط میں نئے حروف کو مقارن حروف پر نقطوں اور علامات کے اضافے سے بنایا گیا ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:

ڃ چ̈ ت̤ ش̈ گ ڷ ڼ

ان کے علاوہ ایک مرکب حرف '' چھ '' بھی بنایا گیا ہے۔ دو حروف 'ژ' اور 'ژھ' پہلے سے ہی بلتی زبان کی دو مخصوص آوازوں کے لئے مستعمل ہیں۔

ستمبر 2001ء میں چار بلتی مصنفین کی ایک جماعت نے حاجی فدا محمد ناشاد ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو شمالی علاقہ جات کی سرپرستی میں اسی رسم الخط میں ایک تصویری بلتی قاعدہ مرتب کیا جسے پروفیسر فتح محمد ملک صدر نشین مقتدرہ قومی زبان نے مئی 2002ء میں شائع کیا۔ 2002ء میں انہی افراد کی کوششوں سے اس رسم الخط کے تحت بلتی زبان کے لئے سافٹ ویئر بھی تیار ہو گیا۔ دسمبر 2001ء میں تبت فاؤنڈیشن لندن کی طرف سے قدیم رسم الخط کا ایک قاعدہ بھی منظر عام پر آیا۔

بلتی زبان کی لغت کی تالیف کے سلسلے میں سب سے پہلے 1152ھ میں سکردو کے سید ابوالحسن تحسینؔ نے نصاب الصبیان کے عنوان سے فارسی ۔بلتی منظوم لغت لکھی۔اس کے بعد 1934ء میں ایک انگریز عیسائی مبلغ اے ایف سی ریڈ نے اپنی بلتی گریمر کے آخر میں دو ہزار کے لگ بھگ الفاظ پر مشتمل انگریزی۔بلتی لغت بھی شامل کی۔1959ء میں ایک بلتی مذہبی عالم شیخ احمد نے ایک مختصر سی عربی۔فارسی۔بلتی لغت مرتب کر کے نجف اشرف عراق سے معرفۃ المبتدئین کے عنوان سے شائع کر دی۔بلتی۔اردو لغت بلتی زبان کے مشہور شاعر راجہ محمد علی شاہ صباؔ نے مرتب کی ہے جو بلتی زبان کی جامع ترین لغت ہے۔انہوں نے بلتی لغت نویسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

بلتی زبان کی گریمر،لغت اور نثری ادب کے حوالے سے مسیحی مبلغین کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔ بلتستان میں پہلا عیسائی مبلغ ایف گستافسن تھا جو 1894ء میں یہاں پہنچا اور شگر کو مرکز بنا کر تبلیغی کام میں مصروف ہو گیا۔گستافسن نے فارسی رسم الخط میں بلتی قاعدہ لکھا،لغت مرتب کی اور کچھ گیت جمع کیے۔لیکن ان میں سے ایک بھی اب دستیاب نہیں۔اس نے بلتستان کے مشہور شاعر چھورکاہ شگر کے عباس علی شاہ عباسؔ سے متی کی انجیل کا بلتی میں ترجمہ کرایا جو 1903ء میں فارسی رسم الخط میں شائع ہوا۔اس کے بعد یوحنا کی انجیل کا بلتی میں ترجمہ کرایا جو 1906ء میں شائع ہوا۔چھپائی کا کام بائبل سوسائٹی لاہور سے کرایا جاتا تھا۔گستافسن کا تعلق سکینڈِ نیوِیَن مشن سے تھا۔کچھ عرصہ شگر میں تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنے کے بعد اس مشن کے لوگ 1908ء میں بلتستان سے چلے گئے۔اس کے سات سال بعد 1915ء میں سنٹرل ایشین مشن کے مبلغین بلتستان میں وارد ہوئے۔اس مشن کے رکن ایچ سی رائٹسن نے بھی عباس علی شاہ عباسؔ کو ترجمے کے کام پر لگایا جنہوں نے پہلے اعمال کی کتاب کا بلتی میں ترجمہ کیا جو 1920ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد لوقا کی انجیل کا بلتی میں ترجمہ کیا جسے 1921ء میں شائع کیا گیا۔1930ء کی دہائی میں اس مشن کا رکن الفریڈ ایف سی ریڈ اپنی بیوی سمیت خپلو میں رہتا تھا۔اس نے انگریزی میں بلتی گریمر مرتب کی جو 1934ء میں شائع ہوئی۔اس گریمر کے آخر میں تقریباً دو ہزار الفاظ پر مشتمل بلتی۔انگریزی لغت بھی شامل ہے۔مسٹر ریڈ کی گریمر تھونمی سامبھوتہ کی تبتی گریمر کے بعد بلتی زبان کی اولین گریمر

ہے۔بلتی زبان میں ابتک کیئے گئے اناجیل کے ترجموں کو رومن رسم الخط کو استعمال کرتے ہوئے رِیڈ نے نظرثانی سے گزارا۔ یوحنا اور مَرقس کی اناجیل کے بلتی ترجموں کو نظرثانی کے بعد 1935ء میں شائع کیا۔ رِیڈ نے زبور کا بلتی ترجمہ 1937ء میں شائع کیا۔ رِیڈ خپلو میں ایک کلینک چلاتا تھا۔ اس کے علاوہ سکول کے بچوں کے لئے اتوار سکول بھی چلاتا تھا۔ سنٹرل ایشین مشن نے ''رومن بلتی قاعدہ،، مرتب کر کے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ 'کھوم لوکھسی لَم ،(راہ نجات) کے نام سے بھی بلتی میں ایک کتابچہ شائع کیا۔ یہ کتابچہ خپلو کے 'کھی فُورُو، نے لکھا تھا۔ مسیحی مبلغین تبلیغ کے ساتھ ساتھ فلاحی بنیادوں پر کلینک اور سکول بھی چلایا کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر 1939ء میں مشن کی سرگرمیاں بند کر کے کارکن بلتستان سے چلے گئے۔ اس کے بعد چالیس سالوں تک بلتستان میں مسیحی مذہب کی تبلیغی سرگرمیاں معطل رہیں۔ 1979ء میں Brethren مشن کے مبلغین نے سکردو میں مکان کرایہ پر لیکر ایک کلینک قائم کر کے تبلیغی کام کا آغاز کر دیا۔ 1981ء میں یہ کلینک خپلو میں شفٹ ہوگئی لیکن 2005ء میں یہ کلینک بند ہوگئی۔ تاہم اس کلینک میں مِڈ وائف کی حیثیت سے کام کرنے والی خاتون مبلغ مِس یُونِس جونز نے فیملی پلاننگ کی طرف سے قائم کلینک میں اپنی خدمات جاری رکھیں۔ اس خاتون نے توریت شریف کا بلتی میں ترجمہ کر کے 2011ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ متی، لوقا، مَرقس اور یوحنا کی اناجیل اور نئے عہد نامہ کے دیگر حصوں کا بلتی میں ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک جامع بلتی لغت بھی تالیف کی ہے۔ مشہور بلتی شاعر احسان علی دانش سے زبور کا منظوم بلتی ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے۔ انہوں نے بعض بلتی لکھاریوں کے ساتھ ملکر بلتی طلباء وطالبات کے لئے رومن رسم الخط میں ایک کورس بک مرتب کر کے شائع کی ہے۔

1991ء میں ایک بلتی نوجوان غلام حسن لوبسانگ نے بلتی میں ہی بلتی زبان کی گریمر لکھی۔ بعد میں 1995ء میں برن یورنیورسٹی سوئزرلینڈ نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اردو میں بلتی زبان کی گریمر غاسینگ کے فدا حسین مرحوم نے 1995ء میں مرتب کی ہے۔

اب تک کی دستیاب معلومات کے مطابق مشہور شاعر شگر کے عباس علی شاہ عباسؔ کی

کتاب ''ماتمی شوقبو'' اور ''بلتی توضیح المسائل'' نثر کی مقامی ابتدائی تحریروں میں سے ہیں جو غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہیں۔ 1949ء میں بلتی زبان میں بہائی مذہب کی کتاب ''بہائی اُصول'' شائع ہوئی۔ بژ و پوریگ کے ماسٹر غلام عباس نے زادالمذنبین کے نام سے اور ہرداس پوریگ کے اخوند یوسف نے راہ نجات کے نام سے بلتی میں مذہبی عقاید و اعمال کے موضوع پر دو کتابیں مرتب کی ہیں۔ اکتوبر 1969ء میں سکردو کے ایک مذہبی عالم شیخ جعفر مرحوم نے قرآن مجید کا بلتی میں ترجمہ کرنے کا کام مکمل کیا تھا۔ یہ ترجمہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ 1987ء میں اصلاح معاشرہ کے عنوان سے بلتی نثر میں فدا حسین شمیم کی کتاب شائع ہو ئی۔ 1992ء میں غلام حسن لوبسانگ نے اوت کے نام سے بلتی میں اقوال زریں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ 1995ء میں راقم الحروف کا بلتی ترجمہ قرآن مجید منظر عام پر آیا۔

ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل، ریڈیو پاکستان راولپنڈی اور ریڈیو پاکستان سکردو کی بلتی نشریات نے بلتی زبان کے نثری ذخیرے میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ بالخصوص چند دلچسپ ریڈیائی ڈرامے وجود میں آئے ہیں۔ خپلو کے محمد علی خان واحد، گول کے آغا شاکر، کھرگرونگ سکردو کے محمد عباس، کریس کے راجہ حامد حسین، کواردو کے غلام عباس سودے، محمد حسن حسرت اور غلام حسن حسنی کے بلتی ڈرامے مقبول خاص و عام ہیں۔

اشاعت اسلام کے بعد عربی اور فارسی کے جو الفاظ بلتی زبان میں داخل ہوئے ان میں سے اکثر اس کا حصہ بن چکے ہیں۔ 1840ء کے بعد سے غیر منقسم ہندوستان تک آمد و رفت شروع ہوگئی تو کچھ اردو کے الفاظ بھی اس میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ 1948ء میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد سے اردو اور انگریزی کے الفاظ کا اس زبان میں ورود زور پکڑ گیا ہے۔ اب سوائے دور دراز علاقوں کے خالص بلتی کہیں نہیں بولی جا سکتی۔ بلتستان کی وادیوں کے لہجے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے برعکس بلتی میں زبان کو مادری زبان کی بجائے ''فہ سکت''، یعنی پدری زبان بولا جاتا ہے۔

بلتی زبان تلفظ کے لحاظ سے انتہائی مشکل اور گریمر کے لحاظ سے بیحد سادہ زبان ہے۔ نہ

اردواور فارسی کی طرح جمع اور واحد کے لئےفعل کے صیغے الگ ہیں، نہ عربی وار دو کی طرح تذکیرو تأنیث کے لئے صیغے علیحدہ ہیں اور نہ اردو کی مانند فعل متعدی مفعول کی مطابقت کرتا ہے۔فعل مجہول کا کوئی صیغہ ہی نہیں۔اس نکتے پر مجھے مسٹر ریڈ سے مکمل اتفاق ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"" The passive voice has no definite form in Balti..... 'It is being done' and 'someone is doing it' are more or less identical........"

لیکن عربی دان بلتی علماء مصنوعی طریقے سے مجہول صیغے کا ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے مفہوم میں مزید پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔اسماء میں جنس حقیقی کے علاوہ تذکیروتأنیث مجازی کا وجود نہیں ہے۔مذکرومؤنث کے علاوہ ایک بے جان جنس ہے۔تعریف وتنکیر کے اصول بھی سادہ ہیں۔حروف جار اسماء یا ضمائر کے بعد آتے ہیں۔متعلق فعل،ظرف زمان ومکان بنانے، اسم واحد کی جمع بنانے اوراسم کی حالت فاعلی،مفعولی اور اضافی میں بدلنے کے طریقے آسان اور سادہ ہیں۔اسم موصول کے لئے کوئی علیحدہ لفظ موجود نہیں بلکہ فعل کے آخر میں (زیر) یا (ف) یا (یٔ) بڑھا کر اس معنی کو ادا کیا جاتا ہے۔اس ترکیب کی وجہ سے انگریزی،اردواور بالخصوص عربی کی لمبی عبارات کا بلتی میں تحت لفظی ترجمہ تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔استفہام کے لئے فعل کے آخر میں (الف) کا حرف بڑھایا جاتا ہے۔بلتی میں آداب کے لئے فعل کے صیغے علیحدہ ہیں۔اس زبان میں محاورے کثرت سے ہیں۔بلتی میں اعلیٰ تخیل پر مشتمل ضرب الامثال بھی بہت ہیں جو انتہائی نصیحت آمیز ہیں۔بلتی زبان کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تقریباً ہر فعل کے ساتھ ایک الگ تاکیدی لفظ (adverb) بھی ساتھ آتا ہے۔جتنے افعال ہیں تقریباً اتنی تعداد کے ایسے تاکیدی الفاظ بھی ہیں۔یہ الفاظ فعل کے معنی میں بڑی قوت پیدا کرتے ہیں لیکن بذات خود ان کے اپنے کوئی معنی نہیں ہیں۔چونکہ یہ زبان تلفظ کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہے اس لئے غیر بلتی لوگ صحیح لہجے سے اسے نہیں بول سکتے۔لیکن تلفظ کی پیچیدگیوں کی مشق کی وجہ سے بلتی لوگ دیگر زبانوں کو اہل زبان کی طرح بول سکتے ہیں۔

جس رسم الخط کو ترک ہوئے کم وبیش چھ سو سال ہوتے ہیں اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو

گا۔ انگریزی کی طرح یہ بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اعراب حروف کی بجائے علامات کے طور پر آتے ہیں۔ اس رسم الخط کی དབུ་ཅན་ اوچن اور اومے དབུ་མེད་ دوشاخیں متوازی طور پر رائج ہیں۔ اوچن اشاعت کے موقع پر جبکہ اومے ہاتھ سے لکھائی کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اوچن کی تفصیل درج کرتے ہیں:۔

حروف تہجی

ཀ་	کا	ཁ་	کھا	ག་	گا	ང་	ڠا
ཅ་	چا	ཆ་	چھا	ཇ་	جا	ཉ་	نیا
ཏ་	تا	ཐ་	تھا	ད་	دا	ན་	نا
པ་	پا	ཕ་	پھا	བ་	با	མ་	ما
ཙ་	ژا	ཚ་	ژھا	ཛ་	دزا	ཝ་	وا
ཞ་	ژا	ཟ་	زا	འ་	اَ	ཡ་	یا
ར་	را	ལ་	لا	ཤ་	شا	ས་	سا
ཧ་	ہا	ཨ་	ا				

نوٹ: جب کوئی سلیبل کسی حرف علت سے شروع ہوتا ہے تو اس کی ابتدا میں འ یا ཨ لانے کے بعد اس پر اعراب لگا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ཨ کے لئے گلا کھلا رہتا ہے اور یہ دیگر حروف کی طرح اعراب کو پرزور طریقہ پر ادا کرتا ہے جب کہ འ کے تلفظ کے وقت گلا بند رہتا ہے اور یہ اعراب کی آوازوں کو خفیف طریقہ پر ادا کرتا ہے۔

حروف تہجی لکھنے کا طریقہ

اعراب

بلتی میں اعراب کی چار علامتیں ہیں جن میں سے صرف پیش کی علامت حرف کے نیچے باقی اوپر آتی ہیں۔ کسی حرف پر ان چار حرکتوں میں سے کوئی نہ ہوتو اس کو پیدائشی اعراب زبر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جسے رکیانگ کہا جاتا ہے۔ اعراب کی چار علامتیں یہ ہیں:

(زیر) کِگُو ◌ི

(پیش) جبسکیو ◌ུ

(نیم زیر) ڈینگبو ◌ེ

(نیم پیش) نرو ◌ོ

نوٹ:۔پیش کی علامت ؎ ابتداء یا آخر میں آتی ہے تو مد کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور درمیان میں آتی ہے تو صرف پیش کی آواز دیتی ہے۔کبھی نرو ˜ کے بیچ میں ٗ ٗ کی علامت ٚ آتی ہے جو ཨ کی آواز دیتی ہے۔اس علامت کو لکھور کہا جاتا ہے۔

خاتمہ حروف

سلیبل جس ساکن حرف پر ختم ہو جاتا ہے اسے خاتمہ حرف کہتے ہیں۔مثلاً: གཅིག (چیگ) میں ག خاتمہ حرف ہے۔

نوٹ: འ صرف اسی صورت میں بطور خاتمہ آتا ہے جب اس سے قبل زبر والا حرف ہو۔اس وقت یہ اس زبر کو لمبا کرتا اور خود الف مقصورہ بن جاتا ہے۔

خاتمہ ثانیہ

بلتی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر الفاظ خصوصاً ماضی مطلق کے افعال دو ساکن حروف پر ختم ہوتے ہیں۔پہلے ساکن حرف کو خاتمہ اور دوسرے کو خاتمہ ثانیہ کہتے ہیں۔ دونوں حروف کو بحالت ساکن ایک ساتھ تلفظ کیا جاتا ہے۔صرف حرف ས بطور خاتمہ ثانیہ آتا ہے۔مثلاً کھیرس ཁྱེརས་ یونس ཡོནས་ مِنس མིནས་ رنس རནས་ وغیرہ۔

(نوٹ):۔ حرف ས جب بطور خاتمہ ثانیہ استعمال ہو رہا ہو تو یہ کبھی نامکمل صورت میں خاتمہ حرف کے نیچے لکھا جاتا ہے۔جیسے لنگس ལྔཾ

خارجی حروف

بعد میں سنسکرت زبان سے وارد شدہ بعض آوازوں کے لئے مندرجہ ذیل حروف استعمال ہوتے ہیں:

کستا ཀྵ ستا ཥ نا ཎ ڈا ཌ ٹھا ཋ ٹا ཊ

ابتداء میں اس زبان میں خ، ز، ژ، غ اور ق کی آوازیں نہیں تھیں۔بلتی میں بعد میں آئی

ہوئی ان نئی آوازوں کے لئے مجوزہ حروف یہ ہیں:

قا ཀ༹་ غا ག༹་ ژا ཞ༹ ز ཛ༹ خا ཁ༹་

دواعرابوں کی مرکب آواز

دواعرابوں کے یکساتھ تلفظ کے موقع پر འ لاکر اسے دوسرے اعراب کا مسکن بنا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ འ اور ཨ ایک جیسے حروف ہیں لیکن ایسے موقع پر صرف འ ہی کو دوسرے اعراب کا مسکن بنایا جاتا ہے جیسے:۔

بوئی	བུའི་	روئے	རོའི་	اَیو	ཨེའོ་
کھیو	ཁེའུ་	لے	ལེའི་	یو	ཡའོ་

مرکب حروف

مرکب حروف کی دو قسمیں ہیں۔ ذیلی ملحقہ حروف اور بالائی ملحقہ حروف

1۔ ذیلی ملحقہ حروف

ذیلی ملحقہ حروف تعداد میں پانچ ہیں۔ یہ حروف سلیبل کے ابتدائی حروف کے نیچے لکھے جاتے ہیں۔ ماقبل حرف کو ساکن اور ملحقہ حرف کو اعراب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یہ پانچ حروف درج ذیل ہیں:

1۔ وزر: اس کی علامت ྭ ہے جو واؤ کی آواز دیتی ہے۔ مثلاً:

فوا ཕྭ کوا ཀྭ سوا སྭ شوا ཤྭ نوا ནྭ وغیرہ۔

2۔ ییتکس: اس کی علامت ྱ ہے جو یاء کی آواز دیتی ہے:

بیہ བྱ کیالبو ཀྱལ་བུ فیا ཕྱ ریا རྱ وغیرہ۔

3۔ رتکس: اس کی علامت ྲ ہے جو 'ر' کی آواز دیتی ہے۔ مثلاً:

کھرب ཀྲབ་ کراژو ཀྲ་ཞུ گرل གྲལ་ کرالید ཀྲ་ལེད་ وغیرہ۔

4۔ لبتکس: اس کی علامت ལ ہے جولام کی آواز دیتی ہے۔

مثلاً: پلنگ པླང فلنگ ཕླང وغیرہ۔

5۔ ہبتکس: اس کی علامت ཧ ہے جو ہاء کی آواز دیتی ہے۔ جیسے: ہلہ ལྷ

2۔ بالائی ملحقہ حروف

بالائی ملحقہ حروف صرف تین ہیں ۔ یہ حروف سلیبل کے ابتدائی حروف کے اوپر لکھے جاتے ہیں جو بحالت ساکن پڑھے جاتے ہیں اور اعراب کو اس کے بعد والے حرف کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ وہ تین حروف یہ ہیں:۔

1۔ رنگو: صرف حرف ཉ کے ساتھ ར مکمل طور پر اور باقی حروف کے ساتھ اس کی شکستہ صورت ཪ لکھی جاتی ہے۔ اس لئے یہ علامت رنگو کہلاتی ہے۔

جیسے: رتہ རྟ رکہ རྐ رگہ རྒ وغیرہ۔

2۔ دوسرا حرف ལ ہے۔ صرف ལྷ میں ལ کو ཧ کے بعد اور باقی حروف کے ساتھ ལ کو پہلے تلفظ کیا جاتا ہے جیسے: لدنگ ལྡང لتمو ལྟན་མོ لتوس ལྟོས وغیرہ۔

3۔ تیسرا بالائی ملحقہ حرف ས ہے۔ جیسے: سکمبو སྐམ་པོ سکیا སྐྱ سمن སྨན سنہ སྣ وغیرہ۔

نوٹ: مرکب حروف کو ہجہ کرتے وقت پہلے بالترتیب دونوں کا نام لینے کے بعد دونوں کی مرکب آواز کو تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ཀྭ کو کاوزرکوا اور རྐ کو راکا تارکہ کہتے ہیں۔

سابقہ حروف

درج ذیل پانچ حروف کبھی سلیبل کے ابتدائی حروف کے آگے بطور سابقہ حروف آتے ہیں۔ اس وقت یہ بحالت ساکن خفیف انداز میں متلفظ ہوتے ہیں جبکہ اعراب ان کے مابعد پر آتے ہیں۔ وہ حروف یہ ہیں۔ ག ད བ མ འ مثلاً

بدون བདུན چیگ གཅིག وغیرہ۔

رفع اشتباہ

سابقہ حرف کسی ایسے خاتمہ حرف سے پہلے آجائے جس پر زبر کے علاوہ دوسری اعرابی علامت نہ ہو تو یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ اسے کس طرح پڑھا جائے۔ مثلاً དག کو 'داگ،، پڑھا جائے یا ད کو سابقہ تصور کر کے 'گا، پڑھا جائے۔ اس اشتباہ کو رفع کرنے کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ اس صورت میں داگ پڑھا جانا چاہیئے۔ ایسے وقت میں ད اگر سابقہ کی حیثیت سے آیا ہے تو یہ جتانے کے لئے کہ ད سابقہ ہے اور ག پر فطری اعراب رکیانگ ہے ག کے بعد འ بڑھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً: گا དགའ داگ དག

بے قاعدہ آوازیں

1۔ میم اور نون کی آوازیں: جب ایک سلیبل کے بعد دوسرا کسی سابقہ حرف یا بالائی ملحقہ حرف کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو دونوں کے بیچ میں میم یا نون کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً جب کہ پہلا سلیبل ག پر ختم ہوتا ہو۔ جیسے: رگیانگ خلو ཀླུ

2۔ مشدّد آواز: جب མ یا བ مندرجہ ذیل خاتمہ یا خاتمہ ثانیہ حروف کے بعد آئے تو ان خاتمہ یا خاتمہ ثانیہ حروف کی آواز مشدّد ہو جاتی ہے۔ وہ حروف درج ذیل ہیں:

ག   གས   ང   ངས   ལ   ར

3۔ ان کے علاوہ بھی وادیوں کے لہجوں کے مطابق بے قاعدہ آوازیں بہت ہیں۔ مثلاً: بژیس تھور བཞིས་ཐུར کو تبت کی طرف ''جیب تھو،، بولتے ہیں۔

لہجے

بلتی زبان اصل میں چھوٹے چھوٹے آزاد سلیبلوں کا مجموعہ ہے اور ہر سلیبل کو الگ الگ زوردار طریقہ پر ادا کیا جاتا ہے۔ تاہم تلفظ کے لحاظ سے لہجے کی تین قسمیں ہیں۔ اونچا، درمیانہ اور دھیما۔

1۔ اونچا لہجہ:

(1) مندرجہ ذیل حروف جب کسی سابقہ کے بعد بطور ابتدائیہ آ جائیں تو ان کو اونچے لہجے میں تلفظ کیا جاتا ہے: ག་ ཁ་ ཆ་ ཇ་ ཐ་ ད་ ཕ་ བ་ ཚ་ ཛ་

(2) مندرجہ ذیل حروف جب بطور ابتدائیہ آ جائیں تو ان کو اونچے لہجہ میں تلفظ کیا جاتا ہے: ཀ་ ཅ་ ཏ་ པ་ ཙ་ ཤ་ ས་ ཏ་

2۔ درمیانہ لہجہ:

مندرجہ ذیل حروف (خواہ سابقہ یا ملحقہ حروف کے ساتھ ہوں یا ان کے بغیر) بطور ابتدائیہ آ جائیں تو ان کو درمیانہ لہجے میں تلفظ کیا جاتا ہے: ཁ་ ཆ་ ཐ་ པ་ ཚ་

3۔ دھیما لہجہ:

(1) مندرجہ ذیل حروف سلیبل کے شروع میں بطور ابتدائیہ آ جائیں تو ان کو ہلکے لہجے میں تلفظ کیا جاتا ہے: ར་ ལ་ འ་ ག་ ང་ ཇ་ ཉ་ ད་ ན་ བ་ མ་ ཛ་ ཝ་
ཞ་ ཡ་

(2) مندرجہ ذیل حروف سابقے کے بعد جب بطور ابتدائیہ آ جائیں تو ان کو دھیمے لہجے میں ادا کیا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں ان حروف کی اصلی آوازیں سرے سے ہی بدل جاتی ہیں: ག་ ཇ་ ང་ བ་ ཛ་

رموز اوقاف

1۔ ژھیگ (་) یہ علامت ہر سلیبل کے خاتمہ پر آخری حرف کے دائیں جانب اوپر کونے پر آتی ہے۔ ہاتھ سے لکھائی کے وقت کبھی (་) کی بجائے (،) کی علامت لگائی جاتی ہے جس کو کبھی آخری حرف کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔

2۔ رکیانگ چھد (།) یہ علامت کا ما(COMMA) سیمی کولن (SEMI COLON)اور

کولن (COLON) کی جگہ معمولی وقف کے لئے آتی ہے۔

3۔ نس چھد (༎) یہ علامت وقف تام کے موقع پر آتی ہے۔

4۔ بجی چھد (༎༎) یہ پیرے یا باب کے اختتام کی علامت ہے۔

نوٹ:۔ بعض اوقات رکیانگ چھد کے لئے " ། "، نس چھد کیلئے " ༎ "،اور بجی چھد کے لئے " ༎ ༎ "،یا " ༑ "،یا " ༑ "،وغیرہ کی علامات استعمال ہوتی ہیں۔کبھی کاما کے لئے ༔ کی علامت آتی ہے۔

ہجے

بلتی عبارت کے ہجہ کرنے کے طریقے حسب ذیل ہیں۔

1۔ پہلے حروف صحیح یا حروف مرکب پھر اعراب پھر دونوں کا تلفظ کریں۔مثلا: ཀོ་ کانروکو۔ སྐི་ ساکاتہ سکاگگوسکی۔

2۔ اگر سلیبل میں خاتمہ حرف بھی ہے تو پہلے پورے سلیبل کو پڑھیں پھر خاتمہ حرف کو اور پھر دوبارہ پورے لفظ کو ادا کریں۔مثلاً: ཁྱོང་ کھایاتہ کھیانروکھیوکھیونگ ناکھیونگ۔ རྐྱོང་ راکاتہ رکہ یاتہ رکیانرورکیورکیونگ نارکیونگ۔

3۔ اگر پہلے حرف پر پیدائشی اعراب یعنی زبر ہے تو پہلے اس حرف کو پھر پورے سلیبل کو پھر خاتمہ حرف کو اور آخر میں پھر پورے سلیبل کو ادا کریں۔مثلاً: སྐམ་ ساکاتہ سکاسکم ماسکم۔ ནང་ نانگ نانگ۔

4۔ سابقہ حرف کے ہجہ کے وقت اس کے نام کے ساتھ (وَؤ) کی آواز پڑھی جاتی ہے جیسے: བདུན་ باوَؤ دا جبسکیوبدُ وبدون نابدون۔ གཅིག་ گاووچا گگوچی چیگ گاچیگ۔

5۔ اگر کسی سلیبل میں ایک ہی حرف بمعہ پیدائشی اعراب زبر ہے تو اس حرف کا نام لینے کے بعد لفظ رکیانگ بڑھایا جاتا ہے جیسے: ས་ سارکیانگ سا۔ ཏ་ تارکیانگ تا۔

اُومے حروف تہجی:

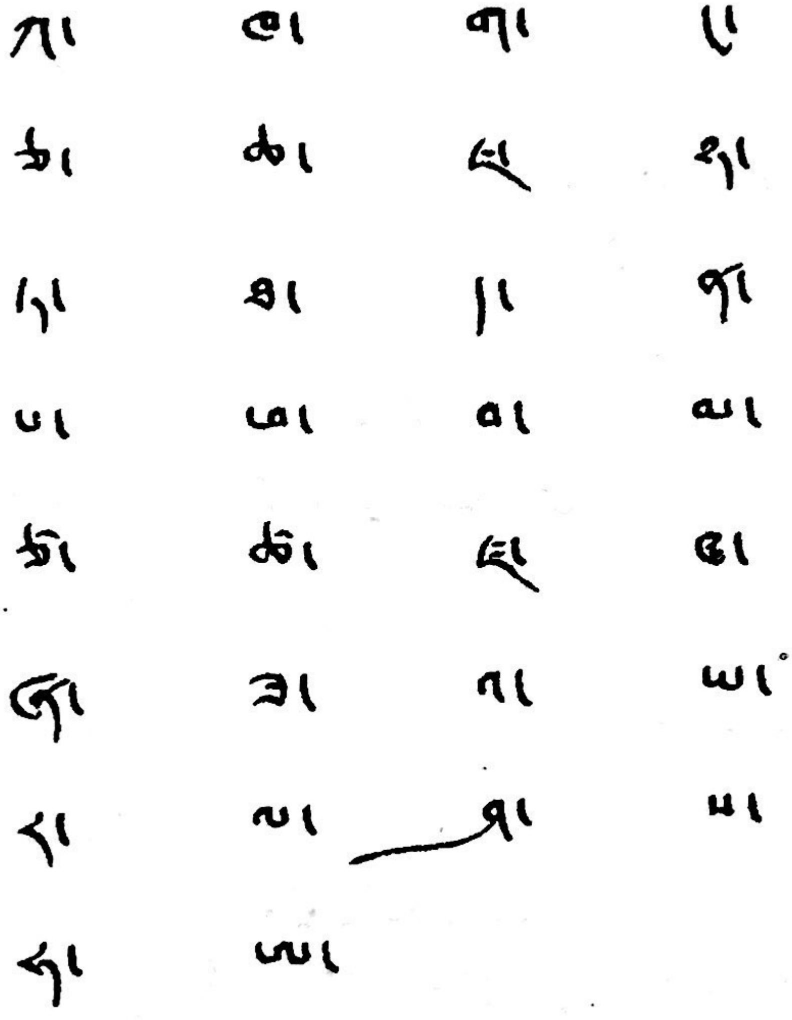

اعراب

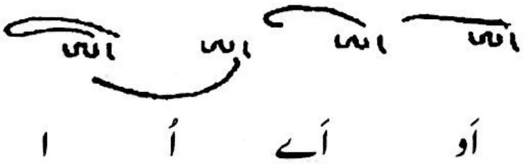

اَو اَے اُ اِ

گنتی

بلتی میں گنتی بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی ہے۔ ایک سے دس تک کے ہندسے حسب ذیل ہیں:۔ 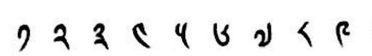

باقی طریقے انگریزی گنتی کی طرح ہیں۔

بلتی شاعری

ابتداء میں بلتی میں منظوم کلام کو خلو کہا جاتا تھا۔اس وقت بلتی اشعار کی رگیا نگ خلوز درونگ خلو، بودھ خلو اور خلو چار اصناف تھیں جن میں رگیا نگ خلو کو اولیت حاصل تھی۔اسی لئے اسے رگیا نگ خلو یعنی نظموں کا سردار نام دیا گیا تھا۔رگیا، سابقہ ہے جو اولیت وعظمت کے لئے لایا جاتا ہے۔رگیا نگ خلو ایک قسم کی آزاد شاعری ہے جس میں اوزان اور قوانی کو پابندی کے ساتھ ملحوظ نہیں رکھا جاتا ہے۔اس کے ابتدائی شعر کو یا ابتدائی شعر کے دوسرے مصرع کو کبھی ہر بند کے بعد مکرر پڑھا جاتا ہے۔اس صنف کے موضوعات میں تاریخ، رزم وبزم، عشق، آہ وبکا، مدح، ہجو وغیرہ سب شامل ہیں۔رگیا نگ خلو میں بیان شدہ واقعات کی مناسبت سے اس کو خفیہ پیغام رسانی کا ذریعہ بھی بنایا جاتا رہا ہے۔

بلتستان میں سرما کی لمبی راتوں کو کہانیاں سننے سنانے کا رواج عام رہا ہے۔ان کہانیوں میں جب کسی کردار کے بارے میں جذبات کے اظہار کا مقام آتا ہے تو اسے منظوم صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔اس قسم کی نظموں کو زدرونگ خلو یعنی نظم کہانی کہا جاتا ہے۔اس میں عموماً قافیہ اور ردیف ملحوظ رکھے جاتے ہیں مگر اوزان کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ بدھ مت کے دور میں مذہبی تعلیمات سے متعلق بلتی نظمیں موجود بتائی جاتی ہیں جو بودھ خلو کہلاتی تھیں۔اشاعت اسلام کے بعد یہ صنف معدوم ہو چکی ہے۔رگیا نگ خلو، زدرونگ خلو اور بودھ خلو کے علاوہ دیگر نظمیں خلو کہلاتی تھیں۔ اس قسم کی نظموں کو ان کے واضع یا موضوعات سے منسوب کیا جاتا تھا۔

اشاعت اسلام نے نئے موضوعات فراہم کئے۔ چنانچہ بلتی شاعری میں قصیدے (حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ، مناقب آئمہ و اولیاء) مرثیے، نوحے، گوشوارے (مثنوی) بحر طویل، ہجو، دیوان، قطعات تاریخ اور فرد کی نئی اصناف ایجاد ہو گئیں۔ابتدائی ایام میں مذہبی نظمیں خداپی خلو، رسول پی خلو، امام پی خلو وغیرہ کی طرح کے ناموں سے معروف تھیں۔لیکن بعد میں خلو کا نام صرف گانوں، عشقیہ غزلوں اور دواوین کے ساتھ مختص ہو گیا۔

ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے بلتی قصیدے، مرثیے، نوحے، ہجو اور خلو عموماً اردو غزل کی صورت میں ہوتے ہیں جن میں پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیہ یا قافیہ وردیف دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن نعت، مناقب اور نوحے کبھی مسمط کی مثلث، مربع مخمس اور مسدس صورتوں میں اور کبھی ترکیب بند اور ترجیع بند کی شکلوں میں بھی ہوتے ہیں۔ نوحے گاہے مستزاد بھی ہوتے ہیں۔ جدید بلتی نوحے اکثر غزل کے اصولوں پر ہی لکھے جاتے ہیں۔ گوشوارے مثنوی ہوتے ہیں جن میں ہر شعر الگ قافیوں میں مگر ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مثنوی میں عام طور پر قصہ، واقعہ، تاریخ، منظر جنگ وغیرہ کی طرح کے طویل مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ بحر طویل میں ان کے علاوہ پندو نصیحت کے مضامین بھی بیان ہوتے ہیں۔ بحر طویل کی نظمیں طویل بحروں میں ہوتی ہیں۔ ہر بند الگ اوزان اور الگ قافیوں میں ہوتا ہے جو درجنوں مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مصرعے آپس میں کلی طور پر یا جزوی طور پر ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخری مصرعے کے پیچھے ''را'' کا لفظ بطور ردیف لایا جاتا ہے۔ مثنوی اور بحر طویل کے تمہید، گریز، مدعا اور خاتمہ چار حصے ہوتے ہیں۔ جو منظوم کلام رگیا نگ خلو اور گانے کے درمیان گایا جاتا ہے بلتی میں اسے دیوان یا بری خلو کہتے ہیں۔ ساخت کے اعتبار سے یہ غزل کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخی قطعات رباعیات اور فرد کی صورتوں میں ہوتے ہیں۔ دیگر مضامین پر بھی رباعیات اور فرد اشعار بہت ملتے ہیں۔ جدید شعراء کے کلام میں عشقیہ اور مذہبی اشعار کے علاوہ دیگر مضامین پر بھی غزلیں ملتی ہیں۔

ہیئت اور ساخت کے علاوہ معنویت کے اعتبار سے بھی بلتی شاعری انتہائی ترقی کے منازل طے کر چکی ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے سارے اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام کے بعد کوئی نیا زدرونگ خلو وجود میں نہیں آیا اور اس صنف کی جو نظمیں ہمارے درمیان موجود ہیں وہ صدیوں پرانی ہیں۔ ان کے شعراء کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی تفصیل موجود نہیں۔ یہی حال پرانے خلو کے شعراء کا بھی ہے۔ جہاں تک رگیا نگ خلو کے شعراء کا تعلق ہے انہی نظموں میں موجود ناموں، واقعات اور قرائن سے شعراء کے

بارے میں اجمالی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔صرف چند ایک رگیا نگ خلو کے شعراء کے بارے میں تاریخی طور پر مختصر معلومات دستیاب ہیں۔خلواور رگیا نگ خلو کے شعراء میں بہت سی شاعرہ خواتین بھی نظر آتی ہیں۔

بلتی شاعری کا پہلا دور یا دور متقدمین 1840ء میں ڈوگروں کے ہاتھوں سقوط بلتستان کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔اس وقت بلتستان کے طول وعرض میں موجود لوک گیتوں کا ذخیرہ اسی دور کی پیداوار ہے۔تاہم اس دور میں وجود میں آنے والے بلتی کلاموں اور اس دور کے بلتی شعراء کے بارے میں کوئی تفصیل اس وقت دستیاب نہیں۔مشہور روایت کے مطابق اسی دور میں بلتستان کے مشہور شاعر میر نجم الدین ثاقب نے فارسی میں منظوم تاریخی کتاب زادالجنان لکھی۔ 1148ھ (1736ء) سے قبل انہوں نے اپنی دوسری منظوم تصنیف فصل الخطاب مکمل کی تھی۔اُن کے بعد سید ابوالحسن تحسین (متوفی 1776ء) نے 1157ھ میں فارسی میں اپنا دیوان بنام 'گلشن اذھان، یا' سفینۃ التحسین، لکھا تھا جو آج دیوان تحسین کے نام سے موجود ہے۔اُنہوں نے بلتی بچوں کو فارسی سکھانے کے لئے 'نصاب الصبیان، کے نام سے 1152ھ میں ایک فارسی۔بلتی منظوم کتاب بھی مرتب کی تھی۔شگر کے اماچہ خاندان کی روایات کے مطابق مشہور شاعر نجم الدین ثاقب نے نثر میں شغر نامہ مرتب کیا تھا جسے بعد میں راجہ شگر کی فرمائش پر سید ابوالحسن تحسین نے منظوم صورت میں بیان کیا جواب شغر نامہ ہی کے نام سے موجود ہے۔

بلتی شعراء

بلتی شاعری کا دوسرا دور 1840ء سے شروع ہوتا ہے۔آزادی کے ڈوگروں کی غلامی میں مبدل ہونے سے یأس وقنوط کی ایک فضا پیدا ہوگئی جو بلتی شاعری خصوصاً مذہبی شاعری کے فروغ کی براہ راست وجہ ثابت ہوئی۔چنانچہ بلتستان کے آخری تاجدار مقپون احمد شاہ کے چار بیٹوں حسین علی خان محبؔ، لطف علی خان عاشقؔ، امیر حیدر مخلصؔ اور ملک حیدر بیدلؔ نے باپ کے ساتھ اسیر ہونے کے بعد غزل گوئی، قصیدہ گوئی، مرثیہ گوئی اور نوحہ گوئی کے فن کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔

عاشق کے بیٹے محمد علی خان ذاکر بھی ان اسیر شعراء میں شامل تھے جو قصیدہ گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ 1842ء کی ناکام جدو جہد آزادی کے بعد شگر کے راجہ حیدر خان حیدر اور ان کے بیٹے مراد خان مراد بھی جموں میں قید ہو گئے۔ حیدر خان حیدر قصیدہ گو اور مراد علی خان مراد قصیدہ گو، مرثیہ گو، نوحہ گو اور غزل گو شاعر تھے۔ مراد کا فارسی اور اردو زبانوں میں بھی کلام موجود ہے۔ حیدر خان حیدر کے کلام میں بلتی قوم کو ڈوگروں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کی تلقین کے متعلق اشارے موجود ہیں۔ محبّ کے کلام کو سلاست و روانی اور معنویت کے اعتبار سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اسی لئے بلتستانیوں کے درمیان وہ ملک الشعراء مشہور ہیں۔

ان شعراء کے بعد شگر کے عباس علی شاہ عباس قصیدہ گو، مرثیہ گو، گوشوارہ نگار، ہلدی کے جوہر علی جوہر قصیدہ گو و بحر طویل نگار، بلغار کے سلطان علی قصیدہ گو، سکردو کے سلطان شاہ قصیدہ گو، بحر طویل نگار، چہلو کے حاتم خان حاتم اور اسفندیار قصیدہ گو، سکردو کے حسن خان بیدل قصیدہ گو، شگر کے منصور علی شاہ منصور قصیدہ گو اور اچھے مرثیہ گو، بلغار کے اکبر مرثیہ گو، سکردو کے شاہ عباس بیدل قصیدہ گو، ولی پہ رستم علی قصیدہ گو، چہلو کے مظفر علی خان ظفر قصیدہ گو، شگر کے اخوند محمد علی طنز نگار، سکردو کے اخوند محمد علی قصیدہ گو و مرثیہ گو، راجہ محمد علی شاہ بیدل قصیدہ گو، کھرمنگ کے جعفر علی خان قصیدہ گو، شگر کے ذاکر علی شاہ قصیدہ گو، اخوند مہدی غزل گو، محمد علی غضو اپا قصیدہ گو و مرثیہ گو، چہلو کے اخوند محمد قصیدہ گو، اخوند کریم قصیدہ گو، گمبہ سکردو کے بوافضل علی شاہ قصیدہ گو، مرثیہ گو، نوحہ گو و قطعات تاریخ نگار، قمراہ کے اخوند حسین قصیدہ گو، کواردو کے اخوند خدایار قصیدہ گو، طنز نگار، گوشوارہ نگار و بحر طویل نگار، اخوند غلام حسین مرثیہ گو، نوحہ گو، بحر طویل نگار، حسین آباد کے امیر بیگ نوحہ گو، بحر طویل نگار، حاجی محمد علی قصیدہ گو و طنز نگار، شگر کے اخوند سلام قصیدہ گو، رگیایول کے اخوند حسن قصیدہ گو، مرثیہ گو، نوحہ گو و طنز نگار، گمبہ سکردو کے بوا ناصر الدین غزل گو، ہجو گو، بحر طویل نگار، سندوس کے اخوند سلطان قصیدہ گو، کھرمنگ کے حسین بلتستانی قصیدہ گو، نوحہ گو و مرثیہ گو اور چہلو کے محمد علی خان واحد غزل گو شاعر گزرے ہیں۔ بلغار کے سلطان علی کا فارسی دیوان زاد الجنان کے نام سے 1336ھ (1917ء) میں مدون ہوا جو اس وقت بھی موجود ہے۔ غاسینگ کے شیخ حیدر نے تجوید کے علم کو

جبکہ کواردو کے اخوند خدایار نے پولو کھیل کی تفصیل کو بلتی میں منظوم کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں متعدد گمنام شعراء بھی گزرے ہیں جن کے کلام مقبول خاص وعام ہیں لیکن بوجوہ وہ بڑے شعراء سے منسوب ہو چکے ہیں۔ محبؔ کے بعد شگر کے عباس علی عباسؔ اور ہلدی کے جوہر علی جوہرؔ کو بلتستانیوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

دور حاضر کے بلتی شعراء میں راجہ محمد علی شاہ صباؔ، شجاعت علی خان شجاعؔ، فدا حسین شمیمؔ، غلام مہدی مرغوبؔ (متوفی 2005ء)، غلام حسن طالبؔ، غلام حسن حسنیؔ، حشمت علی کمالؔ الہامی، اخوند محمد حسین حکیمؔ، شیخ غلام حسین سحرؔ، غلام محمد نادمؔ، غلام مہدی شاہدؔ، امجد علی امجدؔ، فرمان علی خیالؔ، احسان علی دانشؔ، ذیشانؔ مہدی، رضا بیگ گھائلؔ، وزیر محمد حسین راہیؔ، سلامت علی خان سلامتؔ، تہور علی خان تہورؔ، علی احمد قمر، عبدالرحمٰن ثالثؔ، محمد عباس اخترؔ، ذاکر حسین ذاکرؔ، فرح حسین فرحؔ، سید خورشید عالمؔ، ہدایت حسین ہدایتؔ، وزیر احمد ہرپوہ، اخوند ھبۃ اللہ، وزیر غلام علی غمگینؔ، حاجی مہدی اشرفؔ، طالب مجروحؔ، حاجی احمد نادمؔ، علی محمد خالصؔ، اخوند علی اخوندؔ، غلام حسین بلغاریؔ، اسلم حسین سحرؔ، غلام رسول تمناؔ، عاشق حسین عاشقؔ، محمود فردوسیؔ، افضل روشؔ اور یوسف کھسمنؔ مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر شعراء بلتی کے علاوہ اردو میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ 2009ء کے بعد بعض اور نوجوان شعراء منظر پر نمودار ہوے ہیں جن میں سے عارف سحاب، حمایت نذیر، روزی علی صمیم، نسیم ادا، حامد اسد، قمر عباس کاظمی، اشرف راغب، عباس سفیر، فدا حسین نشیمن اور علی اسد موسوی کے نام دستیاب ہوئے ہیں۔

بلتستان کے بعض شعراء صرف اردو شاعری کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ ان میں سید اسد زیدیؔ، ذاکر شیمؔ، شاکر شمیمؔ، ڈاکٹر مظفر حسین انجمؔ، سید اشرفؔ کاظمی، فاچو محمد تقیؔ، غازی محمد نعیم غازیؔ، بشارت حسین ساقیؔ اور عاشق حسین فرازؔ معروف ہیں۔

ریڈیو پر بلتی نشریات کے جاری ہونے کے بعد بلتی شاعری میں ملی نغمے اور زرعی نغمے کی صنفیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ چنانچہ دور جدید کے بعض شعراء ان صنفوں میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

بعض بلتی لوک گیتوں کے نام

قصائد، بحرطویل، گوشوارے، مرثیے، نوحے، ہجو، دیوان وغیرہ کے مجموعے بلتستان کے طول وعرض میں منتشر طور پر موجود ہیں۔ دیگر نظمیں کچھ تحریری شکل میں اور اکثر سینہ بسینہ چلی آ رہی ہیں۔ رگیا نگ خلو میں بلتستان کی قدیم تاریخ اور تہذیب وتمدن کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔ اس کی اس افادیت کے پیش نظر آیندہ محققین کی سہولت کی خاطر ہم یہاں چند ایک کے نام درج کرتے ہیں جو بڑی مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں۔

1۔ بروشال پہ
2۔ لینکپہ شہ چو
3۔ برق مقپون
4۔ منہ فو
5۔ یتو
6۔ لانگدوکپہ
7۔ سکنے
8۔ ملبیگ کالون
9۔ ژھن تھقرینگ
10۔ بونومریوم
11۔ دسنی سرمیک
12۔ جوخچن ہری نو
13۔ کھری سلطان چونمبر 1
14۔ کھری سلطان چونمبر 2
15۔ شیرینگ ہلنو
16۔ گل حلیمہ
17۔ کھری زوم
18۔ تراب نقپو چو
19۔ سوتی (ہیمباف)
20۔ شیرینگ گنہ
21۔ میرگیال
22۔ میزوم (مینگ لیاخمو)
23۔ ابوچومالی خان
24۔ بیانہ نقپو
25۔ ہلہ بینو (لستوتھونمو)
26۔ علی میر
27۔ کھری رگیالمو
28۔ کھریمہ
29۔ شیرولی
30۔ انڈپنی ولی
31۔ ستروغی علی میر
32۔ شرہ ملبیگ
33۔ غبیارسہ غبیارچونگ
34۔ ہیلیمی مراد
35۔ وزیرتھقرینگ
36۔ ریمیک پہ
37۔ فچو مدی
38۔ مدی علی
39۔ امیرحیدر
40۔ خسیری ملنو
41۔ موروپ ستزن
42۔ زونگ فیلے

43۔ موگرینگ — 44۔ گیال ملک چو — 45۔ مستیانگ

46۔ برق مایورچو — 47۔ یودر — 48۔ ہرن چھوغوئے بلافو

49۔ جہان علی میر — 50۔ لینگپہ آرزو — 51۔ ہِنہ خور

52۔ میون ژھانگ تھور — 53۔ شینگ کھن کوفی — 54۔ ژھے مہ مور

55۔ شیرینگ بغدور — 56۔ تلولدیم کھہ — 57۔ ابوشر

58۔ ستق مایورچو — 59۔ ہلال باغ — 60۔ بیالے ہرکونگو

61۔ مقپون عظیم خان — 62۔ ننہ ژھوق سکت — 63۔ غوری تھم

64۔ بیآنچو — 65۔ چھوپسی فتی — 66۔ کلی ملی کوشمل

67۔ شاہ بہرام چو — 68۔ بلغری شقڈنگ چقپہ — 69۔ ردوردچقپہ

70۔ چوپہ حسن خان — 71۔ گلی فمبر چو — 72۔ اتی کواس (تشوپی علی)

73۔ لستیانگ بوڑو — 74۔ غضواپا کریم — 75۔ ہسوروئے حیدر

76۔ شینگ شیرپہ (چھونہ فرول) — 77۔ شیطان پہ — 78۔ استاد مومن

79۔ حاجی کریم — 80۔ تستے مراد — 81۔ فچو شفی

82۔ رگشی چھوقلدیم سکت — 83۔ ننہ لیاخ سکت — 84۔ خورفو احمد

85۔ دازن ملک پہ — 86۔ اپسی پی ننہ — 87۔ بابور

88۔ بلتی بغدور — 89۔ شیرینگ مونچو — 90۔ اول عاشق مو

91۔ ننہ حاجی نو — 92۔ وزیر بغدور — 93۔ آرزوتیانگونگ خان

94۔ چوطالب چو — 95۔ حاتم خان — 96۔ سیلینگ کھر

97۔ ابوچونیمن — 98۔ یقوم شاہ (یعقوب شاہ) — 99۔ جنجال علی

100۔ اماچا — 101۔ ہندوق خسوم — 102۔ پرالہ ہرڑے

103۔ یولی مراد — 104۔ دوم سوم رگہ کھہ — 105۔ علی حسین

106۔ اعظم خان — 107۔ لطف علی خان

بلتی موسیقی

بلتی موسیقی کی حریب،لمنہ ،ہرسیکار،ستغر اور خلوکار پانچ قسمیں ہیں جن کی تعریف حسب ذیل ہے۔

1۔ حریب:

یہ راگ حرب یعنی جنگ سے متعلق ہوتے تھے۔اسی لئے حریب کہلاتے ہیں۔بلتی بزرگوں کے مطابق حریب کی تعداد ساٹھ ہے جن میں سے مندرجہ ذیل کے نام دستیاب ہیں:

نوبت، چھوغو مغلوب، شادیاں، یگاہ، دوگاہ، سیگاہ، چہارگاہ، پنج گاہ، چھوغو سیگاہ، بوتی سیگاہ، ژھوگنہ سیگاہ، چھوغو ذکر، ژھونسے ذکر، حسینی،عجم، مغلوب، غم، بایت، فرود، جاشنہ، چنگ چمبہ، دلاور، پیشی عنبر، ہزار داستان، چمن بے نظیر، غزّ ل، دلدل ثاقلہ، کھانساری، ستروقپہ رگوفچوس، سحر آگاہ، میون ژھانگ کھرلیس، مجاز، مخالف، عشاق، صبح صادق، ساز ہندی، درات، درملا، دور ساقی، سیندوری وغیرہ۔ان میں سے بعض مقامی ایجاد اور باقی ایران و ہندوستان سے درآمد شدہ ہیں۔حریب کے رق، رگو، روانی اور گوشہ چار حصے ہوتے ہیں۔

2۔ لمنہ:

لشکر کے چلنے کے دوران جو میوزک بجائی جاتی تھی وہ لمنہ کہلاتی ہے جس کی تعداد بارہ ہے لیکن ہمیں صرف سات کے نام دستیاب ہوئے ہیں:

چھوغولمنہ، رگیالم چھنمو، بوتی لمنہ، رلٹہ خومبو، زنجیر بادشاہ، شاہ ون، مقپون ستن لہ شخفہ۔

3۔ ہرسیکار:

ناچ کی دھنیں ہرسیکار کہلاتی ہیں جو بول کے بغیر بجائی جاتی ہیں۔اس کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

چھوغو پریسول، گشوپا، میندوق کار، فورگونی کار، سنیوپا (علامت بارات)، فوتونگ کار (علامت شکست) افغانی، تھین کار، بوراکار، الینگ کار، غبیار سہ غبیار چونگ، برہ ڈم، چلا ہو

(علامت وداع) بروق چھوس، بلتی چھوس، بودھ چھوس، کھچے چھوس، مون چھوس۔ ان میں سے متقدم الذکر دس دھنوں کے ساتھ تلوار کے ساتھ اور باقیوں کے ساتھ رومال کے ساتھ یا خالی ہاتھ ناچ ہوتی ہے۔

4۔ ستغرا:

پولو بلتستانیوں کا قومی کھیل ہے۔ اس کھیل کے دوران گول ہونے کے بعد پہلی ہٹ مارنے کو ڈفوق کہتے ہیں۔ ڈفوق مارنے کے دوران جو میوزک بجائی جاتی ہے اسے ستغرا کہتے ہیں۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔

تاجور: تاجدار یا ولیعہد کے لئے۔

بختاور: حکمران خاندان کے دیگر افراد کے لئے

بخشاور: وزیروں کے لئے

گلاور: عام کھلاڑیوں کے لئے

5۔ خلوکار (غنائیہ):

گانے، غزل، دیوان اور لوک گیت کے بول کے ساتھ جو موسیقی بجتی ہے وہ خلوکار کہلاتی ہے۔ اس میں بول، تالی، میوزک اور ناچ ساتھ ہوتی ہیں۔ خلوکار کی قسمیں مون چھوس، بلتی چھوس، بیکار چھوس، سودے چن، بروق چھوس وغیرہ ہیں۔

اگر چہ 1947ء کے بعد سے موسیقی کے جدید آلات بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ لیکن مقامی آلات کے نام یہ ہیں:

1۔ سرنہ (شہنائی)۔ یہ اگر ایک ہی لکڑی سے بغیر جوڑ کے بنائی جائے تو وہ آبری کہلاتی ہے۔

2۔ کرنہ (بگل کی ایک قسم جس کے ذریعے ارد گرد کے لوگوں کو سگنل دیا جاتا ہے)

3۔ خلینگبو (بانسری) اس کی دو قسمیں چک خلینگ (ایک شاخی) اور ژھانگ خلینگ (دو شاخی) کہلاتی ہیں۔

4۔ ڈیا نگ (ڈھول)

5۔ ڈیا نگ من (طبلہ)

6۔ چنگ

کرنہ پر بارہ الگ الگ ساز بجائے جاتے ہیں جو' کرنہ چونس' کہلاتے ہیں۔

لوک کہانیاں

جاڑوں کی لمبی راتوں کو محلّہ کے لوگوں کا ایک گھر میں جمع ہو کر کہانیاں سننے اور سنانے کا رواج بلتستان بھر میں عام رہا ہے۔ یہ کہانیاں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہیں جن میں سے اکثر خالص مقامی اور بعض ایران و ہندوستان سے در آمد شدہ ہیں۔ لوک کہانیوں میں بلتستان کے قدیم مذاہب، تہذیب و تمدن وغیرہ کے بارے میں صریح اشارے ملتے ہیں۔ ان میں جائے وقوعہ خوریول (ترکستان)، ہلہ یول (تبت)، بودھ یول (لداخ)، کھچول (کشمیر)، بروق یول، درے یول، پرستان، یونان، توران، چین، مصر، روم اور ہندوستان بتائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں کیسر کی کہانی سب سے زیادہ لمبی ہے جس کے بارہ ابواب (یلداخ) ہیں۔ چند کہانیوں کے نام یہ ہیں:

ہلہ فو کیسر، اپی ژھو فڑا، شینگ کھن خسوسبو، ژھونکپہ نہ طوطا، ہلم کھن، شینگ کھن چندن، سلیمہ چو چو، رگیالو ستر البو، رگیالو چولو بزانگ، باسیر مو، ستر ینگ چیگ نہ مینگ چیگ، غبول گوستن، بانگمہ نوئے بو بانگمہ خان، سونگ شیر ینگ چو چو، درے یولی گل بہرام، ہو ہو کھن مو چو چو، فڑا ژھونگپا، میمون ژھونگپا، شینگ سکم، نیہ سکم، خسیری کھرہ، ہو ہو کھن بیگم، خسر تی تی، خسیری ہلہ سکن، چھوسی سنمبو، خلونگ ہرتہ، فلو ہرتہ، وانہ وانو، ہر کنگ میدکا کانہ فونو، اپی نہ ابو (اس نام کی کئی کہانیاں ہیں)، گونپہ نواپی، پرستان (اس نام کی بھی کئی کہانیاں ہیں)، اپی ژھو، یونانی بادشاہ، پرستانی بادشاہ، موتی گی چو چو، بازیگر کا کانہ فونو، لعل یولی بادشاہ، پرستانی کیمو کھر، لعل یولی بیگم چو چو، سونوئے بادشاہ، رومی بادشاہ، حلوائی شہری بادشاہ، فڑا بادشاہ، ستر نجی ہر سونو بے خاتون، بادشاہ زادہ نہ وزیر زادہ، ملک تحمال، ملک محمد، خواجہ محراب، نقشہ خاتون، تاج ملوک، شمس و قمر، قمر الزمان، بادشاہ زادہ، گل موتی، گل بہ صنوبر، ناصر شاہ۔

بلتی رسومات اور معاشرہ

آیئے اب ہم بلتی رسومات اور معاشرہ پر طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ رسومات میں پہلا نمبر تہواروں کا آتا ہے۔ یوں تو بلتستان میں بہت سے تہوار ہیں تاہم مے فنگ ،نوروز، عید غدیر اور عید فطر کے تہوار قابل ذکر ہیں۔ مے فنگ کا تہوار ہر سال 21 دسمبر کی شام کو چراغاں کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ اس شام خصوصی کھانوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ بلتیوں کا قدیم قومی تہوار ہے لیکن بلتی بزرگ اس تہوار کی تشریح سے قاصر ہیں۔ 1970ء کی دہائی سے اس کا زور ٹوٹا اور اب (2002ء) تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

نوروز کی عید ایرانیوں کے نئے سال کے پہلے دن منائی جاتی ہے۔ اس روز کا انڈوں کا کھیل بہت مقبول اور مشہور ہے۔ چھوٹے بچوں کو رنگین انڈے بطور عیدی دیئے جاتے ہیں۔ وادی کی مرکزی شغرن (پولوگراؤنڈ) میں موسیقی، پولو، نشانہ بازی اور دیگر کھیلوں کے تماشے دکھائے جاتے ہیں جہاں اہالیان وادی جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں۔ نوروز، عید الفطر اور عید غدیر کے روز ہاتھوں میں مہندی لگانا، نئے کپڑے پہننا اور ایک دوسرے کے گھروں میں مبارک باد کے لئے جانا ضروری ہوتا ہے۔ عید الفطر کے روز نماز عید بھی پڑھی جاتی ہے۔ جب کہ عید غدیر کے روز (18 ذوالحجہ) قصیدہ خوانی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ عید الاضحیٰ کے روز نماز عید اور قربانی کے علاوہ اور کوئی گہما گہمی نہیں ہوتی۔

نئی فصل کے پکنے کے قریب ستروب لہ کی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ اس روز زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جب کھلیان سے دانہ بھوسہ الگ کئے جانے کے بعد غلہ کے گھر لانے کا وقت آتا ہے تو اس شام پھر قریبی عزیزوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ یہ تقریب اونگ چوس کہلاتی ہے۔ یادر ہے کہ غلے کے انبار کو تھیلوں میں ڈالنے کے دوران بات چیت کرنا روایتی طور پر ممنوع تصور کیا جاتا ہے۔

جناب رسول اکرمؐ اور ان کی آل مطہرہؑ کی ولادت کے دن، حضرت فاطمہؑ کی عروسی کے

روز ، شب معراج اور روز مباہلہ قصیدہ خوانی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں جو عید کہلاتی ہیں اور ان کی وفات اور شہادت کے روز مجالس عزا برپا کی جاتی ہیں جو عرس کہلاتی ہیں۔محرم میں پندرہ روز تک اور پھر چہلم کے روز امامباڑوں کے علاوہ گھر گھر مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ان کے علاوہ ہر سال شمسی حساب سے ماہ اسد کے پہلے عشرے میں بھی شہداء کربلا کی یاد میں پھر مجالس عزا منعقد کی جاتی ہیں۔کہتے ہیں کہ واقعہ کربلا اسی موسم میں واقع ہوا تھا۔محرم اور اسد کی دسویں تاریخ کو سکردو میں بلتستان کا سب سے بڑا جلوس نکلتا ہے جس میں ہزاروں سوگوار شرکت کرتے ہیں۔ایسے موقعوں پر عام خیراتی کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن پر زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے عقیدتمندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ان رسومات کی ادائیگی کے لئے ہر محلّہ میں الگ تنظیمیں قدیم الایام چلی آ رہی ہیں جن پر بلتی معاشرتی زندگی کی بنیادیں قائم ہیں۔اس قسم کی تنظیم کے سکریٹری کو ترنہ کہتے ہیں۔مذہبی رسومات کے علاوہ تقریباً سارے معاشرتی امور بھی اسی کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔اسی تنظیم کے تحت ہر محلّہ یا گاؤں کا علیحدہ مولوی ہوتا ہے جس کے لئے سامان زیست کی فراہمی اسی تنظیم (اہالیان محلّہ) کے ذمے ہوتی ہے۔

ہر سال 14 اگست کو یوم آزادی بلتستان منایا جاتا ہے جس کی تقریبات ایک عشرہ تک جاری رہتی ہیں۔اسی دوران مرکزی پولوگراؤنڈ میں مختلف کھیلوں کے تماشے دکھائے جاتے ہیں۔

بلتستان میں شادی کی تقریبات عموماً چار روز تک جاری رہتی ہیں۔پہلے روز ابتدائیہ (کھور رکق)، دوسرے روز مہندی (سیر موسنگ)، تیسرے روز زفاف (بخستون) اور چوتھے روز اختتامیہ (گرون زن) کی تقریبات ہوتی ہیں۔یہاں منگنی کی لمبی رسومات نہیں۔دلہا، دلہن والوں کے درمیان رابطہ شخص کو بلپہ کہتے ہیں۔داماد یا دلہن کا انتخاب ان کے رشتہ دار کیا کرتے ہیں۔کھور رکق کی شام کو محلّہ کی سماجی تنظیم کے لوگ جمع ہوتے اور شادی کے انتظامات مکمل کر لیتے ہیں۔اسی روز عورتیں کولچہ (ایک قسم کا کھانا) پکا کر تیار کرتی ہیں۔سماجی تنظیم کے اراکین انتظامات سے قبل ایک جبری کھانا کھا لیتے ہیں جو "تھب ستد" کہلاتا ہے۔مہندی کی رات دلہا کی طرف سے شادی کے کپڑے (وردان) اور پکے ہوئے کھانے کا تحفہ (کھہ می تھل، اٹھارہ کولچے اور ایک کھب

سے، ایک کولچہ کاوزن آدھ کے.جی اور کھبسے کاوزن دو کے.جی ہوتا ہے) دلہن کے گھر بھیجا جاتا ہے جہاں دلہن کے رشتہ داروں کے سامنے اس کا ماموں اسے کھولتا ہے۔ کھ می تھل کوان کے درمیان بانٹا جاتا ہےاور جسے اس کا ایک ٹکڑا مل جائے اسے دوسری شام دلہن کے ساتھ بارات میں جانا ہوتا ہے۔مہندی ہی کی رات دلہن کے قریب ترین عزیزوں میں سے دو تین یا چار افراد دلہا کے گھر جا کر اس مکھن کو پگھلواتا ہے جو دوسری شام باراتیوں کے کھانے میں ڈالا جانے والا ہوتا ہے۔اس رسم کو ماربجوس اوران افراد کوسنین گو کہتے ہیں۔اسی رات دلہا اور دلہن کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جاتی ہے۔اس دوران ان کے دوست اور سہیلیاں ساتھ ہوتی ہیں۔شادی کے دن دلہا دلہن کی رشتہ دار عورتیں ان کے لئے اونی سہرا (بل تھود) تیار کرتی ہیں۔ یہ ایک بیحد خوبصورت سہرا ہوتا ہے۔سہرا تیار کرنے کے بعد کبھی یہ عورتیں گاتی ناچتی بھی ہیں جن کے گرد تماشائیوں کا ہجوم جمع ہوتا ہے۔کبھی مہندی کی رات کو دلہا دلہن کے دوست اور سہیلیاں ناچ گانے کی محفل منعقد کرتے ہیں لیکن معاشرے میں یہ فعل سخت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔شادی کے روز امیر گھرانے کے دلہا کے ساتھ سوسوا سو گھوڑے سواروں کا ایک جلوس آس پاس کی بستیوں تک سیر کر کے شام کو واپس آتا ہے جو ''ہرتہ سیر،، کہلاتا ہے۔1970ء کے عشرے سے گھوڑوں کی جگہ گاڑیوں نے لی ہےاور دلہا کو گاڑیوں کے جلوس میں پھرایا جاتا ہے۔شام کو دلہن کی رخصتی کا وقت آتا ہے یہ منظر نہایت ہی کرب انگیز ہوتا ہے۔کبھی رخصتی کے وقت چلاہو کی دھن بجائی جاتی ہے۔اس موقع پر کوئی آنکھ ایسی نہیں ہوتی جو تر نہ ہو۔بارات دلہن کی طرف سے جاتی ہے جس میں پچاس سے ڈیڑھ سونفر تک ہوتے ہیں جو ہفت بند (ایک قصیدہ) پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔دلہن گھوڑے پر یا اس کے اپنے ماموں کی پیٹھ پر سوار ہوتی ہے۔بعض اوقات دلہا کو سہ پہر کے وقت دلہن کے گھر لیجایا جاتا ہےاور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دلہن کو لے کر واپس ہوتا ہے۔ایسی صورت میں دلہن کے ساتھ باراتیوں کی تعداد کچھ کم ہوتی ہے۔دلہن والے اپنی حیثیت کے مطابق دلہا کو نقد یا اجناس کی صورت میں تحفہ پیش کرتے ہیں۔فریقین میں تحفے تحائف کے تبادلے کی رسومات بیشمار ہیں۔جہیز لازمی نہیں ہے۔ شادی کے دوران خویش واقارب امدادی تحفے بنام تھودمہ ساتھ لاتے ہیں۔شادی کی دوسری شام

دلہن کے والدین اوراس کے قریبی رشتہ دار (سنین گو) دلہا کے ہاں کھانے پر بلائے جاتے اورانہیں تحفے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ رشتہ دار دلہا کے ہاں ایک مرغی اور پکے ہوئے کھانے کا تحفہ ساتھ لاتے ہیں جو ''بیہ نہ زان،، کہلاتا ہے۔تقریبات کے اختتام پر دلہا دلہن کے رشتہ دار انہیں دعوتیں کھلاتے ہیں۔ یہ دعوتیں گرون زن کہلاتی ہیں۔آجکل شادی کی تقریبات کا عموماً املاک کی فروخت کے بعد آغاز یا اسی پر اختتام ہوتا ہے۔شادی سے قبل عموماً ایک نیا مکان بھی بنایا جاتا ہے۔ یہاں بوڑھے امراء کا نوعمر لڑکیوں سے شادی رائج ہے۔ یہاں کثیر الازدواجی بھی رائج ہے۔ جہالت اور ذہنی پستی کے سبب یہاں طلاق کا حصول اکثر خلع کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ خلع میں عموماً مہر اور لڑکی کی مملوکہ زمین وغیرہ لی جاتی ہے جو رفیع خانی تولو کہلاتی ہے۔اس لئے برائے احتیاط انقطاعی عقد کا رواج عام رہا ہے۔لڑکے لڑکیوں کی شادیاں عموماً بارہ سے سولہ سال کی عمر میں کی جاتی ہیں اور رشتے کا انتخاب چونکہ والدین کرتے ہیں اسی لئے رشد کو پہنچنے کے بعد طلاق کی نوبتیں آ پہنچتی ہیں۔ایسے بھی واقعات سننے میں آئے ہیں کہ شوہر نے بیوی کو طلاق دیئے بغیر دوسری شادی کر لی اور پہلی بیوی نے ساری عمر یونہی گزار دی۔ ایسا اکثر پیش آتا ہے۔خصوصاً جب کہ پہلی بیوی کے ساتھ زمین یا کوئی جائیداد ہو۔ یہاں کی ازدواجی زندگی اور نکاح اور طلاق کی قباحتیں کوئی چشم بینا ہی دیکھ سکتی ہے۔

کسی گھر میں ولادت ہوتی ہے تو اس کے خویش و اقارب پکے ہوئے کھانے لے کر مبارکباد کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ ختنہ کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے۔عقیقہ کی رسم یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔کسی گھر میں موت واقع ہوتی ہے تو اہل محلّہ (محلّہ کی مذہبی انجمن) تجہیز و تکفین کا بدوبست کر لیتے ہیں۔میت کا وارث اسی وقت ان کے لئے کھانے کا انتظام کر لیتا ہے جو سہ فنگ کہلاتا ہے۔اسی یا دوسری شام اس گھر میں ایک خیراتی کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس کے بعد رشتہ دار پکے ہوئے کھانے لے کر پرسہ دینے آتے ہیں اور کھا پی کر واپس ہو جاتے ہیں۔ گاؤں کے سارے افراد فاتحہ خوانی کے لیے ایک بار ضرور ادھر پہنچ جاتے ہیں۔ وقوعہ کے بعد والے جمعہ کو فاتحہ خوانی ختم کی جاتی ہے۔اس روز میت کے قریبی لواحقین ضرور سر دھو لیتے ہیں۔چہلم کے روز پھر فاتحہ خوانی ہوتی ہے اوراس کے بعد ہر سال اسی تاریخ کو فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ بلتستان میں

سالگرہ کی رسم رائج نہیں ہے کیونکہ یہ نئے دور کے سرگشتہ خمار رسوم وقیود کا شغل ہے۔

کوئی بیمار پڑتا ہے تو سارے گاؤں والے اس کی عیادت کے لئے جمع ہو جاتے ہیں اور مرض کی تشخیص، اس کے علاج اور پرہیز کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ گوعلاج کے لئے اب جگہ جگہ ہسپتال اور ڈسپنسریاں قائم ہیں تاہم یونانی طب کے مطابق نشتر اور جڑی بوٹیوں اور نجوم کی کتابوں کے مطابق دم، دعاؤں اور تعویذوں کے ذریعے علاج کا رواج بھی عام ہے۔ نجومی کتب کے ذریعے عموماً چشم بد یا آسیب زدگی تشخیص ہوتی ہے۔ عموماً بیماری کے ابتدائی ایام میں مریض کو اس طرح زیر علاج رکھا جاتا اور آخری مرحلہ پر اسے ہسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ علاج معالجے پر یہاں کے معاشرہ میں زیادہ توجہ نہیں دی جاتی اور نہ اس پر زر کثیر خرچ کیا جاتا ہے۔ کتابی نجومیوں کے علاوہ یہاں کچھ لوگ بان کے نام سے معروف تھے۔ یہ لوگ کچھ عمل کرنے کے بعد نیم بیہوش ہوتے اور غیبی باتیں کرتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس دوران جنات انہیں غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ وغیرہ کی صورت میں سراغرسانی کے لئے لوگ ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ 1970ء کے عشرے کے بعد ان کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ بلتستانی لوگ، نجوم وجفر کے سخت معتقد ہوتے ہیں۔ عام حالات میں بھی طالع نامہ دیکھ کر بعض لوگ اپنے ستارے کی پہچان کئے بیٹھتے ہیں۔

بلتستان کے اکثر باشندے اس کرہ ارض پر انس وجن کے علاوہ ہلہ ہلنو نامی ایک بابرکت جنس کے وجود کے معتقد ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ آہو، مارخور، کیل اور شافو وغیرہ ان کے پالتو جانور ہیں۔ موسیقی اور رقص وسرود کے یہ لوگ بے حد دلدادہ ہیں جس سے خوش ہو کر موسموں کو صاف رکھتے ہیں۔ یہ کبھی کسی انسان کو اغواء بھی کر لیتے ہیں اور کبھی بستیوں سے میوے غائب کر دیتے ہیں۔ ہلافو کیسر اور اس کی بیوی ہلانو بروک مو اسی جنس کے افراد ہیں جو اب تک زندہ ہیں۔ یہ اشاعت اسلام سے قبل کے دیوی دیوتا کے تصورات ہیں جو ابھی تک اذہان سے رفع نہیں ہوئے ہیں۔ کیسر کی کہانی تبت اور لداخ کی طرف بودھوں کے پاس مقدس مذہبی منظوم کتاب کی صورت میں موجود ہے۔

ناپ تول کے مقامی پیمانے تھو (بالشت)، کھرو (ہاتھ)، سترانگ (مقامی ترازو)، ٹوپہ، (پانچ پاؤ) کھل (بیس ٹوپے) اب متروک ہو چکے ہیں۔ بلتی جنتری میں بارہ شمسی سالوں کی ایک گردش ہوتی

ہے۔ جو، لوسکور، کہلاتی ہے۔ ان سالوں کو چوہا، بیل، چیتا، خرگوش، اژدہا، سانپ، گھوڑا، بھیڑو، لنگور، مرغ، کتا اور سور کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لمبے شمار کے لئے لکڑی، آگ، زمین، لوہا اور پانی کی پانچ علامتیں مقرر ہیں جنہیں کھمس کہتے ہیں۔ یہ اسی ترتیب میں دو دو دفعہ مندرجہ بالا سالوں پر لگائے جاتے ہیں۔ دسویں سال میں ان کا دور ختم ہو جاتا ہے اور گیارہویں سال سے پھر شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح ساٹھ سال پورے کئے جاتے ہیں۔ اس چکر کو رب جونگ کہتے ہیں۔ بلتستان میں 21 مارچ کو سال کا نیا دن شمار کیا جاتا ہے۔ کھیتی باڑی کے کاموں کے لئے عربی شمسی مہینے اور مذہبی رسومات کے لئے عربی قمری مہینے شمار کئے جاتے ہیں۔ محرم، رجب، شعبان، شوال، ذیقعدہ اور ذوالحجہ کے لئے علیٰ الترتیب ماتم، لزاخسوم روزہ، برات، سکیال لزا، چھون لزا اور قربان بلتی نام ہیں۔ قوس اور جدی (21 نومبر تا 21 جنوری) کے شمسی مہینوں کو بلتی میں رامن اور رشی من کہتے ہیں۔ 21 دسمبر کے بعد پھر بتدریج گرمی پہنچنی شروع ہوتی ہے تو 10 جنوری کو کھی تروت (کتے کی گرمی)، 20 جنوری کو بیہ تروت (مرغی کی گرمی)، یکم فروری کو کھانگ تروت (گرمی خانہ)، 10 فروری کو ژھونڑے سہ تروت (نیم گرمی زمین) اور 20 جنوری کو چھوغو سہ تروت (گرمی زمین) کے حساب سے گنا جاتا ہے۔ اس کے دس روز بعد 2 مارچ کو گوتب (کاشت کا پہلا وقت)، 8 مارچ کو سکل تب (کاشت کا درمیانہ وقت) اور 12 مارچ کو جوگ تب (کاشت کا آخری وقت) کہا جاتا ہے۔

موسم گرما کے دوران دن کے وقت لوگ بید کے درختوں کے سایوں میں مل بیٹھتے ہیں۔ اس جگہ کو بلچنگرا کہتے ہیں۔ گاؤں کے بزرگ اس جگہ خفیف تنازعات کا تصفیہ بھی کر ڈالتے ہیں اور ملزم پر کوئی مینڈھا، بکرا، مکھن وغیرہ جرمانہ عائد کر دیتے ہیں جو چھدپہ کہلاتا ہے۔ گرمیوں میں پہاڑوں پر چھوٹی چھوٹی وادیاں سرسبز ہو جاتی ہیں تو مویشیوں کو ادھر منتقل کر کے ان کے دودھ کو تولا جاتا ہے اور اپنی دودھ کی مقدار کے مطابق ہر گھرانہ باری باری ان مویشیوں سے معینہ رسومات کے مطابق دودھ لیتا ہے۔ یہ رسم بجون کہلاتی ہے۔ سماجی تنظیم (گرونگ می) کی حدود کے مویشیوں کو ہر گھرانہ باری باری سے چراتا ہے جسے بہ ریس اور نوریس کہتے ہیں۔ گرما کے دوران نوجوانان پہاڑوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ کئی کئی روز تک پکنک کرتے ہیں جو "ری سیر" کہلاتی ہے۔ کبھی نوجوانان

مشترکہ طور پر کھانے کا اہتمام کر لیتے ہیں جسے گرون کہتے ہیں۔خزاں اور سرما کے دوران چند نوجوان مشترکہ طور پر مینڈھا یا بکرا ذبح کرتے ہیں۔ یہ رسم شہ لین کہلاتی ہے۔سرما کی لمبی راتوں کو محلہ کے لوگ کسی گھر میں جمع ہو کر کہانیاں سننے اور سنانے میں گزارتے ہیں۔کبھی کوئی مولوی حملہ حیدری بیان کرتا ہے۔اس دوران مرد اور عورتیں اون کاتنے اور دیگر دستکاریوں کا شغل بھی ساتھ رکھتے ہیں۔

موسم سرما کی پہلی برف باری پر بعض لوگ خصوصاً بچے ایک دوسرے کے گھروں میں مخفی طریقے سے برف کا ٹکڑا رکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ایسے موقع پر وہ شخص یا بچہ باہر نکل کر چلا کر' کھا ستون، کہتا ہے۔اگر اس گھر کا کوئی فرد اس شخص یا بچے کو اس کے گھر پہنچنے سے پہلے پکڑ سکا تو اس کے چہرے پر کالک مل کر چھوڑ دیتا ہے۔بصورت دیگر اس کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا پڑتا ہے جو ''کھا ستون''یعنی برف کی تقریب کہلاتی ہے۔

بلتستان کی خواتین چادر کے نیچے کالی اونی پٹی کی بنی ہوئی ٹوپی استعمال کرتی ہیں۔بلتی زنانہ ٹوپی دو قسم کی ہوتی ہے۔1970ء کے عشرے کے بعد اس رجحان میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ بلکہ اکثر علاقوں میں اب ٹوپی کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ٹوپیوں پر سونے اور چاندی کے خصوصی زیوارت استعمال ہوتے ہیں جن میں تومار، فوقبو اور ہاشہ مقبول ہیں۔ دوسرے زیورات میں انگوٹھی، چوڑیاں، ہار، بالیاں اور چہارگل شامل ہیں۔ چہارگل کو ناک پر سجایا جاتا ہے۔زیورات میں فیروزے، عقیق اور دوسرے قیمتی پتھر خوب استعمال ہوتے ہیں۔

چونکہ بلتستان کے اکثر علاقوں میں پانی کی قلت ہے اس لئے زرعی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے اردگرد کے پہاڑوں پر' ضرورت ایجاد کی ماں ہے، کے مصداق گلیشئر پالنے کا ایک قدیم اور اپنی نوعیت کا منفرد رواج رہا ہے۔گلیشئر پالنے کا طریقہ یہ رہا ہے کہ قدیمی گلیشئروں سے بستی کے لوگ کئی من یخ کے ٹکڑے اٹھا کر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں گلیشئر پالنا مقصود ہوتا ہے۔ یخ لانے کے اس عمل کے دوران ستانا یا ایک دوسرے سے بات چیت کرنا نہایت منع ہے۔ساتھ ہی پالنے کے لئے یخ دو مختلف الجنس یعنی نر اور مادہ گلیشئروں سے علیحدہ علیحدہ لانا لازمی ہے۔اس سلسلے میں بلتستان میں مختلف جنس کے گلیشئر مقرر ہیں جن سے یخ برابر

مقدار میں اور یہ بھی روایت ہے کہ یخ کے بوجھ کی تعداد بھی دونوں جنس کے گلیشئروں سے طاق عدد میں لانا ضروری ہوتا ہے۔ ان آداب کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ گلیشئر نشوونما نہیں پاسکتا۔ منزل مقصود پر یخ کو ایک ایسے مقام پر جہاں دھوپ کم پڑتی ہو ایک گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر منوں کے حساب سے کوئلہ اور بھوسہ ڈال دیتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر جھونپڑی بنا دیتے ہیں تاکہ یخ پر ہر وقت سایہ رہے۔ اس جھونپڑی کی چھت پر یا تو آس پاس سے نرم برف لا کر ڈال دیتے ہیں یا مشکیزوں میں یوں پانی بھر کر رکھ دیتے ہیں کہ پانی کے قطرے وقتاً فوقتاً یخ پر ٹپکتے رہیں تاوقتیکہ برفباری کا موسم شروع ہو۔ سردیوں میں ان پہاڑوں پر گزوں برف پڑتی ہے۔ یہ گلیشئر کی نشونما کا بہترین موسم ہوتا ہے۔ کئی سالوں تک ایسے پالتو گلیشئروں کی یوں عملی پرورش کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے جب تک کہ وہ مضبوط جڑ نہ پکڑیں۔ قدرتی گلیشئروں کے علاوہ بلتستان میں بیشمار ایسے مصنوعی یعنی پالتو گلیشئر بھی ہیں جن سے آبپاشی کے لئے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

بلتستان میں نہری نظام آبپاشی رائج ہے۔ یہاں کے رواج آبپاشی میں یُول (24 کنال زیر کاشت رقبہ) کو پانی کی تقسیم کے لئے اکائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یول کے ایک چوتھائی حصے کو چوکول کہتے ہیں۔ بلتستان کے اکثر دیہات میں پانی کی مقدار ضرورت سے کم ہوتی ہے اس لئے پہلے اسے عموماً گاؤں یا محلے کے اجتماعی تالاب میں جمع کیا جاتا ہے پھر وہاں سے مقدار کو بڑھا کر چھوڑا جاتا ہے اور رواج آبپاشی کے مطابق تقسیم کر کے کھیتوں کو دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت ایک شخص کو نگران بنایا جاتا ہے جسے 'چھوراوا' کہتے ہیں۔ نہر کی دیکھ بھال کے لئے بھی ایک شخص کو ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ اسے 'ہرکونگپون' کہتے ہیں۔ مارچ سے ستمبر کے آخر تک زمینوں پر لگی ہوئی فصلوں کو مویشیوں سے بچانے کے لئے ایک شخص کو مقرر کیا جاتا ہے۔ جسے 'لوراوا' کہتے ہیں۔ چھوراوا، ہرکونگ پون اور لوراوا تینوں کو ہر گھرانہ معینہ پیمانے کا غلہ ادا کرتا ہے۔

1840ء تک بلتستان کے باشندے طبقات میں منقسم تھے جن کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ یہاں کے باشندے صلح و آشتی، امن پسندی، خوش اخلاقی، مہمان نوازی اور تہذیب و آداب میں اپنی

مثال آپ ہیں۔ چوری، اغوا قتل، ڈاکہ زنی اور غنڈہ گردی یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں قاتل کے بھی قتل سے گریز کیا جاتا ہے۔ بلتستان کے مجلسی آداب پڑوس کے علاقوں کے لوگوں میں ''آداب بلتستان،، کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں کے بوڑھے لوگ محفل میں داخل ہوتے وقت میر محفل اور دیگر حاضرین کے لئے الگ الگ دو سلام کرتے تھے۔ یہ رسم 1980ء کے عشرے کے بعد ختم ہو چکی ہے۔

بلتستان میں کھانوں کے اقسام اور کھانے کے آداب بے شمار ہیں۔ تاہم مارزان، ہرسب کھور، پلاپو، فورفور، بلے اور تراسفہ مشہور ہیں۔ یہاں تبّتی نمکین چائے کا استعمال عام ہے جس میں سبز چائے، سوڈا، دودھ، نمک اور مکھن استعمال ہوتے ہیں۔ مارزان میں جو کا آٹا اور گھی استعمال ہوتے ہیں۔ مقامی لباس میں ٹوپی، کرتہ اور پپو کے علاوہ باقی متروک ہو چکے ہیں۔

کھیلوں میں نشانہ بازی اور پولو اب بھی مقبول ہیں۔ بلتستانیوں کا دعویٰ ہے کہ پولو بلتیوں کا قومی کھیل ہے جو بلتستان کے عروج کے زمانوں میں پہلے اس کے اردگرد کے علاقوں میں پھر وہاں سے پوری دنیا میں متعارف ہوا ہے۔ پولو بلتی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گول چیز اور گیند۔ اگر یہ ایران سے پھیلا ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اس صورت میں یہ چوگان کے نام سے معروف ہوتا۔ لیکن آج ساری دنیا میں یہ کھیل بلتی زبان کے لفظ پولو کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ بلتستان میں یہ کھیل گھوڑے پر سوار ہو کر بھی کھیلا جاتا ہے اور پیدل بھی کھیلا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں سٹک کے ساتھ کھیلا جاتا ہے جو دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس کے ابتدائی اصولوں کے مطابق نو گول ہونے تک کھیلا جاتا ہے چاہے اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔ ہر گول کے بعد سائڈ تبدیل کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی بے جوڑا کھلاڑی بھی کھیل میں شریک ہے تو وہ ایک ہی سائڈ پر کھیلتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ باری باری دونوں ٹیموں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسے بلتی میں ''گیانگے'' کہتے ہیں۔

یہاں کے لوگ پھولوں کے زیب تن کرنے کے بیحد شوقین ہوتے ہیں۔ سادہ لوحی کی وجہ سے آباواجداد کے کارناموں کو جنات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ سادہ لوح لوگوں سے ان کی جائیدادیں تحریری طور پر غیر مشروط ہبہ کرائی جاتی ہیں اگرچہ زبانی طور پر درجنوں شرائط ساتھ ہوتی ہیں۔ نماز حاجت اور نماز استسقاء کی بجائے تعویذوں وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے۔ پڑوسی، غریب،

نادار، بیوہ، یتیم اور آفت زدہ لوگوں کی اعانت پر رسومات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

بلتستان کی زراعت وشجر کاری، صنعت وحرفت، زبان ومذہب، شاعری وموسیقی، تہذیب وآداب اور رسومات پر ایرانی تہذیب وتمدن وثقافت کے اثرات مرتب ہیں جس پر بے شمار شواہد موجود ہیں۔

صنعت وحرفت وتجارت

بلتستان بھر میں اون کی لوئیاں اور پٹو تیار ہوتے ہیں۔ خپلو کے فروکس اور چارخانہ پٹو انتہائی عمدہ اور مشہور ہیں۔ سابقہ دور میں یہاں پشمینہ کی چادریں بھی تیار کی جاتی تھیں جن پر سوزن کاری کا رواج نہ تھا۔ شگر میں سنگ زہرمہرہ کے برتن ازقسم چائے دانی، پیالی، گلاس پھولدان وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔ نرم سنگ خارا سے کھانا پکانے کے برتن چھور بٹ (خپلو)، برالدو اور باشہ (شگر) میں بنائے جاتے ہیں۔ لکڑی کے ظروف تقریباً ہر بستی میں تیار ہوتے رہے ہیں۔ مہدی آباد میں مٹی کے برتن تیار کئے جاتے ہیں جو بلتستان بھر میں مقبول ہیں۔ مقامی استعمال کے لئے بکری اور یاگ کے بالوں سے چھرہ (ایک قسم کا بچھونا) سازی ہر گاؤں میں رائج ہے۔ برالدو اور باشہ کے چھرے بہت اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں۔ خانگی ضروریات کے مطابق سویٹر، جراب، ٹوپی اور گلو بند وغیرہ کی بنائی اکثر گھروں میں رائج ہے۔ قالین بافی یہاں رائج نہیں ہے۔ چھور بٹ کے پٹو اپنے ڈیزائن اور صفائی کی وجہ سے مقبول ہیں۔ سلور اور تانبے کے برتن بھی اکا دکا تیار ہوتے ہیں۔ خصوصاً ساوار (ایک قسم کی چائے دانی) بہت عمدہ بنایا جاتا ہے جس پر کندہ کاری بھی کی جاتی ہے۔ زو اور یاگ کے سینگوں کے حقے بھی بنائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن عموماً حقے لکڑی سے بنائے جاتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں تیر وکمان، تلوار، ڈھال اور بندوقیں بنانے کی صنعت ترقی پر تھی جواب بالکل ناپید ہو چکی ہے۔ چاندی سونا وغیرہ سے زیورات سازی اب بھی عروج پر ہے جن میں فیروزہ، عقیق، یاقوت، زمرد وغیرہ کے نگینے بھی بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ موچی، لوہار اور جولاہے کے پیشوں کو کمین پیشے خیال کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان صنعتوں کو یہاں زیادہ ترقی حاصل نہ ہو سکی۔ بلتستان میں چوب کاری کی صنعت اب بھی ترقی پر ہے جو یقیناً قابل دید ہے۔ پنجرہ کی بیشمار قسمیں تیار کی

جاتی ہیں لیکن مہنگا پڑنے کے سبب یہ اجتماعی تعمیرات کے سوا اور کہیں پر زیر استعمال نہیں ہیں۔ یہ چوبی پنجرے بیحد خوبصورت ہوتے ہیں۔ گو اب تعمیر کے جدید ترین طریقے رائج ہو چکے ہیں تاہم یہاں عموماً پہلے لکڑی کی بلیوں سے مکان کا ڈھانچہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ پھر لکڑی کے کھمبوں کے درمیان گول مٹول پتھروں یا کچی اینٹوں کی دیوار قائم کی جاتی ہے۔ قلعوں، محلات، خانقاہوں اور مسجدوں کی تعمیر میں لکڑی کے ٹکڑوں کو اینٹوں کی طرح درست کر کے دیواروں میں ستون کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کی ڈیوڑھیاں سنگ مرمر سے بنائی جاتی ہیں۔ حفاظتی بند کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھروں کو اینٹوں کی طرح درست کر کے استعمال کیا جاتا ہے جن کے درمیان چکنی مٹی کے گارے کو دیگر مسالے کی آمیزش کر کے ڈالا جاتا ہے۔ سدپارہ کا بند اس قسم کی تعمیرات کا شاہکار ہے۔

قدیم زمانے میں بلتستان کا یارقند، کاشغر، لداخ، نوبراہ، تبت، کشمیر اور ہندوستان کے علاقوں کے ساتھ تجارتی لین دین قائم تھا۔ یہاں کی برآمدات کی چیزوں میں اول درجہ پر خستہ اور دوسرے درجہ پر خشک خوبانی ہزاروں من سالانہ کے حساب سے برآمد ہوتی ہے۔ پچھلے زمانے میں خستہ ہندوستان کو اور خشک خوبانی لہاسہ، لداخ اور ہندوستان کو بھیجی جاتی تھی۔ لداخ کو مکھن برآمد کیا جاتا جہاں سے اون اور پشمینہ درآمد کیا جاتا تھا۔ گلگت کو مکھن اور بھیڑیں برآمد کی جاتی تھیں۔ استور سے لشی (ایک قسم کی لکڑی) درآمد ہوتی تھی۔ اونی لوئیاں اور پشمینہ کی چادریں عموماً لداخ اور لہاسہ کی طرف اور کچھ کشمیر کو بھی جاتی تھیں۔ لیکن ان کا زیادہ استعمال مقامی طور پر رہا ہے۔ یہاں کے خانگی ظروف سنگی لداخ اور کرگل تک پہنچتے تھے۔ سنگ مرمر کے برتن کشمیر اور ہندوستان تک بھیجے جاتے جہاں ان کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ یارقند سے قالین، نمدے سماوار اور دریچے اور کاشغر سے چوغے درآمد ہوتے تھے۔ یارقند اور بدخشان سے اچھی نسل کے گھوڑے بھی لائے جاتے تھے۔ کپڑا، لوہا، چائے، شکر، گڑھ، نمک وغیرہ اور دیگر ضروریات ہندوستان سے درآمد ہوتی تھیں۔ اب درآمد برآمد کا رخ پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرف ہو چکا ہے۔ جس کے بعد سے مکھن، بھیڑ، اونی لوئیوں اور پشمینہ کی چادروں کی برآمد یکسر رک گئی ہے۔ 1990ء کی دہائی سے بلتستان میں بڑے پیمانے پر آلو کاشت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس وقت ہر سال کروڑوں

روپے کا آلو یہاں سے ملک کے دوسرے علاقوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ظروف سنگی کی صنعت اب مقامی ضرورت کو پورا نہیں کر رہی ہے۔سنگ زہرمہرہ کے برتن اس وقت پاکستان کے دیگر شہروں کی طرف جا رہے ہیں۔فروکس اور چارخانہ پٹو دیگر شہروں کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔اشیاءخوردنی اور دیگر ضروریات راولپنڈی سے لائی جاتی ہیں۔عمارتی لکڑی چلاس کے جنگلات سے لائی جاتی ہے۔ 1981ء سے راولپنڈی سے تازہ سبزی اور میوہ جات کی درآمد بھی شروع ہوگئی ہے۔ معدنیات کی کانیں حکومت کے قبضہ میں ہیں جو منظور شدہ ٹھیکداروں کے ذریعے خاصی مقدار میں معدنیات یہاں سے برآمد کر لیتی ہے۔

آثارقدیمہ

بلتستان کی وادیوں میں قدیم تاریخ،تہذیب اور تمدن کی بہت سی یادگاریں موجود تھیں لیکن ان کے عدم تحفظ کی وجہ سے بیشتر نشانات منہدم ہو چکے ہیں اور جو موجود ہیں وہ روبہ انہدام ہیں۔

انتہائی قدیم دور کی یادگاروں میں سے ایک چونداہ کا پتھر ہے۔ کہتے ہیں کہ آغاز آبادی کے دوران کچورہ اور بغاردو کے درمیان دریا میں سیلابی ملبے کی وجہ سے سکردو ایک جھیل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔اس وقت سکردو کے گھاٹ کی کشتی چونداہ میں ایک پتھر سے باندھی جاتی تھی جسے چینگ ردوا یعنی باندھنے کا پتھر کہا جاتا تھا۔اسی نسبت سے اس جگہ کا بھی یہی نام پڑ گیا جو کثرت استعمال سے چونداہ بن گیا ہے۔اس پتھر سے رسی گزارنے کے لئے ایک سوراخ نکالا گیا تھا جو اب تک اسی حالت میں موجود ہے۔یہ پتھر اس عظیم حادثے کی یاد برسوں دلاتا رہے گا۔

منٹھل سکردو، چھری تھنگ ،کوشمل ،داسو اور ڈمبوداس کے درمیان غدونگ رگو کے مقام پر،شوت اور ہرپوہ کے درمیان، دافنگ تریکو،شگر، بوتی چوپاری،نچلو ،رگیایول،تھورگو اور دوسرے مقامات پر بڑی بڑی چٹانیں موجود ہیں جن پر قدیم بلتی رسم الخط میں عبارات اور مختلف اشکال کندہ ہیں جو اشاعت اسلام (1381ء) سے قبل کے زمانوں کی یادگار ہیں۔منٹھل کی چٹان پر بدھ منڈلہ کی تصویریں اور عبارتیں کندہ ہیں جن کے اوپر ایک طاقچہ بھی چھت کی بیم کے لئے کندہ ہے۔

اس کے سامنے عبادات بجالانے کے لئے ایک چبوترہ موجود ہے اور پیچھے کے دو اطراف میں غار ہیں جن میں لاما رہتے تھے۔ بعض چٹانوں پر صرف کیل کی صورتیں کندہ ہیں۔ شگر، گول اور یوگو میں براہمی رسم الخط میں چٹانوں پر انسکرپشن موجود ہیں۔

کھر بو سکردو کے قریب پہاڑی پر 1190ء سے قبل کے قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس وقت اس قلعہ تک مٹی کے پائپوں کے ذریعے پانی پہنچایا ہوا تھا۔ پائپ کے ٹکڑے یہاں اب بھی ملتے ہیں۔ شگری سکردو کا قدیم دارالسلطنت تھا۔ اس بستی کے محلہ یارکھور میں 1490ء سے قبل قلعہ موجود تھا جس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ اس کے قریب ہی بردوسنیاس نامی ایک پتھر موجود ہے جس پر 1190ء کے بعد سے 1836ء تک مقپون ولیعہدوں کی رسم تاجپوشی ادا کی جاتی تھی۔ یہ رسم ابراہیم مقپون کے دور سے شروع ہوئی تھی۔ شگری کے نچلے کنارے ایک ٹیلے پر قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ یہ جگہ بہرام کھر کہلاتی ہے غالباً بہرام چو نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ 1982ء کے دوران نیورانگا کے قریب بدھ مت دور کی ایک چھورتن کی جگہ دریافت ہوئی ہے جس میں مٹی اور میت کی راکھ سے تیار شدہ سکہ نما چیزیں موجود ہیں۔

سکردو شہر کے شمال مغربی پہلو میں کھر پوچو پہاڑ پر قلعہ کھر پوچو واقع ہے جسے ابتداء میں تقریباً 1490ء تا 1515ء کے دوران مقپون راجہ بوخا نے تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں 1588 تا 1673ء کے دوران علی شیر خان انچن اور شاہ مراد نے اسے وسیع اور مضبوط تر بنا دیا۔ 1842ء میں ڈوگرہ وزیر لکھپت رائے نے دو منزلہ مسجد کے سوا اس قلعہ کی دیگر تعمیرات کو سات منزلہ تاریخی محل سمیت نذر آتش کر ڈالا۔ 1876 تا 1886ء کے دوران مہتہ منگل سنگھ کاردار (گورنر) نے اسے دوبارہ تعمیر کرلیا۔ تعمیر نو کی تفصیل قلعہ کے اندر دیوار میں موجود ایک کالے پتھر پر فارسی اشعار کی صورت میں کندہ کی ہوئی ہے۔ پورے قلعہ میں مسجد کی عمارت اور محل کا چبوترہ مقپون دور کی یادگار اور باقی ڈوگرہ دور کی تعمیر شدہ ہے۔ کھر پوچو قلعہ تک راستہ بند کرنے کے لئے قلعہ کے اوپر پہاڑ پر ایک حفاظتی چوکی بنی ہوئی تھی جس پر پہرہ دار دستے متعین رہتے تھے۔ یہ ڈونکس کھر کہلاتی تھی جو گر کر چند نوکیلی دیواروں کی صورت میں موجود ہے۔ اس کو اسی مناسبت سے آج کل لقپہ چن (پنجہ نما)

کہتے ہیں۔ یہ شاہ مراد کے دور کی تعمیرات میں سے ہے۔ کھرپوچو پہاڑ کے اوپر سندوس کی طرف کچینہ کھر کے کھنڈرات موجود ہیں جو غالباً علی شیر خان انچن کے دور(1588ء تا1625ء) کی یادگار ہیں۔ اس قلعہ کا ایک دروازہ (بطرف نانگ سوق) اپی چوئے ستغو کے نام سے مشہور تھا جس کی دیواریں نیم خستہ حالت میں اب تک قائم ہیں۔ کچینہ کھر اور ڈونکس کھر کے درمیان ایک عمارت منہدم حالت میں ہے جو شاہ مرادی کھوڑو کے نام سے معروف ہے۔ دیوسائی میں ایک جگہ پتھروں کے دو انبار پڑے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علی شیر خان انچن کے ان اطراف میں حملے کے وقت جاتے ہوئے ہر سپاہی کو حکم تھا کہ ایک ایک پتھر اس جگہ پھینکتا جائے۔ واپسی پر انہیں پھر حکم تھا کہ اس ڈھیر میں سے ایک ایک پتھر اٹھا کر دوسری جگہ پھینکتا جائے۔ اس طرح سے لشکریوں کی کل تعداد اور مارے جانے والوں کی تعداد کا اندازہ کیا گیا تھا۔

سکردو شہر کے شمال سے دریائے سندھ گزرتا ہے۔ باقی تین اطراف میں ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ چنانچہ گمبہ تھور گو پڑی سے لے کر بشو پر دریائے سندھ کے کنارے تک راستوں، دروں اور قابل گزر مقامات پر پہاڑوں پر دیواریں (فصیل) تعمیر کی گئی تھیں جن میں تھور گو ستغو، سد پر ستغو، برگے ستغو اور پشاوری ستغو (شغر تھنگ) چار دروازے تھے۔ اس فصیل کا کچھ حصہ سدپارہ جھیل کے پہلو میں اب بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ تھور گو ستغو 1905ء تک موجود تھا۔ فصیل کے مشرقی اطراف کی پہرہ داری کے لئے حسین آباد کے مشرقی کنارے ایک اونچے پتھر پر چوکی بنی ہوئی تھی جس کے کھنڈرات چھقپو پیو کے نام سے معروف ہیں۔ اسی گاؤں کے جنوب میں پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک چھوٹا سا قلعہ موجود تھا جو کھرچونگ (چھوٹا قلعہ) کے نام سے مشہور تھا۔ اسی مناسبت سے قریبی موضع کا بھی کھرچونگ نام پڑا جو کثرت استعمال سے کھنچونگ بن گیا تھا جس کا نام بدل کر 1973ء کے دوران حسین آباد رکھا گیا۔ علی شیر خان انچن نے 1588 تا1625ء کے دوران میں نالہ سدپر پر بند تعمیر کیا تھا جو اب تک اس دور کے فن کے شاہکار کی حیثیت سے باقی ہے۔ انچن کی رانی میندوق رگیالمو (گل خاتون) نے اسی دوران نہر گنگوپی، میندوق کھر اور کھرپوچو قلعہ کا راستہ تعمیر کرایا تھا۔ میندوق کھر کی کچھ دیواریں کھرپوچو پہاڑ کی کمر پر ابھی تک کھڑی حالت

میں موجود ہیں۔نہر گنگوپی اور کھرپوچو قلعہ کا راستہ جوں کے توں باقی ہیں۔کشو باغ (سکردو) میں ایک ٹیلہ پر1840 تا1842ء کے دوران ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ جگہ اس وقت برباد قلعہ کے نام سے معروف ہے۔اس قلعہ کی تصویر''ویئر تھری امپائرز میٹ،، نامی کتاب میں موجود ہے۔کھرپوچو پہاڑ کے شمال مشرق میں بطرف نانگ سوق نانگمہ سر کا باغ تھا جو دریا برد ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ رگیہ سر بطرف چھومیک، ہلال باغ بطرف سیز گرکھور، چہار باغ بطرف کرفوپی ٹوق،غوروسر بطرف میر بول اور مقپون سر بطرف سندوس پانچ شاہی باغات موجود تھے جن کا اس وقت کوئی وجود نہیں۔ ہلال باغ میں غوڑی بلچنگرا کا چبوترہ واقع ہے جو جوں کا توں باقی ہے۔اس کے قریب ہی شاہی قبرستان ریت کے ٹیلے کی شکل میں موجود ہے۔اس جگہ کبھی چنار کے درختوں کا جھنڈ ہوا کرتا تھا۔ گمبہ سکردو میں خانقاہ معلیٰ کی عمارت نیم خستہ حالت میں موجود تھی جسے 1990 کی دہائی میں ازسرنو پکا کر کے تعمیر کیا گیا ہے۔کہتے ہیں کہ میر شمس الدین عراقی نے اسے تعمیر کرایا تھا۔بعض لوگ اس کی ابتدائی تعمیر کو امیر کبیر سید علی ہمدانی سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ بعد میں اسے وسعت دے کر از سرنو تعمیر کیا گیا تھا۔تعمیر نو کا کام 1130ھ میں مکمل ہو گیا تھا جو دروازے کے اوپر کندہ صورت میں لکھا ہوا موجود تھا۔تھیور میں لب سڑک ایک پرانی مسجد واقع ہے جو گمبہ سکردو کی خانقاہ کی تعمیر کے دوران انہی کاریگروں نے تعمیر کی تھی۔ کواردو میں سید علی طوسی کا مقبرہ موجود ہے جو 1010ھ کے قریب براہ سلتورو بلتستان میں وارد ہوئے اور 1081ھ میں یہیں پر وفات پا گئے تھے۔سید محمود (متوفی 1080ء) کا آستانہ کشو باغ سکردو میں اور سید حیدر علی کا آستانہ قمراہ میں موجود ہے جنہوں نے گیارہویں صدی ہجری کے دوران اپنی زندگیاں یہاں تبلیغ وترویج دین میں گزار دی تھیں۔حمید گڑھ سکردو میں ڈوگرہ دور کی کچھ عمارتیں موجود تھیں جنہیں مہتہ منگل سنگھ کاردار (گورنر) نے 1876-86ء کے درمیان تعمیر کرایا تھا۔1990ء کی دہائی میں انہیں گرا کر ان کی جگہ پر پکی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔اس نے اپنی گورنری کے دوران بلتستان کو نرسریوں، باغات اور جنگلات سے بھر دیا تھا۔سڑکوں کے دونوں طرف شجر کاری کی تھی۔اس کے دور میں نصب شدہ بید، بیر، سفیدہ اور خوبانی کے پودے بوڑھے درختوں کی شکل میں بلتستان بھر میں موجود تھے جنہیں 1980ء کی دہائی

کے ابتدائی سالوں کے دوران نیلام کر کے ختم کیا گیا۔حمید گڑھ کے جنوبی پہلو میں ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا ہے جسے گنگا سنگھ کاردار (گورنر) نے تعمیر کرایا تھا۔سکردو بازار کے قریب سکھوں کا دو منزلہ عبادت خانہ موجود ہے جسے سکردو میں مقیم سکھ دوکانداروں نے 1938ء میں تعمیر کیا تھا۔مقامی لوگوں کے درمیان یہ عمارت مندر کے نام سے معروف ہے۔سکردو شہر میں چھاؤنی کے مشرق میں لب چشمہ ہندوؤں کے مندر کے نشانات باقی ہیں۔1947ء تک یہاں مندر آباد تھا۔

روندو میں ستق اور گنجی کے مقامات پر قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں جو انچن کے دور میں تعمیر ہوئے تھے۔ڈامبوداس کی پہاڑی پر قلعہ کے نشانات موجود ہیں۔کہتے ہیں کہ اس جگہ انچن کے بیٹے عبدال خان نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔میندی میں مقپون والیوں کا چھ منزلہ رہائشی محل تھا جو کھنڈر میں بدل چکا ہے۔یہ محل رونگ کھر کہلاتا تھا۔

کھرمنگ بیامہ میں لب دریا ایک اونچی پہاڑی پر ایک دو منزلہ محل موجود ہے جو بودھی کھر کہلاتا ہے۔یہ محل 1565ء سے قبل لداخ کے کھرپون (والی) نے تعمیر کیا تھا۔اس محل کے نیچے ایک محل بنام انٹھوک کھر موجود تھا جو لداخیوں کے قبضہ سے قبل کھرمنگ کے مقامی حکمران خاندان انٹھوک کا رہائشی محل تھا۔انٹھوک کھر کے نیچے سومہ کھر نامی محل واقع تھا جسے 1653ء تا 1673ء کے دوران مقپون شیر شاہ نے تعمیر کیا تھا۔انٹھوک کھر اور سومہ کھر 1948ء کے بعد منہدم کئے گئے ہیں۔ بوتی کھر بوسیدہ حالت میں ابھی تک موجود ہے۔اسی پہاڑی پر واقع مسجد میں لکڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا صندوق بھی موجود ہے۔اس صندوق میں ایک سر بمہر تھیلے میں چاندی کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ ہے۔تھیلا پھٹا ہوا ہے۔صندوقچہ پر تالا لگا ہوا ہے۔کہتے ہیں کہ اس کے اندر موئے مبارک موجود ہے جسے شیر شاہ کے دور میں کشمیر سے ایک فقیر ساتھ لایا تھا۔یہ سومہ کھر کی زیارت گاہ میں محفوظ رکھا گیا تھا جس کے انہدام کے بعد اسے مسجد میں رکھا گیا ہے جہاں اب یہ انتہائی غیر محفوظ حالت میں پڑا ہوا ہے۔1565ء سے قبل موضع پاری میں ایک قلعہ موجود تھا جسے لداخیوں کے کھرپون (والی) نے تعمیر کیا تھا۔اس کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔یہ جگہ بوتی چو کہلاتی ہے۔لداخی قبضہ کے دوران مہدی آباد (پرکوتہ) میں لب دریا واقع پہاڑی پر قلعہ موجود تھا۔جسے انچن اور شاہ مراد کے

دور(1588 تا1673ء) میں مقپون حکمرانوں نے مضبوط تر بنا دیا تھا۔اس کا ایک دروازہ غبگی ستغو کے نام سے معروف تھا۔ یہ قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔کھر منگ بیامہ میں راجہ کھر منگ کا سہ منزلہ رہائشی محل موجود ہے جو انیسویں صدی سے قبل تعمیر ہوا ہے۔

تھلے خپلو میں چنگ کھر، مرچونگ کھر اور چھوغو کھر نامی قدیم قلعے تھے جو اب صفحہ ہستی سے بالکل ناپید ہو چکے ہیں۔ ہلدی میں ستر نپوئے کھر، بلغار میں سکم کھر کے علاوہ سیلینگ اور کھر کو میں بھی 1300ء سے قبل قلعے تھے۔لیکن یہ بھی معدوم ہو چکے ہیں۔ پھڑوا میں راجہ گوری تھم کے محل کے کھنڈرات موجود ہیں۔خپلو بالا میں خانقاہ معلیٰ اور خپلو پائین میں مسجد چقچن اور جامع مسجد کی پرانی عمارات اب تک موجود ہیں۔خانقاہ اور چقچن کی مسجد کی تعمیر امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ سے منسوب ہے۔ تھغس میں ایک چھوٹی سی پرانی مسجد ہے جسے 1012ھ(1603ء) میں سید علی و سید ناصر طوسی نے تعمیر کیا تھا۔تھغس میں ایک جامع مسجد بھی ہے جسے سید میر عارف نے تعمیر کرایا تھا۔ میر عارف کا مقبرہ بھی اسی بستی میں واقع ہے۔ خانقاہ کریس کی عمارت ابھی تک اچھی حالت میں باقی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سید میر مختار نے تعمیر کرائی تھی۔ میر مختار نے کورو، بلغار، تھلے، ڈغونی، خپلو بالا، سرموں، مچولو، تھغس، سکسہ، پھڑوا، نر، سرمیک، سینو اور دیگر سات مقامات پر بائیس (22) خانقاہیں تعمیر کرائی تھیں جن میں سے اکثر کی تعمیر نو عمل میں آئی ہے۔میر مختار(متوفی 1132ھ) کا مقبرہ بھی کریس میں موجود ہے جس کی چوب کاریاں واقعی قابل دید ہیں۔خپلو بالا میں یبگو راجاؤں کا چار منزلہ رہائشی محل موجود ہے جو ڈوگرہ دور میں تعمیر ہوا ہے۔اس کے عقب میں ایک پہاڑی پر قلعہ تھا جو تھور سے کھر کے نام سے مشہور تھا۔تھور سے کھر کا محل وقوع دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس عمودی چٹان پر کس مہارت کے ساتھ بنیاد رکھی گئی تھی۔اگر یہ پرانا محل موجود ہوتا تو عجائبات میں شمار ہوتا۔مگر زمانے کی تخریبی عادت کے مطابق اس نادرہ روزگار محل کو توڑ تاڑ کر اس کے قریب ہی موجودہ چار منزلہ محل بنایا گیا ہے۔تھور سے کھر کا بانی راجہ سلیم الدے بتایا جاتا ہے جو 70-1450ء کے درمیان خپلو کا حکمران گزر چکا ہے۔ ستیانگ میں ایک جگہ احمد شاہی برانگسہ کے نام سے معروف ہے جہاں سکردو کے آخری تاجدار احمد شاہ نے خپلو پر حملے کے دوران پڑاؤ ڈالا تھا۔

غوڑو چو قدیم ریاست شگر کا دار السلطنت تھا۔ یہاں پتھر کی تقریباً پونے تین میٹر قطر والی ایک ہانڈی موجود بتائی جاتی ہے جو 1400ء سے قبل کی یادگار ہے۔ اس میں اس وقت لشکر کے لئے کھانا تیار کیا جاتا تھا۔ تھول میں تستے چو کالاچی کھر (لاکھی محل) نامی محل واقع تھا جس کے آثار پتھروں کے انبار کی شکل میں باقی ہیں۔ تستون اور ارندو میں قلعوں کے کھنڈرات موجود ہیں جو تقریباً 60-1535ء کے درمیان تعمیر ہوئے تھے۔ شگر میں بونگری نامی پہاڑی پر راجہ گازری نے 1490ء تا 1520ء کے دوران ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جو ڈونگ کھر کہلاتا تھا۔ اس کا محل وقوع دہشت ناک ہے۔ کاش یہ اس وقت موجود ہوتا۔ یہ پہاڑی بعد میں کھری ڈونگس کہلائی۔ 38-1637ء میں راجہ حسن خان نے شگر نالہ کے داہنے کنارے فونگ کھر کے نام سے ایک سہ منزلہ محل تعمیر کیا جس کا ایک حصہ اس وقت تک موجود ہے۔ امبوڑک اور چھہ برونجی (شگر خاص) میں دو پرانی مسجدیں موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہیں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ (83-1373ء) نے تعمیر کرایا تھا۔ شگر کے علاقے میں سید میر یحییٰ نے راجہ اعظم خان کے دور (1685ء تا 1727ء) میں شگر خاص، سرفہ کھور (چھورکاہ)، سوگولدو (چھورکاہ)، جشوپی، الچوڑی، گلاب پور اور وزیر پور میں ایک ہی ڈیزائن کی خانقاہیں تعمیر کرائی تھیں جو اب تک قائم و دائم ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے سلدی تا تستے چودہ مساجد تعمیر کرائی تھیں جن میں سے بیشتر اچھی حالت میں موجود ہیں۔ موچھنمو میں ایک قلعہ بنام قلعہ بیرور گیا لمو موجود تھا جسے اہالیان شگر نے دو علماء سید میر مختار اور سید میر یحییٰ کے لئے 1685ء تا 1727ء کے دوران تعمیر کیا تھا اور اعظم خان کے دور ہی میں اسے منہدم کیا گیا تھا۔

گلتری میں ٹیال کے مقام پر 1840ء سے قبل قلعہ موجود تھا جس کے کھنڈرات اس وقت تک موجود ہیں۔ بلتستان بھر میں چنار کے سینکڑوں سال عمر کے بوڑھے درخت موجود ہیں جو پرانے ادوار کی زندہ یادگار ہیں۔ تقریباً ساری وادیوں میں پولو کھیلنے کے لئے شغرن (پولو گراؤنڈ) موجود ہیں جو مختلف ادوار میں راجاؤں نے تعمیر کی ہیں۔ بلتی روایات کے مطابق ایک معیاری پولو گراؤنڈ کی لمبائی تین سو میٹر اور چوڑائی پچاس میٹر ہوتی ہے۔

......☆......

آٹھواں باب

بلتستان منزل بہ منزل

تعلیم

1892ء میں ریاست کی سٹیٹ کونسل حکومت نے سکردو میں پہلا پرائمری سکول قائم کیا۔ اس کے بعد مختلف دیہات میں سکول اور مکتب قائم کرنے کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ 1948ء میں ڈوگرہ دور کے اختتام کے وقت بلتستان میں 10 مکتب سکول، 32 پرائمری سکول، چپلو میں ایک لوؤر مڈل سکول اور سکردو میں ایک لوؤر ہائی سکول، کل 44 مدارس قائم تھے جن کے انتظام کے لئے ضلع لداخ میں ایک اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکول متعین تھا۔ 1917ء میں سکردو شہر کے پرائمری سکول کو مڈل سکول کا درجہ دیا گیا اور آزادی سے کچھ عرصہ قبل اُسے لوؤر ہائی سکول اور چپلو کے پرائمری سکول کو لوؤر مڈل سکول بنایا گیا۔ حکومت کی خواہش تھی کہ یہاں ہائی سکول قائم کر کے امتحانی سنٹر کھولا جائے لیکن ریاست کے تعلیمی ادارے پنجاب یونیورسٹی کے زیر کنٹرول تھے جس نے یہاں کی جغرافیائی پیچیدگیوں کے پیش نظر اسے ناقابل عمل قرار دے کر اس کی منظوری نہ دی۔

آزادی کے بعد 1958ء تک مزید 20 پرائمری سکول اور دو مکتب کھولے گئے۔ لڑکیوں کے لئے بھی دو پرائمری سکول کھولے گئے۔ لوؤر ہائی سکول سکردو کو ہائی سکول کا درجہ دیا گیا۔ گرلز پرائمری سکول سکردو اور بوائز پرائمری سکول شگر کو مڈل کا درجہ دیا گیا۔ 1968ء تک حکومت نے اور 23 پرائمری سکول قائم کر دیئے۔ اس کے علاوہ سکسہ، مہدی آباد، گمبہ سکردو اور تھوار کے پرائمری سکولوں کو اپ گریڈ کر کے مڈل سکول بنا دیا۔ شگر اور چپلو کے مڈل سکولوں کو ہائی سکول کا درجہ دیا۔ گرلز مڈل سکول میں ہائی کلاسیں چلائیں اور 1968ء میں بلتستان سے پہلی بار سات طالبات میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئیں۔ بنات گل آفریدی پولیٹکل ایجنٹ بلتستان نے ذاتی دلچسپی لے کر

سکردو میں اسی دوران ایک انگلش میڈیم ماڈل پرائمری سکول بھی قائم کر دیا۔

ڈوگرہ دور میں طلباء کی کل تعداد 1000 تھی۔ 1958ء تک یہ تعداد بڑھ کر 3000 ہزار اور 1968ء میں 5000 ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں طلباء و طالبات کو کتابیں حکومت کی طرف سے مستعار دی جاتی تھیں۔

ستمبر 1966ء میں سکردو میں انٹرمیڈیٹ کالج کا قیام عمل میں آیا جس میں طلباء کے لئے آرٹس کے ساتھ ساتھ سائنس کی کلاسوں کا بھی انتظام موجود تھا۔ یہ گلگت بلتستان کا پہلا کالج تھا۔ انسپکٹر مدارس حشمت اللہ خان کو عارضی طور پر پرنسپل کا چارج دیا گیا۔ ستمبر 1975ء میں اس کالج کو اپ گریڈ کر کے ڈگری کالج کا درجہ دیا گیا۔ اس کالج کے ایک فاضل پرنسپل کرنل انور مرحوم (1979-82ء) نے کالج کے اردگرد موجود زمین کو دیوار بندی کر کے اسے لوٹ مار سے بچا کر کالج کی آیندہ ضرورتوں کے لئے محفوظ کر دیا۔

آزادی کے بعد تعلیم کا محکمہ پولیٹکل ایجنٹ/ ڈپٹی کمشنر کے ماتحت رہا۔ جولائی 1976ء سے دو سال تک اسے بلا واسطہ وزارت تعلیم کے کنٹرول میں رکھا گیا۔ جولائی 1978ء میں گلگت میں ایک ڈائریکٹوریٹ قائم کر کے محکمہ تعلیم کو اس کے زیر انتظام لایا گیا جس کی طرف سے ہر ضلع میں ایک ڈپٹی ڈائریکٹر متعین ہے۔ 2002ء میں بلتستان میں محکمہ تعلیم کے زیر انتظام 283 پرائمری سکول، 69 مڈل سکول، 33 ہائی سکول، 52 نان فارمل سکول، 204 کمیونٹی سکول اور 5 مسجد و مکتب سکول کام کر رہے تھے جن میں کل 46843 طلباء و طالبات زیر تحصیل تھے۔ ان میں سے 43 پرائمری سکول، 17 مڈل سکول اور 6 ہائی سکول لڑکیوں کے لئے مختص ہیں جبکہ 178 نان فارمل اور کمیونٹی سکولوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔

مارچ 1987ء میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے پانچ نکاتی پروگرام کے تحت سکردو میں ایک ڈسٹرکٹ پراجیکٹ منیجر کی سربراہی میں کمیشن برائے خواندگی و تعلیم عامہ کا دفتر قائم ہو گیا۔ کمیشن نے بلتستان بھر میں 46 نئی روشنی سکول قائم کئے جن میں سے دو سال کے اندر 700 لڑکیوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ جون 1989ء میں بینظیر بھٹو نے کمیشن کے دفتر اور نئی

روشنی سکولوں کو ختم کر ڈالا۔

1988ء میں سکردو میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا علاقائی دفتر قائم ہوا۔ ابتداء میں یہاں ایک کوآرڈینیٹر متعین تھا۔ فروری 1990ء میں ایک اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر سکردو میں تعینات ہوا۔ اس یونیورسٹی نے ہزاروں علم کے پیاسوں کو نہ صرف علم کی تحصیل جاری رکھنے کا بلکہ اپنی پسند کے مضامین پڑھنے اور تحقیق کرنے کا بھی موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ اساتذہ کی بھی خاصی تعداد یہ یونیورسٹی معاشرے کو فراہم کر رہی ہے۔

1989ء میں بوائز ڈگری کالج سکردو کے پرنسپل (بعد میں سکریٹری) پروفیسر مہرداد کی نگرانی میں سکردو میں لڑکیوں کے لئے انٹرمیڈیٹ آرٹس کلاسوں کا انتظام کیا گیا۔ مارچ 1990ء میں گلگت کالج کی لکچرار مسز روقیہ زیدی کو پرنسپل بنایا گیا اور مختلف سکولوں سے اساتذہ لے کر اسے گرلز کالج کی شکل دی گئی۔ حکومت کی طرف سے گرلز کالج کی منظوری بہت بعد میں ملی اور اسی کالج کے لئے منظور شدہ پوسٹوں پر 1998ء میں بعض خواتین لکچرار بھرتی کی گئیں۔

یکم مارچ 1990ء کو سکردو میں آرمی پبلک سکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ایک سال بعد 20 مارچ 1991ء کو حکومت نے سکردو پبلک سکول اینڈ کالج کا قیام عمل میں لایا۔ لیفٹننٹ کرنل حامد نوید اس کے پہلے پرنسپل تھے۔ 1998ء سے اس ادارے میں کالج کلاسوں کا بھی اجراء کیا گیا۔ یکم مارچ 1992ء کو سکردو شہر میں جناح پبلک سکول کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم ہوا۔ یہ بلتستان میں پہلا پرائیویٹ انگلش میڈیم سکول ہے۔ اس میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے تعلیم ملتی ہے۔

چونکہ بلتستان کی لڑکیوں کے لئے ایف ایس سی کی کلاسوں کا انتظام نہ تھا اس لئے جناح پبلک سکول سکردو کی انتظامیہ نے جولائی 1993ء میں جناح کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے لڑکیوں کے لئے فلاحی بنیادوں پر سکردو میں ایف ایس سی پری میڈیکل کی تدریس کا انتظام کیا اور پانچ طالبات کے لئے سہ پہر کی کلاس شروع ہوگئی۔ ڈگری کالج سکردو کے بیالوجی کے استاد (بعد میں پرنسپل) پروفیسر ضیاء علی، کیمسٹری کے استاد شاہد علی اور فزکس کے استاد ذیجاہ حیدر زیدی نے قومی خدمت کے جذبے کے تحت اس فلاحی مشن کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ دوسرے

سال اردو کے استاد سید تہذیب الحسن اورانگریزی کے استاد سید محمد شاہ بھی اس مہم میں شریک ہوئے۔ 1994ء میں مزید 14 طالبات نے داخلہ لیا۔ 1995ء میں پہلی بار بلتستان سے پانچ طالبات نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا جبکہ دوسرا گروپ سیکنڈ ائیر میں پہنچ گیا۔اسی سال چیف سکریٹری شمالی علاقہ جات نے سائنس کی اس کلاس کواسی انتظام کے ساتھ گرلز انٹرمیڈیٹ کالج سکردو میں منتقل کرلیا۔ یوں طالبات کو بلتستان ہی میں میٹرک کے بعد سائنس کی تعلیم جاری رکھنے کا موقع فراہم ہوگیا۔

1992ء کے بعد بلتستان میں پبلک سکولوں کے قیام کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیرانتظام تعمیر ملت پبلک سکول کے نام سے 1993ء سے، جابر بن حیان ٹرسٹ کے زیرانتظام شیخ محسن علی نجفی کی سرپرستی میں اسوہ پبلک سکول کے نام سے 1994ء سے اور کالعدم تحریک جعفریہ کی طرف سے قائم کی گئی پاکستان ایجوکیشنل کونسل کے زیرانتظام 1995ء سے المصطفیٰ پبلک سکول کے نام سے بہت سے سکول اس وقت (2002ء) بلتستان بھر میں کام کررہے ہیں۔دوسرے پبلک سکولوں میں انوری شہید پبلک سکول دوم سوم خپلو، آئی ایس ایس بی سکردو، اشرف پبلک سکول گمبہ سکردو، کیریئر گائیڈنس پبلک سکول سکردو، شاہ ہمدان پبلک سکول خپلو، الاثر پبلک سکول، شیوک پبلک سکول خپلو، سرسید پبلک سکول سکردو، فائیو سٹار پبلک سکول خپلو، نیو ملینیم پبلک سکول سکردو، نونہال پبلک سکول کچورہ، کائنات پبلک سکول، تہران جینوا پبلک سکول اور شفقت پبلک سکول سکردو قابل ذکر ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس وقت کل ایک سو کے لگ بھگ پرائیویٹ سکول بلتستان میں قائم ہیں۔ان کے علاوہ سنٹرل ایشیا انسٹی ٹیوٹ کے زیرانتظام ڈاکٹر گریک مارٹن سن کی سرپرستی میں بہت سے سکول بلتستان بھر میں 1993ء سے کام کررہے ہیں۔

جون 1998ء میں خپلو میں لڑکوں کے لئے انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا۔ پروفیسر غلام حسن اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔عالمی بینک کے تعاون سے اکتوبر 1999ء میں سکردو میں ایک ایلیمنٹری کالج قائم کیا گیا۔اس ادارے میں خواتین کو پی ٹی سی اور سی ٹی کورس پڑھائے جاتے ہیں۔2000ء میں سکردو میں آغا خان ایجوکیشنل سپورٹ پروگرام (AKESP) کا دفتر قائم ہوا۔

یہ ادارہ بلتستان میں معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے مختلف پراجیکٹس پر کام کر رہا ہے۔ جولائی 2001ء میں کھرمنگ میں اور دسمبر 2001ء میں شگر میں بھی انٹر کالج کا قیام عمل میں آیا۔

12 فروری 2001ء کو بریگیڈیئر تاج اقبال نے کیڈٹ کالج سکردو کے پہلے پرنسپل کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ 21 مئی 2001ء سے اس کالج نے باقاعدہ تدریس کا آغاز کیا۔ واضح رہے کہ سردار مہتاب احمد خان وزیر امور کشمیر کے دور میں سکردو میں کیڈٹ کالج کے قیام کی منظوری دی گئی تھی اور 1995ء سے اس کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا۔

مارچ 2002ء میں ڈگری کالج سکردو میں انفارمیشن ٹیکنالوجی سنٹر قائم ہوا جس کے تحت بی سی ایس اور ایم سی ایس کی کلاسوں کا آغاز ہوگیا۔ مارچ 2002ء ہی کے مہینے میں گلگت میں ڈاکٹر محمد اعظم خان نے قراقرم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔ 2011ء میں سکردو میں قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی سکردو کیمپس کا قیام عمل میں آیا اور حسین آباد کی ہائیر سیکنڈری سکول کی عمارت میں ایجوکیشن، بزنس ایڈمنسٹریشن، کمپیوٹر سائنس اور انگلش چار مضامین میں تدریس کا آغاز کیا۔

25 اگست 2017 کو مسلم لیگ نون کی حکومت نے سکردو میں بلتستان یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دیدی اور 25 اکتوبر کو وزیر اعظم شاہد خاقان عباسی نے کیڈٹ کالج سکردو کی عمارت میں بلتستان یونیورسٹی کا رسمی افتتاح کیا۔ 31 مئی 2018 کو پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم خان کو بلتستان یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا جنہوں نے 20 جون کو سکردو پہنچ کر بلتستان یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا۔

مروجہ تعلیمی اداروں کے علاوہ بلتستان بھر میں اسلامی مدارس اور دینیات سنٹر اسلامی علوم کی تدریس واشاعت میں مصروف ہیں۔

صحت

ریاست کی سٹیٹ کونسل حکومت نے 1901ء میں سکردو میں ایک ڈسپنسری قائم کی جس

میں ڈاکٹر متعین ہوتا تھا۔1925ء میں اسے اپ گریڈ کر کے 10 بستروں کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا گیا۔اس میں دیگر سٹاف کے علاوہ ایک اسسٹنٹ سرجن اور تین سب اسسٹنٹ سرجن متعین تھے۔ لیبارٹری قائم تھی۔خواتین مریضوں کے بھی داخل کئے جانے کا انتظام تھا۔لیکن مریضوں کو ہسپتال کی طرف سے کھانا فراہم کرنے کا بندوبست موجود نہ تھا۔ بعد میں خپلو اور شگر میں ایک ایک ڈسپنسری قائم کی گئی۔ان میں سب اسسٹنٹ سرجن متعین تھے۔ہسپتال اور ڈسپنسریوں میں دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔ضلع لداخ میں ایک ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر محکمہ صحت کا سربراہ ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد 1949ء کے آخر میں دو سول ڈاکٹر سکردو ہسپتال میں متعین ہوئے۔ 25 دسمبر 1950ء کو میجر حیدر بصری حسن خان سکردو میں ایجنسی سرجن تعینات ہوئے۔ وہی ہسپتال کا انچارج آفیسر بھی ہوتا تھا۔ایچ بی ایچ خان 1959ء تک سکردو میں تعینات رہے اور یہیں سے لیفٹننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا کر چلے گئے۔ان کے دور میں سکردو کے ہسپتال کو 35 بستروں کا بنا دیا گیا۔ 1951ء کے آخر میں سکردو ہسپتال میں آٹھ کلوواٹ کا ایک ڈیزل انجن جنریٹر نصب کیا گیا۔ جنریٹر کے نصب کئے جانے کے ساتھ ہی ہسپتال کے صحن میں موجود چنار کے نیچے مریضوں اور دیگر شہریوں کے لئے فلم دکھانا بھی شروع کیا گیا۔ بعد میں 1954ء میں سینما ہال کی تعمیر مکمل ہونے پر فلم دکھانے کا کام ادھر منتقل ہو گیا۔ 1954ء میں ایچ بی ایچ خان کی سرپرستی میں پہلا ڈرامہ باوفا قاتل، اس ہال میں سٹیج ہوا۔اس کے بعد ڈراموں کے دکھائے جانے کا ایک سلسلہ قائم ہوا جو تقریباً ڈیڑھ عشرے تک جاری رہا۔اس سے قبل ڈوگرہ دور میں ہر تین ماہ بعد لوور ہائی سکول سکردو میں ڈرامہ سٹیج کیا جاتا تھا اور اس کی آمدنی کو غریب بچوں کی تعلیم پر خرچ کیا جاتا تھا۔ایچ بی ایچ خان ایک لائق انسان تھے۔ انہوں نے ہسپتال کو جدید ترین سہولیات سے آراستہ کیا۔ ایکسرے اور ای سی جی وغیرہ کی سہولیات فراہم کر دیں۔ لیبارٹری کو بھی جدید آلات اور تربیت یافتہ سٹاف سے مزین کیا۔ڈیوٹی روم، اہم دفاتر اور ایجنسی سرجن کی رہائش گاہ کے درمیان ایک خود کار انٹرکام نصب کیا۔ ہر مریض کے سرہانے ہیڈ فون لگایا گیا جس کے ذریعے مریض روزانہ ایک گھنٹہ ریڈیو پروگرام سن سکتے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود سٹاف کو بلانے کے لئے ہر مریض کے سرہانے

بٹن نصب کیا گیا۔ ہسپتال کے قریب واقع چشمے سے پانی لفٹ کر کے ہسپتال کو صاف پانی فراہم کیا گیا تھا۔ ایچ بی ایچ خان خود مریضوں اور سٹاف کی خدمت کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ اسی لئے لوگ اپنے پیشے کے ساتھ ان کے خلوص اور اس علاقے کے غریب لوگوں کے ساتھ ان کی محبتوں کو اب تک بھول نہ سکے ہیں۔

حکومت پاکستان نے آزادی کے فوراً بعد باغیچہ کھرمنگ اور تھوار میں ڈسپنسریاں قائم کیں۔ اسی دوران اولڈینگ اور پیون میں ایم آئی رومز قائم ہوئے۔ 1968ء تک خپلو اور شگر کی ڈسپنسریوں کو 10 بستروں کا ہسپتال بنا دیا گیا۔ مہدی آباد، کریس اور تھوار کی ڈسپنسریوں میں چار مریضوں کے داخل کئے جانے کا انتظام کیا گیا۔ ان کے علاوہ مختلف وادیوں میں چھ سی کلاس ڈسپنسریاں بھی قائم کی گئیں۔

1962ء میں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال سکردو کی موجودہ عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ مارچ 1973ء میں ہسپتال کو اس نئی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ اس میں ٹی بی سنٹر اور چھوت بلاک علیحدہ تعمیر ہوا۔ بنیادی طور پر یہ 50 بستروں کا ہسپتال تھا لیکن عملاً اس میں 143 بستروں کا انتظام ہے۔ توسیع کا عمل بعد کے زمانوں میں بھی ہوتا رہا جو اب تک جاری ہے۔ اس میں میڈیکل، پیتھالوجی، آئی، سرجری، ای این ٹی، ڈینٹل اور ریڈیوگرافی کے شعبوں میں سپیشلسٹ موجود ہیں۔

اس وقت شگر میں 25 بستروں کا رورل ہیلتھ سنٹر، خپلو میں 20 بستروں کا اور مہدی آباد، طولتی، تھوار، کریس، سکسہ، ڈغونی اور تھغس میں 10 بستروں کے ہسپتال قائم ہیں۔ ان کے علاوہ بلتستان بھر میں اس وقت چھ بی ایچ یو (Basic Health Unit)، 38 سول ڈسپنسریاں اور 25 فرسٹ ایڈ پوسٹ قائم ہیں۔ ہسپتالوں میں میڈیکل آفیسر کے علاوہ ڈینٹل سرجن بھی متعین ہیں اور لیڈی ڈاکٹر کی بھی پوسٹیں موجود ہیں۔ ان میں ایکسرے، لیبارٹری، مائنر اوپریشن تھیٹر اور ویکسی نیشن کی سہولیات دستیاب ہیں۔ اے کلاس ڈسپنسریوں اور بی ایچ یو میں بھی میڈیکل آفیسر تعینات ہیں۔ باقی ڈسپنسریوں میں ڈسپنسر، نرسینگ اسسٹنٹ اور دائی متعین ہیں۔ دوائیں ہر جگہ مفت دی جاتی ہیں۔

ابتداء میں بلتستان میں ایجنسی سرجن محکمہ صحت کا سربراہ ہوتا تھا جو لیفٹننٹ کرنل ہوا کرتا

تھا۔1973ء میں سکردو کے ہسپتال میں ایک لیفٹننٹ کرنل انچارج ہسپتال متعین کر کے اسے براہ راست ہیڈ کوارٹر کے ماتحت کر دیا گیا۔ باقی ہسپتالوں کو ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کے ماتحت کر دیا گیا جو پہلے لیفٹننٹ کرنل اور بعد میں میجر ہوا کرتا تھا۔ جولائی 1991ء سے سول ڈاکٹر ڈی ایچ او متعین ہونے لگا۔

پرائیویٹ سیکٹر میں اس وقت امان کلینک خپلو 1981ء سے، معرفی ٹرسٹ ہسپتال مہدی آباد 1995ء سے، آئی ہسپتال گمبہ سکردو 1999ء سے اور عبداللہ ہسپتال سکردو 2000ء سے خیراتی بنیادوں پر خدمت میں مصروف ہیں۔

1990ء کے عشرے سے سکردو شہر میں تجارتی بنیادوں پر کلینک اور ہسپتال کے قیام کا سلسلہ بھی چل پڑا ہے جس سے عوام کو تشخیص اور علاج معالجے میں بہت سہولت ہو گئی ہے۔ یکم اپریل 2001ء سے گمبہ سکردو میں سی ایم ایچ نے کام کرنا شروع کیا۔

ذرائع آمدورفت

راولپنڈی سے گلگت تک وادی کاغان کے راستے 1953ء میں جیپ سڑک بن چکی تھی۔ جگلوٹ سے استور، دیوسائی اور سدپارہ وادی کے راستے سکردو تک ایک موسمی جیپ ایبل سڑک 1963ء میں بن گئی اور گرمیوں میں اس راستے سے سکردو تک جیپیں آنے لگیں۔ اندرون بلتستان آزادی کے فوراً بعد آرمی انجینئرز نے تونگوس سے باغیچہ کھرمنگ تک 98 میل لمبی سڑک تعمیر کی تھی۔ بعد میں سول محکمے نے سڑکوں کی تعمیر جاری رکھی اور 1968ء تک تین دریائی پلوں سمیت سکردو سے اولڈینگ کھرمنگ، ڈاؤ خپلو، داسوشگر، داپا مہدی آباد، شغرتھنگ اور سکورا روندو تک جیپ سڑک تعمیر ہو گئی۔ اسی سال یعنی 1968ء میں روندو کے راستے ایک نہایت ہی خطرناک جیپ سڑک گلگت تک متصل ہو گئی جہاں سے جیپوں کی آمدورفت قائم ہو گئی اور یوں تاریخ میں پہلی بار سکردو سے باہر کی دنیا تک ایک ہمہ وقتی راستہ کھل گیا۔ اسی دوران گلگت تک شاہراہ قراقرم کی تعمیر مکمل ہو گئی جس کے سروے کا 1954ء میں آغاز ہوا تھا اور 1959ء میں اس کی تعمیر کا کام بھی شروع

ہوا تھا۔ 1974ء میں عالم پل سے سکردو کی طرف ٹرک روڈ کی تعمیر کا کام شروع ہوا جو 1980ء میں تکمیل کو پہنچا۔ 1985ء میں شاہراہ سکردو کو پکا کرنے کا کام بھی مکمل ہوگیا۔ 1980ء سے سکردو میں ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ یہی بلتستان میں معاشی اور سماجی انقلاب کا نقطہ آغاز ہے۔ سکردو شہر کے اندر کی سڑک 80-1976 کے دوران پکی کی گئی۔ 1990ء کے عشرے میں خپلو اور طولتی تک کی سڑکوں کو پکا کیا گیا۔ 2002ء میں تھورگو سے شگرتک کی سڑک کو پکا کرنے کا کام شروع ہوا۔ اسی سال سکردو سے استور تک براہ دیوسائی ٹرک روڈ کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

1949ء کے اواخر تک سکردو میں فوجی اور سول انتظامیہ کی دو گاڑیاں بذریعہ ہوائی جہاز پہنچ چکی تھیں۔ اسی دوران سول سپلائی محکمے کا ایک چھوٹا سا ٹرک بھی سکردو پہنچ گیا۔ اس کے بعد سکردو میں پہلا ٹریکٹر بنیادی جمہوریت کے محکمے نے لایا۔ 1960ء کی دہائی کے آغاز میں تین ٹیکسی جیپیں بھی سکردو سے مختلف سمتوں کو اندرون بلتستان چلنے لگیں۔ 1963ء کے بعد سے پرائیویٹ جیپوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ تاہم 1980ء تک سکردو میں موجود گاڑیوں کو گنا جاسکتا تھا اور تقریباً ہر کوئی انہیں پہچانتا تھا۔ مشہ بروم کمپنی کی سوزکی پک اپ نے دسمبر 1981ء میں شہر سے ہوائی اڈہ تک باقاعدہ سروس شروع کی۔ اس کے بعد دو سالوں کے اندر سکردو میں سوزوکی پک اپ کی تعداد تقریباً دو سو ہوگئی۔ مارچ 1981ء میں سکردو سے گلگت تک مشہ بروم ٹورز اور نیٹکو کی بس سروس شروع ہوئی۔ 1983ء میں سکردو سے گلگت تک ویگن سروس کا آغاز ہوا۔ 1992ء میں سکردو سے راولپنڈی تک براہ راست بس سروس اور 1998ء سے کوسٹر سروس قائم ہوگئی۔ اس وقت مشہ بروم اور نیٹکو کے علاوہ کے ٹو اور ہمالیہ نامی کمپنیوں کی بھی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ سکردو میں پہلی ٹیکسی یلو کیب 1993ء میں پہنچی ۔ 1994ء کے آخر تک ڈیڑھ سو ٹیکسی کاریں سکردو شہر میں چلنے لگیں۔ گاڑیوں کی تعداد میں مسلسل اضافے کی وجہ سے جون 2007ء سے سکردو شہر میں ٹریفک کے مسائل کا آغاز ہوگیا۔ 2012ء سے سکردو میں رکشہ گاڑیاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔

ڈوگرہ حکومت نے ستمبر اکتوبر 1947 میں گمبہ سکردو کے قریب ایک کچا ہوائی اڈہ تعمیر کیا تھا۔ لیکن ڈوگروں کو اسے استعمال کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اکتوبر نومبر 1948ء میں حکومت

پاکستان نے ڈوگرہ ہوائی اڈے کی جگہ پر 200x1200 گز کا ایک کچا ہوائی اڈہ تعمیر کیا۔ اس اڈے پر پہلی بار 16 مارچ 1949ء کو پہلا پاکستانی جہاز لینڈ ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک فوجی برسٹل جہاز تھا جسے ایک بلتستانی پائلیٹ سید اصغر زیدی چلا رہے تھے۔ اس کے بعد فوجی برسٹل اور پاکستان اور رینٹ ایئرویز کے ڈکوٹہ جہازوں نے سکردو اور پشاور کے درمیان باقاعدہ سروس شروع کی ۔ڈکوٹہ جہاز اس فاصلے کو 125 منٹ میں طے کرتے تھے۔ 1950ء کے اواخر سے پشاور کی بجائے سکردو اور راولپنڈی کے درمیان ہوائی سروس کا آغاز ہوا۔ مارچ 1955ء میں اور رینٹ ایئرویز کی جگہ پی آئی اے نے لی۔ اس کے بعد فوکر جہاز بھی چلنے لگے۔ 1970ء کے آخر تک کچے اڈے کے پہلو میں دو کلومیٹر لمبا پکا ہوائی اڈہ تعمیر ہوگیا۔ اسی ہوائی اڈے سے 1986ء سے سکردو اور راولپنڈی کے درمیان بوئینگ 737 جہاز چلنے لگے۔ اسی دوران 1988ء میں اسی اڈے کے قریب دوسرا پکا اور بڑا ہوائی اڈہ تعمیر ہوا۔ اس وقت اسی اڈے اور اسلام آباد ائرپورٹ کے درمیان بوئینگ 737 جہاز چلتے ہیں۔ فوکر جہازوں کو ایک گھنٹہ بیس منٹ لگتے تھے۔ بوئینگ جہاز اس فاصلے کو چالیس منٹوں میں طے کرتے ہیں۔

شاہراہ قراقرم اور شاہراہ سکردو کی تعمیر کے بعد بلتستان میں بڑی تیزی سے اقتصادی اور سماجی انقلاب رونما ہوا جس نے لوگوں کے بود و باش کے طریقوں کو بدل کر رکھ دیا۔ بلتستان کا صدیوں سے محفوظ کلچر اس وقت اسی شاہراہ کی بدولت تیزی سے تبدیلی کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ستمبر 2018ء میں جگلوٹ سکردو روڈ کی توسیع اور تعمیر نو کے پراجیکٹ پر کام شروع ہوگیا۔

بلتی ریڈیو نشریات

بلتی زبان میں پہلی بار 1949ء میں ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل سے پندرہ منٹ کا پروگرام نشر ہونا شروع ہوا۔ چند سال بعد ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے بھی بلتی پروگرام نشر ہونے لگا۔ 16 اپریل 1979ء کو سکردو شہر میں کشوباغ کے مقام پر کرائے کے مکان میں ریڈیو سکردو کے نام سے ایک عارضی ریڈیو سٹیشن قائم ہوا جس میں 250 واٹ کا ایک ٹرانسمیٹر نصب تھا۔ حسیب احمد خان

اس کے پہلے سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ 23 نومبر 1982ء کو سکردو میں نیورانگا کے مقام پر دس کلوواٹ کا ایک ٹرانسمیٹر نصب کر کے باقاعدہ ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا۔

ٹیلی وژن سکردو میں

1989ء میں سکردو شہر میں فوج نے ایک عارضی ریلے سٹیشن کے ذریعے پاکستان ٹیلی وژن کے نشر شدہ پروگراموں کو کیسٹوں کے ذریعے لاکر ریلے کرنا شروع کیا۔ اس وقت خبروں کو چھوڑ کر باقی پروگراموں میں سے انتخاب کر کے نشر کیا جاتا تھا۔ پہاڑوں کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سکردو میں ٹی وی پروگرام دیکھا جاسکے گا۔ لیکن سائنس نے بالعموم اور انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بالخصوص اس عشرے میں اتنی تیزی سے ترقی کی کہ بالآخر ریڈیو پاکستان سکردو کی رہائشی عمارتوں میں ٹی وی ریلے سٹیشن قائم ہوا اور 1992ء کے اوائل میں پاکستان ٹی وی نے ٹیسٹ ٹرانسمیشن شروع کیا۔ 26 نومبر 1992ء سے ای ٹی وی (پی ٹی وی ورلڈ) کے پروگرام باقاعدہ طور پر نشر ہونے لگے۔ اس وقت شام چھ بجے سے رات ساڑے گیارہ بجے تک نشریات ریلے ہوتی تھیں۔ بعد میں 1998ء سے 24 گھنٹے نشریات ریلے ہونے لگیں۔ جولائی 2001ء کے دوران سیٹلائٹ ٹاؤن میں ٹی وی کی اپنی عمارات میں یہ سٹیشن منتقل ہوگیا۔ اس کے علاوہ بلتستان بھر میں جہاں جہاں بجلی دستیاب ہے ڈش کے ذریعے دنیا بھر کے پروگرام دیکھے جاتے ہیں۔ 1990ء کی دہائی سے اس عمل کا آغاز ہوا تھا۔ اگست 2002ء میں فوج نے سکردو شہر میں کیبل نیٹ ورک کی سہولت فراہم کردی۔ اکتوبر 2004ء میں سکردو میں انٹرنیٹ کی سہولت پہنچ گئی۔

ٹیلیفون

آزادی کے بعد وائرلیس سٹیشن فوج کی تحویل میں کام کرتا رہا۔ سول محکموں اور سویلین لوگوں کے پیغامات بھی اسی کے ذریعے بھیجے جاتے تھے۔ بعد میں حمید گڑھ میں ایک پولیس وائرلیس سٹیشن قائم ہوا جہاں سے سرکاری محکموں کے پیغامات بھیجے جاتے تھے۔ 1960ء کی دہائی

کے اوائل میں کشو باغ سکردو میں ایک طاقتور وائرلیس سٹیشن قائم ہوا جہاں سے ٹیلی گراموں کی ترسیل شروع ہوئی۔ اس سے قبل ٹیلیگرام ڈاکخانے میں بک کرنا پڑتا تھا۔

1964ء میں سکردو میں 50 لائنوں کا ایک ٹیلیفون ایکسچینج نصب کیا گیا۔ 74-1970ء کے دوران مزید 50 لائنوں کا اضافہ کر کے تعداد کو ایک سو کر دیا گیا۔ جولائی 1976ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے حکم سے ٹی اینڈ ٹی محکمے کی جگہ ایس سی او نے لی جس نے کامن بیٹری ایکسچینج میں ٹیلیفون کنکشن کی تعداد کو بڑھا کر چار سو کر دیا۔ 1988ء میں سی بی ایکسچینج کی جگہ سکردو میں 600 لائنوں کا ایک خودکار ایکسچینج نصب ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیٹلائٹ کے ذریعے ڈائریکٹ ڈائلنگ کا نظام بھی قائم ہوا۔ 1991ء میں لائنوں کی تعداد کو بڑھا کر بارہ سو کر دیا گیا۔ 1998ء میں سکردو میں 600 لائنوں کا ایک ڈیجیٹل ایکسچینج قائم ہوا۔ 2001ء میں چار ہزار لائنوں کا ڈیجیٹل ایکسچینج نصب کیا گیا۔ اس کے علاوہ 2001ء میں وائرلیس لوکل لوپ ٹیلیفون سسٹم بھی قائم ہوا۔ 2006ء میں اوپٹکل فائبر کیبل بچھا کر ٹیلی فون سروس کو مزید بہتر بنایا گیا۔

اس وقت خپلو میں 800 لائنوں کا، ڈمبوداس میں 600، مہدی آباد میں 300 اور شگر میں 140 لائنوں کا ڈیجیٹل ایکسچینج قائم ہیں جو بڑے شہروں کے ساتھ ڈائریکٹ ڈائلنگ کے ذریعے مربوط ہیں۔ ان کے علاوہ گمبہ سکردو، گول، کریس اور غواڑی میں ایک سو لائنوں کے کامن بیٹری ایکسچینج قائم ہیں جبکہ کھرمنگ میں 40 لائنوں کا، طولتی اور سکسہ میں بیس لائنوں کے اور کچورہ میں دس لائنوں کا لوکل بیٹری ایکسچینج لگے ہوئے ہیں۔ 2006ء میں SCO نے S.COM کے نام سے سکردو میں موبائل فون کی سہولت مہیا کر دی۔

بجلی اور انڈسٹری

ڈوگرہ دور میں ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر بیٹری سیل چارج کرنے کے لئے چھومیک سکردو میں پن چکی کے ذریعے ڈائنمو گھما کر اس سے کام لیا کرتا تھا۔ 1951ء میں سکردو ہسپتال میں 8 کلو واٹ کا ایک ڈیزل انجن جنریٹر نصب ہوا۔ یہ اس سرزمین میں پہلا بجلی گھر تھا۔ 1953ء سے شہر کے

سارے سرکاری کوارٹروں کو بھی اسی سے بجلی سپلائی کی جانے لگی۔ بجلی کے کرایے کے پیسے ہسپتال کے یونٹ فنڈ میں جمع ہوتے تھے۔ اسی دوران ہسپتال سے حمید گڑھ تک سڑک پر سٹریٹ لائٹیں بھی لگ گئیں۔ 1965ء میں محکمہ پی ڈبلیوڈی، بنیادی جمہوریت اور مقامی باشندوں کے اشتراک سے حسین آباد میں دس کلوواٹ کا ایک پن بجلی گھر قائم ہوا۔ یہ بلتستان میں پہلا پن بجلی گھر تھا۔ 1971ء میں سکردو شہر کو جزوی طور پر پائپ کا پانی پہنچایا گیا۔ پی ڈبلیوڈی کے سربراہ انجینئر حسین ولی نے واٹر سپلائی لائن پر 10 کلوواٹ کا ایک جنریٹر نصب کر کے اہم سرکاری کوارٹروں کو بجلی فراہم کی۔ 1973ء میں سکردو شہر کے پہلو میں 400 کلوواٹ کے پن بجلی گھر کی تعمیر مکمل ہوئی اور شہر کو بجلی کی باقاعدہ سپلائی شروع ہوئی۔ اس کے بعد سارے علاقے میں پن بجلی گھروں کی تعمیر کا سلسلہ قائم ہوا۔ 1987ء میں سندوس میں ایک شمسی توانائی کا بجلی گھر قائم ہوا جو ایک سال کام کرنے کے بعد بیکار ہو گیا۔ اس وقت (2002ء میں) گنگچھے ضلع میں کریس، تھلے، کھرکو، دوم سوم، پیون، غربوچونگ اور خپلو میں پن بجلی گھر قائم ہیں جن سے مجموعی طور پر تقریباً ساڑھے تین میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ سکردو ضلع میں سکردو شہر، کچورہ، بشو، گول، سرمیک، مہدی آباد، طولتی، اولڈینگ، منٹھوکھا، غندوس، شگر، نیا سلو، میندی، ستک اور طورمیک میں پن بجلی گھر قائم ہیں جن سے مجموعی طور پر 9 میگاواٹ بجلی پیدا ہوتیا ہے۔ اس کے علاوہ خپلو میں 450 کلوواٹ اور سکردو شہر میں ایک میگاواٹ بجلی ڈیزل انجن کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ پن بجلی گھروں کے قیام کا سلسلہ ابھی تیزی سے جاری ہے۔ ستمبر 2002ء میں سد پارہ ڈیم کے پراجیکٹ پر کام شروع ہوا جس کی تکمیل پر 2012ء میں 12 میگاواٹ بجلی پیدا ہونا شروع ہوا۔ چونکہ اس پراجیکٹ کا اہم جزو شتونگ نالے کا رخ بدلنے کا کام معطل ہو چکا ہے اس لئے تسلسل کے ساتھ مطلوبہ بجلی پیدا کرنے اور مزید زمینوں کو سیراب کرنے کا کام بھی معطل ہے۔

1962ء میں محمد حسین نام کے دو افراد نے اپنے تیسرے دوست کے ساتھ مل کر سکردو میں ایک آرا مشین، ایک چکی اور صابن سازی کی مشین نصب کی تھی۔ سکردو میں یہ پہلا کارخانہ تھا۔ یہ مشینیں ڈیزل انجن موٹر سے چلتی تھیں۔ 1973ء میں سکردو شہر میں بجلی کی فراہمی کے ساتھ ہی آرا

مشینوں اور چکیوں کی بہتات ہوگئی۔اس کے بعد ویلڈ ینگ ،خراد،فوٹوسٹیٹ (یکم جنوری 1977ء) اور ہر قسم کی مشینوں کا استعمال عام ہوگیا۔سکردو شہر میں پہلا فوٹوسٹوڈیو کرگل کے حاجی محمد حسین نے 1958ء میں اور پہلا چھاپ خانہ 1978ء میں سکسہ کے حاجی روزی محمد نے قائم کیا تھا۔پہلا کمپیوٹر سکردو میں اے کے آر ایس پی نے 1987ء میں لایا تھا۔1990ء میں بغاردو تھنگ کے مقام پر پہلا سنگ مرمر کا کارخانہ لگ گیا۔2000ء میں حسین آباد اور شگر میں ماربل کے کارخانے قائم ہوئے۔2-2000ء کے دوران سکردو شہر میں اکبر، القریش اور کے ٹو کے ناموں سے تین فلور ملوں نے کام شروع کردیا۔

اخبارات وجرائد

بلتستان میں صحافتی سرگرمیوں کا آغاز 1949ء سے ہوا۔یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی ہوئی جس کے فوراً بعد جنگ کے دوران کی بدعنوانیوں اور کوتاہیوں پر تنقید کرتے ہوئے سکردو سے ایک گمنام قلمی ہفت روزہ 'صدائے جرس، کے عنوان سے جاری ہوا جو کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں مختلف جگہوں سے بلتستانیوں نے اخبارات وجرائد اور مجلّے شائع کیے۔اس سلسلے میں اب تک کی دستیاب معلومات کو ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

اخبارات

نام	مدیر/ادارہ	سن اجراء	مقام اشاعت	موجودہ صورتحال
صدائے جرس قلمی ہفت روزہ	گمنام	1949ء	سکردو	بند ہوا
جمہور قلمی پندرہ روزہ	بلتستان مسلم لیگ	1949ء	سکردو	بند ہوا
ترجمان قلمی پندرہ روزہ	محرم علی شاہ	1949ء	خپلو	بند ہوا
بادشمال ہفت روزہ	مرزا غلام محمد	1958ء	لاہور	بند ہوا
صدائے بلتستان ہفت روزہ	رضا انصاری	1972ء	کراچی	بند ہوا
سیاچن ہفت روزہ	میجر (ریٹائرڈ) اقبال	1988ء	راولپنڈی	بند ہوا

قراقرم ہفت روزہ		1990ء	راولپنڈی	بند ہوا
کے ٹو ہفت روزہ	راجہ حسین خان مقپون	1996ء	راولپنڈی	روزنامہ بن گیا
سیاچن روزنامہ		1996ء	راولپنڈی	بند ہوا
سیاچن ہفت روزہ	محمد قاسم نسیم	1998ء	سکردو	بند ہوا
بادشمال ہفت روزہ	محمد عابد عبداللہ	1999ء	راولپنڈی	جاری ہے
کرگل ماہنامہ	منظور حسین پروانہ	2000ء	کراچی	جاری ہے
نقارہ ہفت روزہ	سید اعجاز حسین	2002ء	راولپنڈی	جاری ہے
انتخاب سہ ماہی	ذیشان مہدی	2002ء	سکردو	بند ہوا
بیدار	اسلم حسین سحؔر	2004ء	سکردو	جاری ہے
کے ٹو روزنامہ	راجہ حسین خان مقپون	2006ء	راولپنڈی	جاری ہے
گلگت ٹوڈے	غلام محمد پاروی	2007ء	راولپنڈی	بند ہوا

مذہبی جریدے

حبل المتین	آغا علی موسوی	1974ء	لاہور	بند ہوا
الزہراء	شیخ محسن علی نجفی	1979ء	اسلام آباد	بند ہوا
نوائے صوفیہ ماہنامہ	مولانا محمد بشیر	1992ء	اسلام آباد	جاری ہے
النصرت	شیخ فرمان علی		لاہور	جاری ہے
تبیان ماہنامہ	صوفیہ امامیہ نوربخشیہ ٹرسٹ		کراچی	جاری ہے
التراث شش ماہی	مولانا عبدالواحد	2000ء	غواڑی	جاری ہے

مجلّے

بلتستان	محکمہ بنیادی جمہوریت بلتستان	1960ء	سکردو
بلتستان کے سخنور	حلقۂ علم وادب (سن قیام 1984ء)	1991ء	سکردو
معراج ادب	حلقۂ علم وادب	1998ء	سکردو

کاروان	کاروان ادب چپلو (سن قیام 1991ء)	1994ء	چپلو
بلتستان	بلتستان ریسرچ سنٹر		سکردو
بلتی یل	بلتستان سٹوڈنٹس فیڈریشن		کراچی

انتظامیہ کے سربراہان بلتستان

1۔اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ بلتستان

1۔ وزیر ولایت علی خان	فروری 1948ء
2۔ حکیم محمد لطیف	نومبر 1948ء

2۔ ایڈیشنل پولیٹکل ایجنٹ بلتستان

1۔محمد بہرام خان	پی سی ایس	ستمبر 1949ء
2۔ کیپٹن اشرف حسین	پی سی ایس	جولائی 1953ء
3۔ راجہ حبیب الرحمن خان	ریٹائرڈ بریگیڈئیر	نومبر 1955ء
4۔ بنات گل خان	پی سی ایس	نومبر 1958ئق
5۔ فیض اللہ خان	جی اے آر	ستمبر 1959ء

3۔پولیٹکل ایجنٹ بلتستان ایجنسی

1۔ فیض اللہ خان	جی اے آر	جنوری 1964ء
2۔ بنات گل خان	پی سی ایس	جنوری 1964ء
3۔ ممتاز خان وزیر	پی سی ایس	جولائی 1968ء
4۔ملک محمد عظیم (قائم مقام)		اگست 1970ء
5۔صحبت خان	پی سی ایس	اپریل 1971ء
6۔محمد شفیق	پی سی ایس	اکتوبر 1972ء

4۔ ڈپٹی کمشنر بلتستان

1۔ محمد شفیق	پی سی ایس	فروری 1973ء
2۔ افتخار الدین		فروری 1975ء
3۔ غازی جوہر خان		اپریل 1976ء
4۔ ملک محمد عظیم		اگست 1978ء
5۔ محمد شریف		جنوری 1980ء
6۔ غازی جوہر خان		اگست 1983ء
7۔ محمد نذیر		ستمبر 1985ء
8۔ غازی جوہر خان		مئی 1986ء
9۔ محمد نذیر		جنوری 1990ء
10۔ محمد بلال		جون 1990ء
11۔ غازی جوہر خان		اپریل 1992ء
12۔ شمائل احمد خواجہ		اکتوبر 1993ء
13۔ ثناء اللہ		جولائی 1995ء
14۔ نور محمد		اکتوبر 1999ء
15۔ سعید احمد خان		جنوری 2000ء
16۔ محمد اکبر میر		اپریل 2000ء
17۔ غلام حسین		ستمبر 2002ء
18۔ محمد عباس		جون 2003ء
19۔ ساجد رشید بلوچ		اکتوبر 2003ء
20۔ محمد شفا		ستمبر 2004ء

21۔زرق مرزا		جولائی2005ء
22۔وزیر اشفاق		جولائی2008ء
23 ۔آصف بلال لودھی		نومبر2008

ڈپٹی کمشنر ضلع گنگ چھے

1۔ وزیر فرمان علی		اکتوبر1974ء
2۔ راجہ محمد علی شاہ	(قائم مقام)	دسمبر1975ء
3۔ محمد شریف		مارچ1976ء تا30 جون1978

گنگ چھے ضلع کی بحالی کے بعد

1۔ غلام نبی		دسمبر1989ء
2۔ راجہ شہزاد خان		اگست1990ء
3۔ ثناء اللہ		مارچ1991ء
4۔ داؤد خان		اپریل1993ء
5۔ خان بہادر		نومبر1996ء
6۔ محمد اکبر میر		اکتوبر1999ء
7۔علی ظہیر ہزارہ		اپریل2000ء
8۔محمد امین	(قائم مقام)	اکتوبر2000ء
9۔محمد حمیر کریم		دسمبر2000ء
10۔وزیر اشفاق احمد خان	(قائم مقام)	اپریل2002ء
11۔فدا حسین		اکتوبر2002ء
12۔سید ھادی		ستمبر2007ء

5۔کمشنر بلتستان ڈویژن

1۔آصف بلال لودھی	ڈی ایم جی	18 ستمبر 2009ء
2 ۔ڈاکٹر ساجد محمود چوہان ڈی ایم جی		26 مئی 2010ء
3۔خالد نذیر وٹو	ڈی ایم جی	19 فروری 2012ء
4۔عبدالقمر شہزاد		12 اکتوبر 2012ء
5۔ملک محمد افسر خان		13 جولائی 2014ء
6۔ محمد شگری		15 جنوری 2016ء
7۔ عاصم ایوب	پی اے ایس	18 اگست 2016ء
8۔ محمد حمزہ سالک	پی اے ایس	16 دسمبر 2017ء

ممبران کونسل/اسمبلی

1۔انتخابات:30 دسمبر 1970ء (ایڈوائزری کونسل فار ناردرن ایریاز)

(گلتری کی وجہ سے کھرمنگ میں انتخابات ستمبر 1971ء میں ہوئے)۔

1۔آغا محمد	سکردو
2۔راجہ فضل علی خان	روندو
3۔محمد حسین	شگر
4۔راجہ امان علی شاہ (9/10/71)	کھرمنگ
5۔وزیر محمد صادق	پرکوتہ۔خپلو
6۔راجہ فتح علی خان	خپلو

2۔انتخابات:6 نومبر 1975ء (ناردرن ایریاز کونسل)

1۔سید حیدر شاہ	سکردو

2۔سید شمشاد حسین	روندو
3۔محمد حسین	شگر
4۔وزیر محمد صادق	کھرمنگ
5۔راجہ حامد حسین	پرکوتہ۔خپلو
6۔سید محمد کاظمی	خپلو

3۔انتخابات: 11اکتوبر1979ء(ناردرن ایریاز کونسل)

1۔وزیر محمد صادق (متوفی 1982ء)	سکردو
آغا احمد علی شاہ (1982ء سے)	سکردو
2۔حاجی جمعہ خان	روندو
3۔حاجی محمد حسین (بلا مقابلہ)	شگر
4۔سید محمد علی شاہ	کھرمنگ
5۔سید محمد شاہ (بلا مقابلہ)	خپلو
6۔غلام علی حیدری	خپلو

4۔انتخابات:26اکتوبر1983ء(ناردرن ایریاز کونسل)

1۔آغا احمد علی شاہ	سکردو
2۔حاجی احمد چو	روندو
3۔حاجی محمد حسین (بلا مقابلہ)	شگر
4۔آغا محمد علی شاہ	کھرمنگ
5۔محمد اسماعیل (بلا مقابلہ)	خپلو
6۔محمد جعفر	خپلو

5۔ انتخابات: 11 اکتوبر 1987ء (ناردرن ایریاز کونسل)

1۔آغا احمد علی شاہ (متوفی 1989ء)	سکردو
غلام حسین سلیم (1989ء سے)	سکردو
2۔وزیر فیض محمد	روندو
3۔راجہ محمد اعظم خان	شگر
4۔سید اسد شاہ زیدی	کھرمنگ
5۔سید طاہر علی شاہ	خپلو
6۔محمد جعفر	خپلو

6۔ انتخابات: 19 دسمبر 1991ء (ناردرن ایریاز کونسل)

1۔حاجی غلام حیدر	سکردو
2۔الیکشن سے بائیکاٹ	روندو
3۔راجہ محمد اعظم خان	شگر
4۔سید اسد شاہ زیدی	کھرمنگ
5۔فدا حسین زیدی	خپلو
6۔محمد جعفر	خپلو
7۔مسز فوزیہ سلیم عباس	(خواتین کی مخصوص سیٹ پر)

7۔انتخابات: 25 اکتوبر 1994ء (ناردرن ایریاز کونسل)

1۔حاجی فدا محمد ناشاد	پیپلز پارٹی	سکردو
2۔غلام حسین سلیم	تحریک جعفریہ	سکردو
3 سید محمد عباس رضوی	تحریک جعفریہ	سکردو

4۔صادق علی	تحریک جعفریہ	روندو
5۔حاجی محمد حسین	تحریک جعفریہ	شگر
6۔سید اسد شاہ زیدی	آزاد	کھرمنگ
7۔فدا حسین زیدی	آزاد	خپلو
8۔محمد اقبال	آزاد	خپلو
9۔محمد اسماعیل	آزاد	خپلو

8۔انتخابات: 5 نومبر 1999ء (ناردرن ایریاز قانون ساز کونسل)

1۔حاجی فدا محمد ناشاد	آزاد (بلا مقابلہ)	سکردو
2۔سید مہدی شاہ	پیپلز پارٹی	سکردو
3۔سید محمد عباس رضوی	تحریک جعفریہ	سکردو
4۔وزیر حسن	پیپلز پارٹی	روندو
5۔عمران ندیم	تحریک جعفریہ	شگر
6۔سید محمد علی شاہ	تحریک جعفریہ	کھرمنگ
7۔محمد اسماعیل	آزاد	خپلو
8۔محمد جعفر	پیپلز پارٹی	خپلو
9۔غلام علی حیدری	آزاد	خپلو
10۔فریدہ بتول	(خواتین کی مخصوص سیٹ پر)	سکردو
11۔ناصرہ بیگم	(خواتین کی مخصوص سیٹ پر)	خپلو

9۔انتخابات: 12 اکتوبر 2004ء (ناردرن ایریاز قانون ساز اسمبلی 20 اکتوبر 2007ء سے)

1۔حاجی فدا محمد ناشاد	مسلم لیگ	سکردو
2۔وزیر ولایت علی ایڈووکیٹ	آزاد	سکردو

3۔شیخ نثار حسین سرباز	پیپلز پارٹی	سکردو
4۔ایم سکندر علی	مسلم لیگ	روندو
5۔عمران ندیم	مسلم لیگ	شگر
6۔سید اسد زیدی	آزاد	کھرمنگ
7۔محمد اسماعیل	پیپلز پارٹی	خپلو
8۔محمد ابراہیم ثنائی	مسلم لیگ	خپلو
9۔محمد اقبال	آزاد	خپلو
10۔فوزیہ سلیم عباس	مسلم لیگ	سکردو (خواتین کی مخصوص سیٹ پر)
11۔آمنہ انصاری	مسلم لیگ	گنگچھے (خواتین کی مخصوص سیٹ پر)
12۔غلام نبی ایڈووکیٹ	مسلم لیگ	سکردو (ٹیکنو کریٹ " ")
13۔غلام حسین ایڈووکیٹ	مسلم لیگ	گنگچھے (ٹیکنو کریٹ " ")

10۔انتخابات: 12 نومبر 2009ء (گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی)

1۔سید مہدی شاہ	پی پی پی	سکردو
2۔شیخ نثار حسین	پی پی پی	سکردو
3۔وزیر شکیل احمد	(2013ء میں جج بن گئے)	سکردو
حاجی فدا محمد ناشاد	(06 اکتوبر 2013 سے)	پی ایم ایل (ن) سکردو
4۔وزیر حسن	پی پی پی	روندو
5۔آغا محمد علی شاہ	پی پی پی	کھرمنگ
6۔راجہ اعظم خان	ایم کیو ایم	شگر
7۔محمد جعفر	پی پی پی	خپلو

8۔ مفتی محمد عبداللہ (2013ء میں وفات پا گئے)	پی ایم ایل (ن)	خپلو
سلطان علی (06 اکتوبر 2013ء سے)	پی ایم ایل (ن)	خپلو
09۔ انجینئر محمد اسماعیل	پی پی پی	خپلو
10۔ شیرین فاطمہ (خواتین کی مخصوص سیٹ پر)	پی پی پی	سکردو
11۔ آمنہ انصاری	پی ایم ایل (ق)	خپلو
12۔ غلام حسین (ٹیکنو کریٹ کی مخصوص سیٹ پر)	پی ایم ایل (ن)	خپلو

11۔ انتخابات: 8 جون 2015ء (گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی)

1۔ حاجی اکبر تابان	(پی ایم ایل۔ن)	سکردو
2۔ امتیاز حیدر خان	(ایم ڈبلیو ایم)	
3۔ حاجی فدا محمد ناشاد	(پی ایم ایل۔ن)	
4۔ سکندر علی	(تحریک اسلامی)	روندو
5۔ عمران ندیم	(پی پی پی)	شگر
6۔ اقبال حسن	(پی ایم ایل۔ن)	کھرمنگ
7۔ ابراہیم ثنائی	(پی ایم ایل۔ن)	گنگ چھے
8۔ غلام حسین	(پی ایم ایل۔ن)	گنگ چھے
9۔ محمد شفیق	(پی ایم ایل۔ن)	گنگ چھے
10۔ ریحانہ عبادی	(تحریک اسلامی)	(خواتین کی مخصوص سیٹ) سکردو
11۔ شیرین اختر	(پی ایم ایل۔ن)	گنگ چھے
12۔ میجر (ر) محمد امین	(پی ایم ایل۔ن)	(ٹیکنو کریٹ کی مخصوص سیٹ)

گورنر گلگت بلتستان

1۔قمرزمان کائرہ	15 ستمبر2009ء
2۔ڈاکٹر شمع خالد (متوفیہ 15-09-2010)	23مارچ2010ء
3۔وزیر بیگ قائم مقام گورنر	16 ستمبر2010ء
4۔پیر کرم علی شاہ	یکم فروری2011ء
5۔برجیس طاہر	16فروری2015ء
6۔میر غضنفر علی خان	24نومبر2015ء

صوبائی حکومت کے سربراہان

1۔ ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو

1۔پیر کرم علی شاہ	29نومبر1994ء
2۔حاجی فدا محمد ناشاد	27جولائی2000ء
3۔میر غضنفر علی خان	28اکتوبر2004ء

2۔ چیف ایگزیکٹیو

1۔میر غضنفر علی خان	20اکتوبر2007ء

3۔ وزیر اعلیٰ

1۔سید مہدی شاہ	11دسمبر2009ء
2۔شیر جہان میر نگران وزیر اعلیٰ	11دسمبر2014ء
3۔حفیظ الرحمٰن	26جون2015ء

سپیکر کونسل / اسمبلی

ناردرن ایریاز قانون ساز کونسل

1۔ صاحب خان	27جولائی2000ء

ناردرن ایریاز قانون ساز اسمبلی (20-10-2007 سے)

1۔ ملک مسکین	23 نومبر 2004ء

گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی

1۔ وزیر بیگ	10 دسمبر 2009ء
2۔ حاجی فدا محمد ناشاد	25 جون 2015ء

چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل

1. ڈسٹرکٹ کونسل بلتستان

1۔ وزیر غلام مہدی	دسمبر 1979ء
2۔ حاجی فدا محمد ناشاد	دسمبر 1983ء
3۔ وزیر شکیل احمد	دسمبر 1987ء

2. ڈسٹرکٹ کونسل سکردو

1۔ حاجی حامد حسین	دسمبر 1991ء
2۔ حاجی حامد حسین	دسمبر 1999ء
3۔ راجہ جلال حسین مقپون	نومبر 2004ء

3 ڈسٹرکٹ کونسل گنگچھے

1۔ سلطان علی	دسمبر 1990
2۔ محمد ابراہیم	دسمبر 1991ء
3۔ محمد ابراہیم	دسمبر 1999ء
4۔ محمد ابراہیم	نومبر 2004ء

بلدیہ کے سربراہان

1۔ چیئرمین ٹاؤن کمیٹی سکردو

1 ۔حاتم خان مقپون	اکتوبر 1961
2۔آغا ہادی	اکتوبر 1967

2۔ چیئرمین میونسپل کمیٹی سکردو

1۔حاجی رستم علی	1979ء
2۔حاجی غلام حیدر	1983ء
3۔حاجی غلام حیدر	1987ء
4۔بہادر علی سالک	1991ء
5۔تقی اخوندزادہ	دسمبر 1999ء
6۔ بشیر احمد خان	جون 2001ء
7۔حاجی غلام حیدر	نومبر 2004ء

3. چیئرمین میونسپل کمیٹی خپلو

1۔ محمد یوسف	دسمبر 1991ء
2۔ محمد یوسف	دسمبر 1999ء
3۔ محمد یوسف	نومبر 2004ء

ضمیمہ جات

۱۔	حکمران خاندانوں کے نسب نامے	423
۲۔	پدم کے مجاہدین	438
۳۔	شہداء بلتستان	440
۴۔	قدیم راستے	450
۵۔	ماآخذ	457
۶۔	نقشہ بلتستان	464

حکمران خاندانوں کے نسب نامے

شجرۂ نسب مقپون راجگان سکردو

1۔	ابراہیم مقپون	1190ء	تا	1220ء
2۔	ستک سنگے	1220ء	تا	1250ء
3۔	زک سنگے	1250ء	تا	1280ء
4۔	بروک سنگے	1280ء	تا	1310ء
5۔	سیک سنگے	1310ء	تا	1340ء
6۔	نم گوری تھم	1340ء	تا	1370ء
7۔	سا گوری تھم	1370ء	تا	1400ء
8۔	کھوکھور سنگے	1400ء	تا	1437ء
9۔	غوطہ چو سنگے	1437ء	تا	1464ء
10۔	بہرام چو	1464ء	تا	1490ء
11۔	بوخا	1490ء	تا	1515ء
12۔	شیر شاہ	1515ء	تا	1540ء
13۔	علی خان	1540ء	تا	1565ء
14۔	غازی میر	1565ء	تا	1588ء
15۔	علی شیر خان انچن	1588ء	تا	1625ء

16۔ احمد خان — 1625ء تا 1627ء

17۔ عبدال خان — 1627ء تا 1637ء

18۔ آدم خان — 1637ء تا 1656ء

علی محمد خان

بہ نیابت مرزا خان 1639ء تا 1651ء

بہ نیابت مراد خان 1651ء تا 1656

16۔احمد خان

19۔شاہ مراد علی شاہ (راجہ روندو) 20۔شیر شاہ شاہ سلطان (راجہ استور) امام قلی

بطور راجہ پہلی بار 1637ء
بطور نائب آدم خان 1651ء تا 1656ء
بطور راجہ 1656ء تا 1673ء

راجہ کھرمنگ 1653ء تا 1685ء
راجہ سکردو 1673ء تا 1681ء

21۔محمد رفیع خان 1681ء تا 1712ء رضی خان دولت خان

22۔سلطان مراد 1712ء تا 1722ء فخر النساء زوجہ اعظم خان اماچا

23۔حکومت اعظم خان اماچا
1722ء تا 1727ء

24۔محمد ظفر خان 1727ء تا 1765ء

25۔علی شیر خان ثانی 1765ء تا 1800ء

زوجہ اول زوجہ دوئم زوجہ سوئم

دولت نصیر عظیم خان

26۔احمد شاہ 1800-40ء غلام شاہ

عبدال خان (جھلو میں مارا گیا) شاہ رخ سلطان محمد خان محمد علی خان محمد مراد شاہ محمد

زوجہ اول دختر دولت خان استور زوجہ دوئم خواہر حیدر خان شگر

شاہ مراد شاہ جہاں بیگم (زوجہ علی شیر خان کھرمنگ) 27۔محمد شاہ (ڈوگرہ دور کا پہلا راجہ)

محمد علی خان احمد چو امیر حیدر لطف علی خان ملک حیدر حسین خان

27۔ محمد شاہ

- زوجہ اول (دختر شاہ سلطان استور)
  - 28۔ علی شاہ
- زوجہ دوئم (دختر زعفر زاہد خان)
  - دختر (زوجہ مہدی علی خان طولتی)
- زوجہ سوئم بلتی
  - خیر النساء

28۔ علی شاہ

- زوجہ اول (دختر علی شیر خان کھر منگ)
  - 29۔ حسن خان
  - محمد شاہ
  - شاہ مراد
  - فضل علی خان
  - محمد خان
- زوجہ دوئم
  - عبداللہ خان

29۔ حسن خان

- 30۔ محمد علی شاہ (ڈوگرہ دور کا آخری راجہ)
  - جعفر علی خان
    - ذوالفقار علی خان
      - جلال حسین
      - جعفر علی خان
  - حاتم علی خان
  - نثار علی خان
  - شاہ عباس

شجرۂ نسب مقپون راجگان روندو

- علی شیر خان انچن
  - احمد خان
    - شاہ سلطان (استور)
    - شیر شاہ (کھرمنگ)
    - علی شاہ روندو
      - احمد خان
        - دولت شمشیر
          - اسد اللہ قلی خان
            - محمد علی خان
              - مرزا خان
                - عباس خان
                  - علی خان (راجہ بوقت فتح)
                    - حسین خان
                      - عبد اللہ خان
                        - محمد علی خان
                          - عبد اللہ خان
                            - محمد علی خان
                              - عبد اللہ خان
                            - فضل علی خان
                        - جعفر علی خان
                        - فضل علی خان
                        - لطف علی خان
                      - شاہ سلطان
                  - شیر شاہ
    - شاہ مراد (سکردو)

شجرۂ نسب مقپون راجگان استور

- علی شیر خان انچن 1588ء تا 1625ء
  - احمد خان 1625ء تا 1627ء
    - شاہ سلطان
      - علی جبار
        - محمد رضا خان
          - احمد علی خان
            - شاہ قلی خان
              - مراد علی خان (راجہ بوقت حملہ مرتضیٰ خان 1779ء)
                - دولت علی خان
                  - شاہ سلطان
                    - جبار خان (راجہ بوقت حملہ وزیر لکھپت)
                      - محمد خان (کشمیر میں فوت ہوا)
                    - بہادر خان
                      - شاہ سلطان
                        - حسن خان
                          - ساجد علی خان
    - شیر شاہ
    - علی شاہ
    - شاہ مراد
    - امام قلی

شجرۂ نسب مقپون راجگان کھرمنگ

علی شیر خان انچن 1588ء تا 1625ء

آدم خان 1637ء تا 1656ء — عبدال خان 1627ء تا 1637ء — احمد خان 1625ء تا 1627ء

دختر زوجہ شاہ مراد

شاہ مراد (سکردو) — علی شاہ (روندو) — شیر شاہ (کرتخشہ) — شاہ سلطان (استور) — امام قلی

1653ء تا 1685ء

عزیز خان 1685ء تا 1710ء — حمزہ خان

سعادت خان 1710ء تا 1735ء

اعظم خان — شاہ نواز

عبدالرحیم خان — علی شاہ (طولتی) — مختہ خان (دوس کر) — عباس بیگ (دوس کر)

اشرف خان — مشرف خان

محمد علی خان

زوجہ اول دختر علی شیر خان سکردو — زوجہ دوئم

حیدر علی خان — عباس علی خان — قاسم علی خان — اسداللہ خان

علی شیر خان — عبدالرحیم خان — امیرالدین خان — حسن خان

زوجہ اول شاجہاں بیگم — زوجہ دوم فضہ بیگم دختر سید حسین کھرمنگ

دختر احمد شاہ راجہ سکردو (لاولد)

زوجہ دوم فضہ بیگم دختر سید حسین کھرمنگ

جعفر علی خان 1850ء تا 1885ء — حسین علی خان — تاج بیگم (زوجہ علی شاہ راجہ سکردو)

جعفر علی خان:

زوجہ اول دختر محمد شاہ سکردو — زوجہ دوم — زوجہ سوم

امان علی شاہ سکردو 1885ء تا 1915ء — محمد علی خان — سعادت علی خان

زوجہ فاطمہ بیگم دختر علی شاہ سکردو

علی شیر خان — امیر الدین خان — سلطان حیدر — مہدی علی خان

زوجہ خواہر ناصر علی خان چپلو

واجد علی شاہ — احمد علی خان — محمد صالح خان — محمد حسین خان — محمد شاہ

واجد علی شاہ:

امان علی شاہ — زاہد علی خان

شجرۂ نسب مقپون راجگان طولتی

- اعظم خان راجہ کرتخشہ 1720ء تا 1750ء
  - عبدالرحیم خان راجہ کرتخشہ
  - علی شاہ راجہ طولتی
    - زوجہ اول
      - احمد خان
      - کریم خان
      - صمد خان
      - حسین علی خان
    - زوجہ دوئم
      - مولا قلی خان

- (راجہ بوقت فتح ڈوگرہ)
  - مہدی علی خان
    - محمد علی خان
      - مہدی علی خان
        - علی شاہ
        - شبیر حسین
      - محمد عباس
      - فدا حسین
    - لطف علی خان
    - احمد خان
  - محمد عظیم خان
  - عبداللہ خان

شجرۂ نسب قدیم واماچا حکمرانان شگر

خاندان قدیم	خاندان جدید عماچہ		
1۔ گیا کھانگ	1۔ چاتھم	11۔ غازی تھم المعروف غازی میر 1430ء تا 1470ء	
2۔ گیا پا کھانگ	2۔ بولگو تھم	12۔ علی میر	1470 تا 1490ء
3۔ تے ستے چو	3۔ یولگو تھم	13۔ گازری	1490 تا 1520ء
4۔ یوق تھم	4۔ راموں	14۔ عبداللہ خان	1520 تا 1535ء
5۔ یوقما تھم	5۔ پیکر دین	15۔ حیدر خان	
6۔ شیر کھانگ	6۔ رام	16۔ حمید خان	
7۔ مرکھانگ	7۔ رزی تھم	17۔ روزی خان	1535 تا 1637ء
8۔ چاکھانگ	8۔ ائی تھم	18۔ سلطان خان	
9۔ چاپا کھانگ	9۔ تنزن تھم	19۔ محمد خان	
10۔ شیر بٹن — مشیڈ	10۔ گوری تھم	20۔ حسن خان	1637ء تا 1638ء

21۔ امام قلی خان 1638ء تا 1685ء — مجید خان

زوجہ اول خواہر امیر خان کرلیس — زوجہ دوئم غضواپا

22۔ اعظم خان 1685ء تا 1727ء — 23۔ علی خان 1727ء تا 1755ء

اس کی زوجہ دختر محمد رفیع خان

سلیمان خان — 24۔ حسین خان 1755ء تا 1790ء

زوجہ اول — زوجہ دوئم خاندان یبگو چپلو

26۔ قلی خان (بار اول 1792-1799) (بار دوئم 1811-1813) (بار سوئم 1818-1819)

دولت علی خان

اس کی زوجہ دختر احمد شاہ سکردو

زوجہ قلی خان دختر احمد شاہ سکردو

28. سلیمان خان — مالی خان

29۔ امام قلی خان (لاولد) — عباس خان

30۔ علی مردان خان — 31۔ اعظم خان

32۔ محمد علی شاہ صبا

24۔ حسین خان 1755ء تا 1790ء

زوجہ دوئم خاندان یبگو چپلو

25۔ محمد اعظم خان (بار اول 92-1790) (بار دوئم 1799 تا 1811ء) (بار سوئم 1813-1818)

اس کی زوجہ دختر پھاچو چپلو

27۔ حیدر خان (راجہ بوقت ڈوگرہ حملہ) — دولت خاتون (زوجہ راجہ احمد شاہ سکردو) — حاتم خان — حلیمہ خاتون

شجرۂ نسب اماچا حکمرانان شگر مرتبہ راجہ سلیمان خان

1. اماچا
2. چاتھم
3. چاماتھم
4. یاکسر گاؤتھم
5. کھمول گوتھم
6. گبول گوتھم
7. خان
8. ماخان
9. رام
10. رحمام
11. دولت شاہ
12. ہری پل مرچک
13. امباروت
14. غازی میر
15. علی میر
16. اماچن دے
17. غرزے
18. حیدر خان
19. حسن خان
20. امام قلی خان
21. قلی خان
22. اعظم خان
23. علی خان
24. حسین خان
25. محمد خان
26. قلی خان
27. سلیمان خان

شجرۂ نسب یبگو راجگان خپلو مرتبہ راجہ علی شیر خان خپلو

1. سلطان اسکندر اعظم
2. سلطان ابراہیم
3. سلطان اسحٰق
4. سلطان عبدالرحیماد
5. میر براہیر
6. ارمان ساہیر
7. بیثرب نم
8. تم لوتنگ
9. سلطان محمود میر غازی
10. سلطان مہدی غزالی
11. مہدی ابراہیم
12. ملک حیدر شاہ
13. سلطان ملک غزالی
14. سلطان ملک شاہ
15. سلطان جنید شاہ
16. حیدر شاہ
17. حیدر کرار
18. شاہ ابراہیم
19. سلطان جوہر فانی
20. نجم الملک
21. ملک رستم
22. مہدی میر
23. ملک میر
24. ملک جبار
25. سعد اللہ خان
26. سعد قرون بیگ
27. سعد جلیل خان
28. سعد رستم بیگ
29. عطاء اللہ خان
30. سعد خلیل خان
31. سعد یعقوب خان
32. سعد میر غازی
33. سعد ملک پرنور
34. سعد بابر ملک
35. سعد محکم خان
36. سعد شاہ عظیم بیگ
37. سعد گوہر بیگ
38. سعد ملک شاہ شجاع
39. سلطان یبگو
40. یبگو لطیف بیگ
41. یبگو شیر غازی
42. یبگو احمد غازی
43. یبگو نور غازی
44. یبگو عالم گیر غازی
45. یبگو بیوان چو
46. یبگو ہل غازی
47. یبگو شیر غازی
48. یبگو بیگ منتر
49. یبگو تراب خان
50. سلطان سالمونڈے
51. سلطان برولدے
52. سلطان ملک بال
53. سلطان ازرونا
54. سلطان ٹیکم
55. سلطان بیکم
56. سلطان کورکور
57. سلطان بہرام
58. سلطان سیکم
59. سلطان میر خان
60. سلطان ابراہیم

61. سلطان غازی میر چو
62. سلطان حسین خان
63. سلطان رحیم خان
64. سلطان حاتم خان
65. سلطان دولت علی خان
66. سلطان محمد علی خان
67. سلطان یحییٰ خان
68. سلطان دولت علی خان
69. سلطان محمد علی خان
70. سلطان حاتم خان
71. سلطان ناصر علی خان

شجرۂ نسب یبگو راجگان خپلو (مرتبہ حشمت اللہ خان)

1. بیگ منتھل (تقریباً 850ء)
2. ٹیکم بیگ
3. محمود مزدقالی
4. سلطان مہد غزالی
5. ملک غوشالی
6. ملک شاہ
7. جنید شاہ
8. حیدر کرار
9. ملک میر
10. جور خانے
11. عالم ملک
12. رستم ملک
13. ملک میر
14. ملک جبار
15. مہدی میر
16. جلیل بیگ
17. رستم بیگ
18. طلاب خان
19. مقیم خان 1380ء تا 1420ء
20. شاہ اعظم خان 1420ء تا 1450ء
21. نور غازی
22. عالمگیر غازی
23. عاصی غازی
24. یبگو برات خان
25. یبگو سلیم الدے 1450ء تا 1470ء
26. یبگو برولدے
27. یبگو ملک بال
28. یبگو ازرو 1475ء تا 1485ء

آخری نور اجگان ممکن ہے کہ یکے بعد دیگرے راجہ رہے ہوں۔ مگر باپ بیٹے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شاہ اعظم سے یبگو بہرام تک 40۔50 سال کے اندر نو پشتوں کا ہونا قرین قیاس نہیں ہوسکتا۔ گو کہ نام اسی طرح تحقیق ہوئے۔

29. یبگو بیکم 1485ء تا1494ء

یبگو کورکور

30. یبگو بہرام 1494ء تا1550ء

31. یبگو سیکم 1550ء تا1575ء

یبگو ابراہیم (سالنگ) 1575ء تا1590ء

یبگو بیگ امان المعرف بیوان چو (کریس)

ا۔ یبگو تراب خان (خپلو وچھوربٹ) 1575ء تا1600ء

2۔ یبگو میر خان 1600ء تا1615ء

3۔ یبگو حسین خان 1615ء تا1640ء

زوجہ حیا خاتون خواہر شاہ مراد

4۔ یبگو بابر

5۔ یبگو یعقوب

ہر دو 1640ء تا1674ء

حمزہ خان

زوجہ لیو دختر بیوان چو

احمد میر (شاخ کریس)

33. یبگو شیر غازی 1590ء تا1620ء

34. یبگو رحیم خان 1620ء تا1660ء

ارگیال خاتون (زوجہ جمیا نگ نمکیل لداخ)

35. یبگو حاتم خان اعظم 1660ء تا1727ء

اعظم خان

36. یبگو دبلہ خان 1727ء تا1764ء

37. یبگو محمد علی خان 1764ء تا1795ء

38. یبگو یحیٰ خان 1795ء تا1812ء

38. یبگو یحییٰ خان 1800ء تا 1812ء

41. یبگو دولت علی خان 39. یبگو محمود شاہ المعروف مہدی علی خان 1812ء تا 1819ء محمد خان

40. حکومت احمد شاہ راجہ سکردو بذریعہ
یول ستر ونگ کریم کھرپون
1819ء تا 1840ء

42. یبگو محمد علی خان ثانی 1860ء تا 1880ء

زوجہ اول رانی زوجہ دوئم پنجابی

43. یبگو حاتم خان ثانی یبگو علی شیر خان

لطف علی خان (لاولد فوت ہوا) 44. یبگو ناصر علی خان (1890ء تا 1948ء) دولت علی خان

یبگو فتح علی خان افتخار علی خان قربان علی خان محبوب علی خان

محمد ذکریا ناصر علی خان

سکندر خان اکبر خان اسفندیار خان عباس خان

شجرۂ نسب یبگو خاندان کریس

یبگو بیکم

یبگو ابراہیم خان (سالنگ)　　1۔ یبگو بیگ امان المعروف بیوان چو (کریس)

(دختر) لیودز وجہ حمزہ خان

یبگو تراب خان

خپلو چھور بٹ

2۔ احمد میر

3۔ امیر خان　　حاتم خان

4۔ علی خان —— 5۔ میر بیگ —— 6۔ مرزا خان

حسن خان (لاولد فوت)　　بہادر خان (لاولد فوت)　　7۔ ذوالفقار خان

زوجہ اول ورانی　　زوجہ دوئم بلتی

جبار خان　　حیدر علی خان　　سلطان خان　　شاہ محمد

8۔ خرم خان راجہ بوقت فتح　　یعقوب خان

9۔ ذوالفقار خان　　مہدی علی خان

زوجہ اول رانی (لاولد)　　زوجہ دوئم بلتی

حسین علی خان

10۔ محمد علی خان غریتق　　سکندر خان　　احمد علی خان　　محمد حسین خان

حامد حسین ——→ خرم خان

پدم کے مجاہدین

1.	حاجی محمد علی	کواردو
2.	علی نصیب	ڈوروسکردو
3.	غلام محمد	سکمیدان
4.	محمد امین	سندوس
5.	وزیر عبداللہ	کواردو
6.	عبداللہ	کواردو
7.	نقی جو	کواردو
8.	غلام حیدر	کواردو
9	حاجی حسین (شہید)	حسین آباد
10.	عسکری	سندوس
11.	شیر محمد	سندوس
12.	شکور علی	سندوس
13.	محمد جو	سندوس
14.	مہدی	سندوس
15.	اسد	سندوس
16.	غلام مہدی	سندوس
17.	محمود	سندوس
18.	غلام حسن	سندوس
19.	محمد علی	سندوس
20.	غلام علی	ژھلو
21.	محمد	گون کریس
22.	محمد	منگوشگر
23.	محمد حسن	کھرمنگ
24.	سکندر	تھوار
25.	شمشیر (شہید)	تھوار
26.	داؤد	تھوار
27.	رستم	چھری
28.	فدا علی	کرگل
29.	سرور (شہید)	کرگل
30.	عبدالکریم	کرگل
31.	غلام حسین	کرگل
32.	حبیب اللہ	کرگل
33.	غلام حسین	پسی کرگل
34.	اکبر	ٹمبس کرگل
35.	محمد علی	پدم
36.	حبیب اللہ	پدم
37.	فضل بخش	پدم
38.	عزیز بٹ	پدم
39.	عبدالشکور	پدم
40.	مولا بخش	پدم

41. حبیب اللہ پدم
42. غلام رسول پدم
43. نور محمد پدم
44. احمد خان پدم
45. محمد رفیق پدم
46. عبدالرحمٰن پدم
47. محمد خلیل پدم
48. عبدالغنی پدم
49. عبدالرزاق پدم
50. محمد جلیل پدم
51. رستم بٹ پدم
52. نظر محمد (شہید) پدم
53. غلام نبی پدم
54. ملاپ حسین پدم
55. محمد موسیٰ سولو پدم
56. فیض بخش پدم
57. احد میر پدم
58. محمد شریف پدم
59. محمد یسین پدم

پدم

پدم کے چند غیر مجاہد افراد غلام محمد راکھا، اس کے والدین (والد اَمواور والدہ)، مجاہد محمد علی کا بھائی حفیظ اللہ اور عبدو رحیم نامی شخص شہید ہو گئے۔ محمد ولد عبدالصمد زخمی ہو کر معذور ہو گیا۔ شہید غلام محمد کا کم سن بیٹا حسن اور مجاہد محمد شریف کا والد محمد اکرم بھی مجاہدین کے ساتھ ہجرت کر کے سکردو چلے آئے۔ مجاہد عبدالغنی بعد میں 1965ء میں شہید ہو گیا۔ شہید نذر محمد مجاہد مولا بخش کا بہنوئی تھا۔ اس کا اصلی نام نیاز محمد تھا۔ بعد میں نذر محمد کے نام سے معروف ہو گیا۔ سورو سے علی، تقی اور علی نام کے تین نوجوان بھی پدم پارٹی کے ساتھ چلے آئے۔

شہداء بلتستان

1948ء کے شہداء

1. تقی	شگری خورد	2. شیر علی	شگری خورد
3. محمد تقی	شگری خورد	4. حاجی حسین	حسین آباد
5. اسد	حسین آباد	6. کریم	کچورہ
7. نذیر	کچورہ	8. موٹا حسن	شگری کلان
9. علی ماسین	کھرپتو	10. ماسٹر غلام رضا	کھرپتو
11. سکندر	شگری بالا	12. شیر علی	گمبہ سکردو
13. علی حسین	گمبہ سکردو	14. محمد حسین	آستانہ
15. علی	کچورہ	16. حسین	کواردو
17. شکور علی	شگری	18. غلام مہدی	چھومیک
19. عبدالرحیم	گول	20. اخوند مہدی	سیز گرکھور
21. غلام مصطفیٰ	سکمیدان	22. احمد	سکمیدان
23. علی جو	سکمیدان	24. حاجی حسین جو	سکمیدان
25. غلام محمد	سکمیدان	26. حیدر جو	سکمیدان
27. محمد علی	چونداہ	28. صادق	سیز گرکھور
29. محمد حسین	کرسمہ تھنگ	30. علی	حسن کالونی سکردو
31. محمد حسین	ہرپوہ	32. شمشیر	تھوار
33. غلام حسین	تھوار	34. تقی	تھوار
35. رضا	تلوبروق	36. محمد	تلوبروق
37. اکبر	تلوبروق	38. مہدی	تلوبروق
39. کریم خان	ڈوڑو	40. نذر محمد	تھغس

41. عبدالرحمٰن	سکمہ	42. مہدی	مرکونجہ شگر
43. محمد حسین	کمنگو	44. حسن علی	کمنگو
45. حاجی غلام	طولتی	46. حمزہ	طولتی
47. حکیم	طولتی	48. علی میر خان	طولتی
49. حسین	طولتی	50. روزی علی	طولتی
51. حسین	طولتی	52. غلام علی	طولتی
53. حاجی علی	طولتی	54. حسین	طولتی
55. کاظم	کسورو	56. مہدی	باغیچہ
57. کلبی علی	پلپلدو	58. رجب	مہدی آباد
59. حسین ولد فضل	شگری کلاں	60. حاجی محمد علی	کھرپتو
61. حسین	چھومیک	62. حیدر ولد احمد	سیزگرکھور
63. اصغر	سکمیدان	64. مہدی ولد حسن	باغیچہ
65. وزیر سلیمان	مہدی آباد	66. غلام سرور	غندوس
67. کلبی علی	کواردو		

11 فروری 1948ء کو ڈوگرہ فوج نے سکردو شہر میں پھیل کر جن لوگوں کو شہید کیا تھا اُن میں سے چند ایک کے نام شہداء کی درج بالا فہرست میں درج نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ حاجی حسن جو، مام بابو ولد حاجی حسین جو، رسول جو ولد حاجی حسین جو، منشی عبدالرحمان ولد منور جو کشتواڑی، زَیبوٗ دختر منشی عبدالرحمان، احد ولد مہدی جو، سلطان بی زوجہ حاجی محمد علی چنداہ پا، روزی کتی شوپہ۔

1965ء کے شہداء

1۔	لانس نائیک	محمد حسین	کچورہ
2۔	لانس نائیک	محمد علی	اولڈ نیگ سکردو

3۔	سپاہی	عبدالغنی	سکمیدان سکردو
4۔	سپاہی	جعفرشاہ	فرانو
5۔	سپاہی	محمد حسین	نیورانگاہ
6۔	سپاہی	حسین	کوروگنگچھے
7۔	سپاہی	محمد اکبر	بغاردو
8۔	سپاہی	ملک چو	ہرپوہ
9۔	سپاہی	کاظم	کشمراہ
10۔	سپاہی	محمد یوسف	ملایوا خپلو
11۔	سپاہی	غلام حسین	برقچھن خپلو

1971ء کے شہداء

1۔	نائب صوبیدار	حسن ستارہ جرأت	مرہ پی شگر
2۔	حوالدار	غلام حسین	کوروگنگچھے
3۔	حوالدار	غلام محمد	خپلو
4۔	حوالدار	شیر محمد	شگر
5۔	نائیک	علی محمد	سکسہ
6۔	نائیک	سید محمد	سکسہ
7۔	نائیک	کریم	سرمیک
8۔	نائیک	حسین خان	شگر
9۔	نائیک	علی	خپلو
10۔	نائیک	محمد	سکردو
11۔	لانس نائیک	غلام محمد	کھانکسر خپلو
12۔	لانس نائیک	محمد حسین	مہدی آباد

13	لانس نائیک	مہدی	شگر
14۔	لانس نائیک	محمد	منٹھوپہ شگر
15۔	سپاہی	غلام حسین	مرہ پی شگر
16	سپاہی	محمد	منگوشگر
17۔	سپاہی	علی	چھورکاہ
18	سپاہی	علی	کچورہ
19۔	سپاہی	سید مجتبیٰ	حسین آباد
20۔	سپاہی	مہدی خان	خپلو
21۔	سپاہی	رستم علی	چھورکاہ
22۔	سپاہی	مراد	ڈغونی
23۔	سپاہی	حسین	پرتوک
24۔	سپاہی	غلام محمد	غندوس
25۔	سپاہی	ابراہیم	خپلو
26۔	سپاہی	احمد علی	نر
27۔	سپاہی	ولی	شگر
28۔	سپاہی	شکور علی	کھانکسر خپلو
29۔	سپاہی	حسین	سکسہ
30۔	سپاہی	ابراہیم	پیون
31۔	سپاہی	محمد	کوستنگ
32۔	سپاہی	محمد امین	برق چھن خپلو
33۔	سپاہی	حسن	چونداہ
34۔	سپاہی	محمد حسین	کھرپتو

35۔	سپاہی	محمد حسین	شگر
36۔	سپاہی	غلام مہدی	سکسہ
37۔	سپاہی	محمد علی	ڈغونی
38۔	سپاہی	عبدالرحیم	ٹیقشی
39۔	سپاہی	عبدالکریم	کشمل شگر
40۔	سپاہی	حسن	ڈمبوداس
41	سپاہی	قربان	کواس (امیر آباد)
42۔	سپاہی	غلام محمد	کرکت کھرمنگ
43۔	سپاہی	غلام حسین	غندوس
44۔	سپاہی	حسین	شگر
45۔	سپاہی	محمد حسین	حسن آباد گنگچھے
46۔	سپاہی	علی محمد	کھرپتو
47۔	سپاہی	حسن	سکسہ
48۔	سپاہی	حسن	کوروگنگچھے
49	سپاہی	محمد سرور	کریس
50۔	سپاہی	محمد حسن	غاسنگ
51۔	سپاہی	محمد خان	پرتوک
52۔	سپاہی	غلام محمد	کرکت کھرمنگ
53۔	سپاہی کلرک	رضا	بغاردو

1986-89ء کے شہداء

1۔	حوالدار	غلام ہادی	تھغس
2۔	نائیک	اسماعیل	خپلو

3۔	نائیک	علی خان (تمغہ بسالت) تھوار	
4۔	لانس نائیک	غلام حید (تمغہ بسالت) تھوار	
5۔	سپاہی	حسین	کواردو
6۔	سپاہی	نعمت خان	ستق
7۔	سپاہی	غلام	اولڈنیگ
8۔	سپاہی	محمد رفیق	کچورہ
9۔	سپاہی	سلیمان	گلتری
10۔	سپاہی	محمد علی	مرہ پی
11۔	سپاہی	اودچو	ستق
12۔	سپاہی	محمد حسین	بروق کھورشگر
13۔	سپاہی	بشارت حسین	قمراہ
14۔	سپاہی	وزیر علی (تمغہ بسالت)	سندوس
15۔	سپاہی	غلام مہدی (تمغہ بسالت)	براہ
16۔	سپاہی	ابراہیم	وزیرپور
17۔	سپاہی	غلام مہدی	سکردو
18۔	سپاہی	حسن	گمبہ سکردو
19۔	سپاہی	محمد علی	ڈغونی
20۔	سپاہی	سید محمد شاہ	گلاپ پور
21۔	سپاہی	غلام حیدر	ڈمبوداس
22۔	سپاہی	سید اکبر شاہ	چھورکا
23۔	سپاہی	محمد عزیز	رانگاہ
24۔	سپاہی	عبدالرحمٰن	کونیس

1999ء کے شہداء

1۔	صوبیدار	سید محمد شاہ (ستارہ جرأت)	کواردو
2۔	صوبیدار	غلام مہدی	براہ پائین
3۔	نائب صوبیدار	اسماعیل	براہ بالا
4۔	نائب صوبیدار	سلیمان (تمغہ بسالت)	قمراہ
5۔	حوالدار	محمد قاسم	طورمک
6۔	حوالدار	سید حسین شاہ	چھورکا
7	حوالدار	فضل	مصطفیٰ آباد شگر
8۔	حوالدار	احسان علی	سکوراشگر
9۔	حوالدار	اکبر علی	حمزی گونڈ
10۔	حوالدار	موسیٰ	چھری
11۔	حوالدار	احمد علی	کواردو
12۔	حوالدار	جعفر علی	تلوبروق
13۔	حوالدار	محمد	کندوس
14۔	حوالدار	غلام حسن (تمغہ جرأت)	کوروچلو
15۔	حوالدار	عبدالرشید	غواڑی
16۔	نائیک	عبدالحسین	انگوت
17۔	نائیک	فرمان علی	کوتھنگ
18۔	نائیک	محمد رضا	گرخ
19۔	نائیک	محمد رضا	اولڈنیگ کھرمنگ
20۔	نائیک	حسن	ہوطو
21۔	نائیک	محمد علی	شوت روندو

22۔	نائیک	غلام رسول	قمراہ
23۔	نائیک	فدا علی	نیورانگاہ
24۔	نائیک	عبدالقادر	بلغار
25۔	نائیک	غلام حیدر	مرچھاچلو
26۔	لانس نائیک	محمد بشیر	کواردو
27۔	لانس نائیک	غلام محمد	کواردو
28۔	لانس نائیک	غلام حسین	ڈیمل شگر
29۔	لانس نائیک	محمد علی	کوروچلو
30۔	لانس نائیک	محمد یوسف	ہچھی چلو
31۔	لانس نائیک	سید احسان	غورسے چلو
32۔	لانس نائیک	مرزا	بغاردو
33۔	لانس نائیک	حسن (تمغہ جرأت)	داسو روندو
34۔	سپاہی	محمد عبداللہ	بغاردو تھنگ
35۔	سپاہی	جعفر حسین	طورمک روندو
36۔	سپاہی	سید ممتاز حسین	تھوار بالا
37۔	سپاہی	منظور احمد	تھماچو شگر
38۔	سپاہی	محمد حسن	گول
39۔	سپاہی	علی محمد	گلاب پور
40۔	سپاہی	حبیب حسین	تھورگو بالا
41۔	سپاہی	فدا علی	مورول
42۔	سپاہی	نثار حسین	گونگمہ تھنگ طولتی
43۔	سپاہی	علی موسی	تھورسے

44-	سپاہی	محمد حسن	ہمیسل شگر
45-	سپاہی	محمد کاظم	چونداہ
46-	سپاہی	حسن خان	غاسنگ
47-	سپاہی	محمد عیسیٰ	کچورہ
48-	سپاہی	رجب علی	مہدی آباد
49-	سپاہی	علی محمد	مورول
50-	سپاہی	غلام	رانگاہ سکردو
51-	سپاہی	سکندر	طورمک
52-	سپاہی	شمس الدین	کچورہ
53-	سپاہی	غلام محمد	طولتی
54-	سپاہی	محمد جواد	نیا نیور سکردو
55-	سپاہی	غلام مہدی (تمغہ جرأت)	ہینگو روندو
56-	سپاہی	نیاز علی	نوگام گلتری
57-	سپاہی	محمد حاجت	یولبو روندو
58-	سپاہی	ابوذر حسین (تمغہ جرأت)	کھربو سکردو
59-	سپاہی	باقر علی	ماشنگ کھرمنگ
60-	سپاہی	محمد	سیندو
61-	سپاہی	محمد علی	تریکو روندو
62-	سپاہی	بابر علی	فرنساٹ گلتری
63-	سپاہی	غلام نبی	حشوپی
64-	سپاہی	محمد یونس	حمزی گونڈ
65-	سپاہی	محمد حسین	ڈمبوداس

66۔	سپاہی	شیر علی	مرہ پی
67۔	سپاہی	تقی	مرہ پی
68۔	سپاہی	محمد حسین	کچورہ
69۔	سپاہی	حسن	بلغار
70۔	سپاہی	فرمان علی (تمغہ جرأت)	پرتوک
71۔	سپاہی	محمد حسین	سکسہ
72۔	سپاہی	فدا علی	ڈغونی
73۔	سپاہی	محمد علی	براہ بالا
74۔	سپاہی	احمد علی	کوروچلو
75۔	سپاہی	محمد حسین	تھغس
76۔	سپاہی	محمد تقی	ڈغونی
77۔	سپاہی	حسین	بلغار
78۔	سپاہی	محمد باقر	گونگمہ تھنگ طولتی
79۔	سپاہی	غلام حسین	فرانو
80۔	سپاہی	احمد علی	غواڑی
81۔	سپاہی	محمد حسن	گون
82۔	سپاہی کلرک	محمد خان	داسوروندو
83۔	سپاہی کلرک	علی موسیٰ	بنیال گلتری

قدیم راستے

اس پہاڑی علاقے سے باہر کی جانب دریائے سندھ کی وادی کو چھوڑ کر باقی سارے راستے موسمی ہیں جو صرف گرمیوں کے دوران کھلے رہتے ہیں اور سال کے باقی مہینے برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ بلتستان کی سیاست میں اور بلتی کلچر کے تحفظ میں یہاں کی اس جغرافیائی تنہائی کا اہم کردار رہا ہے۔ بلتستان کی تاریخ وثقافت کو مکمل طور پر سمجھنے کے حوالے سے ان راستوں کا علم بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سکردو بلتستان کا دارالسلطنت رہا ہے جہاں سے مختلف علاقوں کو جانے والے قدیم راستے حسب ذیل ہیں۔ پندرہ بیس میل کے فاصلے پر جو بڑا گاؤں آتا وہ پڑاؤ یعنی بستی منزل کہلاتا تھا جہاں قیام کے لئے ڈاک بنگلہ ہوتا تھا۔

1۔ سکردو تا کرگل

سکردو تا گول 20 میل، گول تا مہدی آباد 12 میل، مہدی آباد تا طولتی 16 میل، طولتی تا باغیچہ 16 میل، باغیچہ تا اولڈ ینگ 16 میل، اولڈ ینگ تا کرگل 16 میل۔

1۔ کرگل تا سرینگر

کرگل تا شمشہ کھر بو 14 میل، شمشہ کھر بو تا دراس (ہمباف) 1/2 22 میل، دراس تا مٹائن (امبوٹی) 1/2 12 میل، مٹائن تا بالتل 14 میل، بالتل تا سونا مرگ 9 میل، سونا مرگ تا گونڈ 14 میل، گونڈ تا کانگن 13 میل، کانگن تا گاندربل 11 میل، گاندربل تا سرینگر 131/2 میل۔ کھہ رول پر 90 گز لمبا پل ہے۔ بالتل درہ زوجی لہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر مغرب میں واقع ہے۔ درہ زوجی لہ سرینگر سے 64 میل پر ہے۔ سرینگر سے کرگل اور لداخ تک کا واحد زمینی راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔ یہ درہ 11578 فٹ سطح سمندر سے بلند ہے جو اکتوبر تا مئی برف سے ڈھکا رہتا ہے۔

2۔ کرگل تا لیہ

1۔ براہ مولبیگ: کرگل تا مولبیگ 22 میل، مولبیگ تا بودھ کھر بو141/2 میل، بودھ کھر بو تا لا مہ یورو 15 میل، لا مہ یورو تا نورلہ183/4 میل، نورلہ تا ساسپول 14 3/4 میل، ساسپول تا نیمو1/2 11 میل، نیمو تا لیہ3/4 12 میل۔ لا مہ یورو سے 10 میل لیہ کی طرف کھلسے گاؤں واقع ہے جہاں دریائے سندھ پر پل لگا ہوا ہے۔ یہاں سے لیہ 53 میل ہے۔ ساسپول سے1/2 7 میل پر بازگو گاؤں واقع ہے جہاں سے نیمو4 میل کا فاصلہ ہے۔

2۔ براہ سورو: کرگل سے دریائے سورو کے ساتھ ساتھ سورو گاؤں، سورو سے فوتولہ، فوتولہ سے لامہ یورو، لامہ یورو سے لیہ۔

3۔ براہ واکھا: کرگل سے نالہ واکھا، واکھا سے فوتولہ، فوتولہ سے لامہ یورو، وہاں سے لیہ۔ لیہ سے لہاسہ تبت پیدل تین ماہ کا اور لیہ سے براہ نوبراہ و درہ قراقرم یارقند پانچ ہفتے کا سفر ہے

3۔ کرگل تا زانسکر: کرگل سے زانسکر کے مرکزی گاؤں پدم براہ سورو وکرتسے 150 میل کا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ کرگل سے مولبیگ کے راستے نیمو پھر وہاں سے پدم تک راستہ ہے۔ سورو سے جموں کے علاقہ واروَن کشتوار تک بھی پہاڑی درہ ہے۔ سورو سے کشمیر تک بھی راستہ ہے۔

2۔ سکردو تا خپلو

سکردو تا گول 20 میل، گول تا کریس 8 میل، کریس تا کورو10 میل، کورو تا ڈغونی 12 میل، ڈغونی تا خپلو 11 میل، خپلو تا ڈاؤو14 میل، ڈاؤو تا پیون (چھوربٹ)10 میل، پیون تا فرانو11 میل، فرانو تا تورتوک9 میل۔

1۔ خپلو تا نوبراہ: خپلو تا تورتوک 45 میل، تورتوک تا ملکشہ 18 میل، ملکشہ تا ہلچنگمر 14 میل،

ہلچنگمر تا سکورو 8 میل، سکورو تا سکمپوک 9 میل، سکمپوک تا دیسکت 10 میل، دیکست تا کھلسر 14 میل، کھلسر تا پنا مک 14 میل، پنا مک تا اومبولونگ 15 میل۔

2۔ نو براہ تا یارقند: اومبولونگ تا توتیا لکہ 11 میل، توتیا لکہ تا سیا سیر بلانگسہ 22 میل، سیا سیر تا مور گو 12 میل، مور گو تا قزل لنگر 20 میل، قزل لنگر تا پولو 18 میل، پولو تا بلتی بلانگسہ 22 میل، بلتی بلانگسہ تا شیڈ ولہ 70 میل، شیڈ ولہ تا یارقند 240 میل۔ توتیا لکہ اور سیا سیر کے درمیان سیا سیر لہ آتا ہے جو 17500 فٹ بلند ہے۔ پولو اور بلتی بلانگسہ کے درمیان درہ قراقرم آتا ہے جو 18200 فٹ بلند ہے۔ بلتی بلانگسہ اور شیڈ ولہ کے درمیان سوکید لہ آتا ہے جو 18200 فٹ بلند ہے۔ شیڈ ولہ اور یارقند کے درمیان دو اور درے آتے ہیں۔ یارقند سے کاشغر پیدل ایک ہفتہ کا راستہ ہے۔

3۔ نو براہ تا لیہ: کھلسر تا ہردونگ (براستہ کھردونگ لہ 18500 فٹ) 12 میل، کھردونگ تا لیہ (براہ گنگ لس) 27 میل۔

4۔ خپلو تا لیہ: (1) براہ چھور بٹ لہ: پیون تا چونگہ پڑاؤ 12 میل، پڑاؤ تا ہنو (براہ چھور بٹ لہ یا ہنولہ) 19 میل، جو تین ماہ کھلا رہتا ہے۔ ادھر سے گھوڑا گزر سکتا ہے۔ ہنو تا سکیور بوچن 17 میل، سکیور بوچن تا کھلسے 16 میل، کھلسے تا لیہ 53 میل۔
(2) براہ وادی شیوق: خپلو تا تورتوک 45 میل، تورتوک تا بیوغدنگ، بیوغدنگ تا اودمارو، اودماردو تا ہندرر (ہنڈل۔ نو براہ خاص)، ہندر تا کھلسر، کھلسر تا کھردونگ، کھردونگ تا لیہ (براہ گنگ لس)۔

5۔ خپلو تا یارقند براہ سلتورو: خپلو تا غورسے 13 میل، غورسے تا پھڑوا 9 میل، پھڑوا تا مندک 12 میل، مندک تا سلتورو گونگمہ 6 میل، گونگمہ سے گیارو، تیرم، علی بلانگسہ اور سیاچن گلیشئر سے ہوتا ہوا سلتورو درہ عبور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وادی

نوبراہ آتی ہے جہاں سے یہ راستہ لیہ۔ یارقند شاہراہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھڑوا سے دو گھنٹے پیدل سفر کے بعد دوم سوم آتا ہے جہاں پر سلتورو اور کوندوس کی وادیاں ملتی ہیں۔ کوندوس نامی نالہ سے بھی سلتورو۔نوبراہ راستہ تک گرما کے دوران ایک دن کا سفر ہے۔ سیاچن گلیشئر کی شمالی شاخ کے جھیل خمدان کے پاس وادی شیوق میں بڑھ جانے کی وجہ سے نوبراہ سے یارقند تک کا یہ قدیم راستہ اب مسدود ہو چکا ہے۔

6۔خپلو تا کھرمنگ: خپلو سے ڈغونی 11 میل، ڈغونی تا کورو12 میل، کورو تا کریس 10 میل، کریس سے کشتی کے ذریعے دریا عبور کرنے کے بعد چھوندو پر یہ راستہ سکردو۔کرگل شاہراہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

3۔ سکردو تا برزل (13900 فٹ)

1۔ براہ برگے نالہ: سکردو (کھرپچو) تا پڑاؤ 14 میل، پڑاؤ تا مرفو چھو (لال پانی) 18 میل، مرفو چھو تا سکبہ چن 10 میل، سکبہ چن تا برزل چوکی 13 میل۔

2۔سکردو سے پنڈوبل: پنڈوبل سے علی ملک ماٹ، علی ملک ماٹ سے پڑاؤ، پڑاؤ سے برزل چوکی۔

3۔ براہ سدپارہ: سکردو سے سدپارہ، سدپارہ سے ترونمو بلانگسہ، ترونمو بلانگسہ سے علی ملک ماٹ، علی ملک ماٹ سے برزل چوکی۔

4۔ براہ شغرتھنگ: سکردو تا کچورہ 12 گھنٹے، کچورہ تا پڑاؤ چھپر (شغرتھنگ) 13 گھنٹے، پڑاؤ چھپر تا عالم پی لہ 12 گھنٹے، عالم پی لہ تا بوبن 10 گھنٹے، بوبن تا گودائی 9 گھنٹے، گودائی تا چلم 16 میل، چلم تا برزل چوکی 17 میل۔

5۔ برزل تا سرینگر: برزل چوکی (ستقپی لہ) تا پشواڑی 11 میل، پشواڑی تا گریز (کھچولی غواڑی) 15 میل، گریز تا باڈون 5 میل، باڈون تا کھروگبل 8 میل، کھروگبل تا تراگبل 1/2 14 میل، تراگبل تا بانڈی پورہ 12 میل، بانڈی پورہ تا سرینگر 1/2 34 میل۔

4۔ سکردو تا استور (ہسورہ)

1۔ براہ شغر تھنگ: سکردو تا کچورہ 12 گھنٹے، کچورہ تا پڑاؤ چھپر 13 گھنٹے، پڑاؤ تا ردوکس 12 میل۔ رودکس تا چھومیک 9 میل، چھومیک تا تھنگیہ 13 تھنگیہ تا استور 14 میل۔

2۔ براہ نالہ سدپارہ، دیوسائی چلم پھر استور تک راستہ ہے۔

3۔ براہ برگے نالہ چلم اور استور تک راستے موجود ہیں۔

1۔استور تا گلگت: استور تا ڈشکن 14 میل، ڈشکن تا دوین 11 میل، دوین تا بونجی 18 میل، بونجی تا پڑی بنگلہ 17 میل، پڑی بنگلہ تا گلگت 18 میل۔

2۔استور تا برزل: گودائی تا چلم 16 میل، چلم تا برزل چوکی 17 میل۔

3۔استور تا سرینگر: استور تا رٹو 21 میل، رٹو تا شنگر گڑھ 16 میل، شنگر گڑھ تا کامری 25 میل، کامری تا گریز 15 میل، گریز تا سرینگر 1/2 74 میل،

4۔استور تا گلتری: چلم سے برزل لہ تک دس میل کی چڑھائی ہے۔ اس کے بعد 40 میل تک دیوسائی کی سطح مرتفع آتی ہے اور اس کے بعد دس میل کی اترائی کے بعد گلتری آتا ہے۔

5۔ سکردو تا شگر

1۔سکردو تا برالدو: سکردو تا شگر 19 میل، شگر تا کشومل 16 میل، کشومل تا داسو 16 میل، داسو تا چھقپو، چھقپو تا اسکولی (برالدو)۔

2۔برالدو تا یارقند: اسکولی سے للّی گو، جھیل

چھوبر، زینگ چن، گلیشئر، ردوکس گھاس کی اترائی، گلیشئر، مستغ لونکھہ، سپنگ لہ، لوبسانہ بلانگرا، گلیشئر، درہ (18400 فٹ) اور اترائی کے بعد چنگ تھنگ آتا ہے جہاں سے یارقند اور کاشغر تک راستے موجود ہیں۔ اس راستے 1880ء تک مقامی

لوگ گھوڑے سمیت آتے جاتے تھے۔

3۔شگر تا باشہ: شگر تا کشومل 16 میل، کشومل تا چھوترون 16 میل، چھوترون تا سیسکو 12 میل، سیسکو تا ارندو 12 میل، باشہ سے ہسپر گلیشئر کے اوپر سے ہوتا ہوا نگر تک تین دن کا راستہ ہے جہاں سے آگے جا کر درہ خنجراب سے ترکستان کو جاتا ہے۔

4۔ شگر تا خپلو: 1۔ براہ نر: شگر تا نر 13 میل، نر سے کریس، کریس سے یہ راستہ سکردو۔خپلو شاہراہ میں ملتا ہے۔

2۔ براہ تھلے لہ: شگر تا پڑاؤ 9 گھنٹے، پڑاؤ تا کسور میک 1/2 10 گھنٹے، کسور میک تا ڈغونی 41/2 گھنٹے۔ڈغونی سے یہ راستہ سکردو۔خپلو شاہراہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

5۔ شگر تا روندو:

1۔براہ غنڈولہ: شگر سے چھوترون، چھوترون تا پڑاؤ 7 گھنٹے، پڑاؤ تا ہری مل 8 گھنٹے، ہری مل تا داسو (روندو) 3 گھنٹے۔

2۔براہ ستق: شگر تا چھوترون، چھوترون تا ہری مل (طور میک)، ہری مل تا پڑاؤ، پڑاؤ تا ستق روندو۔

6۔ سکردو تا شنگھو شگر:

سکردو تا سدپارہ، سدپارہ تا ترونمو بہو، ترونمو بہو تا علی ملک ماٹ، علی ملک ماٹ تا کتی شو خلاص، کتی شو خلاص تا میتال۔

اس کے علاوہ کتی شو، منٹھو، تورغون، شیلا اور ہرغوسل سے پھلٹوکس اور شنگھو شگر تک راستے موجود ہیں جو جون سے اکتوبر تک کھلے رہتے ہیں۔لیکن شنگھو شگر کا ہمہ وقتی راستہ براہ کھہ رول و کا قسر ہے جو سال بھر کھلا رہتا ہے۔

7۔ سکردو تا روندو:

سکردو تا قمراہ 6 گھنٹے ،قمراہ تا چھری 5 گھنٹے ، چھری تا تونگوس 1/2 4 گھنٹے ،تونگوس تا داسو 5 گھنٹے ، داسو تا تھوار مینڈی 5 گھنٹے۔

1۔روندو تا گلگت: تھوار تا تریکو، تریکو تا چھوترون ، چھوترون تا اسکولی نالہ، اسکولی نالہ تا شنگوس لہ،شنگوس لہ تا برومدو، برومدو تا ہراموش (ساسی)، ہراموش تا پڑی بنگلہ، پڑی بنگلہ تا گلگت۔

2۔براہ بینگو نالہ: تھوار مینڈی تا پڑاؤ 18 میل، پڑاؤ تا پڑاؤ 12 میل، پڑاؤ تا تھنگیہ 9 میل، تھنگیہ تا استور 14 میل۔

3۔براہ بلامیک: مینڈی تا بلامیک 12 میل، بلا میک تا رگیالموئے بلانگسہ 10 گھنٹے، رگیالموئے بلانگسہ تا تھنگیہ 8 گھنٹے تھنگیہ تا استور 14 میل۔

4۔ مینڈی سے براہ تھورچے بلامیک بھی استور تک راستہ ہے۔

پرانے زمانے میں راستے نہایت دشوار تھے۔خطرناک پڑیاں، جگرخراش نشیب وفراز، خوفناک اترائیاں اور قدم قدم پر پھسلنیں موجود تھیں۔ پڑیوں پر راستے اس حد تک تنگ تھے کہ بیک وقت مخالف سمتوں سے آنے والے دو گھوڑے ان راستوں سے نہیں گزر سکتے تھے۔اس لئے پڑیوں میں داخل ہونے سے پہلے ایک آدمی کو جا کر دوسری طرف کے مسافروں کو روکنا پڑتا تھا۔ دریاؤں پر ہلچو کزم (توت کے درختوں کی جڑوں کے چھلکے یا بید کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی رسیوں کا پل) بنے ہوئے تھے۔ جہاں سے صرف انسانوں کی آمد ورفت ہوتی تھی۔اس کے علاوہ زخ (مشکوں اور لکڑی کے ڈنڈوں سے بنی ہوئی کشتی) اور کشتیوں کے ذریعے بھی دریا عبور کر لئے جاتے تھے۔جنوری اور فروری کے دوران بلتستان میں کئی مقامات پر شدید سردی کی وجہ سے دریا کی سطح پر یخ جم جاتی ہے اور یہ چند روز میں کئی فٹ موٹی اور مضبوط ہو جاتی ہے تو اسے بطور پل آمدو رفت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانوں میں تجارتی قافلے گھوڑوں اور گدھوں کے ساتھ اس قسم کے پلوں کے ذریعے آتے جاتے تھے۔ 1980ء تک کئی مقامات پر مرد اور عورتیں بغل میں مشک لے کر تیر کر دریا پار آتے جاتے تھے۔

مآخذ

1. قدیم ترین جغرافیہ جموں وکشمیر — پنڈت کلہن ،اردو ترجمہ اچھر چند شاہپوریہ
2. راج ترنگنی — کلہن ،اردو ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ
3. فاہیان کا سفر نامہ ہند — اردو ترجمہ یاسر جواد، 2000
4. سفر نامہ مارکو پولو — اردو ترجمہ عاصم بٹ
5. سفر نامہ ہوان تسانگ — ترجمہ یاسر جواد
6. تاریخ چترال — منشی عزیز الدین
7. تاریخ جموں — حشمت اللہ خان
8. تاریخ رشیدی — مرزا حیدر دوغلات (NEYELIASCOULD) انگریزی ترجمہ
9. تحفۃ الاحباب — محمد علی کشمیری
10. دیوان تحسین — ابوالحسن تحسین
11. بوقبوق نامہ — سلطان علی
12. اکبر نامہ — ابوالفضل (انگریزی ترجمہ H.BEVERIDGE)
13. تاریخ ہندوستان — ذکاءاللہ
14. مجالس المؤمنین — قاضی نوراللہ شوستری
15. تاریخ فرشتہ — محمد قاسم فرشتہ
16. منتخب التواریخ — عبدالقادر بدایونی
17. تاریخ عالم آرای عباسی — سکندر بیگ منشی
18. برنیئر کا سفر نامہ ہند — ڈاکٹر ایف برنیئر
19. زادالجنان — سلطان علی
20. تاریخ اعظمی — خواجہ محمد اعظم
21. شاہ جہاں نامہ — ملا محمد صالح کمبوہ
22. بلتی زبان — محمد یوسف حسین آبادی
23. تاریخ شاہ جہاں — ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، ترجمہ سید اعجاز حسین
24. تحفۃ الاحباب اردو بنام تحفہ کشمیر — اردو ترجمہ محمد رضا اخونزادہ
25. تزک جہانگیری — جہانگیر

26. مکمل تاریخ کشمیر	محمد دین فوق
27. تاریخ گلگت	شاہ رئیس خان
28. تاریخ عہد عتیق ریاست ہنزہ	حاجی قدرت اللہ بیگ
29. قدیم لداخ	کاچو سکندر خان سکندر
30. گلاب نامہ	دیوان کرپارام
31. اقبالنامہ جہانگیری	مرزا محمد المعروف معتمد خان
32. عالمگیر نامہ	مرزا محمد ساقی
33. بادشاہ نامہ	عبدالحمید لاہوری
34. نورالمؤمنین	حمزہ علی
35. تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں	صابر آفاقی
36بلتستان پر ایک نظر	محمد یوسف حسین آبادی
37. قراقرم ہندوکش	منظوم علی
38. گلگت 1947ء سے پہلے	گھنسارا سنگھ (ترجمہ شیر باز علی خان برچہ)
39. شمشیر سے زنجیر تک	کرنل مرزا حسن خان
40. گلگت سکاؤٹس	میرزادہ محمد شاہ خان
41بلتستان تاریخ وسیاست	محمد قاسم نسیم
42. شملہ سے بلتستان تک	محمد حسن حسرت
43. شمالی علاقہ جات حقائق ومسائل	انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد
44. تاریخ کشمیر	محمود آزاد
45. اہالیان بلتستان کی زبوں حالی	چیئرمین لداخ بلتستان یونائیٹڈ آرگنائزیشن کراچی
46. سانحہ گلگت	وزیر غلام عباس
47. بادشمال	(جلد نمبر 1 شمارہ نمبر 43,42 اپریل 1959ء)
48. سوانح حیات سید عباس موسوی	تنظیم باشہ بلتستان
49. ایک حقیقت ایک جائزہ	بی ایس ایف
50. مقالہ بلتستان چین تعلقات	لوشوئی لین
51. تاریخ حسن	پیر غلام حسن کھویہامی

52. شغر نامہ	سید ابوالحسن تحسین
53. دربارِ اکبری	محمد حسین آزاد
54. مسل بندوبست	1969 بکرمی
55. تحریر محررہ 1093ھ	بعہد راجہ محمد رفیع خان
56. تحریر محررہ 1180ھ	بعہد راجہ علی شیر خان ثانی
57. بلتی کا قاعدہ	مولوی محمد خلیل الرحمٰن
58. نصاب الصبیان	سید ابوالحسن تحسین
59. معرفۃ المبتدئین	شیخ احمد بلتستانی
60. تحریر محررہ 1253ھ	بعہد راجہ احمد شاہ
61. کارگل کے ہیرو	محمد اسلم لودھی
62. جہد مسلسل	امان اللہ خان
63. آپریشن سیاچن	رفیق ڈوگر
64. معرکہ کارگل	ارشاد احمد حقانی
65. قاطع البرہان	سید علی اکبر روندوی
66. تحفہ تبت	مولوی عبدالحق تبتی
67. آئینہ دردستان	ہدایت اللہ اختر
68. تذکرۂ علماء امامیہ شمالی علاقہ جات	حسین عارف نقوی
69. مذہب یا اقتدار	سید جعفر شاہ ایڈووکیٹ
70. روز نامہ حریت کراچی،	17 اکتوبر 1970ء
71. روز نامہ جنگ کراچی،	20 اکتوبر 1970ء
72. روز نامہ حریت کراچی،	23 جنوری 1972ء
73. روز نامہ نوائے وقت کراچی،	28 مئی 1972ء
74۔ نوٹ	از مولانا محمد شریف بلغاری
75۔ بہارستان شاہی	
76۔ آتش چنار	شیخ محمد عبداللہ
77۔ تحریک و تاریخ پاکستان	پروفیسر شیخ محمد رفیق

78۔حیات قائد کشمیر چوہدری غلام عباس سید محمود آزاد

79۔مسل بابت پرورش راجہ محمد علی شاہ 1911ء

بالمشافہ انٹرویو (1978-83 کے دوران) از جناب

80۔ بریگیڈئر (ر) محمد اسلم خان

81۔ کرنل (ر) حسن خان

82۔ کرنل (ر) احسان علی

83۔ کرنل (ر) محمد خان

84۔ میجر (ر) راجہ محمد بابر خان (بشکریہ ماہنامہ بیباک)

85۔ گروپ کیپٹن (ر) شاہ خان

86۔ صوبیدار (ر) حاجی رستم علی سکردو

87۔ صوبیدار (ر) حاجی نجف علی سکردو

88۔ صوبیدار (ر) وزیر شیر احمد (وزیر شمشیر)

89۔ صوبیدار (ر) حاجی مہدی کورو

90۔ صوبیدار (ر) حاجی احمد علی (امو)

91۔ صوبیدار (ر) فاچو فدا حسین چھلو

92۔ صوبیدار (ر) رجب ملک سکردو

93۔ صوبیدار (ر) وزیر شکور علی سکردو

94۔ صوبیدار میجر (ر) محمد علی گلگت

95۔ حوالدار (ر) سکندر روندو

96۔ حوالدار (ر) مولوی علی محمد سکردو

97۔ نائک (ر) پنجابی محمد حسین سکردو

98۔ سپاہی سرفراز خان شگر

99۔ راجہ حاتم خان سکردو

100۔ راجہ فتح علی خان چھلو

101۔ راجہ محمد علی شاہ شگر

102۔ آغا احمد علی شاہ سکردو

103۔ شیخ غلام محمد الغروی سکردو

104۔ مولوی محمد کثیر چپلو

105۔ وزیر غلام مہدی سکردو

106۔ اخوند رضا تھوار روندو

107۔ وزیر تقی شوت روندو

108۔ وزیر غلام حسن سندوس سکردو

109۔ محمد امین سندوس سکردو

110۔ غلام مہدی سندوس سکردو

111۔ شیخ محمد خان گلتری

112۔ مولا بخش شگر (بشکریہ کاچو حیدر خان کواردو)

113۔ سید مختار تھلے چپلو

114۔ وزیر غلام حیدر حسین آباد سکردو

115۔ وزیر ماسٹر حسن حسین آباد سکردو

116۔ وزیر سرور ستق روندو

117۔ وزیر سکندر ہرداس روندو

118۔ علی حسن گربی داس روندو

119۔ محمود تونگوس روندو

120۔ منشی عبدالحمید سکردو

121۔ دین محمد سکردو

122۔ خواجہ نور الدین سکردو

123۔ رحمت الاہ بیگ سکردو

ان کے علاوہ گنگنی، برولمو، بریسل، میموش تھنگ، اولدنگ، مورول، گلتری، ترکتی، واچرا، چیچے تھنگ، گرخ، باغیچہ، کھرمنگ، غاسنگ، مہدی آباد، سیرمیک، گول، تھورگو، اولدینگ، حسین آباد، سیکمیدان، سندوس، کھرپتو، گمبہ سکردو، قمرا، چھری، تھوار، تریکو، شنگوس، تلو، چپلو اور شگر کے اسی سرکردہ لوگوں کے بھی انٹرویو لئے گئے تھے جن کا ذکر بخوف طوالت چھوڑ دیا گیا ہے۔

1. Ladak - Alexander Cunningham New Delhi, 1977

2. Bolor And Dardistan - Karl Jettmar, Islamabad, 1980

3. The Kingdom of Ladak - Luciano Petech, Roma, 1997

4. The Jammoo And Kashmir Territories - Frederic Drew, Indus Publications, 1980

5. Al-Beruni's India - Dr. A.H. Dani, 1973

6. A History of Ladakh - A.H. Francke.

7. Tibet the Land and the People - Tiley Chodag

8. Tribes of the Hindu Koosh - John Bidulph

9. When Men and Mountain Meet - John Keay

10. The Making of the Frontier - Algernon Durand

11. On Alexander's Track to the Indus - Sir Aurel Stein

12. The Gazetteer of Kashmir and Ladak - Under the Direction of Quarter Master General In India.

13. Travels in the Himalayan Provinces of Hindustan and the Punjab - Willian Moorcroft

14. Travels in Kashmir, Ladak and Skardo - G.T. Vigne

15. The Travels of Fahsien - Retranslated by H.A. Giles

16. Language Hunting in the Karako ram - E.O. Lorimer

17. Where three Empires Meet - E.F. Knight

18. Bernier's Travels - Francois Bernier

19. A summer Ride Throungh Western Tibet - Jane E. Duncan

20. The Lure of Karakoram - A. Saeed Khan Qamar

21. The Himalayas - Nigel Nicolson

22. The Karakoram - Shiro Shrahata

23. Everest - National Geographic Society

24. Military Plight of Pakistan - Col M.N. Gulati

25. The Muslim and Christian Calendars - G.S.P. Freeman Grenville

26. Debacle in Baltistan - Skumar Mahajan

27. The Gilgit Rebellion - William A. Brown

28. Liberation of Northern Areas - Major Sikandar Khan

29. Map/Atlas of the Northern Area - Manzooom Ali

30. Kashmiries Fight for Freedom - Muhammad Yusuf Saraf
31. Highlights of Tibetan History - Wang Furen and SUO Wenqing, Beijing, 1984
32. Notes on N.As. For Senate Committee - Sardar Aminullah Khan Chief Commissioner.
33. Report on NA - 1984, Secretaries Committee
34. Advisory Council NA to Legislative Council NA - Deputy Chief Executive Office Gilgit.*
35. Hudud al Alam - Translated by V. Minorsky
36. Baltistan in History - Banat Gul Afridi
37. Balti Grammar - A.F.C. Read
38. The Written Tibetan Language - Y. M. Parfionovich
39. Ancient Pakistan - University of Peshawar
40. Antiquities of Indian Tibet - A.H. Francke
41. Census Reports 1998
42. Dardistan - G.W. Leitmer
43. War Above the Clouds - Martin A. Sugarman
44. History of Northern Areas of Pakistan - Dr. A.H. Dani
45. Modern Tibetan Languege - Losang Thonden
46. Text Book of Tibetan Colloquial Language - S.G. Amipa
47. A Tibetan English Dictionary - H.A. Jaschke
48. Ladakh and Baltistan Through the Ages - Abdul Ghani Sheikh (Karakoram - Hindu Kush - Himalaya Dynamics of change Part II)
49. The Karakorams - Hiroki Fujita
50. The Legacy of Kashmir, Ladakh and Skardu - Major Arthur Neve
51. Western Himalaya and Tibet - Thomas Thomson
52. The Italian Expedition to the Himalaya, Karakoram and Eastern Turkistan (1913-14) - Flippo De Flippi
53. The Apricot Road to Yarkand - Salman Rashid
54. Correspondence between Ahmad shah and captain Wade

......☆......

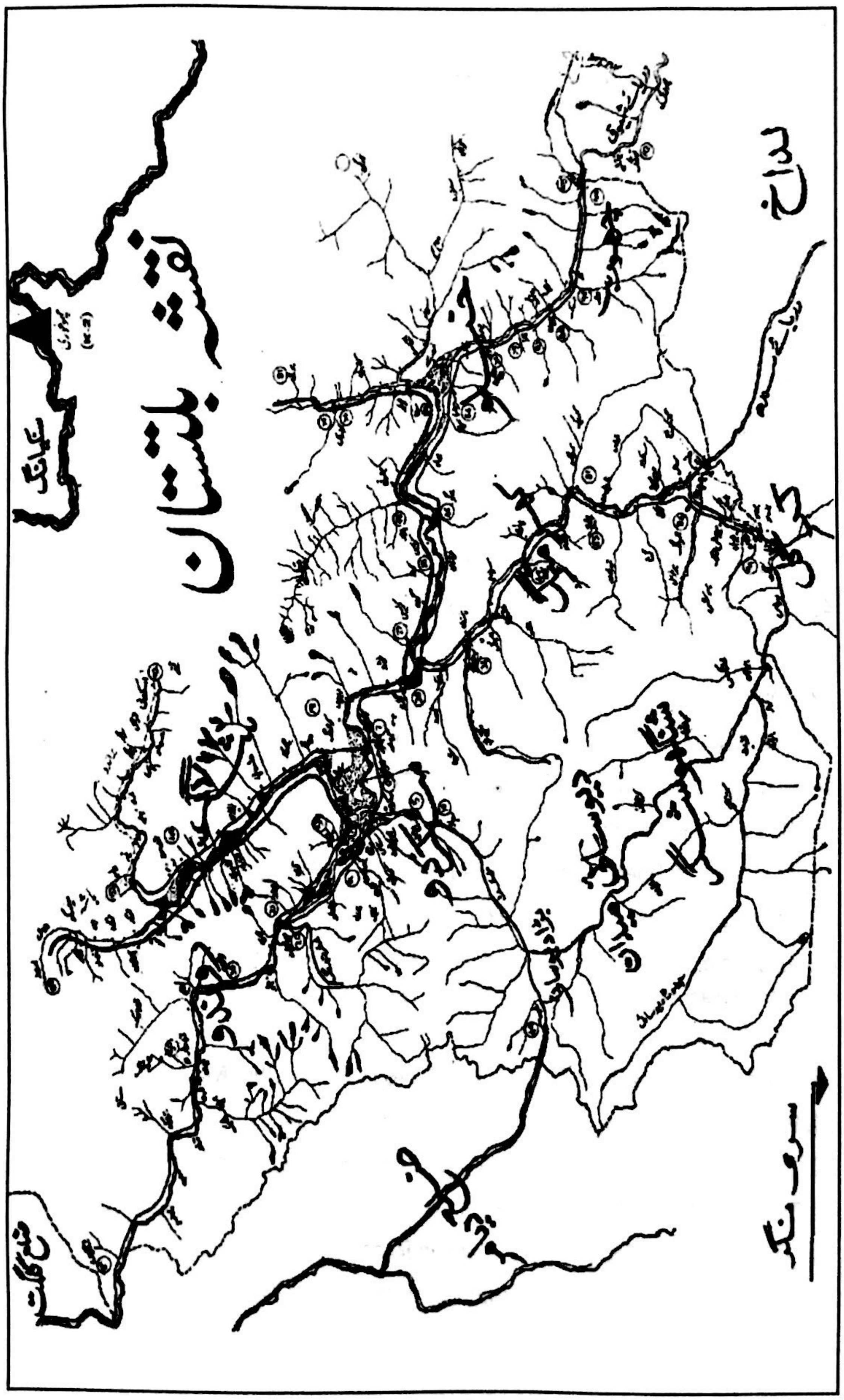
بلتستان
لداخ

سکردو شہر کے جنوبی کنارے پر واقع چٹان پر 1000ء سے قبل چوکور دائرے کی شکل میں کندہ شدہ بدھ کے
مختلف جنموں کی تصاویر پر مشتمل مَنڈَلہ

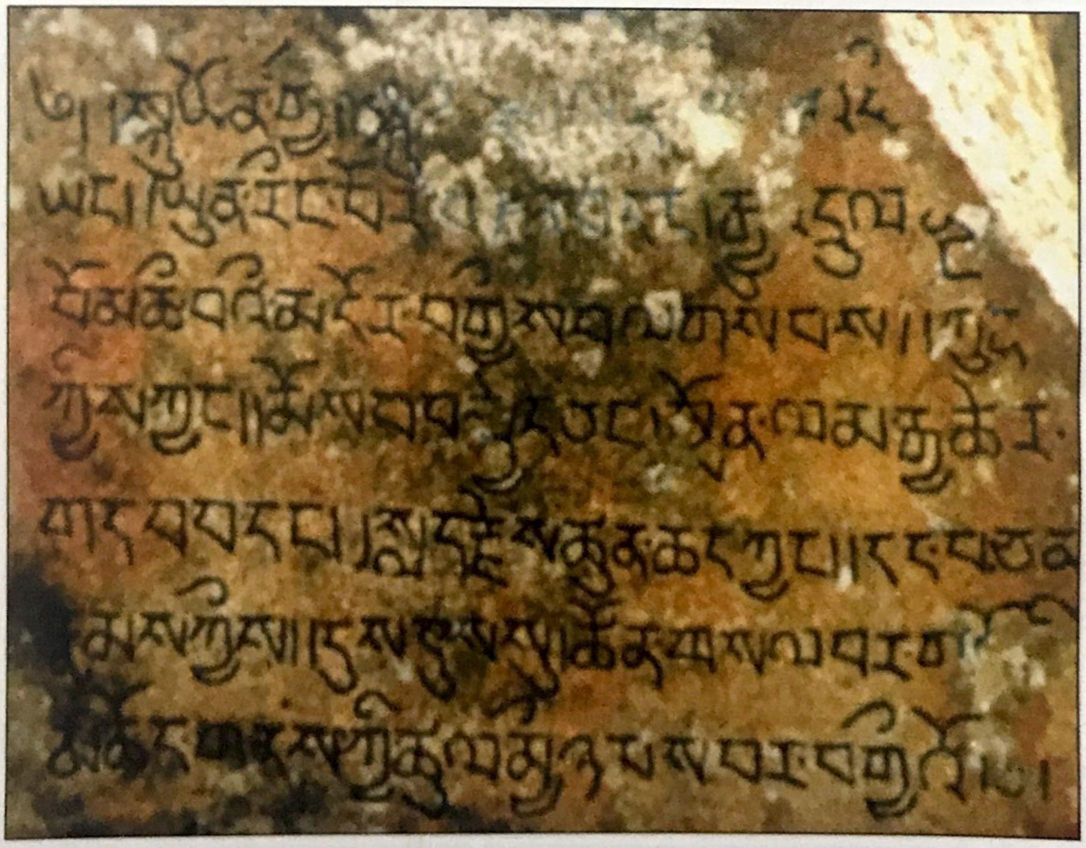

بدھ کی تصویروں والی چٹان پر قدیم بلتی رسم الخط میں کندہ عبارت

خانقاہ چقچن خپلو جسے 1381ء میں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ نے تعمیر کرایا تھا

مسجد امبوڑیگ شگر جسے 1383ء میں امیر کبیر سید علی ہمدانی نے تعمیر کرایا تھا

پھونگ کھر (شگرفورٹ) جس کی تعمیر راجہ حسن خان اماچہ نے 1637ء میں شروع کی تھی

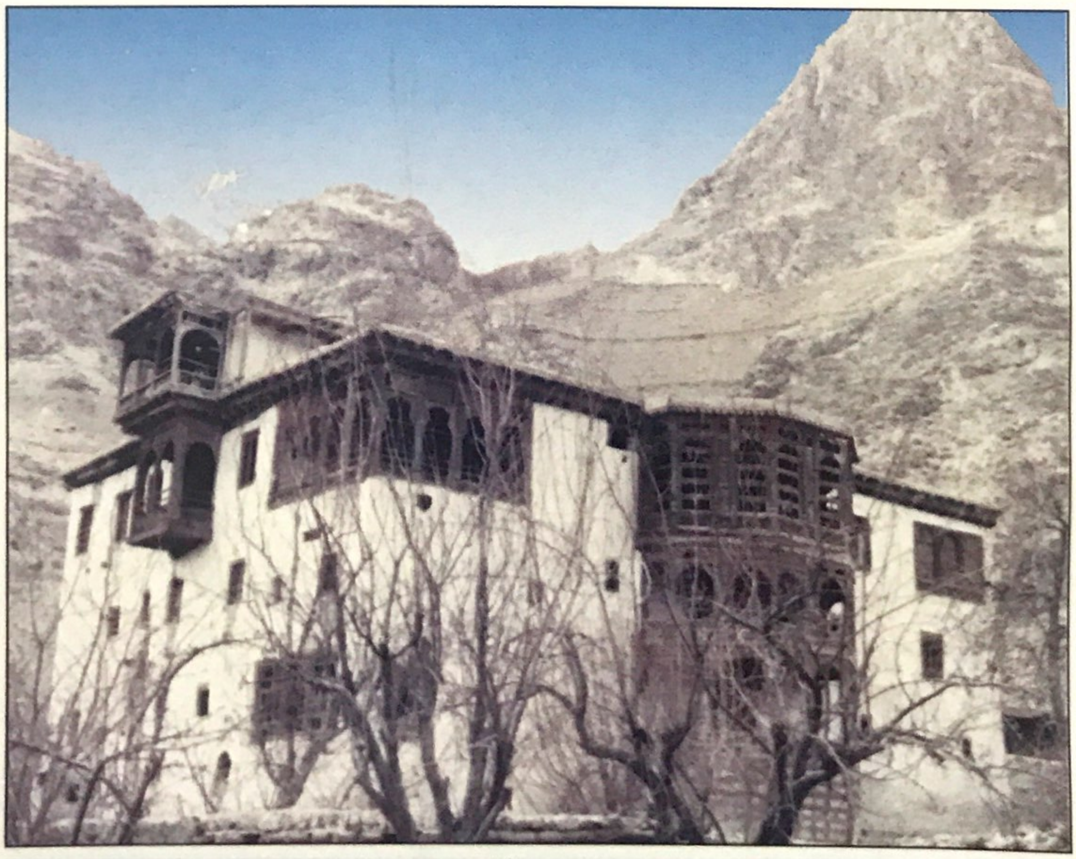

خپلو میں یبگو راجاؤں کا رہائشی محل (خپلو پیلس)

ایک بلتی دسترخوان جس پر مقامی کھانوں کے بیشتر اقسام موجود ہیں

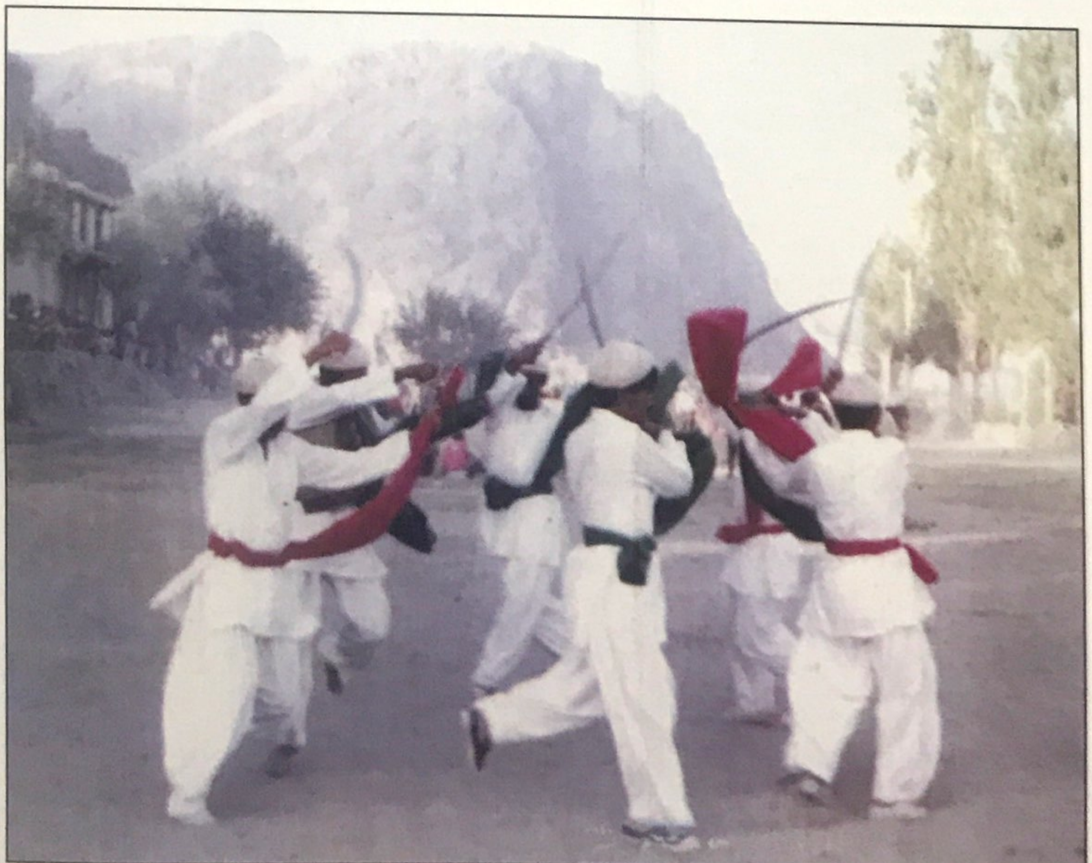

مقپون پولوگراؤنڈ سکردو میں تلوار ناچ کا ایک منظر

آئی بیکس فورس کے کمانڈر کرنل احسان علی اور مصنف (1981ء)

اسکیموفورس کے کمانڈر میرزادہ شاہ خان اور مصنف (1982ء)

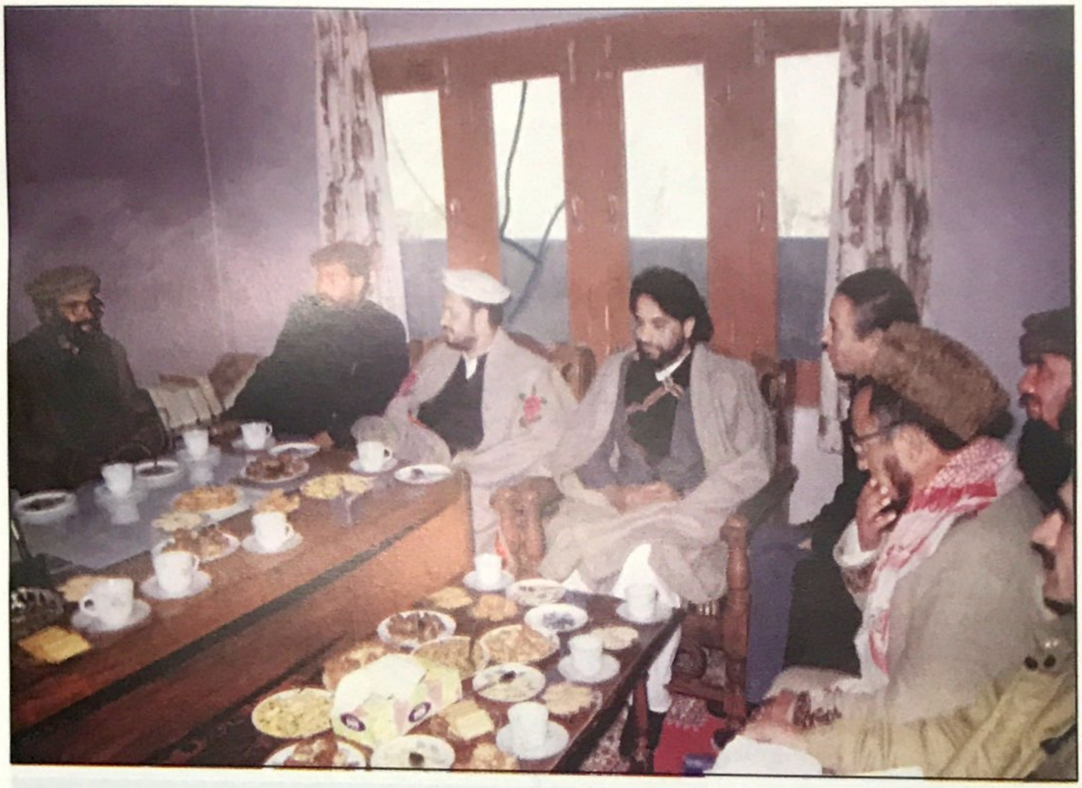

مصنف آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم سردار عتیق احمد خان کے ساتھ۔ سید اسد زیدی، ڈاکٹر محمد علی جوہر، مولانا ابراہیم خلیل، راجہ اعظم خان اور جواد جعفری بھی ساتھ بیٹھے ہیں۔ (1992ء۔ جناح پبلک سکول سکردو)

مسٹر لوشوئی لین جنہوں نے ''تاریخ بلتستان'' اور 'بلتستان تہذیب وثقافت' کا چینی زبان میں ترجمہ کیا ہے

مقامی لباس میں ملبوس ایک بلتی بچی

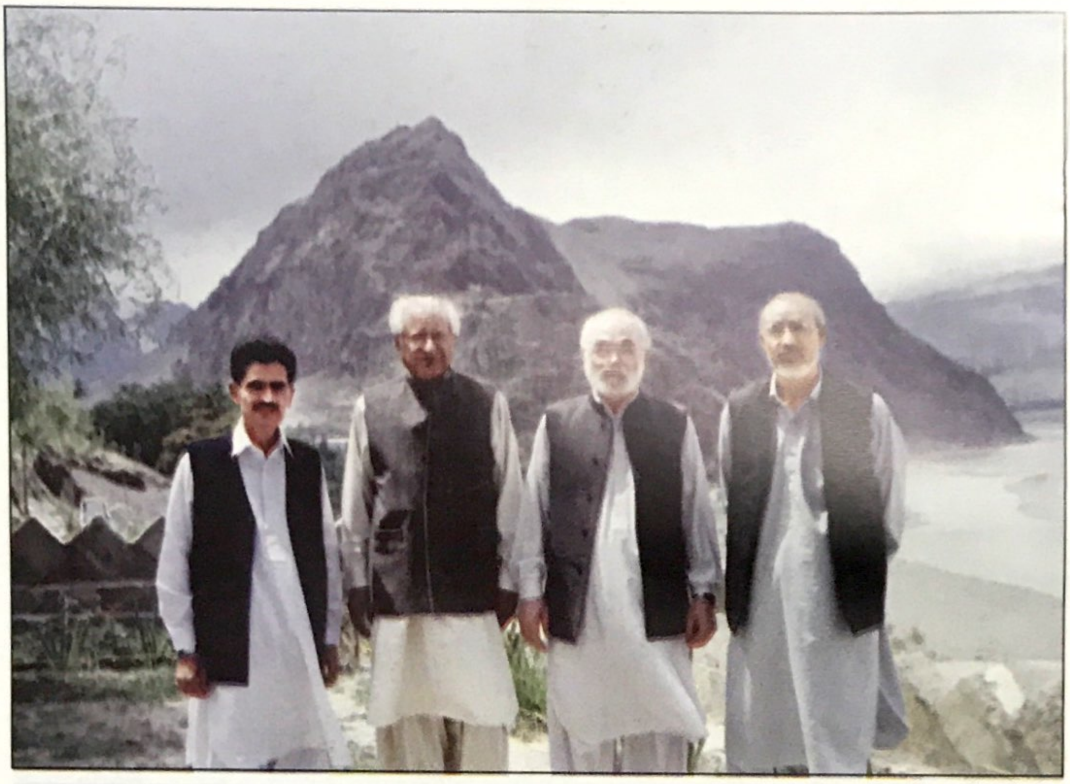

محمد حسن حسرت، محمد یوسف حسین آبادی، پروفیسر فتح محمد ملک چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اور محمد قاسم نسیم
بلتی قاعدہ کی تقریب رونمائی کے بعد (2002ء)

محمد یوسف حسین آبادی، افتخار عارف، صوبہ سرحد کے سابق وزراء قاری روح اللہ مدنی اور مولانا عبدالباقی
اور آٹھویں کلاس کے طالب علم ادریس یوسف (2001ء)

محمد حسن حسرت، سید محمد عباس کاظمی، حاجی فدا محمد ناشاد، راجہ محمد علی شاہ صبا اور محمد یوسف حسین آبادی

پہلی صف میں بیٹھے ہوئے دائیں سے محمد عباس، اخون محمد حسین حکیم، عبداللہ کریم، اقبال ساجد۔ دوسری صف میں حاجی فدا محمد ناشاد، محمد حسن حسرت، محمد یوسف حسین آبادی، غلام حسن حسنی، ابراہیم تبسم۔ آخری صف میں محمد علی ناز، فرمان علی خیال، وزیر محمد علی، کمال الہامی، وزیر احمد، محمود فردوسی، مہدی شاہد، شیخ سجاد، محمد نذیر اور بشیر عالم (1992ء)

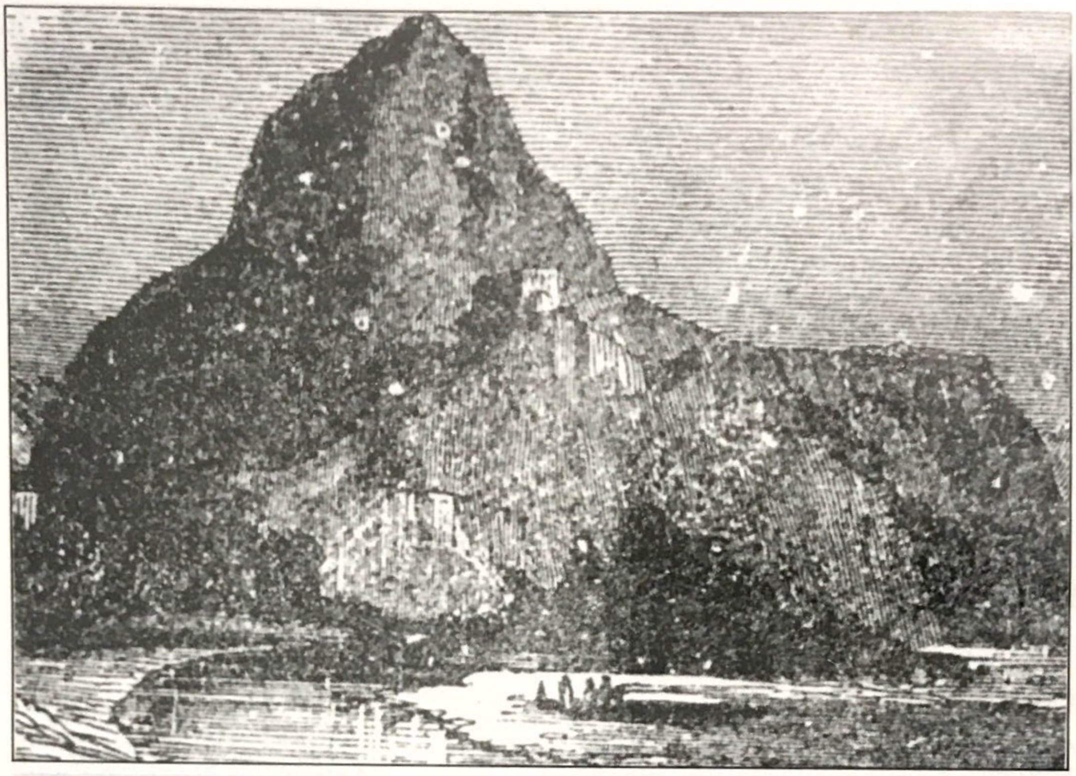

کھرپوچوقلعہ۔قلعہ کے بیچ میں مقپون بادشاہوں کا سات منزلہ محل نظر آرہا ہے۔قلعہ کے نیچے پانچ منزلہ
مینڈوق کھر اور کنارے پر سنگے ستاغو (شیر دروازہ) نظر آرہے ہیں۔ (1835ء)

کھرمنگ قلعہ۔ پہاڑی کی چوٹی پرانٹوک کھر، بوتی کھر اور سومہ کھر تینوں نظر آرہے ہیں۔

بائیں طرف: راجہ احمد شاہ اپنے بیٹوں محمد علی خان اور محمد شاہ اور ایک ملازم کے ساتھ
دائیں طرف: وزیر زور آور سنگھ ڈوگرہ فوجی افسروں کے ساتھ (1840ء)

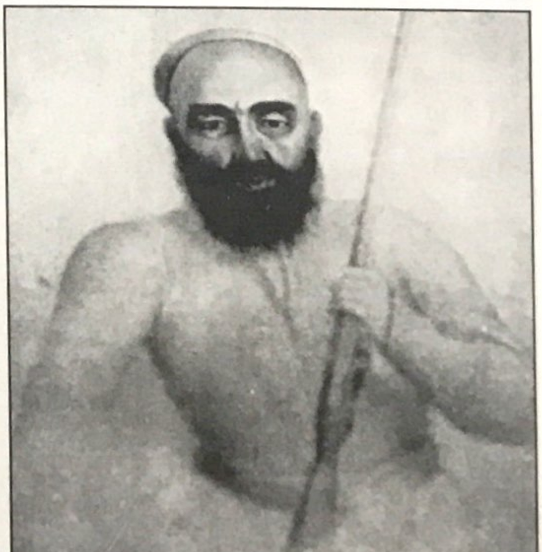

بلتستان کا آخری بادشاہ احمد شاہ مقپون

احمد شاہ کا بیٹا شہزادہ احمد علی خان

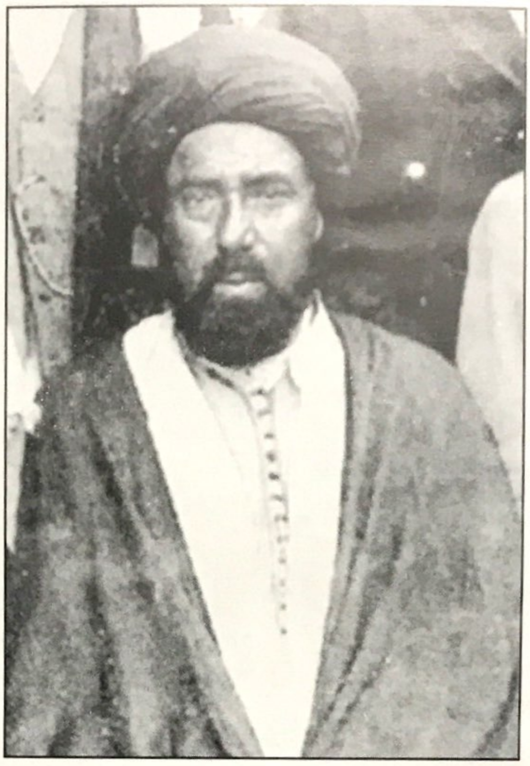

آغا سید عباس چھوترون شگر

شیخ جواد ناصر الاسلام سکردو

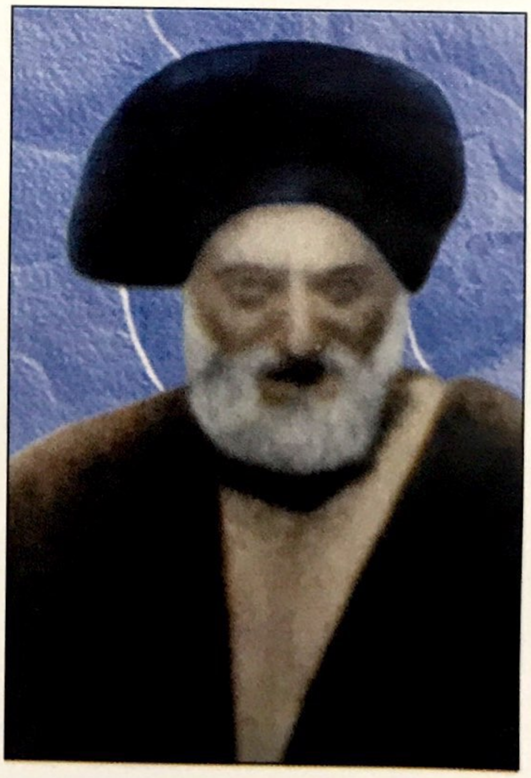

سید عباس علی شاہ عباس

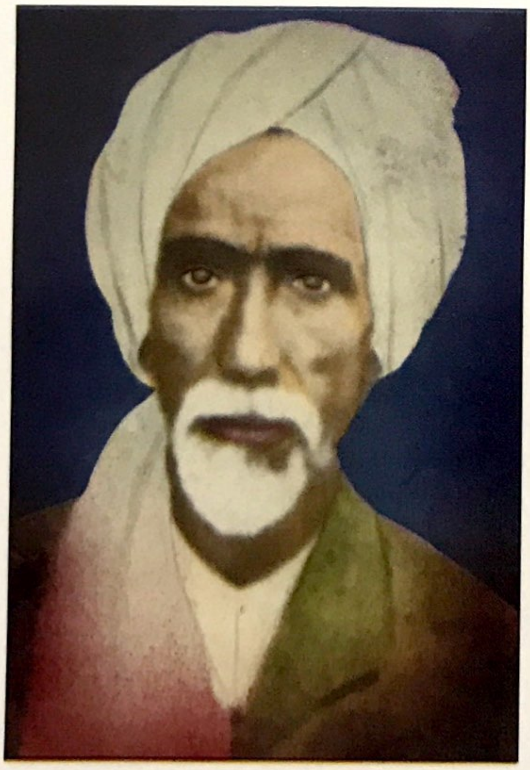

مقپون محمد علی خان ذاکر ترال کشمیر

کرنل مرزا احسن خان

بریگیڈیئر محمد اسلم خان

راجہ محمد بابر خان

راجہ محمد علی خان روندو

پدم پارٹی کے بعض مجاہدین: (بائیں سے) حاجی محمد علی کواردو، علی نصیب ڈورو، محمد امین سندوس، عبدالشکور پدم، سکندر تھوار، مہدی سندوس اور عبداللہ کواردو وزیر اعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ (1949ء)

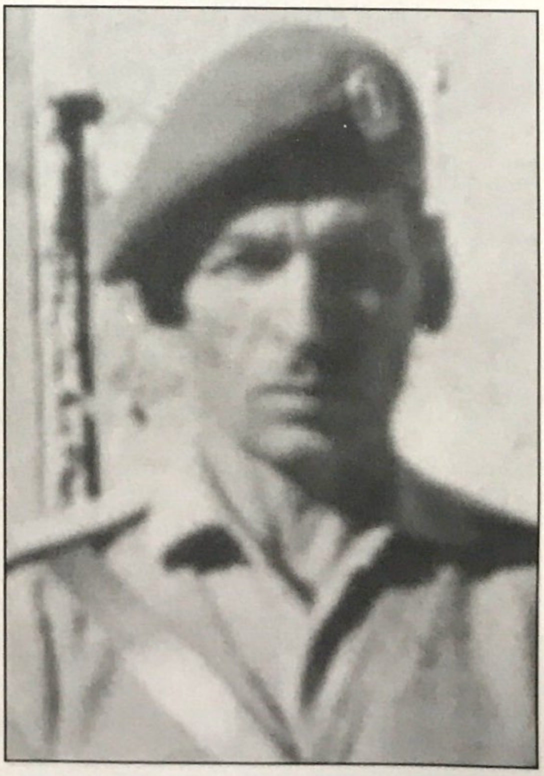

ڈوگرہ وزیر وزارت کو قتل کرنے والے سپاہی سرفراز خان

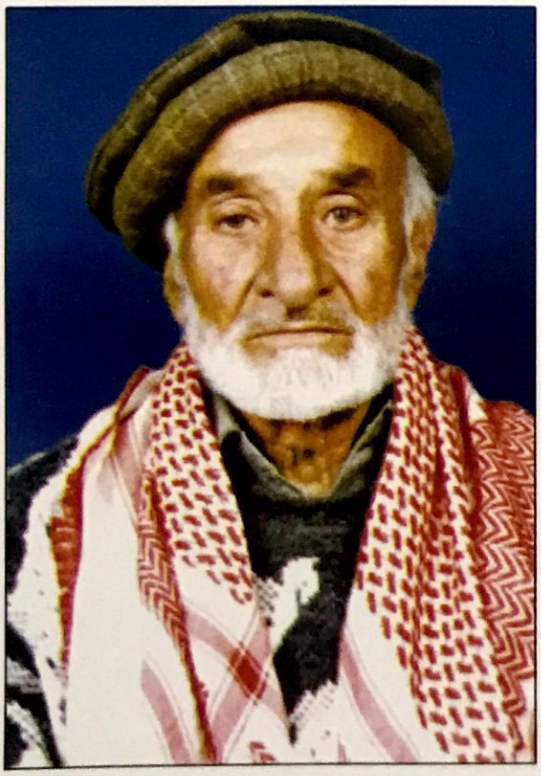

سپاہی محمد حسین کشمراہ سکردو

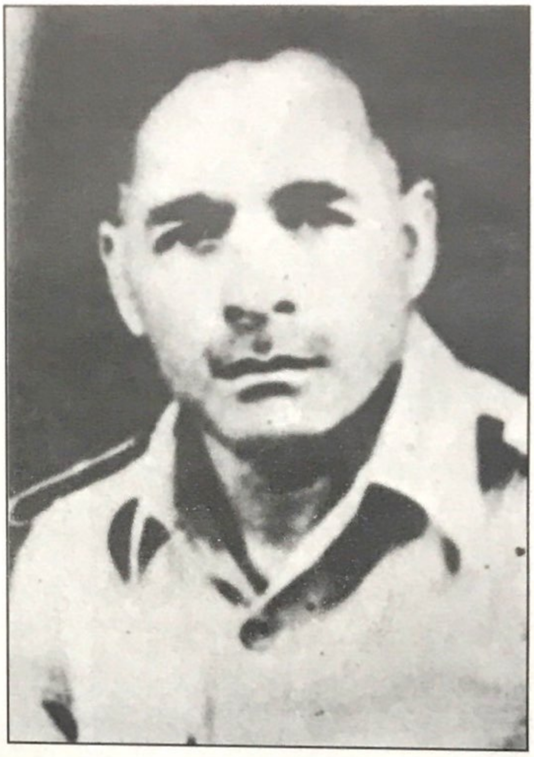

کیپٹن نیک عالم

کرنل مطاع الملک

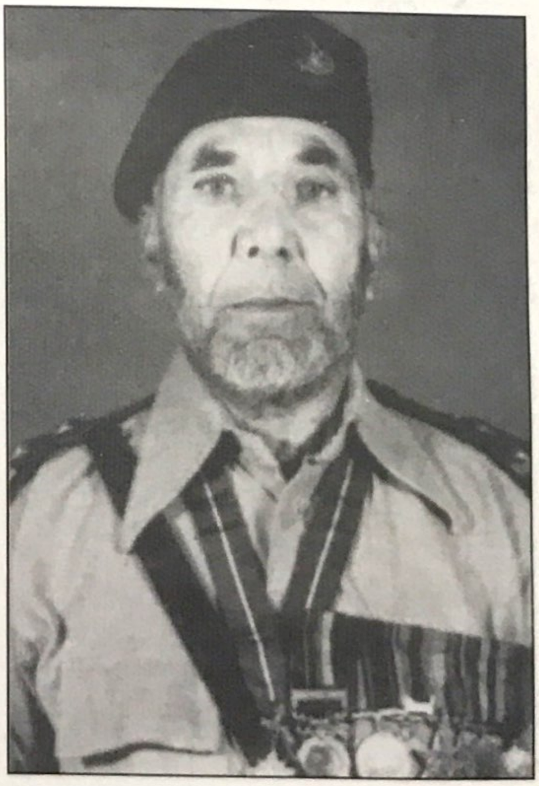

نائیک (بعد میں صوبیدار) رستم علی سکمیدان

صوبیدار نجف علی سکمیدان

اسلام آباد (مارچ 1996ء) قرآن مجید کے بلتی ترجمے کی تقریب رونمائی۔
دائیں سے: محمد یوسف حسین آبادی، نوابزادہ نصر اللہ خان، شیخ محسن علی نجفی، آغا علی موسوی،
سفیر ایران اخوندزادہ اور ثقافتی ڈائریکٹر علی ذوعلم

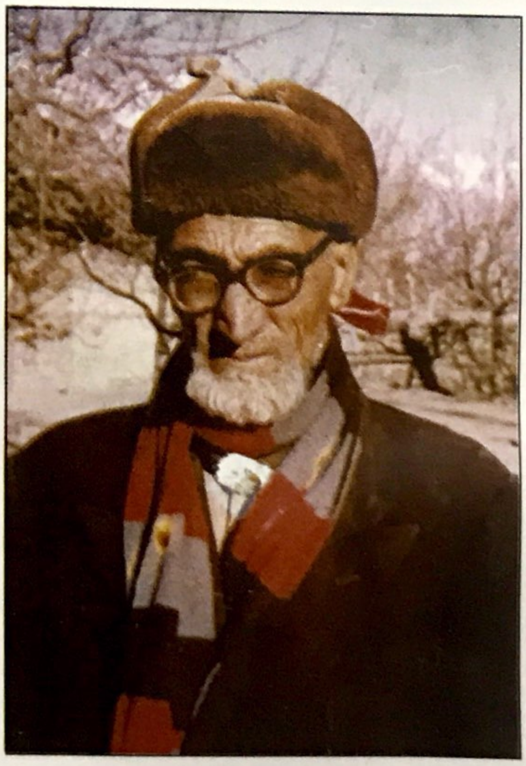

نائب صوبیدار وزیر شیر احمد المعروف وزیر شمشیر سکمیدان

الحاج مولوی حشمت اللہ خان جنہوں نے تاریخ جموں کے ضمن میں بلتستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ مرتب کی ہے۔

مصنف صدر جنرل ضیاء الحق کو اپنی پہلی تصنیف کا نسخہ پیش کر رہے ہیں۔ آغا احمد علی شاہ ساتھ کھڑے ہیں (1985)

ایوان صدر: جنوری 1996ء ۔حاجی فدا محمد ناشاد اور مصنف صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری کے ساتھ

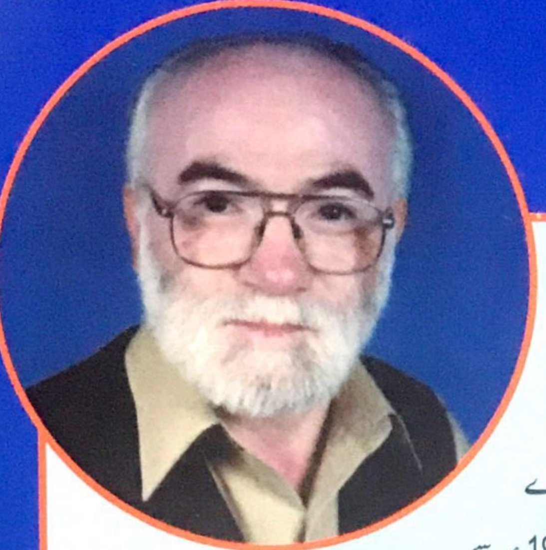

محمد یوسف حسین آبادی 26 اپریل 1948ء کو سکردو کے گاؤں حسین آباد میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم سکردو میں حاصل کی۔ بعد ازاں کراچی چلے گئے جہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے کیا۔ اسی دوران انہوں نے مذہبی تعلیم بھی حاصل کی۔ 1978ء سے 1983ء تک جنگ آزادی بلتستان کی تاریخ پر تحقیق کی جس کے نتیجے میں اپنی پہلی تصنیف ''بلتستان پر ایک نظر'' کے نام سے 1984ء میں منظر عام پر لایا۔ 1980ء میں انہوں نے بلتی زبان کا قدیم رسم الخط اِگے دریافت کر کے اس کا احیا عمل میں لایا۔ 1990ء میں بلتی زبان کی تاریخ اور رسم الخط پر ان کی تصنیف ''بلتی زبان'' شائع ہوئی۔

بلتی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کرنے میں عمر کا ایک حصہ صرف کیا اور ان کا یہ ترجمہ 1995ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ تحقیق وتصنیف کے ساتھ ساتھ علاقے میں معیار تعلیم کو بہتر بنانے میں بھی انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مارچ 1992ء میں انہوں نے ''جناح پبلک سکول'' کے نام سے سکردو شہر میں ایک انگلش میڈیم سکول کا قیام عمل میں لایا جو بلتستان میں پرائیوٹ سیکٹر میں پہلا انگلش میڈیم سکول ہے جسے مثال بنا کر بعد میں پورے بلتستان میں انگلش میڈیم سکولوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جولائی 1993ء میں انہوں نے جناح کالج کے نام سے طالبات کیلئے سکردو میں ایف ایس سی پری میڈیکل کلاسوں کا اجرا کیا اور یہ کلاسیں اسی انتظام کے ساتھ جی بی حکومت نے 1995ء میں گورنمنٹ گرلز انٹر کالج سکردو میں منتقل کر لیں۔ انہوں نے کئی تعلیمی اور دیگر اداروں میں اعلی تدریسی اور انتظامی عہدوں پر کام کرنے کے بعد سروس سے مستعفی ہو کر اپنے آپ کو مکمل طور پر تعلیم و تحقیق کیلئے وقف کر دیا۔ 2000ء میں جناح کالج کی کلاسوں کا دوبارہ اجرا عمل میں لا کر اسی سے منسلک ہو گئے جو نجی شعبے میں بلتستان کا پہلا کالج ہے۔

28 مئی 2007ء کو سکردو شہر سے متصل حسین آباد میں انہوں نے فروغ سیاحت کے لئے جناح پارک کے نام سے ایک تفریحی پارک تعمیر کیا۔ اگست 2007ء میں اُنہوں نے اپنے ذاتی وسائل سے بلتستان کی تاریخ وثقافت سے متعلق ایک میوزیم کے قیام پر کام شروع کیا اور نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کرنے کے بعد 25 دسمبر 2012ء کو ''بلتستان میوزیم'' کے نام سے سکردو میں ایک جامع میوزیم کا قیام عمل میں لایا۔ ادب (تاریخ) کے شعبے میں ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں صدر پاکستان نے انہیں مارچ 2016ء میں پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ سے نوازا۔ جولائی 2018ء میں بلتستان یونیورسٹی سکردو نے انہیں آثار قدیمہ اور ثقافتی علوم و ورثہ کے ڈپارٹمنٹ میں آنریری پروفیسر امریٹس مقرر کیا۔

فراغت کے لمحات کو پھولوں، پودوں، پالتو جانوروں اور پرندوں کے ساتھ گزارنا ان کا مشغلہ ہے۔

Rs. 850/=